إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

(روم رکوع ۳)

آئینہ حقیقت نما

جلد اوّل

مصنفہ

اکبر شاہ خان نجیب آبادی

باہتمام

سید فدا حسین بی اے (علیگ)

در یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ طبع شد

ملنے کا پتہ :- منیجر عبرت نجیب آباد

تہدیہ

میں اس کتاب کی جلد اول کو حضرت محمد بن قاسم سلطان محمود غزنوی سلطان شہاب الدین غوری سلطان قطب الدین ایبک سلطان شمس الدین التمش سلطان ناصر الدین محمود سلطان غیاث الدین بلبن سلطان جلال الدین فیروز خلجی کے اسمائے گرامی کے ساتھ معنون کرتا ہوں الٰہی تو ان نیک لوگوں کی روحوں پر نیز میرے ماں باپ میرے دوستوں اور میرے چھوٹے بڑے رشتہ داروں پر اپنے رحم و کرم کی بارشیں کرا در ہاں! اے میرے خدا میرے گناہوں لغزشوں اور کمزوریوں کو اپنے دامن عفو میں چھپا اور میری محنتوں کو ضائع ہونے سے بچا۔ آمین یارب العالمین

مصنف

۱ر جولائی ۱۹۲۶ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
حامداً و مصلیاً

دیباچہ طبع دوم

خدائے تعالیٰ نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کو جو قبولیت عطا فرمائی وہ میری توقعات سے بہت زیادہ ہے۔ ملک کے بااثر، کثیر الاشاعت اور معزز ترین روزناموں، سہ روزہ اور ہفتہ وار اخباروں نیز پندرہ روزہ اور ماہانہ علمی رسالوں نے جیسے شاندار ریویو لکھے اُن سے میری بڑی ہی ہمت افزائی ہوئی ۱۹۲۶ء کے آخری حصہ میں پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا اور ۱۹۲۷ء کے آخری مہینوں میں یہ کتاب نایاب اور غیر موجود تھی۔ کئی سال سے اس کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت کے لیے تقاضے ہو رہے تھے لیکن میں اپنی دوسری مصروفیتوں کے سبب اس وقت سے پہلے اس کتاب کو دوسری مرتبہ نہ چھپوا سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج دوبارہ چھپنے کے لیے پریس میں بھجوا رہا ہوں۔ میرے جن دوستوں اور بزرگوں نے اس کتاب کی تالیف و تصنیف پر میری ہمت افزائی فرمائی ہیں اُن کے لیے حسنات دارین کی دعا اور خدائے تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مجھکو اس سے بھی زیادہ مفید کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

میں اُن لوگوں کی ہمیشہ عزت کرتا ہوں جو بغرضِ اصلاح میرے کاموں پر نکتہ چینی کرتے اور میرے عیوب سے مجھکو واقف بناتے ہیں لیکن جو لوگ ازراہ شرارت اور اپنے جذبۂ حسد سے مجبور ہو کر نامعقول اور بیہودہ طور پر معترض ہوں اُن کو جواب دینا یا اُن کی طرف متوجہ ہونا میں اپنی توہین سمجھا کرتا ہوں۔ میرے بعض دوستوں نے ازراہِ شرارت نہیں بلکہ اس زمانہ کی ایک تصنیفی بدعت سے متاثر ہو کر نہایت نیک نیتی کے ساتھ یہ اعتراض کیا کہ آئینہ حقیقت نما میں جو سیکڑوں کتابوں کے حوالجات دئے گئے ہیں ان کے ساتھ صفحات کے ہندسے بھی کیوں درج نہیں کیے گئے اور بعض باتوں کو مجمل اور بلا تفصیل کیوں رکھا گیا۔ یہ اعتراض چونکہ نہایت سادگی اور غلط فہمی کی بنا پر کیا گیا ہے لہٰذا دوسرے ایڈیشن کے اس دیباچہ میں مَیں اس کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

میری طرف سے مذکورہ اعتراض کا جواب یہ ہے کہ مَیں نے اس زمانہ کے دوسرے مصنفین کی طرح یہ نہیں کیا کہ کتاب کا مسودہ لکھ لینے کے بعد درج شدہ مطالب کو دوسری کتابوں میں تلاش کر کے اُن کتابوں کے نام اور صفحات کے ہندسے حاشیہ میں درج کر دئے ہوں اور اپنی لکھی ہوئی ایک ایک سطر کے لیے تین تین

حاشئے درج کیے ہوں۔ یہ اس قدر آسان کام تھا کہ اس سے زیادہ آسان میرے لیے دوسرا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ میں خود دوسرے مصنفین کے اس التزام کا غیر مفید بلکہ گمراہ کُن ہونا محسوس کر چکا ہوں اور میرا تجربہ اس کے متعلق نہایت تلخ ہے۔ میں نے جس مقصد کو مدِنظر رکھکر یہ کتاب لکھی ہے اُس کا واضح تذکرہ دیباچہ طبع اول میں موجود ہے۔ اُس محدود و متعین مقصد کو حاصل کرنے اور یقین کو عین الیقین کے مرتبہ تک پہنچانے کے لیے جہاں جہاں حوالہ کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں میں نے محولہ کتب اور محولہ مصنفین کے اصل الفاظ نقل کر دئے ہیں تاکہ ہر شخص اُن الفاظ پر غور کر سکے اور اُن سے خود نتائج اخذ کر کے تسکین پا سکے۔ یہ نہیں کیا کہ دوسروں کے الفاظ کا مطلب اپنی عبارت میں درج کر کے حاشیہ پر صفحہ کا نمبر لکھدیا ہو۔ جہاں مطالب اپنی شہرت کے سبب معلوم عوام تھے اور اصل الفاظ کا نقل کرنا ضروری نہ تھا وہاں صرف کتاب یا مصنف کا نام لیکر اُس کی عبارت کا خلاصہ یا محض اشارہ ہی کافی سمجھا گیا۔ میں نے ہر جگہ اپنے اُس مقصد کو جو دیباچہ میں بیان ہو چکا تھا پیشِ نظر رکھا اور اُسی کے تقاضے سے کسی کو زیادہ ضروری کسی کو ضروری کسی کو کم ضروری اور کسی کو غیر ضروری قرار دیا۔ لیکن پڑھنے والوں میں ایسے حضرات بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اس کتاب کے اصل مقصد کے سوا اپنے دوسرے مقاصد بھی اسی کتاب سے حاصل کرنا چاہتے ہوں اور اُن دوسرے مقاصد سے تعلق رکھنے والے کسی بات کے متعلق اجمال یا سرسری بیان دیکھکر اور مکمل تحقیق نہ پاکر معترض ہوتے ہوں۔ مثلاً اس کتاب میں سبکتگین اور محمود غزنوی کا تذکرہ آیا ہے ایک شخص جو محمود غزنوی پر کوئی مضمون یا رسالہ لکھنا چاہتا ہے وہ محمود کے حملوں کے متعلق تو ایک طویل باب اس کتاب میں پاتا ہے لیکن اُس کو محمود غزنوی کا شجرۂ نسب اور اُس کی اولاد کے تفصیلی حالات نظر نہیں آتے تو وہ اپنی کم فہمی کے سبب ناراض ہوتا ہے اور اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اس کتاب کا مقصد سلطان محمود غزنوی سلطنت کی مکمل تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس کتاب کی تصنیف کا جو اصل مقصد ہے وہ بحمد اللہ تعالیٰ اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جن چیزوں کو وہ تلاش کرنا چاہتا ہے اُن کو اس کتاب میں ارادتاً غیر ضروری سمجھکر ترک کر دیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں حوالہ اور ثبوت کے لیے جو سیکڑوں عبارتیں جا بجا دوسری کتابوں سے نقل کی گئی ہیں اُن کے ساتھ اگر صفحہ کا نمبر بھی درج کر دیا جاتا تو کیا حرج تھا حالانکہ میں نے جن کتابوں سے اصل عبارتیں نقل کی ہیں اُن میں سے زیادہ ایسی ہیں جو قلمی ہیں اور قلمی کتابوں پر صفحات کے نمبر عموماً نہیں ہوتے اگر ان قلمی کتابوں کے صفحات پر نمبر اب لکھدئے جاتے اور وہی حوالوں کے ساتھ درج کیے جاتے تو اس سے پڑھنے والوں کو کیا فائدہ پہنچتا۔ لیکن میں صفحات کے ہندسے درج کرنے کو ہر حالت میں فضول ...

اور لغو کام سمجھتا ہوں اس لیے کہ کسی پادشاہ یا کسی جنگ یا کسی اہم واقعہ سے تعلق رکھنے والی جو عبارت کسی کتاب سے نقل کی گئی ہے اُس کتاب میں اُس پادشاہ یا اُس لڑائی یا اُس واقعہ کا تذکرہ تلاش کر لینا کوئی دشوار کام نہیں۔ جس شخص نے حوالہ کی جانچ پڑتال کے لیے اس اصل کتاب کو تلاش کر کے بہم پہنچا لیا ہو اُس کے لیے کتاب میں سے وہ مقام جہاں کی عبارت نقل کی گئی ہے تلاش کر لینا کیا مشکل کام ہے۔ لیکن رواج کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ لوگ حوالوں کے ساتھ صفحات کے ہندسے دیکھکر مرعوب ہو جاتے اور اصل کتابوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی بہت ہی کم توفیق پاتے ہیں۔

اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی ایک ہزار جلدیں چھپوائی گئی تھیں اور ڈھائی روپیہ فی جلد قیمت رکھی گئی تھی جو کتاب کی حیثیت کے موافق بلکہ کسی قدر سستی سمجھی گئی تھی۔

اُس پہلے ایڈیشن کی قریباً چار سو جلدیں مفت تقسیم ہوئی تھیں اس مرتبہ کوئی جلد کسی کو مفت دینے کی ضرورت نظر نہیں آتی لہٰذا میں نے اس کی قیمت پہلے سے کم کر دی ہے اس کتاب کی عام طلب و خواہش جو ملک میں پائی جاتی ہے اُس کا اندازہ کرتے ہوئے امید ہے کہ یہ دوسرا ایڈیشن بھی پہلے ایڈیشن کی طرح انشاءاللہ تعالیٰ بہت جلد ختم ہو جائیگا۔

میں اسی ہفتہ سے تاریخ ہند کی جلد اول کے کام یعنی اُس کی تالیف و ترتیب و تہذیب کے کام میں ہمہ تن مصروف ہوتا ہوں لہٰذا اس دوسرے ایڈیشن کی کاپیاں پڑھنے اور کتابت کی اغلاط کے رفع کرنے نیز اس کتاب کے شایع کرنے کا کام میری طرف سے اور میری اجازت سے برخوردار محمد ایوب خاں منیجر مکتبۂ عبرت انجام دینگے۔ میں نے یہ چند سطور نہایت عجلت میں قلم برداشتہ لکھی ہیں جبکہ دوسرے ایڈیشن کی کتابت کے لیے مسودہ کاتب صاحب کے پاس بھیجا جا رہا ہے۔ والسّلام

۱۵ اپریل ۱۹۳۱ء

اکبر شاہ خاں
نجیب آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

اللہ یعنی وہ ہستی جو کامل معبود خالص محبوب اور غایت مقصود ہے اگر ہماری حفاظت نہ کرے اگر وہ ہمارے لیے جائے پناہ نہ ہو اگر وہ ہمکو صراط مستقیم نہ دکھائے تو ہم اُس گمراہ کرنے اور قعر ضلالت و ہلاکت میں گرا دینے والی ہستی سے جو ہمارے بڑے باپ آدم علیہ السلام اور اُن کی تمام اولاد کی دشمن ہے کہاں محفوظ رہ سکتے اور ایک اُنگلی کسی بے ضرر مقام پر رکھ سکتے ہیں۔ لہذا ہم مجبور ہیں کہ کسی کام کے کرنے اور کسی قدم کے آگے اُٹھانے کا ارادہ کرنے سے پہلے اُس قدیمی اور یقینی دشمن سے جس کا نام شیطان رجیم ہے اپنے آپکو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے تمام طاقتوں کے مصدر تمام خوبیوں کے منبع اور تمام صفات حسنہ کاملہ کے جامع یعنی اللہ تعالےٰ کی پناہ میں آجائیں۔ اسی لیے آج کا کام شروع کرنے سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کا زبان پر بیساختہ آجانا فطرت انسانی کا تقاضا تھا نہ تکلف و تصنع۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اگر کسی کام کے شروع کرتے وقت اُس اللہ تعالےٰ کے نام کو جو رحمٰن و رحیم ہے یعنی بلا مبادلہ اور بلا معاوضہ انعام دینا اور کوششوں کے نیک نتایج پیدا کرتا ہے اپنے کام کا دیباچہ نہ بنائیں تو ممکن ہے کہ پہلی ہی اینٹ کے بے موقع نصب ہونے سے دیوار کی کجی اُس کو دو گز بھی اونچا نہ اُبھرنے دے ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج — تا ثریا میرود دیوار کج

لہذا یہ کیسے ممکن تھا کہ آج کا کام شروع کرتے ہوئے اُس رحمٰن و رحیم خدا کے نام کو عنوان کار نہ بنایا جاتا اور زبان پر بے اختیار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا روح پرور کلمہ نہ آجاتا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

وہ اللہ وہ معبود وہ محبوب وہ مقصود جو ہر ایک صفت حسنہ کاملہ سے متصف اور ہر ایک

عیب ونقص سے مبرّا ہے نہ صرف مسلمانوں کا بلکہ ہندوؤں، سکھوں، بودھوں، یہودیوں، مجوسیوں، جینیوں، بُت پرستوں، زر پرستوں، جاہ پرستوں، خود پرستوں، مسیح پرستوں، پیر پرستوں اور گور پرستوں کا بھی پرورش کنندہ ہے اور نہ صرف انسان ہی اُس کی ربوبیت سے فیض یافتہ ہیں بلکہ جمادات، نباتات، حیوانات سب اُس کے فیضِ تربیت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس طرح جنگل کا ہاتھی اُس کے انعامات کا مورد بنکر مست ہے اسی طرح زمین پر چلنے والی چیونٹی اُس کے زیرِ پرورش مگن اور آزاد ہے۔ ہوا میں اُڑنے والا بھُنگا اور سمندر میں رہنے والی ویل مچھلی سب اُسی کے گُن گانے اور اُسی کے سہارے چین اُڑاتے ہیں اُس سے نہ صرف انسان وملائک فیض پاتے بلکہ شیاطین الانس اور طواغیت الجن بھی اُس کی دی ہوئی مہلت کو اپنی خواہش کے موافق کام میں لاتے اور سانپ بچھو بھی اُس کی پیدا کی ہوئی مٹی چاٹ چاٹ کر لاتعامل زہر کے ذخیرے جمع کررہے ہیں۔ غرضکہ ہمارے وہم وخیال کے وسیع احاطہ میں جو کچھ بھی سما سکتا ہے خدائے تعالےٰ کی ربوبیت پر اُس کی بنیاد اور اُسی کے فیض پر اُس کے وجود کی اُفتاد ہے۔ اسی لیے اُس کا نام ربّ العالمین ہے اور اسی لیے وہ ہر ایک قسم کی تعریف وتحمید کا مستحق ہے اور اسی لیے غفلت سوز جوش اور الفت ساز خروش کے ساتھ بیتابانہ اور عاشقانہ انداز میں یکایک زبان پر آگیا کہ الحمد للہ ربّ العالمین۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ واصحاب سید نا محمد وبارک وسلم علیھم

خدائے تعالیٰ کے احسانات اور اُس کی رحمتوں کا شمار سمندر کے قطروں اور ریگستان کے ذرّوں کے ذریعہ بھی ممکن نہیں وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا۔ مگر ان نعمتوں اور احسانوں کی اگر کوئی فہرست بنانی شروع کریگا تو اس فہرست میں جس احسان اور جس نعمت کو سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ گراں سنگ ہونے کے سبب سب سے پہلے لکھے گا وہ اُس باعث تکوین موجودات۔ رحمۃ للعالمین سید البشر خاتم الانبیاء۔ شافع روزِ جزا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود باجود ہوگا جس نے مبعوث ہوکر انسان کو با اخلاق انسان اور با خدا انسان بنایا مخلوق کو خالق سے آشنا کیا۔ تاریکی سے نکالکر روشنی میں لایا دوزخ سے بچاکر جنت کا راستہ دکھایا۔ دُنیا کی بہیمیت و سبعیت کو مٹاکر رافت ورحمت کا دریا بہایا۔ وہی جامع جمیع کمالات انسانیہ ہستی ہے جس نے انسان کو اُس کی سعادت کا راستہ بتاکر سمجھایا کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک ملت کے پیشواؤں کی

تکریم کرنا با خدا انسانوں کا فرض اولین ہے اُس کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر ہے بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں پر بھی کیونکہ اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کی تصدیق کی۔ اس محبوب رب العالمین کے احسانات نہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں تک ہی محدود ہیں بلکہ اس نے وان من امة الا خلا فيها نذير اور ولكل قوم هاد کے ارشادات الٰہی ہم تک پہنچا کر ہر مسلمان کو سمجھا یا کہ ایرانیوں تورانیوں۔ چینیوں اور ہندوؤں وغیرہ سب کے بزرگوں میں خدائے تعالیٰ کے فرستادے آتے رہے۔ لہذا تم دوسری قوموں اور دوسرے مذہبوں کے پیشواؤں کی عزت تو کر سکتے ہو لیکن گالی کسی کو نہیں دے سکتے۔ اُس نے ہمارے اخلاق کو یہاں تک وسیع و دلربا بنا یا کہ ایک مسلمان کی زبان کسی بُت پرست کے معبود باطل کی دشنام دہی کے لیے بھی وا نہیں ہو سکتی۔ لہذا کوئی قوم اور کوئی ملک اور کوئی ملت ایسی نہیں پائی جا سکتی جس پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احسان ثابت نہو اللّٰھم صل علی محمد و علی ال محمد وصحبه وازواجه وذریاته وبارك وسلم خلاصۂ کلام یہ کہ ؎

خدا در انتظار حمد ما نیست	محمد چشم بر راہِ ثنا نیست		
محمد حامدِ حمدِ خدا بس	خدا مدّاحِ شانِ مصطفےٰ بس		

عرضِ مدّعا

ہندوستان کی تیس بتیس کروڑ یا اس سے بھی زیادہ انسانوں کی آبادی میں ہندو اور مسلمان دو ہی قومیں تعداد نفوس اور اثر و اقتدار کے اعتبار سے قابل تذکرہ اور ایک دوسرے کی مد مقابل سمجھی جاتی ہیں۔ مسلمان ہندوستان میں آٹھویں صدی عیسوی کے ابتدا میں داخل ہوئے اور انیسویں صدی کے درمیانی حصہ یعنی ۱۸۵۷ء تک قریباً ساڑھے گیارہ سو سال انھوں نے اس ملک میں ہندوؤں پر حکومت کی۔ اس طویل مدت کا ابتدائی اور آخری حصہ ایسا بھی ہے جس میں مسلمان ہندوستان کے پورے رقبہ پر قابض نہ تھے تاہم اس بات کے ماننے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کی شہنشاہی ابھی ماضی قریب میں معدوم ہو کر اُس کی جگہ انگریزوں کی حکومت اس ملک میں قائم ہوئی ہے اور مسلمانوں کی شہنشاہی کے زمانے میں ہندوستان کے اندر نسل انسانی کی سیکڑوں نہیں تو بیسیوں پشتیں ضرور گذر چکی ہیں۔ اس طویل مدت میں مسلمان حکمرانوں کا ہندو حکم برداروں کے ساتھ کیسا سلوک رہا؟ یہ کوئی ایسی باریک اور پوشیدہ بات نہ تھی جس کی

تلاش میں ہمکو سرگردانی و پریشانی لاحق ہوئی مگر چونکہ ہندوستان پر ایک ایسی قوم کی حکومت ہے جس نے اس وقت تک اس ملک کو اپنا وطن بنانا نہیں چاہا لہذا ایسے سامان پیدا ہوتے گئے کہ دیسی مدارس و مکاتب نہایت تیز رفتاری کے ساتھ فنا ہونے لگے اور چند ہی روز کے بعد ہندوستان بھر کے تقریباً تمام طلبا سرکاری مدارس کے کمروں میں نظر آنے لگے چند دیسی مکاتب جو اپنی سخت جانی کے سبب باقی رہے وہ کسی قطار شمار میں نہیں آسکتے۔ سرکاری مدارس کے لیے تاریخ کی حد سے زیادہ مجمل و مختصر کتابیں تالیف کرنے والوں۔ خود غرض سیاحوں اور غیر ملکی تاریخ نویسوں کے ہاتھوں تاریخ ہند کی جس طرح مٹی پلید ہوئی ہے اور سرکاری درسگاہوں میں تعلیم پائے ہوئے لوگوں کو گمراہ ہونے کا جو موقع ملا ہے اُس کی نظیر غالباً دُنیا کا کوئی ملک پیش نہیں کرسکتا۔ یہی سبب ہے کہ آج براعظم ہندوستان میں کسی شخص سے بمشکل یہ توقع کیجاسکتی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے حالات کا تھوڑا بہت صحیح اندازہ کرسکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے ہمدرد رہے ہیں اور ہندوؤں کو مسلمانوں سے حمایت۔ محبت۔ انصاف اور مروت کی توقع رکھنی چاہیے تو لوگوں کو معاً محمود غزنوی کے حملے۔ شہاب الدین غوری کی یورشیں۔ اورنگ زیب کی زیادتیاں جن کا حال اُنھوں نے تاریخ نما گمراہ کُن کتابوں اور جھوٹے افسانوں میں پڑھا ہے یاد آجاتی ہیں اور وہ دل ہی دل میں اُس شخص کی باتوں پر ہنستے اور اُس کے قول کو ناقابل التفات سمجھتے ہیں۔ سچ ہے۔ کہ جھوٹے کے آگے سچے کو رونا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں جب سے مسلمان آئے اور جب سے ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے واسطہ پڑا اُس وقت سے لیکر غدر ۱۸۵۷ء تک ہندوستان کی تمام تاریخیں جو ہم عہد مورخوں نے اپنے چشم دید حالات پر لکھیں سب فارسی زبان میں ہیں۔ اپنی آنکھوں دیکھے ایک واقعہ کو کئی کئی مورخوں نے جداجدا اپنے اپنے رنگ میں اس طرح لکھا ہے کہ ہر شخص کسی ایک زمانے کے حالات یا کسی ایک واقعہ کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے کئی کئی تاریخوں کا مابہ الاشتراک پیش نظر رکھکر حقیقت واصلیت سے بخوبی آگاہ ہوسکتا ہے مگر گمراہ کن تاریخوں کے رواج اور فارسی زبان کا دفتر گاؤخوردہ ہوجانے کے سبب کسی کو اتنا دماغ اور اس قدر فراغ میسر نہیں کہ دجل و گمراہی کے پردے کو چاک کرکے حقیقت آشنا بنے اور دوسروں کو غلط فہمیوں سے نکالے۔

مروجہ گمراہ کن تاریخوں تک ہی ہم ہندوستانیوں کی مصیبت کا خاتمہ نہیں ہوجاتا بلکہ سب سے بڑی مصیبت کا تذکرہ ابھی باقی ہے وہ یہ کہ ہندوستان کی موجودہ آب و ہوا نے بہت سے نئے نئے فرقے اور نئے نئے لیڈر پیدا کردئے ہیں۔ اس نئی پیداوار میں ایک ایسا فرقہ بھی پیدا ہوا جس نے اپنی تمام تر ہمت

وطاقت اس کوشش میں صرف کر دی کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو گالیاں دی جائیں اور ناحق اُن کا دل دُکھایا جائے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پلید کوشش یہ ہوئی کہ ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں کو ظلم و نالائقی سے بیجا طور پر متہم کرنے اور اُن پر انواع و اقسام کے عیوب تھوپنے کے لیے جھوٹے افسانوں اور فرضی ناولوں کا سلسلہ جاری کر کے عوام کو گمراہ اور ہندو مسلمانوں کے درمیانی خلیج کو اور بھی وسیع کیا گیا سخت تعجب اور حیرت کا مقام ہے کہ اس قسم کی شر انگیز کارروائیوں اور دروغ بافیوں کے مرتکب مطلق نہیں شرماتے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ صدق و راستی پر کذب و دروغ غالب آجائیگا اور حقیقت و اصلیت ہمیشہ کے لیے روپوش و مدفون ہو جائے گی۔ حالانکہ ع = ایں خیال است و محال است و جنوں۔

ان ناشدنی کارروائیوں کا یہ افسوسناک نتیجہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے قدیمی خوشگوار تعلقات کا واپس ہونا ظاہر بیں نگاہوں کو غیر ممکن معلوم ہونے لگا ہے۔

میں نے ہندو مسلمانوں کے گیارہ سو سال (سنہ ء سے سنہ ء تک) کے تعلقات پر تاریخی واقعات کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے اور ایسا مواد فراہم کر دیا ہے جس سے مطالعہ کرنے والے کے دل میں کوئی شک و شبہ انشاء اللہ تعالیٰ باقی نہیں رہ سکے گا غلط فہمیوں کے بادل پھٹ جائیں گے اور اس حقیقت کا چہرہ کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ صاف نظر آجائیگا اسی لیے اس کتاب کا نام میں نے "آئینہ حقیقت نما" تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کو ہندوستان کی وہ تاریخ نہ سمجھا جائے جس کے شائع کرنے کا میں پہلے اعلان کر چکا ہوں اور جو اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ شائع ہونے والی ہے اس کتاب میں صرف وہی واقعات درج کیے گئے ہیں جن سے ہندو مسلمانوں کے قدیمی تعلقات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ اس مختصر کے پڑھنے سے یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ آجکل موجودہ ضرورتوں کو مد نظر رکھکر ہندوستان کی صحیح اور مکمل تاریخ کا مرتب کرنا کس قدر ضروری اور اہم کام ہے مورخین کا دستور ہے کہ وہ کتاب کے دیباچہ میں اُن تاریخی کتابوں کی ایک فہرست درج کر دیا کرتے ہیں جن سے آنھوں نے اس تصنیف میں مدد لی ہے لیکن میں اگر ایسی کتابوں کی فہرست درج کرنا چاہوں تو اس فہرست کا نمبر شمار شاید سیکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک پہنچ جائے لہذا میں یہ کام قارئین کرام کے سپرد کرتا ہوں وہ اگر کوئی مختصر سی فہرست مرتب کرنا چاہیں تو اس کتاب کو مطالعہ فرماتے ہوئے خود ہی مرتب فرمالیں کیونکہ میں نے مشہور تاریخوں بالخصوص ہندو اور ہندو پرست مصنفوں کی کتابوں سے جا بجا اقتباسات نقل کر دئیے ہیں جو مطالعہ کرنے والے کے علم کو عین الیقین تک پہنچا دینے کے لیے کافی ہیں۔ تاہم اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میرے اس کام میں بہت سے استفام

اور نقائص رہ گئے ہونگے۔ میں انسان ہوں اور عام انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں ہوں تو میں نے یہ کام کسی قدر عجلت اور پریشانی کے عالم میں کیا ہے اور نظر ثانی و تہذیب کا موقع بھی نہیں مل سکا ہے ؎

خاطر مسلسل است و پریشاں چو زلف یار + عیبم مکن کہ در شب ہجراں نوشتہ ام

مگر چونکہ میری نیت نیک ہے اور ثواب سمجھکر یہ کام کیا ہے لہذا خدائے تعالیٰ سے اجر کی توقع رکھتا ہوں اور وہی اگر اس ناچیز کوشش کو قبول فرمالے تو میرا بیڑا پار ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرَّاحِمِیْنَ۔ آمین

اکبر شاہ خاں
نجیب آبادی

اس مقدمہ کو چند چھوٹے چھوٹے مقدمات کا مجموعہ سمجھنا چاہیے ذیل میں چند نہایت ضروری باتیں اس لیے درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کتاب کی تصنیف و تالیف کا مقصد بوجہ احسن پورا ہو اور مطالعہ کرنے والے کے دماغ میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ سکون قلب کے ساتھ ابواب کتاب کو مطالعہ کر سکے اور اس کے علم اور واقفیت میں اضافہ ہو۔

(۱) اسلام اور احکام جنگ

غلط فہمیاں پھیلانے اور جھوٹ بولنے والوں نے ایک یہ تہمت بھی تراشی ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو لوگوں کو خونریزی و سفاکی کی تعلیم دیتا اور خود غرضی و نفس پرستی سکھاتا ہے۔ حالانکہ اسلام کا نام ہی خود بتا رہا ہے کہ یہ مذہب ضرور سلامتی و سلامت روی و مسالمت (رواداری) کی تعلیم دیتا ہوگا۔ اسلام اور اس کی تعلیم سے واقف ہونے کے لیے قرآن مجید اور آنحضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔ جن لوگوں کو مطالعہ کی وسیع فرصت میسر نہیں ہے ان کے لیے میری کتاب حجۃ الاسلام کا مطالعہ کافی ہے۔ اس جگہ صرف اشارے کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں تمام دنیا پر انتہائی جہالت و ظلمت چھا گئی تھی۔ ایران روم۔ مصر۔ عرب۔ ہندوستان۔ چین۔ غرضکہ ہر ملک اور ہر قوم انسانیت۔ تہذیب اور روحانیت سے بالکل معرا ہو کر رذالت و پستی کے انتہائی مقام پر پہنچ چکی تھی۔ ایران میں زرتشتی مذہب اور مجوسی اخلاق مزدکی بد اخلاقی کا جامہ پہن چکا تھا۔ وہاں نفس پرستی اور بدچلنی نے شاہی درباروں اور شرفا کے گھروں کی چار دیواریوں میں بھی اپنا عمل دخل بٹھا لیا تھا۔ نوع انسان کی شرافت چند صاحب طبل و علم اور طاقتور لوگوں کا حصہ بنکر باقی تمام انسانوں کو چوپاؤں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ہندوستان میں مزدکی مذہب کا مثنیٰ بام مارگی مذہب کے نام سے موجود تھا۔ بام مارگیوں کا صرف نام ہی لے دینا کافی ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کی اخلاقی زمین میں کیسے کیسے تخم نشو و نما پا سکتے تھے۔ اسی زمانے میں.

ایک چینی سیاح ہیونگ شیانگ ہندوستان میں آیا تھا وہ اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے کسی ایک گھر کو بھی بتوں سے خالی نہیں بتاتا اور جو جو اعمال ان بتوں کی پوجا میں بجالائے جاتے تھے اُن کے سننے سے حیرت ہوتی ہے کہ انسان جس کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل ہے کس قدر پستی و رذالت میں پہنچ چکا تھا پتھروں درختوں۔ دریاؤں۔ پہاڑوں۔ چوپایوں اور سانپوں سے گذر کر عورت و مرد کی شرمگاہوں تک کو اس انسان نے اپنا معبود و مسجود بنا لیا تھا۔ یونان و روم کی بت پرستی ہندوستان کی بُت پرستی سے کسی طرح کم نہ تھی وہاں بھی چند طاقتور اور صاحب اقتدار ہستیوں یعنی بادشاہوں سپہ سالاروں اور امیروں کو خدائی کے دعوے تھے۔ یہ لوگ اپنے ہم جنس انسانوں کو اس قدر ذلیل سمجھتے اور ایسے مظالم اُن پر روا رکھتے تھے کہ آج اگر اُن کا عشر عشیر ظلم بھی کوئی شخص کسی بیل یا گھوڑے پر روا رکھے تو اُس پر فوراً مقدمہ قایم ہو جائے اور قید و جرمانہ کی سزا پائے۔ وہاں عورتوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ خودکشی کریں اور اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے گر کر تماشائیوں کے لیے سامان تفریح بنیں۔ خدائے واحد کا نام لینے والا اور بتوں کو چھوڑ کر خدا کی عبادت کرنے والا اُن ملکوں میں تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی حال مصر و چین کا تھا ساری کی ساری دُنیا بدچلنی۔ ظلم۔ بے حیائی۔ سفاکی اور جہالت میں مبتلا ہو کر تیرہ و تار ہو چکی تھی۔ ملک عرب ان تمام رذالتوں اور جہالتوں کا مرکز بنا ہوا تھا کیونکہ یہ نالائقیاں اس ملک میں حد سے زیادہ ترقی کر چکی تھیں۔ اس ایسے زمانے اور ایسے ملک میں آنحضرت محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دنیا کی اس رذالت اور پلیدی کو دور کرنے کے لیے توحید کا عَلَم بلند کیا اور پچیس سال سے کم عرصہ میں ملک عرب کے باشندوں کو تمام دُنیا کا معلّم اور رہبر بنا دیا۔ ابھی پہلی صدی ہجری ختم نہ ہونے پائی تھی کہ چین کے ساحل سے مراقش و اسپین کے ساحل تک تمام متمدن دنیا مسلمانوں کے زیر سایہ ہر قسم کے اخلاق فاضلہ میں ترقی کر رہی تھی۔ اسلام کی اس حیرت انگیز کامیابی پر غور کرنے کے بعد ہر اہل عقل کا فرض تھا کہ وہ اسلام کی کامیابی کا راز تعلیم اسلامی میں تلاش کرتا اور اس بیہودہ خلاف عقل اور بے بنیاد فریب میں مبتلا نہ ہوتا کہ اسلام کی کامیابی کا سبب ظلم و تشدد۔ قتل و غارت۔ اور نفس پرستی وغیرہ میں مضمر ہے۔ معمولی سے معمولی اور ادنیٰ درجہ کی قابلیت کا انسان بھی اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے کہ کوئی مذہب۔ کوئی قوم اور کوئی ملک قتل و غارت۔ ظلم و تشدد اور نفس پرستی کے ذریعہ کامیابی و کامرانی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا اور ہلاکت و ناکامی سے نہیں بچ سکتا۔ مگر اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں نے آج تک بھی اس صاف سیدھی اور پیش پا اُفتادہ بات کی طرف متوجہ ہونا نہیں چاہا اور مُرغے کی ایک ہی ٹانگ بتانے پر اصرار کیا۔ بہرحال اگر کوئی شخص اس خاص معاملہ میں اسلام کی تعلیم سے صحیح واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات پر غور

کرنا چاہیے۔

شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا (شوریٰ رکوع ۲)

خدا نے تمہارے لیے دین کا وہ راستہ بنایا ہے جس کا حکم نوحؑ کو دیا گیا اور پھر محمد صلعم پر اُس کی وحی بھیجی اور ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ کو بھی اُسی کا حکم دیا تھا کہ دین پر سیدھے چلو اور اُس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

وامرھم شوریٰ بینھم (شوریٰ ع ۴)

اور مومن اپنے کاموں کو مشورے سے طے کیا کرتے ہیں۔

لا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا (سورہ مائدہ ۲ ع)

کسی قوم کی عداوت کے سبب اُس قوم سے بے انصافی مت کرو بلکہ انصاف کرو۔

کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین۔ (سورہ نساء رکوع ۲۰)

انصاف پر قایم ہوجانے والے ہوجاؤ اللہ کے لیے گواہی دو چاہے اپنے یا اپنے والدین اور رشتہ داروں کے برخلاف گواہی دینی پڑے۔

فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور (سورہ حج رکوع ۴)

بتوں کی ناپاکی سے بچو اور جھوٹی باتوں سے بچو۔

وعباد الرحمن الذی یمشون علی الارض ھوناً واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاماً (سورہ فرقان رکوع ۶)

اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر صلحکاری سے چلتے ہیں اور جب جاہل اُن سے خطاب کریں تو سلامتی کی باتیں کرتے ہیں۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا (سورۃ الانفال رکوع ۸)

اور اگر لوگ صلح کرنے پر مائل ہوں تو تو بھی صلح کی طرف جُھک جا۔

الصلح خیر (سورہ نساء رکوع ۱۹)

صلح خیر و برکت ہے۔

ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا (سورۂ اعراف رکوع ۱۱)

اور لوگوں کو اُن کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ مچاؤ۔

لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ لا یحب المقسطین (سورہ ممتحنہ رکوع ۲)

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور تمکو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا اللہ تمکو اس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن سے نیک سلوک کرو اور اُن سے انصاف کا برتاؤ کرو۔ بیشک اللہ پسند کرتا ہے انصاف

کرنے والوں کو۔

وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ (سورہ مائدہ رکوع ۱)

اور ایک دوسرے کی خدا ترسی اور نیکی کے کاموں میں مدد کرو اور بغاوت و بدکاری کے کاموں میں مدد نہ کرو۔

ادفع بالتی ھی احسن فاذی الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم وما یلقٰہا الا الذین صبروا وما یلقٰہا الا ذو حظ عظیم۔

(حم سجدہ رکوع ۵)

تو بُری بات کو نیک بات کے عوض میں ٹالدے تب جلد تیرا دشمن بھی دلی دوست ہو جائیگا۔ اس کام کا ذمہ اُٹھانا بڑی برداشت والوں کا کام ہے اور اسے بڑے نصیب والے اختیار کرتے ہیں۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم۔

(سورہ انعام رکوع ۱۳)

مشرکوں کے ساتھ بدزبانی کا برتاؤ مت کرو ورنہ پھر وہ ضد اور نادانی سے اللہ کو بُرا کہیں گے۔

اُدع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔ ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین

(سورہ نحل رکوع ۱۶)

لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ اور اُن سے مباحثہ کرو تو بہت پسندیدہ طور پر کرو تیرا رب اُن لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اُس کے راستے سے بہک گئے اور وہ راہ پانے والوں سے بخوبی واقف ہے مخالفین کے ساتھ انتقاماً سختی بھی کرو تو ویسی ہی کرو جیسی سختی تمہارے ساتھ کی گئی ہو اور اگر ایذاؤں پر صبر کرو تو بہرحال صبر کرنے والوں کے حق میں صبر کرنا ہی بہتر ہے۔

ان آیات پر غور کرنے سے ایک خالی الذہن منصف مزاج شخص پر ثابت ہو سکتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر لوگوں نے قتل و غارت اور ظلم و ستم کی تہمتیں لگانے میں بڑی بے انصافی سے کام لیا ہے۔ اس جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن مجید میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں مال و دولت حاصل کرنے یا ملک گیری کے لیے لوگوں پر زیادتی اور اعتدا کی اجازت دی گئی ہو ہدایت اور ترغیب کا تو ذکر ہی کیا۔ ہاں قرآن مجید میں احکام جنگ ہیں لیکن وہ تمام احکام جنگ محض دفاعی اور خود حفاظتی ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو اس لیے جنگ کی اجازت دی ہے کہ وہ فتنہ و فساد اور بدامنی کو مٹا کر دنیا میں امن و امان قایم کردیں۔ اسلام چونکہ عین فطرت انسانی کے مناسب مذہب ہے لہذا اسلام کو سمجھنے اور اُس پر آزادا

غور کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ دنیا میں امن و امان قائم اور ہر انسان کو اُس کی جائز آزادی حاصل ہو تاکہ مذہب کے سمجھنے اور اُس کے اختیار کرنے میں کوئی بیجا رکاوٹ حائل نہ رہے۔ بنابریں اسلام سب سے زیادہ امن و امان اور صلح و آشتی کا خواہاں ہے اور اسی لیے وہ فساد کے مٹانے اور امن و امان قایم کرنے کی غرض سے اگر ضرورت ہو تو جنگ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ دنیا میں کون سمجھدار شخص ایسا ہے جو اسلام کی اس تعلیم کو قابل اعتراض اور مذموم قرار دے سکے۔ عیسائیوں۔ مجوسیوں۔ یہودیوں۔ اور ہندوؤں وغیرہ کے مذاہب میں جس قسم کی لڑائیوں کے احکام ہیں اُن کو اگر اسلامی احکام جنگ کے مقابل رکھا جائے اور عدل و انصاف کی عینک لگا کر پرکھا جائے تو یقیناً کسی عیسائی۔ مجوسی۔ یہودی۔ آریہ اور ہندو کو اسلام کے متعلق ایک لفظ بھی معترضانہ لہجہ میں زبان تک لانے کی جرارت نہیں ہوسکتی ان مذاہب میں کوئی بھی مذہب ایسا نہیں ہے جس نے جنگ کے لیے ترغیب نہ دی ہو یا اُس مذہب کی جائز قرار دادہ جنگ اسلامی جہاد سے زیادہ یا اسلامی جہاد کی برابر معقول اور مناسب قرار دی جاسکے۔ قرآن مجید صاف صاف فرماتا ہے۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (بقرہ رکوع ۳۴)	دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت اور گمراہی میں یقیناً کھلا فرق ظاہر ہو گیا ہے۔ جبر اور زبردستی کی کیا ضرورت ہے۔

قرآن مجید نے کن حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے ذیل کی آیات سے ظاہر ہے۔

قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (بقرہ رکوع ۲۴)	مسلمانو! جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اللہ کے رستے یعنی دین کی حمایت میں اُن سے لڑو اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ کسی طرح زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ (سورہ حج رکوع ۶)	اجازت دی جاتی ہے اُن لوگوں کو جن سے جنگ کیجا رہی ہے کہ وہ بھی جنگ کریں اس لیے کہ وہ مظلوم ہیں اور یاد رکھیں کہ اللہ اُن کی نصرت پر قادر ہے۔
الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانھم وھموا باخراج الرسول وھم بدؤکم اول مرۃ (سورہ توبہ رکوع ۲)	تم کیوں جنگ نہیں کرتے اُن لوگوں سے جنہوں نے توڑ دیا اپنی قسموں کو عہد کرنے کے بعد اور پختہ ارادہ کر لیا رسول کے نکال دینے کا اور انھیں لوگوں نے پہلی دفعہ تم سے جنگ کرنے میں ابتدا کی۔

قرآن مجید نے مسلمانوں کو صرف انھیں لوگوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت دی ہے جو بلا وجہ حملہ آور

ہیں اور قسموں اور عہدناموں کو توڑ کر فتنہ و فساد برپا کرنے لگیں اور مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں اور مسلمانوں کے قتل کرنے میں ابتدا کر چکے ہیں۔

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ ذلک بانھم قوم لا یعلمون (سورہ توبہ رکوع ۱)

اگر تجھ سے کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ کا خواستگار ہو تو اُس کو پناہ دے اور اُس وقت تک اُس کو اپنی پناہ میں رکھ کہ وہ اطمینان سے خدا کے کلام کو سن سمجھ لے اور پھر اُس کو اُس کے امن کی جگہ پر واپس پہنچا دے یہ رعایت اُن لوگوں کے حق میں اس لیے ضروری ہے کہ یہ لوگ اسلام کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر قرآن مجید میں جبر و تعدی کی تعلیم ہوتی تو یہ حکم نہ ہوتا کہ جو کافر قرآن مجید کو سننا چاہے اور سننے کے بعد مسلمان نہ ہو تو اُس کو اُس کے امن کی جگہ پر پہنچا دو بلکہ یہ حکم ہوتا کہ جب ایسا کافر قابو میں آ جائے تو اُس کو فوراً زبردستی مسلمان بنا لو۔ ہاں! قرآن مجید میں یہ حکم بھی موجود ہے کہ۔

قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔ (سورۂ توبہ رکوع ۴)

وہ اہل کتاب جو نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور نہ خدا اور اُس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے اور نہ دیانت اور سچائی کی راہ کو اختیار کرتے ہیں اُن سے تم لڑو یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں۔

بس یہی ایک آیت ہے جس سے بعض نادان معترضوں کو دھوکہ لگا ہے کہ قرآن شریف میں لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے لڑائی کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس آیت میں اور اس سے آگے کی آیات میں بھی مسلمان بنانے کا کوئی حکم یا ذکر نہیں ہے۔ اگلے رکوع کے پڑھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اُن اہل کتاب کا ذکر ہے جو علانیہ طور پر جرائم پیشہ ہو گئے تھے جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔

وتری کثیرا منھم یسارعون فی الاثم والعدوان واکلھم السحت لبئس ما کانوا یعملون ٥ لولا ینھاھم الربانیون والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت لبئس ما کانوا یصنعون۔ (سورۂ مائدہ رکوع ۹)

اور اے پیغمبر تم ان میں سے بہتیروں کو دیکھو گے کہ گناہ کی بات یعنی جھوٹ اور ظلم اور مال حرام کے کھانے پر گرے پڑتے ہیں بہت ہی بُرے ہیں وہ کام جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں ان کو ان کے ربی یعنی مشائخ اور علما جھوٹ بولنے اور مال حرام کے کھانے سے کیوں منع نہیں کرتے۔ بہت ہی بُری ہے وہ درگذر جو

ان کے مشائخ اور علما کرتے رہے ہیں۔

پھر ان کی بدزبانیوں گستاخیوں اور اوباشانہ طرزعمل کا ذکر کرکے فرمایا کہ۔

کلما اوقدوا نارا للحرب اطفاھا اللہ ویسعون فی الارض فسادا واللہ لا یحب المفسدین۔ (مائدہ رکوع ۹)	جب کبھی یہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں خدا اُس کو بُجھا دیتا ہے اور ملک میں فساد پھیلاتے پڑے پھرتے ہیں اور اللہ فسادیوں کو دوست نہیں رکھتا۔

پادری فنڈر اپنی کتاب میزان الحق میں اس امر کی تصدیق کرتا اور لکھتا ہے کہ درحقیقت ملک عرب میں جو عیسائی اور یہودی تھے وہ سخت بدچلن ہوگئے تھے اور ملک کے لیے اُن کا وجود خطرناک تھا۔ قرآن کریم میں ان ہی لوگوں کے متعلق ایک جگہ ارشاد ہے کہ۔

ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ (سورۂ توبہ رکوع ۵)	اہل کتاب کے اکثر عالم اور مشائخ لوگوں کے مال ناحق ناروا ہڑپ کرنے اور راہ خدا سے لوگوں کو روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے رہتے اور اُس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو اے پیغمبر اُن کو روز قیامت کے عذاب دردناک کی خوش خبری سُنا دو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

ومن اھل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یؤدہ الیک ومنھم من ان تامنہ بدینار لا یؤدہ الیک الا مادمت علیہ قائما ذلک بانھم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل ویقولون علی اللہ الکذب وھم یعلمون۔ (آل عمران ع ۸)	اور اہل کتاب میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر اُن کے پاس زر نقد کا ڈھیر بھی امانت رکھوا دو توجب مانگو اُٹھا تمھارے حوالے کریں اور اُن میں سے بعض ایسے ہیں کہ زیادہ نہیں ایک بہت چھوٹی سی اشرفی بھی اُن کے پاس امانت رکھوا دو تو وہ تمکو بدون اس کے واپس نہ دیں کہ ہر وقت تقاضے کے لیے اُن کے سر پہ کھڑے رہو ان لوگوں میں یہ بدمعاملگی اس وجہ سے آئی کہ وہ پکارے گلے کہتے ہیں کہ عرب کے جاہلوں کا

حق مار لینے میں ہم سے بازپرس نہیں ہوگی اور جان بوجھکر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔

عرب کے مشرکوں کی طرح یہود و نصاریٰ بھی سخت بدچلن اور جرائم پیشہ ہو چکے تھے۔ تمام ملک مطلق العنان تھا عرب میں نہ کوئی باقاعدہ سلطنت تھی نہ کوئی ملکی قانون تھا جس کی پابندی سب پر لازم ہوتی

ایسی حالت میں جرائم پیشہ لوگوں کو سزا دینا۔ ان سے اقرار اطاعت لینا ان کو فساد اور جرائم سے باز رکھکر امن وامان قایم رکھنے والے قانون کے ماتحت بنانا قابل اعتراض کیسے ہوسکتا ہے: ہاں اگر اس معاملہ میں آنحضرت صلعم سے غفلت اور کم التفاتی سرزد ہوتی تو موجب الزام تھا اسی لیے خدائے تعالیٰ نے فرمایا کہ۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا۔ ان اللہ لا یحب المعتدین (بقرہ رکوع ۲۴)

تم خدا کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں (یعنی دوسروں سے کچھ غرض نہ رکھو) اور زیادتی مت کرو۔ خدائے تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس حکم کو تبلیغ دین اور اشاعت اسلام سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اسلام کی اشاعت اور دین کی تبلیغ کے متعلق تو صاف حکم قرآن مجید میں موجود ہے۔

وقل للذین اوتوا الکتاب والامیین أسلمتم فان اسلموا فقد اھتدوا وان تولوا فانما علیک البلاغ۔ (آل عمران رکوع ۲)

اے پیغمبر اہل کتاب اور عرب کے جاہلوں سے کہو کہ کیا تم دین اسلام میں داخل ہوتے ہو پس اگر اسلام قبول کرلیں تو ہدایت پا گئے اور اگر منہ موڑیں تو تمھارا تو صرف اتنا ہی کام ہے کہ حکم الٰہی پہنچا دو۔

اس آیت میں یہ نہیں لکھا کہ تمھارا یہ بھی کام ہے کہ تم ان سے جنگ کرو پس ظاہر ہے کہ جنگ اُن جرائم پیشہ لوگوں سے کی جاتی تھی جو مسلمانوں کو قتل کرتے تھے یا امن عامہ میں خلل ڈالتے تھے۔ پھر ایک جگہ حکم ہوتا ہے کہ

اُذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ط ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز (حج رکوع ۶)

جن مسلمانوں سے کافر لڑتے ہیں اب اُن کو بھی اُن کا فروں سے لڑنے کی اجازت ہے اس واسطے کہ اُن پر ظلم ہو رہا ہے اور کچھ شک وشبہ نہیں کہ اللہ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے یہ وہ مظلوم لوگ ہیں جو بیچارے صرف اتنی بات کے کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے ناحق ناروا اپنے گھروں سے نکال دئے گئے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے صومعے اور گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کے ڈھائے جاچکے ہوتے اور جو اللہ کے کام میں مدد کرے گا اللہ بھی ضرور

اُس کی مدد کریگا کچھ شک وشبہ نہیں کہ اللہ زبردست اور سب پر غالب ہے۔
قرآن مجید نہ صرف مسجدوں کی حفاظت کو ضروری سمجھتا ہے بلکہ وہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو بھی ظالموں کے ہاتھ سے بچانا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن مجید نے عبادت گاہوں کے منہدم کرنے والوں اور مذہبی آزادی کے دشمنوں سے جنگ کرنے کی اجازت محض اس لیے دی ہے کہ مذہب کے سمجھنے اور قبول کرنے میں کسی قسم کے جبر واکراہ اور جور وتعدی کو دخل نہ رہے۔ اسلام چونکہ عین فطرت انسانی کے موافق اور دلائل حقہ وبراہین نیرّہ سے مویّد مذہب ہے لہذا اُس کی اشاعت اُسی وقت زیادہ ہو سکتی ہے جبکہ ہر قسم کا امن امان دُنیا میں قائم ہو اور اسلام کے سمجھنے اور اُس سے واقف ہونے کا موقع لوگوں کو میسر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سب سے زیادہ فتنہ وفساد اور بدامنی کا دشمن اور امن وامان کا خواہاں ہے لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا۔ اور اسی لیے اگر ضرورت ہو تو وہ امن وامان کے قائم کرنے کی غرض سے جنگ کرنے اور تلوار سے کام لینے کو بھی جائز بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔

(۲) اخوت ومساوات ورواداری

ہمکو اس بات کا اقرار کرنا چاہیے کہ ایک مرتبہ ہندوستان قدیم میں بھی اخوت ومساوات کا آوازہ بلند ہو چکا ہے یعنی گوتم بدھ نے سیاسی وقومی ومذہبی حقوق میں مساوات پیدا کرنے کی نہایت موثر کوشش کی اور اسی لیے ہم گوتم بدھ کو قدیم ہندوستان کا مصلح اعظم کہہ سکتے ہیں گوتم بدھ کے قائم کیے ہوئے مذہب کو مہاراجہ اشوک کے زمانہ میں سب سے زیادہ عروج حاصل ہوا اور ہندوستان میں مہاراجہ اشوک اور چندر گپت کے زمانے ہی میں شہنشاہی قائم ہو سکی گوتم بدھ سے پہلے اور بودھوں کی سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی سلطنت کے قائم ہونے تک اس ملک میں نہ کوئی بڑی سلطنت قائم ہو سکی نہ اخوت انسانی اور مساوات ورواداری کی کوئی مثال قائم ہوئی۔
ویدوں کے زمانے کے عام ہندو اخلاق اور اُس کی خوبی یا بُرائی کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے اس وقت صرف اسی قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ ہندو مذہب کے روشن پہلو اور ہندو قوم کے قابل تعریف اخلاق کا خلاصہ اور منتہائے ترقی یہ ہے کہ انسان تارک الدنیا اور تمام علائق سے منقطع ہو کر جنگلوں، پہاڑوں اور غاروں میں تنہائی کی زندگی بسر کرے یہی وجہ ہے کہ مدنیت اور جمہوریت کی قابل تذکرہ مثالیں ہندوستان کی قدیم تاریخ میں موجود نہیں ہیں۔ ہندوؤں کی چھوت چھات اور برہمن، چھتری، ویش، شودر کی تقسیم ہندوؤں کے سیاسی، اخلاقی اور روحانی تنزل کا سب سے بڑا سبب ہے۔ منو مہاراج نے جن کو ہندوستان کا مقنن اعظم کہا جاتا ہے اپنے شاستر میں برہمنوں کا اقتدار بڑھانے اور شودروں کے حقوق کو بالکل برباد اور فنا

کرنے کے لیے ایسے سخت قوانین و آئین بنائے کہ اس سے بڑھ کر نسلِ انسانی پر شاید ہی کوئی ظلم کہیں ہوا ہو۔ قانونِ منو کی رو سے شودر جنمی غلام ہیں۔ غلامی ان کا طبعی خاصہ ہے۔ مالک کے آزاد کر دینے کے باوجود بھی وہ آزاد نہیں کہلا سکتے۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے ان کا مس کرنا تو کجا سایہ بھی باعث ناپاکی ہے۔ یہ شودر وہ لوگ تھے جو ایران کی طرف سے آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پیشتر اس ملک میں آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آریوں نے جب اُن کو مغلوب کر کے اپنا محکوم بنا لیا تو اُن کو اپنی تہذیب اپنے علوم اور اپنے اخلاق سکھانے نہ چاہے بلکہ ہر اعتبار سے اُن کو پست و ذلیل ہی رکھنا چاہا۔ اور شودر کا خطاب دیکر اُن سے اس طرح خدمات لینی شروع کیں جس طرح چوپایوں سے انسان خدمت لیتا ہے چنانچہ اس کے ثبوت میں منوشاستر کے وہ ابواب پیش کیے جا سکتے ہیں جو برہمنوں اور شودروں کے حقوق کو واضح اور متعین کرتے ہیں۔ منوشاستر کی رو سے برہمن کا کام شاستر پڑھنا پڑھانا۔ یگ کرنا یگ کرانا۔ اعلیٰ ذاتوں کی پروہتی کرنا اور تحائف لینا تھا۔ برہمنوں کی عورتیں دیویاں اور برہمن دیو کہلاتے تھے۔ شودر اگر پکی ہوئی روٹی کو چھو دے تو وہ روٹی پلید ہو جاتی تھی۔ عورتیں خواہ کسی ذات کی ہوں مردوں کے مقابلہ میں ذلیل تھیں۔ شودر وید کو سن بھی نہیں سکتا تھا اور اگر بلا ارادہ اُس کے کان میں وید کے الفاظ پڑ جائیں تو اُس کو نہایت اذیت کے ساتھ بہرا بنا دینا ضروری تھا۔ برہمن اگر کوئی عظیم الشان جرم کرے تب بھی اُس کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ دنیا میں کوئی چیز شودر کی ملکیت نہیں تھی۔ منوشاستر کے پانچویں باب میں صاف مذکور ہے کہ شودر کو جھوٹی خوراک کھانا۔ پرانے کپڑے پہننا اور نکما اسباب خانہ داری رکھنا چاہیے اور کوئی شودر برہمن یا چھتری کی نسبت کوئی بُرا لفظ زبان سے نکالے تو اُس کی زبان کاٹ لینی چاہیے کیونکہ وہ نیچی ذات کا آدمی ہے۔ آٹھویں باب میں ہے کہ اگر کوئی نیچی ذات کا آدمی اعلیٰ ذات کے آدمی کے ساتھ اس کی برابر بیٹھے تو اُس کی پیشانی پر داغ لگا کر جلاوطن کر دینا چاہیے یا راجہ اُس کی پیٹھ میں سے ایک حصہ گوشت کا کاٹ ڈالے شودر کو اگر کوئی برہمن بلا وجہ قتل کر دے تو اُس کے قصاص میں برہمن کو ہرگز قتل نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اُس کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ شودروں کے لیے لازمی تھا کہ وہ جب کسی راستے یا کوچے سے گذریں تو خاص قسم کی آواز دیتے جائیں تاکہ اعلیٰ ذات کے آدمی خبردار ہو جائیں اور اُن پر اس شودر کا سایہ نہ پڑنے پائے۔ غرض اس قسم کے صدہا قوانین تھے جن کا کچھ کچھ مٹا ہوا اثر آج تک بھی ہندوؤں میں موجود ہے کہ وہ نیچ ذات کے لوگوں سے ہمسرانہ سلوک روا نہیں رکھتے منوشاستر کی رو سے مشترکہ خاندان میں عورتیں وراثت سے محروم ہیں یعنی باپ کے تمام ترکہ کے مالک بیٹے ہوتے ہیں۔ بیٹیاں محروم الارث قرار دی گئی ہیں۔ غرض منو کے قانون کی رو سے ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ حکماً مجبور رہے کہ

وحشیانہ زندگی بسر کرے اور اُس کے ساتھ نہایت ظالمانہ برتاؤ کیا جائے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ ہندوؤں میں اخوت انسانی کی مذہباً کوئی گنجایش نظر نہیں آتی۔ اور غالباً ایسی ناقابل قبول مجموعۂ احکام کو دیکھکر ہندوؤں میں نئے نئے مذہبی فرقے ایسے پیدا ہو رہے ہیں جو شودروں کے ساتھ رعایت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ مگر ہندوؤں کے مذہبی علماء یعنی برہمن لوگ ان کے مخالف ہیں۔

ظہور اسلام سے پہلے عیسائی مذہب کی جو حالت تھی اور عیسائیوں نے اخوت ومساوات کو جس طرح پامال کیا تھا اُس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں

قیصر قسطنطنیہ نے چھٹی صدی عیسوی کے درمیانی حصّہ میں یہ حکم نافذ کر دیا تھا کہ جو لوگ کیتھلک مذہب کی پیروی نہ کریں اُن کو کوئی سرکاری عہدہ نہ دیا جائے قیصر جارڈین نے تیس ہزار یہودیوں کو ملک شام سے جلاوطن اور ملک بدر کر دیا۔ یہودی یا غیر کیتھلک عیسائی بھی اپنی کوئی مذہبی رسم قیصر روم کی عملداری میں ادا نہیں کر سکتے تھے اُن کی مذہبی کتابیں چھین کر زبردستی جلادی جاتی تھیں ۵۸۶ء میں تمام دُنیا کے عیسائی علماء اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے کہ عورت میں روح ہے یا نہیں آخر بڑے بحث ومباحثہ کے بعد کثرت رائے سے یہ بات طے ہوئی کہ عورت میں روح ہے۔ بڑے بڑے پادری بشپ اور پوپ جنت کے مالک سمجھے جاتے تھے اور ان کے خلاف زبان تک ایک حرف لانا بھی موت کا مترادف تھا۔ مذہبی سرداروں اور امیروں کی تفریح کے لیے عوام کو ہلاکت میں ڈالنا۔ شیروں سے لڑانا معمولی باتیں تھیں۔ مغلوب ومحکوم لوگوں کو چوپایوں سے زیادہ مرتبہ حاصل نہ تھا عیسائی، یہودی، مجوسی وغیرہ مذاہب اور ایرانی، یونانی، رومی وغیرہ اقوام پر نظر کی جائے تو اخوت ومساوات اور رواداری کی ہندوؤں سے بھی بدتر حالت اُن میں نظر آتی ہے تمام ملکوں اور قوموں کا مفصل تذکرہ اس مختصر کتاب میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت تو صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اسلام اس معاملہ میں کیا تعلیم دیتا ہے۔

اسلام نسبی وقومی امتیاز کو بالکل مٹاتا اور تمام بنی نوع انسان کو مساوی درجہ عطا فرماتا ہے اسی طرح قانونی حقوق سب کے مساوی ٹھیراتا ہے۔ ہاں! اسلام اس بات کا قائل ہے کہ جو شخص زیادہ با اخلاق اور با خدا ہو اُس کی زیادہ عزت کی جائے اور جو زیادہ محنت کرے اور زیادہ کمائے وہ آرام طلب نکمے اور نکھٹو آدمیوں کے مقابلے میں اگر زیادہ دولت اور زیادہ سامانِ معیشت کا مالک ہو تو کچھ حرج نہیں ہے۔

انما المومنون اخوۃ (سورہ حجرات)	مسلمان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

یاایہاالناس اناخلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ (حجرات)

لوگو ہم نے تم کو ایک نر و مادہ سے پیدا کیا اور تم کو مختلف اقوام و قبائل بنا دیا تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ خدا کے نزدیک تم میں سب سے بزرگ اور مکرم وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار رہو۔

آنحضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ عرب کے لوگوں کو عجم کے لوگوں پر اور عجم کے لوگوں کو عرب کے لوگوں پر محض عربی یا عجمی ہونے کی وجہ سے کوئی فضیلت نہیں ہے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حبشی غلام تھے جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضؓ حضرت بلال رضؓ کو اپنا آقا کہا کرتے تھے۔ حضرت سلمانؓ۔ حضرت حذیفہؓ۔ حضرت صہیب رضؓ بھی غلام ہی تھے اور صحابۂ کرام رضؓ کے اعلیٰ ترین طبقہ میں انکا شمار ہے۔

یاایہاالذین امنوا کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لاتعدلوا اعدلوا ہو اقرب للتقویٰ۔ (آل عمران)

ایمان والو خدا کے واسطے قائم اور انصاف کے گواہ رہو کسی قوم کی دشمنی اس بات کا باعث نہ ہو کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو کہ یہ بات تقویٰ سے قریب تر ہے۔

واذا قلتم فاعدلوا ولوکان ذاقربیٰ (سورۂ انعام)

جب کہو انصاف کی بات کہو چاہے کسی قرابت دار ہی کو نقصان کیوں نہ پہنچے۔

مذکورہ دونوں آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ دوست دشمن اور رشتہ دار غیر رشتہ دار سب کے ساتھ عدل و مساوات کے برتاؤ کا حکم ہے کسی کے ساتھ بے انصافی یا بیجا طرفداری کی مطلق اجازت نہیں۔ اُدھر منو شاستر میں شودر اور برہمن کی جان میں کوئی مساوات نہیں ادھر قرآن مجید میں النفس بالنفس (جان کے بدلے جان) کہکر سب میں مساوات قائم کردی۔ دوسری جگہ کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ (تم پر مقتولین کا قصاص فرض کیا گیا) فرما کر کسی قاتل کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رکھی اگر کوئی فاطمی یا کوئی برہمن کسی غلام یا شودر کو ناحق قتل کریگا تو اس فاطمی یا اُس برہمن سے ضرور قصاص لیا جائیگا۔ یہی نہیں کہ یہ احکام قرآن مجید میں لکھے رہنے کے لیے ہوں اور مسلمانوں نے ان پر عمل نہ کیا ہو بلکہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف مسلمانوں کے لیے اُن کی زندگی کا دستور العمل رہا ہے ایک مرتبہ سفر میں لوگوں نے کھانا پکانے کے لیے کام تقسیم کر لیے آنحضرت صلعم بھی اُس قافلہ میں موجود اور اُن سب لوگوں کے آقا و شہنشاہ و سپہ سالار تھے آپ نے لکڑیاں لانے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں مدینہ

منورہ سے بیت المقدس تک ایک اونٹ پر سفر کیا ایک غلام بھی ہمراہ تھا۔ اُس اونٹ پر فاروق اعظمؓ اور اُن کا غلام باری باری سے سوار ہوتے تھے۔ شہر قریب آیا تو آخری باری غلام کی تھی اور فاروق اعظمؓ اونٹ کی مہار پکڑے ہوئے آگے آگے پیدل چل رہے تھے غلام نے عرض کیا کہ شہر قریب آگیا ہے اب آپ سوار ہو جائیں اور میں اونٹ کی مہار پکڑ کر آگے چلوں فاروق اعظمؓ نے کہا کہ نہیں سوار ہونے کی باری تمھاری ہی ہے۔ چنانچہ اسی حالت میں جبکہ خلیفۂ اسلام کی شان و عظمت دیکھنے کے لیے لوگ جوق جوق گھروں سے نکل آئے تھے داخل ہوئے ایک مرتبہ ایک نومسلم پادشاہ یعنی جبلہ غسانی کو ایک معمولی غریب آدمی کے ناجائز طور پر تھپڑ مار دینے کے جرم میں مجرم قرار دیکر حکم سزا صادر ہوا جس کی وجہ سے وہ مرتد ہو کر بھاگ گیا۔ ایک مرتبہ خلیفۂ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مدعا علیہ بنکر عدالت کے کمرہ میں مدعی کے برابر کھڑا ہونا پڑا۔ اسلام میں اکثر سلاطین ایسے گذرے ہیں کہ کسی معمولی آدمی نے نالش کردی تو قاضی کی عدالت میں اُن کو مدعی کی برابر کھڑے ہو کر اپنی صفائی پیش کرنی پڑی۔ قیصر روم کے دربار میں جب آنحضرت صلعم کے مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ سفارت پر تشریف لے گئے تو اُنھوں نے اپنے خلیفۂ وقت کی نسبت ایک موقع پر فرمایا کہ

"ہمارا سردار ہم ہی کا ایک فرد ہے اگر ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر صلعم کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اُس کو اپنا سردار باقی رکھیں اور اگر ان کے سوا وہ کسی اور چیز پر عمل کرے تو ہم اُس کو معزول کر دیں اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں اور اگر زنا کرے تو سنگسار کریں اور اگر وہ کسی کو گالی دے تو وہ بھی اُس کو اُسی طرح گالی دے اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اُس کا بدلہ دینا پڑے وہ ہم سے چھپکر پردہ میں نہیں بیٹھتا وہ ہم سے غرور نہیں کرتا۔ مال غنیمت میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دے سکتا وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک معمولی سی بدگمانی کی وجہ سے ایک شخص نے مجمع عام میں اعتراض کیا اور صاف الفاظ میں کہا کہ جب تک میرے اعتراض کا جواب نہ ملے گا ہم آپ کی تقریر نہیں سنیں گے۔ فاروق اعظمؓ نے جب بیت المقدس پر قبضہ کیا تو وہاں کے عیسائی روسار کو اپنے سامنے بلا کر یہ امان نامہ لکھوایا اور اُن کے حوالے کیا کہ

"یہ وہ امان نامہ ہے جو امیر المومنین عمرؓ نے ایلیا والوں کو دیا ہے۔ ایلیا والوں کی جان۔ مال۔ گرجے۔ صلیب۔ بیمار۔ تندرست سب کو امان دی جاتی ہے۔ اُن کے گرجاؤں میں سکونت نہ کی جائیگی اور نہ وہ ڈھائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اُن کے احاطوں کو بھی نقصان نہ پہنچایا جائے گا نہ اُن کی

صلیبوں اور مالوں میں کسی قسم کی کمی کی جائے گی نہ مذہب کے بارے میں کسی قسم کا کوئی تشدد کیا جائیگا اور نہ اُن میں سے کسی کو کوئی ضرر پہنچایا جائے گا یونانیوں یعنی رومیوں میں سے (مصافی یعنی جنگجو فوج میں سے) جو شخص شہر سے نکل جائے گا اُس کے جان و مال کو امن دیجاتی ہے جب تک کہ وہ محفوظ مقام تک نہ پہنچ جائے اور اگر کوئی رومی ایلیا ہی میں رہنا پسند کرتا ہے تو اس کو اطاعت کا اظہار و اقرار کرنا پڑے گا اور اگر ایلیا (بیت المقدس) کے باشندوں میں سے کوئی شخص رومیوں کے ساتھ جانا چاہے تو اُس کو بھی امن ہے یہاں تک کہ وہ محفوظ مقام تک پہنچ جائے۔"

اس عہدنامہ پر آپ نے سرداران لشکر کے بھی دستخط کرادئے تھے تاکہ وہ سب بھی اس کے گواہ رہیں اور کسی قسم کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد شام فلسطین کے اور بھی کئی شہروں نے اسی قسم کے امان نامے حاصل کرکے اپنے آپ کو بغیر مقابلہ کیے خوشی خوشی مسلمانوں کی حفاظت میں دیدیا۔ فاروق اعظم رض کی حکومت و سلطنت تقریباً تیس لاکھ میل مربع رقبہ پر تھی اس قدر وسیع سلطنت کے فرمانروا اور اپنے زمانے میں دُنیا کے سب سے زیادہ طاقتور شہنشاہ کو کسی مرض کی وجہ سے کسی نے شہد کھانے کو بتایا آپ کے یہاں شہد نہ تھا اور کسی جگہ سے بھی شہد نہیں مل سکتا تھا البتہ بیت المال یعنی سرکاری خزانے میں تھوڑا سا شہد موجود تھا لوگوں نے کہا کہ آپ اس شہد کو استعمال کریں۔ فاروق اعظم رض نے جواب دیا کہ یہ تو تمام لوگوں کا مال ہے جب تک عام لوگ مجھکو اجازت نہ دیں میں استعمال نہیں کرسکتا۔ آپ نے خلیفہ ہونے کے بعد ابتدائی مدتوں بیت المال سے ایک حبہ بھی نہیں لیا رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ پر افلاس مستولی ہونے لگا اور فقر و فاقہ کی نوبت پہنچنے لگی تب آپ نے صحابہ کرام رض کو مسجد نبوی میں جمع کرکے فرمایا کہ میں کاروبار خلافت میں اس قدر مصروف رہتا ہوں کہ اپنے نفقہ کا کوئی اہتمام نہیں کرسکتا آپ سب ملکر میرے لیے کچھ مقرر کر دیجیے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ صبح و شام کا کھانا آپکو بیت المال سے ملا کریگا۔ فاروق اعظم رض نے اسی کو منظور کرلیا۔ اس کھانے کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ دور دراز کے صوبوں اور عاملوں کے سفیر مدینہ منورہ میں پیغام لیکر حاضر ہوتے تو وہ فاروق اعظم ہی کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھاتے۔ ان سفیروں کو عموماً اس بات کی شکایت ہوتی کہ مدینہ میں ہم کو کھانا بہت ہی معمولی اور ادنٰے درجہ کا ملتا ہے۔

(۳) اسلامی نظام سلطنت

فکر عمیق اور کافی غور و تدقیق سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت ضرور بے پردہ ہوجائے گی کہ دنیا کی سب سے

بڑی مصیبت اور نوع انسان کی سب سے بڑی ہلاکت و لعنت یہ ہے کہ طاقتور انسان کمزور انسان کو دبانے ڈرانے۔ اُس کے حقوق چھیننے اور غصب کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں عام طور پر عدل و انصاف کے قیام میں مشکلات حائل رہی ہیں، آریوں نے طاقت پاکر غیر آریوں کو۔ برہمنوں اور چھتریوں نے شودروں کو جس طرح دبایا۔ ڈرایا اور اُن کے حقوق سے محروم کیا عالم آشکارا ہے۔ رومیوں نے افریقیوں پر غلبہ پایا تو کسی درگذر اور رعایت کو جائز نہ رکھا۔ مصریوں نے شامیوں کو اور یونانیوں نے ایرانیوں کو اپنے آپ سے کمزور پاکر خون کے دریا بہانے اور کمزوروں کو انسانی حقوق سے محروم کرنے میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھی۔ گاتھ اور گال نے طاقت پاکر کمزوروں کو چوپایوں سے بدتر سمجھا اور مغول نے چیرہ دست ہوکر مغلوبوں کے لوٹنے۔ قتل کرنے میں جنگل کے درندوں اور بھیڑیوں کو مات کردیا۔ نوع انسان میں عورت مرد کے مقابلہ میں کمزور تھی لہذا ہر ملک اور ہر قوم نے عورت کو اس قدر ذلیل بنایا کہ وہ چوپایوں اور جمادی جائدادوں کی طرح مرد کی بے زبان ملکیت سمجھی گئی۔ قانون منو نے عورت کا جو مرتبہ قائم کیا ہے اُس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں عربوں نے دختر کشی کو جیسا قابل فخر کام سمجھا تھا اُس کی روئداد پڑھکر بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔ غرض دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں بتایا جاسکتا جہاں طاقتوروں نے کمزوروں کو مظالم کا تختۂ مشق نہ بنایا ہو اور ضعیفوں کو طاقتوروں کے آگے اپنے شرف انسانیت سے دست بردار نہ ہونا پڑا ہو۔ فرعون مصر نے اگر خدائی کا دعویٰ کرکے لوگوں سے اپنے روبرو سجدہ کرایا تھا تو اس تہذیب و شائستگی کے زمانے میں آج بھی اکثر عمال سلطنت کے متعلق سنا جاتا ہے کہ کسی کے جھک کر سلام نہ کرنے اور تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہونے پر اُس کو پٹوانے اور بعض اوقات تو تھوک کر چٹوانے اور کبھی زمین پر پیٹ کے بل بھی چلوا لیتے ہیں۔ دُنیا میں طاقتوروں کے ظلم و غرور کی جس قدر لمبی عمر ہے اُسی قدر کمزوروں کی بزدلی اور بیجا خوشامد طویل العمر ہے۔ دُنیا کے یہ دونوں مرض سب سے زیادہ پُرانے اور سب سے زیادہ انسانی شرف کو برباد کرنے والے ہیں۔ انھیں دونوں پلید بیماریوں نے انسان کو خدائے تعالیٰ کی معرفت اور عبادت سے باز رکھکر یا تو مزد خدائی کا مدعی اور دہریہ بنایا یا مشرک اور بُت پرست بناکر پتھروں اور زہریلے کیڑوں کے آگے اُس کا سر جھکایا۔ ان دونوں مذکورہ بیماریوں کے دور کرنے اور انسان کو اُس کی شرافت پر قائم رکھنے کے لیے خدائے تعالےٰ نے ہر زمانے میں ہادی۔ رہبر۔ پیغمبر۔ اوتار۔ وخشور۔ پرافٹ۔ نبی اور رسول بھیجے جنھوں نے طاقتوروں کو ظلم و ستم سے روکنے اور کمزوروں کو ظالموں کے مقابلے میں اپنے حقوق کی حفاظت پر آمادہ کرنے یعنی تمام طاقتوں کے مالک اور معبود حقیقی کی عبادت

وفرمانبرداری بجالانے پر مستعد کیا۔ جب سے اس ربع مسکون پر نسل انسانی آباد ہے اُسی وقت سے
مذکورہ دونوں بیماریاں انسانوں میں موجود ہیں اور اُسی وقت سے ان دونوں بیماریوں کے معالج
یعنی پیغمبروں کی تعلیمات کا سلسلہ جاری ہے وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر۔ ان پیغمبروں اور ہادیوں نے
ہمیشہ انسان کو انسانیت پر قائم رکھنے کی کوشش کی اور انسان کے باہمی تعلقات کو خوشگوار رکھکر معبود حقیقی
کی عبادت بجالانے کی فراغت اُن کے لیے مہیا کی۔ اس کوشش میں اُن کو کبھی وعظ و پند سے کام لینا پڑا
کبھی ضعیفوں کو بہادر بنا کر کج فہم اور سرکش ظالموں کا سر توڑنے اور اُن کے کبر و غرور کو خاک میں ملانے کی
ضرورت پیش آئی۔ دُنیا کے ہادیوں اور پیغمبروں کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔ انھیں
ہادیوں اور رہبروں کی لائی ہوئی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ دنیا میں بار بار ظلم و عصیاں اور جور و طغیاں کے
طوفان برپا ہونے کے بعد فرو ہو گئے۔ سب سے بڑا اور عظیم الشان طوفان جس نے تمام ربع مسکون کا احاطہ
کرلیا تھا اُس وقت آیا جبکہ رہبر کامل عالم انسانیت کو اُس کا حق واپس دلانے کے لیے مبعوث ہونے
والا تھا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

مندرجہ بالا تمہید سے غالباً یہ بات بخوبی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ انسانی آبادی کے لیے نظام سلطنت جس
چیز کا نام ہے وہ اگر دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنے اور حقوق انسانی کی حفاظت کا ذریعہ ہے تو وہ ہادیان
برحق کی تعلیمات کا نتیجہ ہوسکتا ہے اور اُسی کہا جاسکتا ہے کہ نسل انسانی کی بہبود و فلاح کے لیے سلطنت و حکومت کے جس قدر
نظام قائم ہوئے وہ سب کے سب پیغمبروں۔ رسولوں۔ اور ہادیوں کے قایم کیے ہوئے یا اُن کی تعلیمات
سے ماخوذ تھے۔ آنحضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ دنیا کے آخری اور سب سے بڑے ہادی تھے اس لیے
نوع انسان کی بہبود و فلاح کے لیے آپ کی لائی ہوئی شریعت یعنی اسلام سے ہمکو سب سے بڑی یہی
توقع ہوسکتی تھی کہ وہ سب سے بہتر نظام سلطنت پیش کریگا۔ آؤ ہم اپنی فکر و تمیز اور فہم و عقل کی کسوٹی
پر بھی اس کو پرکھ کر دیکھ لیں۔

پرانے مذہبوں نے نسل انسانی کے حقوق کی حفاظت کے لیے جو نظام سلطنت قائم کیے تھے وہ ہمیشہ
نوع انسان کی مذکورہ پشتینی بیماریوں کے بار بار عود کر آنے کے سبب درہم برہم ہو ہو گئے اور نئے ہادیوں اور
نئے رسولوں کے آنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ آنحضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسی شریعت
لیکر آئے جو آج تک من کل الوجوہ محفوظ اور ہر قسم کی تحریف و تبدیل سے پاک موجود ہے اور آیندہ بھی
اُس کے متغیر و متبدل ہونے کا کوئی امکان نہیں لہذا اسلامی نظام سلطنت میں اگر ان کی قدیمی
بیماریوں کے عود کر آنے کی وجہ سے کوئی اختلال پیدا ہو تو اُس کی اصلاح کے لیے ہمکو صرف شریعت اسلامی

کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا جو محفوظ و موجود ہے کسی دوسری شریعت اور دوسرے ہادی کے انتظار کی ضرورت نہیں جس طرح ہر شریعت ایک ہادی اور پیغمبر کی اطاعت انسان سے چاہتی ہے اسی طرح اسلام بھی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے انسان سے پیغمبر اسلام کی اطاعت اور نظام اسلام یعنی قرآن کریم کی دی ہوئی تعلیم کی تعمیل چاہتا ہے جس طرح ہر ایک مذہب انسان کو غلامی اور خواری سے نکالکر آزادی و حریت عطا کرنے کے لیے احکام خداوندی یعنی مذہب اور احکام مذہب کی اطاعت چاہتا ہے اسی طرح اسلام بھی انسان کو غلامی کے طوق سے آزاد کرنے کے لیے فرمانبرداری کا خواہاں ہے۔ تمام مذاہب کے احکام دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں ایک کو تعظیم لامر اللہ اور دوسرے کو شفقت علی خلق اللہ یا ایک کو عبادات اور دوسرے کو معاملات کہہ سکتے ہیں اسی دوسرے حصے کو سلطنت سمجھنا چاہیے۔

اسلام تجویز کرتا ہے کہ تمام انسان یکساں حقوق رکھتے ہیں۔ پیدائشی طور پر کسی انسان کو دوسرے انسان پر محض خاندان یا قوم کی وجہ سے کوئی فضیلت و برتری حاصل نہیں ہے۔ ہاں اپنے اعمال سے ہر شخص اپنے مرتبہ اور استحقاق کو بڑھا یا گھٹا سکتا ہے۔ تمام سمجھدار لوگ اپنے اندر سے کسی ایک شخص کو منتخب کر کے اپنا امیر اور قانون کے نافذ کرنے کا مہتمم بنا لیں۔ اس امیر کو منتخب ہونے کے بعد شاہانہ اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ایسے اختیارات حاصل نہیں ہو سکتے کہ وہ مسئول نہ ہو سکے بلکہ وہ قانون یعنی شریعت کے قائم کیے ہوئے اصولوں اور حکموں کے ماتحت ملک و قوم میں امن و انتظام قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور ہر ایک شخص اس کو کوئی خلاف قانون کام کرتے ہوئے دیکھکر روک ٹوک کر سکتا اور ہر معاملہ میں اس سے جواب طلب کرنے کا آزادانہ حق رکھتا ہے اس امیر یا شہنشاہ کو خلیفہ کہتے ہیں۔ خلیفہ کو بیت المال کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ بیت المال میں جو روپیہ یا مال جمع ہوتا ہے وہ رعایا کا مشترکہ خزانہ ہے خلیفہ کو اپنی ذات یا اپنی ذاتی خواہشات کے لیے بیت المال سے کچھ بھی خرچ کرنے کا اختیار نہیں اس کی حیثیت محض ایک امین یا مہتمم کی ہوتی ہے وہ رفاہ رعایا اور مخلوق خدا کے فائدے کے لیے اس خزانے کو خرچ کرتا ہے۔ یتیموں۔ بیواؤں۔ محتاجوں۔ مسافروں کی امداد اور فوج و پولیس وغیرہ کے مصارف میں بیت المال کا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اگر ملک میں بغاوت ہو تو اس کے فرو کرنے اور بدامنی کو امن و امان سے تبدیل کرنے کی تدابیر عمل میں لاتا ہے۔ مظلوموں کے حقوق ظالموں سے دلاتا اور ہر ایک بدمعاش کو تکلے کی طرح سیدھا بنا دیتا ہے۔ چوروں ڈاکوؤں اور رہزنوں کو سزائیں دیتا اور رعایا کی جان و مال و آبرو کی حفاظت و نگرانی کرتا ہے۔ انفصال خصومات میں عدل و انصاف کو مد نظر رکھتا اور مسلم و غیر مسلم کا

اس عدل کے معاملے میں مطلق لحاظ نہیں رکھتا ہے۔ تمام بے حیائی کے کاموں کو روکتا ہے اور لوگوں کو دیندار اور سنجیدہ زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ملک کی حفاظت کے لیے فوج کی ضرورت ہو تو مسلمانوں کی فوجی بھرتی کرتا ہے لیکن غیر مسلموں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ بیرونی حملات۔ اندرونی فسادات اور ہر قسم کی بے راہ روی کے مٹانے اور دور کرنے نیز رفاہ رعایا کے اہتمام کے لیے بیت المال میں خزانہ فراہم ہونے کے ذرائع یہ ہیں کہ مسلمانوں سے زکوۃ و عشر کے ذریعہ روپیہ وصول ہوتا ہے جس کی تشریح خود احکام شرع میں موجود ہے۔ اسی طرح غیر مسلموں کی اپاہج بیت ضعیف اور بوڑھی ٹیکس جزیہ کے نام سے وصول کیا جاتا ہے غیر مسلموں کو سوائے اس جزیہ کے اور کوئی ٹیکس ادا کرنا نہیں پڑتا۔ لیکن مسلمانوں کو زکوۃ کے علاوہ صدقات اور ضرورت کے وقت بڑے بڑے چندے ادا کرنے پڑتے ہیں مسلمان فوجی خدمات ادا کرنے پر بھی مجبور ہیں اور زکوۃ وغیرہ بھی کسی حالت میں معاف نہیں کیے جاسکتے غیر مسلم اگر اپنی خوشی سے فوجی خدمات ادا کرنے پر آمادہ ہوں تو جزیہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے جان و مال کو اس لیے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے کہ یہ نوع انسان کی فلاح و بہبود کے زیادہ خواہاں اور امن و امان کی قدر و قیمت کو پہچاننے کے سبب اُس کے قیام کے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ خلیفہ مسلمانوں کو نماز و روزہ حج زکوۃ وغیرہ عبادات پر قائم رکھتا اور ان چیزوں کے ادا کرانے کا اہتمام کرتا ہے غیر مسلم رعایا کے عبادت خانوں کی حفاظت کا بھی خلیفہ اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت اُس کا فرض ہے۔ راستوں کی حفاظت اور تجارت و صنعت و زراعت کی ترقی کی تدابیر عمل میں لانا بھی خلیفہ کے فرائض میں داخل ہے۔ خود رو پیداوار یعنی جنگلوں۔ پہاڑوں اور دریاؤں سے حاصل ہونے والی چیزیں تمام لوگوں کی مشترکہ ملکیت ہیں ان پر کوئی ٹیکس حکومت کی طرف سے عائد نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی نظام سلطنت کا کامل نمونہ خلفائے راشدین کی حکومت و سلطنت ہے۔ جو شخص پورے اور مکمل اسلامی نظام سلطنت سے واقف ہونا چاہے وہ خلفائے راشدین کے حالات مطالعہ کرے۔ اسلام نے اپنے سکھائے ہوئے اخلاق پر چونکہ مدار حکومت رکھا ہے لہذا اُس نے دوسری قوموں یعنی دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر حکومت کرنے میں کسی بے اعتمادی کے دخل کو مطلق ضروری نہیں سمجھا اور اس بات کی بھی اجازت دیدی کہ تم دوسری قوموں یعنی دوسرے مذہب والوں کو بھی عاملانہ عہدے دے سکتے ہو کیونکہ مسلمان اگر سچے پکے مسلمان ہوں تو کبھی اس قدر کمزور ہو ہی نہیں سکتے کہ دوسروں سے مغلوب ہو جائیں بخلاف دوسرے مذاہب اور دوسری قوموں کے کہ اُنھوں نے دوسروں پر مطلق اعتماد نہیں کیا۔ خلیفہ اگر بے راہ روی اختیار کرے تو اُس کو مسلمانوں کی جماعت فوراً معزول کر سکتی اور دوسرے موزوں شخص کو انتخاب کر لینے کا حق رکھتی ہے لیکن بلا وجہ خلیفہ کے حکم سے سرتابی اور اُس کی نافرمانی جرم عظیم اور بغاوت ٹھیرائی گئی ہے

خلیفہ کے انتخاب میں کسی وراثت کسی خاندانی یا قومی استحقاق کو رتی برابر بھی دخل نہیں ہے۔ آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ استحقاق قابلیت کی بنا پر مسلمانوں کے خلیفہ منتخب ہوئے اُن کے بعد باوجود اس کے کہ اُن کے جوان۔ بہادر۔ عقلمند اور لائق بیٹے موجود تھے حضرت عمر فاروق اعظمؓ خلیفہ منتخب ہوئے جو حضرت ابوبکرؓ سے کوئی قریبی رشتہ داری نہیں رکھتے تھے۔ فاروق اعظمؓ کے بعد حضرت عثمان غنی رضؓ خلیفہ ہوئے حالانکہ فاروق اعظمؓ کے نہایت لائق و فائق بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ موجود تھے حضرت عثمان غنی رضؓ کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ منتخب ہوئے حالانکہ حضرت عثمان غنیؓ کے بیٹے اور قریبی رشتہ دار موجود تھے خلافت راشدہ نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ سلطنت اور حکومت کسی خاص خاندان اور کسی مخصوص قبیلہ کا حق نہیں ہے۔ اسلام اگر اس خاندانی حق اور سلطنت میں وراثت کو تسلیم کرتا تو صدر اسلام میں ایسی بے عنوانی ہرگز نہیں ہوسکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے وراثتی شخصی سلطنت کی لعنت کو دُنیا سے مٹایا اور بتایا کہ حکومت وسلطنت ایک امانت ہے جو تمام لوگوں کی طرف سے کسی ایک شخص کو سپرد کی جاتی ہے۔
جب وہ شخص فوت ہو یا معزول کیا جائے تو اُس کی جگہ پھر تمام سمجھدار لوگ کسی دوسرے شخص کو منتخب کر کے قایم کر دیں اس طرح دُنیا میں نہ کوئی شاہی خاندان موجود ہوسکتا ہے نہ کوئی فرمانروا اپنے بیٹے کو اپنا ولیعہد بنانے کا خیال دل میں لاسکتا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کو بھی لازمی قرار دیا کہ ہر خلیفہ تمام اعاظم امور میں اقدام سے پیشتر لوگوں سے مشورہ ضرور کرے اور ایک مجلس شوریٰ ہمیشہ امور سلطنت میں خلیفہ کو امداد پہنچاتی رہے۔ خلفائے راشدین کو جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو وہ منادی کو حکم دیتے کہ الصلوٰۃ جامعۃ کی آواز بلند کرتا ہوا گلی کوچوں میں سے گذر جائے۔ اس اعلان کو سنتے ہی تمام لوگ مسجد نبوی میں جمع ہو جاتے خلیفہ ممبر پر چڑھ کر حمد و نعت کے بعد حاضرین کے سامنے ایک مختصر اور جامع تقریر میں وہ مسئلہ پیش کر دیتا۔ صاحب الرائے اور سمجھدار لوگ باری باری سے تقریریں اُس مسئلہ کے متعلق کرتے اور آخر میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوجاتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنی سب سے پہلی تقریر میں فرمایا کہ

"لوگو میں تمہارا خلیفہ مقرر ہوا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں .... اگر میں ٹھیک کام کروں تو مجھے مدد دو اور اگر میں غلط روی اختیار کروں تو مجھ کو سیدھا کر دو"

حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ مجلس شوریٰ منعقد ہوئی اور اختلاف آرا ہوا تو فاروق اعظمؓ نے اس موقع پر ایک تقریر کی جس میں فرمایا کہ

"میں بھی تم میں سے ایک کے برابر ہوں ..... میرا یہ منشا نہیں کہ میں جو چاہتا ہوں اُس کو آپ لوگ بھی مان لیں"

بہر حال اسلام نے سب سے پہلے باقاعدہ اور موثر طریقے سے شخصی وراثتی سلطنت کے سلسلے کو مٹانے کی کوشش کی۔ اگرچہ کچھ دنوں کے بعد مسلمانوں کی غفلت اور بدنصیبی سے خود مسلمانوں کے اندر موروثی سلطنت کا سلسلہ جاری ہو گیا مگر پھر بھی مسلمانوں میں اسلامی نظام سلطنت کے اصول نمایاں رہے مسلمانوں ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ ہسپانیہ کے ہمسایہ ملک فرانس میں جمہوری سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اُس کے بعد امریکہ میں بھی جمہوریت قایم ہوئی اور آج تو دنیا کے بہت سے ملکوں میں جمہوری سلطنتیں قایم ہو چکی ہیں۔ فرانس و امریکہ کی جمہوریت درحقیقت اسلامی تعلیمات سے متاثر ہونے کا ایک نتیجہ ہے لیکن اس جمہوریت اور اسلامی نظام سلطنت میں زمین و آسمان کا فرق ہے اس مروجہ جمہوریت میں جو جو خرابیاں شخصی سلطنت کے حامیوں نے بیان کی ہیں اسلام کی مجوزہ سلطنت میں اُس قسم کی خرابیوں میں سے ایک بھی ثابت نہیں کیجا سکتی۔ مسلمان اپنے حکمراں کو اگر وہ خدا اور رسول کے حکم کی مخالفت میں کوئی حرکت کرے تو فوراً روکنے اور ٹوکنے کا قانونی حق رکھتے ہیں لیکن اُس کے ہر ایک حکم کی تعمیل کو جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو ضروری سمجھتے اور اُس سے بغاوت و سرکشی کے خیال تک کو دل میں نہیں آنے دیتے۔ مسلمانوں کو جبکہ یہ حق حاصل ہے کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی پر اپنے خلیفہ کو معزول کر سکتے ہیں تو پھر اس سے بڑھکر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ ایک تجربہ کار مفید ملک و قوم۔ نیک طینت۔ نیک نیت اور قیمتی شخص کو جو اپنے فرائض عمدگی سے بجا لا رہا ہے محض اس لیے کہ اُس کو تین یا پانچ سال کی مدت گذر چکی ہے معزول کر کے نئے انتخاب کی زحمت گوارا کریں اور کسی نئے تجربہ کی مصیبت میں اپنے آپ کو مبتلا کریں۔

عیسائیت نے مال و دولت کا مرتبہ مذہباً اس قدر ذلیل ٹھیرایا ہے کہ دولتمندوں کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے روکدیا ہے۔ بودھ مذہب نے پیشوایان مذہب کو گداگری کرنے کی اجازت دی ہے مگر اسلام نے مال کو سامانِ معیشت قرار دیکر اُس کا اصلی مرتبہ ظاہر فرما دیا ہے۔ ملک کے تمام باشندوں یا تمام بنی نوع انسان کے اندر مالی مساوات محال اور عقلاً اشتراکیت و بولشویت کے اصول ناقابل عمل ہیں مگر ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے یہ ماننا ضروری ہے کہ جس قدر مال و دولت افراد کے قبضہ میں ہے وہ تمام مجموعی طور پر ملک و قوم کی دولت ہے اور اسی لیے قوم کے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ دوسرے شخص کی دولت کو برباد اور تلف ہونے سے بچائے تاکہ ملک و قوم کی دولت میں کمی واقع نہ ہو

اور اگر کوئی شخص اپنی دولت خود اپنے ہاتھ سے برباد کر رہا ہو تو دوسرے کا فرض ہو کہ وہ اُس کو اس غلطی سے روک دے۔ اسلام نے اس حقیقت کو مد نظر رکھ کر حکم دیا ہے کہ لا تؤتوا السفہاء اموالکم (اپنے اموال بے وقوفوں کے سپرد نہ کرو) اسی طرح لیس للانسان الا ما سعیٰ (انسان جو کچھ کوشش کرتا ہے وہی اُس کے لیے ہی) فرما کر ہر شخص کو کسب معاش کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ رشوت کو جو انسان کے لیے بلا استحقاق آمدنی ہے اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے۔ تجارت کی تو اسلام نے ترغیب دی ہی لیکن سود خوری کو اس لیے ممنوع قرار دیا کہ اس میں بہت سی اخلاقی اور اقتصادی مضرتیں مضمر ہیں سود خوری سے انسان کی باہمی محبت و مہربانی و ہمدردی کی صفت حسنہ معدوم ہو جاتی ہے۔ بے محنت دولت کمانے سے انسان آرام طلب اور بزدل ہو جاتا ہے۔ سود خوری کے رواج سے ملک کی تمام دولت بتدریج سمٹ کر ایک محدود گروہ کے قبضہ میں آجاتی ہے اور باقی لوگوں کو مظلومانہ طور پر افلاس میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ غلہ یا دوسری ضروریات زندگی کی چیزوں کو گرانی کے انتظار میں فروخت نہ کرنے اور روکے رکھنے کو بھی اسلام نے منع کیا ہے کیونکہ اس سے اگرچہ ایک شخص کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن باقی تمام لوگوں کو اس سے اذیت ہوتی ہے۔ قمار بازی اور شراب خواری کو بھی اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ ان چیزوں سے فتنے اور فسادات پیدا ہوتے ہیں۔

آج کل کے یورپی ملکوں کو اپنی تہذیب اور ترقی یافتہ حالت پر بڑا غرور اور گھمنڈ ہے لیکن انھیں ملکوں میں آئے دن اُن کے نظام سلطنت کو ظالمانہ قرار دینے والے گروہ پیدا ہو رہے ہیں۔ ای بلفورٹ ایک فلاسفر کا قول ہے۔

"وہ وقت قریب ہے جبکہ کسی انسان کو محب وطن یا وطن پرست کہنا اُس کی انتہائی توہین ہوگی کیونکہ ہم اتفاق سے ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جس میں مخصوص نظام حکومت اور ممتاز طبقے کے افراد کے مفاد کی خاطر غارتگری کا بازار گرم ہے۔ اسی غارت گری کو حب الوطنی کہا جاتا ہے۔"

اس قول کے قائل ای بلفورٹ نے آجکل کی مہذب عیسائی سلطنتوں اور جمہوریتوں کی بدعمالیوں سے تنگ آکر مندرجہ بالا الفاظ کہے ہیں۔ روس کا سب سے بڑا مدبر طالسطائی کہتا ہے کہ نوع انسان میں سے ہر قسم کے ملکی و قومی و خاندانی امتیازات بکلی مٹا دینے چاہئیں۔ ان لوگوں نے یورپی اور عیسائی جمہور کے مفاسد و مظالم کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ باتیں زبان سے نکالی ہیں لیکن اسلام ملکی و قومی امتیازات کو تسلیم کرتا ہوا وہ نظام سلطنت اور وہ اخلاقی تعلیم پیش کرتا ہے کہ اسے بلفورٹ اور طالسطائی کو اس قسم کی خلاف فطرت انسانی تجاویز پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور ہر قسم کے مفاسد

مظالم کا پورے طور پر سدباب ہو جاتا ہے اور انسان نہایت آسانی سے سعادت انسانی تک پہنچنے کی سہولت پا جاتا ہے منطقہ حارہ کو جس طرح منطقہ باردہ نہیں بنایا جا سکتا اسی طرح اقوام عالم کے خصوصی امتیازات اور انسان کی حب الوطنی کو فنا نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اسلام نے قبائل و شعوب کے امتیازات اور انسان کے جذبۂ حب الوطنی کی تعریف بھی کی ہے مگر اس امتیاز قومی اور حب الوطنی کو کہیں بھی ایسا ناجائز موقع نہیں دیا کہ وہ نوع انسانی پر مظالم روا رکھنے کا ذریعہ بن سکے۔

(۴) غیر مسلموں کی ضروری شہادتیں

(۱) امریکہ کے مشہور عالم ڈریپر کا قول ہے۔

"دنیا کی تاریخ میں کوئی مذہب اتنی جلدی اور اس قدر وسعت کے ساتھ نہیں پھیلا جتنا کہ مذہب اسلام تھوڑے ہی عرصہ میں کوہ التائی سے لیکر بحر اٹلانٹک تک اور ایشیا کے مرکز سے افریقہ کے مغربی کناروں تک جا پہنچا۔"

اس قول کو پڑھ کر سوچنا چاہیے کہ اسلام کی یہ حیرت انگیز اشاعت تلوار یعنی جبر و تشدد کے ذریعہ ہوئی تھی یا اپنے اعلیٰ اصول اور مفید تعلیمات کے ذریعہ۔

(۲) سر ولیم میور (لائف آف محمدؐ کا مصنف) جو اسلام کی مخالفت میں شہرت حاصل کر چکا ہے ایک جگہ مندرجہ ذیل الفاظ لکھنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

"اسلام نے ہمیشہ کے واسطے توہمات باطلہ کو جن کی تاریکی مدتوں سے چھا رہی تھی کالعدم کر دیا۔ بت پرستی موقوف ہو گئی اور خدا کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور ہر ایک جگہ محیط قدرت کا مسئلہ حضرت محمد (صلعم) کے معتقدوں کے دلوں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اصول ہو گیا ہے جیسا کہ حضرت محمد (صلعم) کے دل میں تھا۔ مذہب اسلام میں سب سے پہلی بات جو خاص اسلام کا مفہوم ہے یہ ہی کہ خدا کی مرضی پر کامل بھروسہ اور توکل کرنا چاہیے بلحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں چنانچہ مذہب اسلام میں یہ ہدایت ہی کہ سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ محبت رکھیں۔ یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیے غلاموں کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آنا چاہیے نشہ کی چیزوں کی ممانعت ہے۔ مذہب اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔"

(۳) چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں ایک آرٹکل لکھنے والا اسلام اور اسلامی تعلیم کی نسبت لکھتا ہی کہ

"مذہب اسلام کے نہایت کامل اور روشن حصے یعنی قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم میں ناانصافی کذب۔ غرور۔ انتقام۔ غیبت۔ استہزا۔ طمع۔ اسراف۔ عیاشی۔ بدگمانی نہایت قابل ملامت قرار دی گئی ہے۔ نیک نیتی۔ فیاضی۔ حیا۔ تحمل۔ صبر۔ بردباری۔ کفایت شعاری۔ سچائی۔ راست بازی۔ ادب۔ صلح۔ سچی محبت اور سب سے پہلے خدا پر ایمان لانا اور اس کی مرضی پر توکل کرنا سچی ایمانداری کا رکن اور سچے مسلمان کی نشانی خیال کی گئی ہے۔۔۔۔۔۔ یورپ میں علوم و فنون کی ترقی کا اصل سبب بھی اسلام ہی ہوا ہے۔"

(۴) ڈاکٹر گستاولی بان فرانسیسی لکھتا ہے کہ

"جس وقت ہم فتوحات عرب پر نظر ڈالیں گے اور اُن کی کامیابی کے اسباب کو اُبھار کر دکھائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اشاعت مذہب میں تلوار سے مطلق کام نہیں لیا گیا کیونکہ مسلمان ہمیشہ مفتوح اقوام کو اپنے مذاہب کی پابندی میں آزاد چھوڑ دیتے تھے اگر اقوام عیسوی نے اپنے فاتحین کے دین کو قبول کر لیا اور بالآخر اُن کی زبان کو بھی اختیار کیا تو یہ محض اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے اپنے جدید حاکموں کو اُن قدیم حاکموں سے جن کی حکومت میں اُس وقت تک تھے بہت زیادہ منصف پایا اُن کے مذہب کو اپنے مذہب سے بہت زیادہ سچّا اور سادہ پایا۔ یہ امر تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی مذہب بزور شمشیر نہیں پھیل سکتا۔ جس وقت عیسویوں نے اندلس کو عربوں سے فتح کر لیا اُس وقت اس مفتوح قوم نے جان دینا قبول کیا لیکن مذہب کا بدلنا قبول نہیں کیا۔ فی الواقع دین اسلام بعوض اس کے کہ بزور شمشیر پھیلایا گیا ہو محض بہ ترغیب اور بزور تقریر شائع کیا گیا ہے اور یہی ترغیب تھی جس نے اقوام ترک و مغل کو بھی جنہوں نے آگے چلکر عربوں کو مغلوب کیا دین اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔ چین میں بھی اشاعت اسلام کچھ کم نہیں ہوئی ہماری کتاب کے ایک دوسرے حصے میں معلوم ہوگا کہ اُس ملک میں بھی اسلام کس قدر جلد پھیلا اگرچہ عربوں نے چین میں گز بھر زمین پر بھی قبضہ نہیں کیا تاہم اس وقت چین میں کروڑوں مسلمان ہیں۔" (منقول از تمدن عرب)

(۵) رابرٹس اپنی تاریخ چارلس پنجم میں لکھتا ہے کہ

"وہ مسلمان ہی تھے جن میں اشاعت مذہب کے جوش کے ساتھ رواداری ملی ہوئی تھی ایک طرف تو وہ اپنے پیغمبر کے دین کو پھیلاتے تھے دوسری طرف اُن اشخاص کو جو اُسے قبول نہیں کرتے اپنے اصلی ادیان پر قایم رہنے دیتے تھے۔"

(۶) میشو رہبان اپنی کتاب سفر مشرق میں لکھتا ہے کہ

"عیسائیوں کے لیے نہایت افسوس کی بات ہے کہ مذہبی رواداری جو مختلف اقوام میں ایک بڑا قانون مروت ہے عیسائیوں کو مسلمانوں نے سکھایا۔ یہ بھی ایک ثواب کا کام ہے کہ انسان دوسرے کے مذہب کی عزت کرے اور کسی کو مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے۔"

(۷) تاریخ جنگ صلیبی میں مذکورہ مصنف میشو لکھتا ہے کہ

"جس وقت حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کو فتح کیا تو اُنھوں نے عیسائیوں کو مطلق نہیں ستایا برخلاف اس کے جب صلیبیوں نے اسی شہر مقدس کو لیا تو اُنھوں نے نہایت بے رحمی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور یہودیوں کو جلا دیا۔"

(۸) فتح بیت المقدس کے متعلق ڈاکٹر گستاوی بان لکھتا ہے کہ

"بیت المقدس کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ کا اخلاق ہم پر ثابت کرتا ہے کہ ملک گیران اسلام مفتوح اقوام کے ساتھ کیسا نرم سلوک کرتے تھے اور یہ سلوک اُس مدارات کے مقابل جو صلیبیوں نے اسی شہر کے باشندوں سے کئی صدی بعد کی نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ اس شہر مقدس میں بہت تھوڑے اشخاص کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور آپ نے سفرونیس بطریق سے درخواست کی کہ مقامات مقدسہ کی زیارت میں آپ کے ہمراہ چلے۔ اُسی وقت حضرت عمرؓ نے منادی کرا دی کہ میں ذمہ دار ہوں کہ باشندگان شہر کے مال اور اُن کی عبادت گاہوں کی حرمت کی جائے گی اور مسلمان عیسائی گرجوں میں نماز پڑھنے کے مجاز نہوں گے۔ جو سلوک عمرو بن عاصؓ نے مصریوں کے ساتھ کیا وہ اس سے کم نہ تھا اُس نے باشندگان مصر سے وعدہ کیا کہ اُنھیں پوری مذہبی آزادی۔ پورا انصاف بلا رو رعایت اور جائداد کی ملکیت کے پورے حقوق دیئے جائیں گے اور اُن ظالمانہ اور غیر محدود مطالبوں کے عوض میں جو یونانی شہنشاہ اُن سے وصول کیا کرتے تھے صرف ایک جزیہ لیا جائیگا جس کی تعداد دس روپیہ سالانہ تھی رعایائے صوبجات نے اِن شرائط کو اس قدر غنیمت سمجھا کہ وہ فوراً عہد و پیمان میں شریک ہوگئے اور جزیہ کی رقم اُنھوں نے پیشگی ادا کردی۔ عمال اسلام اپنے عہد پر اس درجہ مستحکم رہے اور اُنھوں نے اُن لوگوں کے ساتھ جو ہر روز شاہنشاہ قسطنطنیہ کے عاملوں کے ہاتھ سے انواع و اقسام کے مظالم سہا کرتے تھے اس طرح کا عمدہ برتاؤ کیا کہ سارے ملک نے بہ کشادہ پیشانی دین اسلام اور عربی زبان کو قبول کرلیا۔ میں بار بار کہونگا کہ یہ وہ نتیجہ ہے جو ہرگز بزور شمشیر نہیں حاصل ہوسکتا۔"

(۹) مصر کے مشہور اخبار (اجیپٹ) میں ایک مسیحی نے لکھا تھا کہ

"ہم عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ کرتے ہیں تو ایک نمایاں فرق یہ نظر آتا ہے کہ عیسائی مذہب کے

راستے میں جب علوم و فنون آگئے تو اُس نے نہایت بیدردی سے اُن کو پامال کیا لیکن اسلام نے خود علوم و فنون کی بنیادیں قایم کیں اور عیسائیت و مجوسیت نے جن شائقین علوم کو شوق علم کے جرم میں جلاوطن کیا اسلام نے اُن کو اپنے دامن میں پناہ دی"..... "جس طرح عیسائیت علم اور تمدن کے میدان میں اسلام کے دوش بدوش نہیں چل سکتی اسی طرح اخلاقی حیثیت سے بھی اسلام کا مقابلہ نہیں کرسکتی"

(۱۰) بیروت کے ایک مسیحی اخبار الوطن میں ایک مسیحی نامہ نگار نے آنحضرت صلعم کے متعلق ایک مضمون لکھا اُس میں وہ لکھتا ہے کہ

"پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی قوم کے پھیلنے اور باقی رہنے کے تمام سامان فراہم کردئے کیونکہ مسلمان جب قرآن و حدیث میں غور کریں گے تو وہ اپنی ہر دینی و دنیوی ضرورت کا علاج اُس میں پائیں گے اُنھوں نے اپنے پیرووں کے لیے ایک عالمگیر کانفرنس کی بنیاد ڈالی یعنی حج کے ذریعہ تمام دنیا کے صاحب ثروت اور بااثر لوگ ایک جگہ جمع ہوکر آپس میں ربط و اتحاد بڑھا سکتے ہیں اُنھوں نے زکوٰۃ فرض کرکے فقرائے قوم کا کافی بندوبست کردیا کہ قوم میں کوئی فقیر باقی نہ رہے اُنھوں نے ایک زندہ جاوید زبان مسلمانوں کے لیے قایم کردی کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا سمجھنا ہر مسلمان پر فرض ہے عام افراد قوم کے لیے اُبھرنا اور ترقی کرنا آسان کردیا کیونکہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر سوائے تقویٰ کے اور کسی چیز کے سبب ترجیح نہیں دی۔ مسلمان اپنے پریسیڈنٹ کا جس کو وہ خلیفہ کہتے ہیں خود انتخاب کرتے تھے۔ غیر مسلم یعنی ذمیوں کے لیے اسلامی ممالک میں عیش و راحت کے ساتھ رہنا آسان کردیا کیونکہ حکم دیا کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے اور سب سے پسندیدہ خدا کے نزدیک وہ ہے جو اُس کی اولاد کو نفع پہنچائے۔ اُنھوں نے عورت کے مرتبہ کو بلند کردیا۔ بیت المال کے لیے قواعد مرتب کیے اور حکمت و دانائی کو مسلمانوں کا گم شدہ مال قرار دیا اور اُس کے حاصل کرنے کی ترغیب دی"

(۱۱) جون ڈیون پورٹ صاحب لکھتے ہیں کہ

"یہ خیال کہ قرآنی مذہب تلوار کے ذریعہ سے شائع ہوا تھا بالکل غلط ہے کیونکہ ہر ذی فہم [illegible]

آدمی ادنیٰ فکر سے معلوم کرسکتا ہے کہ آنحضرت (صلعم) کا مذہب ایسا تھا کہ جس میں۔ انسان کی قربانی اور خونریزی کی جگہ نماز اور زکوٰۃ قایم کی گئی تھی اور ہمیشہ کے جھگڑوں اور قضیوں کی جگہ باہمی اخلاص و محبت کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور یہی باعث ترقی کا ہوا تھا۔ حقیقت میں یہ مذہب اہل مشرق کے واسطے سرتاپا برکت تھا اور آنحضرت (صلعم) نے ہرگز اس قدر خونریزی نہیں کی جس قدر موسیٰ

علیہ السلام نے بُت پرستی کی بیخ کنی کے لیے کی تھی۔

(۱۲) مشہور مورخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے کہ

"قدرت کے قانون میں ہر شخص اسلحہ کے ذریعہ اپنی ذات وملکیت کی حفاظت کا حق رکھتا ہے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکتا یا اُن سے زیادتی کا بدلہ لے سکتا ہے اور اپنے انتقام و معاوضہ کو ایک مناسب حد تک وسیع کر سکتا ہے۔ محمد صاحب (صلعم) کو اُن کے ہم وطنوں کی ناانصافی نے اس وقت محروم و جلاوطن کیا جبکہ وہ اپنے بے اندیش مذہب اور صلح آمیز رسالت پر عامل تھے۔

(۱۳) مسٹر طامس کارلائل اپنی کتاب "لیکچرز آن ہیروز" میں لکھتا ہو کہ

"اسلام کا آنا عرب کی قوم کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا عرب پہلی ہی پہل اس کے ذریعہ زندہ ہوا۔ اہل عرب گلہ بانوں کی غریب قوم تھی اور جب سے دُنیا بنی تھی عرب کے چٹیل میدانوں میں پھرا کرتی تھی اور کسی شخص کو ان کا کوئی خیال بھی نہ تھا۔ اس قوم میں ایک اولوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ جس پر وہ یقین کرنے تھے بھیجا گیا۔ اب دیکھو کہ جس چیز سے کوئی واقف ہی نہ تھا وہ تمام دنیا میں مشہور و معروف ہو گئی اور چھوٹی چیز نہایت بڑی بن گئی اس کے بعد ایک صدی کے اندر ایک جانب غرناطہ اور ایک طرف دہلی ہو گئی۔ ..... ایک چنگاری ایسے ملک میں پڑی ...... جو ظلمت میں چھپا ہوا ریگستان تھا مگر دیکھو اس نے زور شور سے اُڑنے والی باروت کی طرح نیلے آسمان تک اُٹھتے ہوئے شعلوں کے ذریعہ دہلی سے تا بہ غرناطہ روشن کر دیا۔

(۱۴) جی ایم۔ راڈویل کہتا ہے کہ

"دلیلوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت (صلعم) کے سب کام اس نیک نیتی کی تحریک سے ہوتے تھے کہ لوگوں کو جہالت اور بت پرستی سے چھڑائیں اور یہ کہ اُن کی زیادہ سے زیادہ خواہش یہ تھی کہ امر حق یعنی توحید الٰہی کا جوش جو اُن کی روح پر غایت درجہ مستولی ہو رہا تھا اس کا خوب اشتہار و اظہار کریں اُن کی ذات کریم اور سیرت صداقت مشحون کی نسبت اُن لوگوں کا تصور کرنا چاہیے جن کے اخلاق اور ایمان کو ابنائے جنس کے تمام امور دینی پر کامل اختیار حاصل ہے ...... قرآن میں ایک نہایت گہری حقانیت ہے جو اُن لفظوں میں بیان کی گئی ہے جو باوجود مختصر ہونے کے قوی اور صحیح رہنمائی اور الہامی حکمتوں سے مملو ہیں۔"

(۱۵) جرمن مستشرق عمانویل ڈویش لکھتا ہے کہ

"قرآن مجید کی مدد سے عربوں نے سکندر اعظم اور رومیوں کی سلطنت سے بڑی دُنیا فتح کر لی۔

فتوحات کا جو کام رومیوں سے سیکڑوں برس میں ہوا تھا عربوں نے اُسے اُس کے دسویں حصہ وقت میں انجام پر پہنچایا۔ اسی قرآن کی مدد سے تمام سامی اقوام میں صرف عرب ہی یورپ میں شاہانہ حیثیت سے داخل ہوئے جہاں اہل فینیشیا بطور تاجروں کے اور یہودی لوگ پناہ گزینوں اور اسیروں کی حالت میں پہنچے۔ ان عربوں نے بنی نوع انسان کو روشنی دکھلائی جبکہ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی ان عربوں نے یونان کی عقل و دانش کو زندہ کیا اور مغرب و مشرق کو فلسفہ۔ طب اور علم ہیئت کی تعلیم دی اور موجودہ سائنس کے جنم لینے میں انھوں نے حصہ لیا۔ ہم ہمیشہ اُس روز کا ماتم کریں گے جس دن غرناطہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔"

(۱۶) ڈاکٹر سموئیل جانسن لکھتا ہے کہ

"قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانہ کے لیے اس قدر موزوں ہیں کہ زمانہ کی تمام صدائیں خواہ مخواہ اُس کو قبول کر لیتی ہیں اور وہ محلوں۔ ریگستانوں۔ شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے.....وہ ایسی کارکن قوت بن گیا جس کے ذریعہ سے جس وقت عیسائیت تاریکی کی ملکہ بنی ہوئی تھی یونان اور ایشیا کی تمام روشنی عیسائی یورپ کے گہرے اندھیرے میں پہنچی۔"

(۱۷) مارگولیتھ انگریزی ترجمہ قرآن (مترجمۂ راڈ ویل) کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ

"تحقیقات سے یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ یورپ میں علم کے دورِ جدید سے کئی صدیوں پیشتر یورپ کے علمی فلسفہ۔ ریاضی۔ ہیئت اور دیگر علوم کے متعلق جو کچھ جانتے تھے وہ تقریباً سب کا سب اصلی عربی کتابوں کے لاطینی ترجموں کے ذریعہ سے انھیں حاصل ہوا تھا۔ قرآن ہی نے شروع میں کنایۃً ان علوم کے حاصل کرنے کا ذوق شوق عربوں اور اُن کے دوستوں میں پیدا کیا تھا۔"

(۱۸) لڈولف کریہل جس نے ۱۸۴۴ء میں آنحضرت صلعم کے حالات شائع کیے تھے لکھتا ہے کہ

"قرآن میں عقائد۔ اخلاق اور ان کی بنا پر قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے اس میں ایک وسیع جمہوری سلطنت کے ہر شعبہ کی بنیادیں بھی رکھدی گئی ہیں عدالت۔ حربی انتظامات۔ مالیات اور نہایت محتاط قانون غرباء وغیرہ کی بنیادیں خدائے واحد کے یقین پر رکھی گئی ہیں۔"

(۱۹) ریورینڈ ڈبلیو اسٹیفن لکھتا ہے کہ۔

"آنحضرت نے بُت پرستی کے ایک منتشر انبار کے عوض میں خالص توحید کا عقیدہ قائم کیا۔ آپ نے لوگوں کے اخلاقی معیار کو بلند کیا اور ان کی تمدنی حالت کو ترقی دی اور ایک سنجیدہ اور معقول طریق عبادت جاری کیا آخر کار آپ نے اس ذریعہ سے بہت سے وحشی اور آزاد قبیلوں کو جو محض ذرّوں کی طرح

اِدھر اُدھر اُڑتے پھرتے تھے باہم ملا کر ایک ٹھوس ملکی جماعت کی شکل میں منتقل کر دیا آپ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جہاں ملکی نظام معقول اعتقاد اور خالص اخلاق سے لوگ ناواقف تھے آپ نے ان تینوں باتوں کو وہاں رواج دیا۔ ملکی حالت۔ مذہبی اعتقاد اور اخلاقی حالت کی اصلاح کر دی بہت سے آزاد قبیلوں کی جگہ آپ نے ایک قوم چھوڑی۔ بہت سے معبودوں اور بہت سے خداوندوں کے باطل عقیدے کی جگہ آپ نے ایک قادر مطلق مگر رحمٰن و رحیم خدا کا معقول عقیدہ قایم کیا لوگوں کو تعلیم دی کہ وہ اس خیال کے ساتھ زندگی بسر کریں کہ وہ وجود مطلق ہر دم ہمارا محافظ و نگہبان ہے۔ اسی کو نیکیوں کا جزا دینے والا سمجھیں اور اسی کو بدوں کا سزا دینے والا سمجھکر اُس سے ڈریں۔ بہت سی قابل نفرت اور وحشت انگیز رسمیں جو آپ کے زمانہ تک عرب میں رائج تھیں ان پر آپ نے زبردست حملہ کیا۔ اوباشانہ بدکاری کی بجائے تعدد زوجات کا ایک با احتیاط اور باضابطہ اصول منضبط کیا گیا۔ دختر کشی کی رسم کا پورا پورا انسداد کیا۔ ترک۔ ہندوستانی حبشی اور بربری اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اپنے بتوں کو اُٹھا کر پھینکدیں اپنے رندانہ رسم و رواج کو خیرباد کہدیں اور خدائے واحد کی پرستش میں شایستہ طرز عبادت اور ایک باقاعدہ طرز معاشرت کی طرف رجوع کریں۔ اہل فارس کا عقیدہ بھی صاف اور خالص ہو گیا اور اُنھوں نے اسلام سے یہ بات سیکھ لی کہ نیکی و بدی کی دو ہمسر قوتیں (یزدان و اہرمن) نہیں ہیں بلکہ نیکی و بدی دونوں اُسی علیم اور قدوس کے زیر فرمان ہیں جو آسمان و زمین کی تمام چیزوں پر حکمرانی کرتا ہے "

(۲۰) ڈاکٹر ڈبلیو ٹی آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام اسی موضوع پر لکھی گئی ہے کہ "اسلام کی اشاعت بزور شمشیر نہیں بلکہ صلح و آشتی کے ساتھ ہوئی ہے" جو قابل مطالعہ ہے۔ اور اُس کا اُردو ترجمہ دعوت اسلام کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔

(۲۱) موسیو لیبلی جنھوں نے ایک بے نظیر کتاب مشرق پر لکھی ہے اور جو ایک نہایت محقق اور مذہبی مصنف ہیں اُن کا قول ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی کتاب تمدن عرب میں اس طرح نقل کیا ہے۔

"مسلمان اُن نظامات میں جو اقوام مزدوری پیشہ کی بہبودی سے متعلق ہیں اس وقت تک اُن سخت غلطیوں سے بچے ہوئے ہیں جو مغرب میں واقع ہوئی ہیں۔ ان میں اب تک وہ عمدہ نظامات کامل طور سے باقی ہیں جن کے ذریعہ سے اُنھوں نے امیر و غریب و غلام و مالک میں صلح قایم رکھی ہے اسی قدر کہنا کافی ہے کہ وہ قوم جس کو تعلیم دینے کا دعویٰ یورپ کر رہا ہے فی الواقع وہ قوم ہے جس سے خود اسے سبق لینا چاہیے۔

(۲۲) پروفیسر اڈیورڈ مونٹ پروفیسر السنہ مشرقیہ جنیوا یونیورسٹی کہتے ہیں کہ
"آنحضرت صلعم کو اصلاح اخلاق اور سوسائٹی سے متعلق جو کامیابی ہوئی اُس کے اعتبار سے آپ کو انسانیت کا محسن اعظم یقین کرنا پڑتا ہے۔

(۵) ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے زمانہ کی پیدا شدہ شرارتوں میں خصوصیت سے ایک یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ اسلام کو مورد الزام بنانے کے لیے بعض نام کے مسلمان سلاطین کی بداعمالیوں کا تذکرہ نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں بتایا جاسکتا جس سے منسوب ہونے والا ہر ایک شخص اُس مذہب کی خلاف ورزی پر تا در نہ ہو سکے مجوسیوں۔ بودھوں۔ ہندوؤں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی تعداد آج بھی دنیا میں لاکھوں سے گذر کر کروڑوں تک پہنچتی ہے کیا کوئی شخص مرد میدان بن کر اس بات کے ثابت کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے کہ ان مذکورہ مذاہب کے ماننے والوں میں فی صدی پانچ آدمی ---- بھی ایسے مل سکتے ہیں جو ہمہ وجوہ اپنے احکام مذہبی کے پابند ہوں اور اُن کی عملی زندگی اپنے اپنے مذاہب کا ایسا کامل نمونہ ہو کہ جس میں خلاف ورزی مذہب کا کوئی شائبہ تلاش نہ کیا جا سکے۔ انسانی کمزوری انسانی غفلت۔ انسانی سہو ونسیان۔ اور انسانی سرکشی ونادانی کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ انسان کے قدم بھٹکتے رہے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ کسی مذہب کی تعلیمات کے اچھے یا بُرے نتائج کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم اُس مذہب کے ماننے والوں کی عملی و اخلاقی حالت پر ضرور نظر ڈالیں گے لیکن ہماری نظر زمین پر رینگنے والے ایسے کیڑے کی نظر کے مشابہ نہ ہونی چاہیے جو دو ڈھائی انچ سے زیادہ فاصلہ کی کوئی چیز نہیں دیکھ سکتا۔ ہر مذہب کے ماننے والوں میں ایک تعداد نافرمانوں اور بداعمالیوں کی بھی شامل رہا کرتی ہے لیکن اُس مذہبی جماعت کا مجموعی مزاج ہمیشہ اس مذہب کی تعلیمات کا نتیجہ ہوا کرتا ہے کسی قوم یا ملک کے مزاج اور مجموعی اخلاق کا اندازہ اُس قوم یا ملک کے صرف قلیل ترین حصہ کے مطالعہ سے نہیں بلکہ کثیر حصہ کے مطالعہ سے کیا جاتا ہے اور اس اصول سے انکار کی کسی عقل و فراست کو جرأت نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اسلام کو عیاشی کا محرک ثابت کرنے کے لیے تاریخ ہند میں سے محمد شاہ عدلی۔ جہاندار شاہ اور واجد علی شاہ کے حالات نہایت جوش وخروش کے ساتھ پیش کرتے ہیں وہ اسی تاریخ ہند میں ناصر الدین محمود۔ شمس الدین التمش۔ غیاث الدین بلبن۔

خان شہید- جلال الدین خلجی - فیروز تغلق- بہلول لودی- سکندر لودی- شیر شاہ اعظم- اکبر- شاہجہان- عالمگیر وغیرہ کے حالات کیوں ملاحظہ نہیں فرماتے اور جو لوگ تیمور کی خونریزی کے افسانے سنا کر نوع انسان کی ہمدردی کا ثبوت دینے کے لیے نوحہ خواں ہیں وہ تیمور کی اولاد میں اکبر و جہانگیر کی ہندو نوازیوں کی داد کیوں نہیں دیتے۔

احکام مذہبی کی پابندی میں سب سے زیادہ سست بادشاہوں اور امیروں کا گروہ ہوا کرتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُس نے ان فرمانرواؤں کے طبقہ کی بھی اصلاح کر کے مطلق العنانی کا خاتمہ کیا اور شاہ و گدا دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ لیکن جو لوگ احکام اسلامی سے غفلت اور روگردانی کر کے مطلق العنان فرمانروائی کے مذہبی جرم میں گرفتار ہوں اُن کو مذہب اسلام کے ناقص ہونے کی دلیل میں کیسے پیش کیا جا سکتا ہے قرآن مجید نے خود الھٰکم التکاثر اور اکابر مجرمیہا فرما کر بتا دیا کہ سب سے زیادہ ناقص اور مورد الزام لوگ امیروں اور نمبرداروں کے طبقہ میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ آج بھی یورپ کی عیسائی قومیں اور عیسائی سلاطین انجیل کی تعلیمات کے خلاف عملدرآمد کر رہے ہیں اور ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے نہیں کرتے بلکہ رات دن نوع انسان کے قتل اور سفاکِ دم کے لیے انواع و اقسام کے آلات و اسلحہ ایجاد کرنے میں مصروف ہیں لیکن عیسائی پادریوں نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے عیسائی مذہب کا ناقص و نادرست ہونا تسلیم نہیں کیا۔ مہابھارت اور رامائن کے افسانوں میں کنس و جراسندھ و راون وغیرہ راجاؤں کے قصے پڑھنے والوں کو یہ استحقاق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کو جو پابندی احکام اسلامی میں زیادہ چست اور مستعد نہ تھے نمونہ قرار دیکر اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے عام اخلاق کا مطالعہ غیر ضروری قرار دیں۔

اسی سلسلے میں ایک اور بھی نہایت اہم اور ضروری بات کی طرف توجہ دلانا باقی ہے وہ یہ کہ مسلمانوں اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں پر احمقانہ و معاندانہ حملے کرنے والے محمد بن قاسم- محمود غزنوی- شہاب الدین غوری- علاء الدین خلجی- عالمگیر اورنگ زیب کو مورد الزام بناتے وقت اور اُس زمانے کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے بُعدِ زمانی اور اُس کے متعلقات کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں وہ جب محمود و شہاب الدین کا ذکر کرتے ہیں تو اُس زمانے کے ہندوستان کو آج کا ہندوستان- اُس زمانے کی دنیا کو آج کی دنیا اور اُس زمانے کے تمدن و معاشرت کو آج کا تمدن و معاشرت فرض کر لیتے اور اسی مفروضہ کی بنا پر لوگوں کو یقین دلاتے اور اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر اس ملک کے باشندوں کی معاشرت کس قدر کثیف- ان کے اخلاق کس قدر پست اور ان کا تمدن کس قدر ادنیٰ درجہ کا تھا۔

یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اُس زمانے میں ہندوستان کے سوا باقی تمام دُنیا کی کیا حالت تھی اور مسلمانوں نے اس ملک میں داخل ہو کر ہندوؤں کو کس قدر فوائد پہنچائے اور اُن میں کیسی روشن خیالی پیدا کی۔ آج کل اہلِ ہند کی آنکھیں یورپ کی تہذیب و ترقی کے آگے خیرہ ہو رہی ہیں لیکن اُن کو اس بات کے تحقیق کرنے کی فرصت میسّر نہیں کہ یورپ کی یہ تمام ترقیات اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق و ترقی کا نتیجہ ہیں۔ اُن کو شاید یہ بھی کبھی بھولے سے خیال نہیں آتا کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر ہندوؤں کا لباس کیسا تھا۔ اُن کی خوراک۔ برتن۔ اُن کی بستیاں۔ مکانات۔ صحن و دروازے کیسے ہوتے تھے۔ اُن کے میلوں ٹھیلوں اور آدابِ مجلس کی کیا حالت تھی۔ اُن کے علوم و فنون کیا اور کس حیثیت کے تھے اُن کی سواریاں اور اسلحۂ جنگ اور فنونِ حرب کا کیا مرتبہ تھا۔ اُن کے خیالات و جذبات میں کس قدر سنجیدگی اور متانت تھی اور اُن کی حمیّت و غیرت کا اعلیٰ معیار کیا تھا۔ یہ تمام باتیں ایک مستقل تصنیف کی خواہاں ہیں۔ کم از کم اتنا تو ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ جس زمانے میں مسلمان ہندوستان کو فتح کر کے اس پر حکومت کر رہے تھے اور ہندو مفتوح نہایت آزادی کے ساتھ اپنے مندروں کے اندر پوجا پاٹ میں مصروف تھے اُس زمانے میں دوسرے غیر مسلم فرماں رواؤں کا طرزِ عمل اپنی رعایا کے ساتھ کیا تھا۔ روم کے پوپ انوسنٹ نے حکم دیا تھا کہ " منکرین عقائد کیتھولک کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے "۔ اندلس کی اسلامی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائے ہوئے عیسائیوں نے جب یورپ کے عیسائی ملکوں میں جا کر علم اور عقل کی باتوں کا اظہار کیا تو وہ ہر جگہ ستائے اور تنگ کیے گئے کیونکہ اُس زمانے کا تاریک یورپ کسی علم و تہذیب کی شعاع کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ انھیں مذکورہ عیسائیوں میں سے ایک نے جب توس قزح کی نسبت کہا کہ یہ خدا کی انتقام لینے والی کمان نہیں ہے بلکہ پانی کے قطرات پر آفتاب کی روشنی پڑنے سے نمایاں ہوتی ہے تو اُس کو قید کر دیا گیا اور جب وہ قید خانہ میں مر گیا اور اُس کو دفن کر دیا گیا تو بعد میں مذہبی فتوے کے موافق اُس کی لاش قبر سے نکال کر آگ میں جلائی گئی۔ علم و عقل کی باتیں جو اندلس کی اسلامی درس گاہوں کے ذریعہ یورپ میں شائع ہو رہی تھیں اُن کے روکنے اور تاریکی کو باقی رکھنے کے لیے ایک جاسوسی کا محکمہ قائم کیا گیا کہ کوئی کتاب پوپ کی اجازت کے بغیر شائع نہ ہو سکے چنانچہ اس محکمہ کے ذریعہ ۱۴۸۱ء سے ۱۸۰۸ء تک ایک لاکھ چودہ ہزار نو سو چھ آدمی محض اس لیے مجرم قرار دیئے گئے کہ وہ علم و حکمت اور فلسفہ کی باتیں زبان یا زبانِ قلم تک لائے تھے۔ ان میں سے ایک ہزار تئیس (۱۰۲۳) کو زندہ آگ میں ڈال کر جلایا گیا اور سولہ ہزار آٹھ سو ساٹھ (۱۶۸۶۰) کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ باقی کو دوسری سخت سزائیں دی گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان

میں سلطان بہلول لودی اور سکندر لودی فرمانروا تھے اور ہندوؤں کو فارسی زبان پڑھا پڑھا کر بڑے بڑے شاہی عہدے تفویض کر رہے تھے اور کبیر داس اپنے خیالات کی آزادانہ نشر و اشاعت میں مصروف اور اپنے کبیر پنتھی مذہب کی بنیاد رکھنے میں مشغول تھے۔ اُدھر اندلس میں عیسائیوں نے چیرہ دست ہو کر ۱۴۹۱ء میں تیرہ لاکھ بے عذر اور امن پسند مسلمانوں کو معاہدہ کے خلاف صرف اس وجہ سے آگ میں زندہ ڈالکر جلایا کہ وہ عیسائی نہ تھے اور ادھر سلطان سکندر لودی ہندوؤں کو حکومت کے عہدوں پر مامور کر رہا تھا کیا کسی ہندوستان کے باشندے کی یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ وہ یا اُس کے باپ دادا بہلول لودی اور سکندر لودی کے زیر حکومت ہندوستان میں نہ ہوتے بلکہ اٹلی یا اسپین میں ہوتے جہاں اختلاف عقائد کی وجہ سے زندہ آگ میں ڈالکر جلایا جا رہا تھا۔ ہندوستان کے اندر جس زمانہ میں مغلوں کی سلطنت قائم ہو رہی تھی اور شیر شاہ اعظم ایک ادنیٰ طبقہ کے ہندو کی شکایت پر اپنے عزیز بیٹے اور ولی عہد سلطنت کو سخت سزا دینے کا حکم دیکر عدل و انصاف کی پوری پوری داد دیچکا تھا اُس زمانے میں تہذیب کے علمبردار اور عدل و انصاف کے دعویدار یورپ کے بعض سپہ سالاروں نے یہ عزم کر لیا تھا کہ امریکہ کے ملک مکسیکو کو بالکل ویران کر کے وہاں اپنی ایک نوآبادی قائم کریں چنانچہ مکسیکو کے قدیم پادشاہ کو گرفتار کر کے اُلٹا لٹکا یا گیا اور اُس کے سامنے اس کی رعایا کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال ڈال کر جلانے کا دلچسپ کام شروع کیا گیا اور اس طرح ہزارہا بندگان خدا کو آگ میں جلانے کے علاوہ پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لینے والوں کو کتّوں سے پھڑوایا گیا اس انسانی تہذیب کا نمونہ دکھانے والے وہی مہذب و شائستہ ہسپانوی تھے جنھوں نے مسلمانوں کو اندلس سے یہ الزام دے کر تخم سوختہ کیا تھا کہ یہ ظالم، گنہگار اور بد دین قوم ہے۔ جنوبی امریکہ کے ملک پیرو میں اٹلی کے ایک مجہول النسب سپہ سالار نے جس طرح قتل و غارت کا بازار گرم کر کے وہاں کے قدیم باشندوں کو فنا کیا اُس کی روئداد بھی جسم کے رونگٹے کھڑے کرنے میں ہسپانوی مظالم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ملک کانگو میں بلجیموں نے وہاں کے باشندوں کو صرف چند تولہ ربڑ کی چوری کے الزام میں جس طرح ستایا اور قتل و غارت کے جو ہنگامے برپا کیے اُس کی مثالیں چنگیز و ہلاکو کے کارناموں میں بھی تلاش نہیں کی جا سکتیں۔ آسٹریلیا اور ٹسمانیہ کے باشندوں کو جس طرح صفحۂ ہستی سے معدوم ہونا پڑا وہ بھی کچھ کم حسرت انگیز نہیں ہے۔ یہ سب اُس زمانے کی داستانیں ہیں جبکہ ہندوستان میں مسلمان فاتحین نے ہندو مفتوحین پر عدل و انصاف اور رعایت و مروّت و دلدہی کی بارشیں برسا رکھی تھیں اور ہندوؤں کو وزارت عظمیٰ اور سپہ سالاری کے عہدے تفویض کیے تھے۔ جس زمانے میں عالمگیر اورنگ زیب ہندوستان میں تخت نشین

ہو رہا تھا اُس زمانے میں انگلستان کے اندر یہ عجیب و غریب قانون جاری تھا کہ جس عورت پر کوئی
شخص ساحرہ ہونے کا الزام لگائے اُس کو امتحان کی غرض سے کسی دریا یا تالاب یا سمندر میں ڈالا
جائے اگر وہ عورت پانی میں ڈوب کر مر گئی تو ثابت ہوا کہ وہ ساحرہ نہ تھی اور اگر کسی طرح ڈوبنے
سے بچ گئی تو اُس کا ساحرہ ہونا ثابت ہو گیا لہذا اُس کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس عورت پر کوئی
شخص ساحرہ ہونے کا شبہ کر دیتا تھا اُس عورت کی موت یقینی تھی اس طرح ہزار ہا بے گناہ عورتیں نذر
اجل ہوئیں۔ کبھی ان بے گناہ عورتوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونکی جاتی تھیں اور لوہا گرم کرکے داغ
دیے جاتے تھے۔ اس طرح اول اُن سے جرم کا اقرار کرایا جاتا تھا جب ان ناقابل برداشت اذیتوں
کے مقابلہ میں وہ اقرار جرم کر لیتی تھیں تو فوراً اُن کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ کیا اس عجیب و غریب
طرز حکومت کے مقابل اُسی زمانے میں ہندوستان کے اندر عدل و انصاف کے دریا نہیں
بہہ رہے تھے اور کیا عالمگیر کی سلطنت میں اس قسم کی کوئی مثال تلاش کی جا سکتی ہے؟

آریوں نے ہندوستان میں داخل ہو کر غیر آریوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا تھا اور برہمنی
مذہب کے ماننے والوں نے بودھوں کو کس طرح ہندوستان سے جلاوطن اور ناپید کرنے کی کوشش
کی تھی۔ ان پرانی داستانوں کے دوہرانے اور یاد دلانے کی ضرورت نہیں آؤ آخری زمانے میں
جبکہ ہندو مفتوحوں اور مسلمان فاتحوں کو اس ملک میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے سیکڑوں
ہزاروں برس گذر چکے تھے اور ہمسائگی و ہموطنی کے سبب محبت و اخلاص کے تعلقات بہت قوی
ہو گئے تھے دیکھیں اور تحقیق کریں کہ ہندوؤں نے چیرہ دست ہو کر مسلمانوں کے ساتھ کس قسم کا
سلوک کیا تھا۔ پنجاب میں صرف چالیس پچاس سال تک سکھوں کی سلطنت قائم رہی لیکن ہم آج تک
پنجاب کے مسلمانوں سے سکھوں کے ظلم و جور کی عجیب عجیب داستانیں سنتے ہیں اور حیرت زدہ ہوتے
ہیں دکن میں مرہٹوں کی سلطنت بھی کچھ عرصہ کے لیے قائم ہو گئی تھی لیکن اس مرہٹہ سلطنت کی
چند روزہ تاریخ میں قتل و غارت کے ہنگامے۔ مظلوموں کی آہ و بکا کا شور بستیوں کے جلنے کا دھواں
خون کے سیلاب۔ تڑپتی ہوئی لاشیں اور مسمار شدہ مکانات کے اینٹ پتھروں کے انبار صفحہ
پر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بیچارے سکھوں اور مرہٹوں ہی کی کیا خطا ہے موجودہ مہذب یورپ کو
دیکھو کہ مفتوحہ قوموں کے ساتھ ان فاتحین کا سلوک کس قسم کا ہے اور یہ تعلیم یافتہ فاتحین اپنے مفتوحین
کو کہاں تک اُن کے انسانی حقوق عطا کرنے پر آمادہ ہیں۔ غرض دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں بتائی
جا سکتی جس نے فتحمند ہو کر مفتوحوں کے ساتھ اس مسالمت۔ رواداری، نرمی۔ رعایت مساوات

اور عدل و انصاف کا سلوک کیا ہو جیسا کہ مسلمانوں نے عام طور پر اپنے مفتوحین سے کیا۔ جن ملکوں پر سیکڑوں برس سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہے اُن میں آج تک عیسائی اور یہودی نہایت امن و امان اور فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور جائز طور پر کوئی وجہ شکایت بیان نہیں کیجا سکتی۔ خود ہندوستان میں مسلمانوں نے ہزار گیارہ سو سال حکومت کی لیکن ہندو نہایت آرام و آسائش اور فارغ البالی کے ساتھ رہے جس کا ثبوت یہ کتاب پیش کریگی مگر اس کے خلاف ہم دیکھتے ہیں کہ اندلس اور صقلیہ میں جہاں مسلمانوں کی بہت آبادی تھی آج ایک بھی مسلمان نظر نہیں آتا اور ان کے ساتھ جو سلوک فاتحین نے کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ترکوں کی سلطنت میں عیسائی کس امن و امان اور اطمینان کے ساتھ رہے لیکن ہرزی گوینا۔ بوسینیا۔ رومانیہ۔ بلغاریہ۔ یونان۔ سرویہ وغیرہ ترکوں کے صوبے جب اُن کے قبضہ سے نکلکر دوسری قوم کے قبضہ میں پہنچے تو مسلمان وہاں نہ رہ سکے اور آج مسلم آبادی سے یہ علاقے خالی نظر آتے ہیں۔ اس تہذیب و روشن خیالی کے زمانے میں مسلمانان روس کے جس قسم کے مظالم سہے اُن کا تصور خون کے آنسو رلانے کے لیے کافی ہے۔ یہودیوں کے ساتھ روشن خیال یورپ نے جو ظالمانہ برتاؤ کیا کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن یہ بات بھی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ مصر و ٹرکی میں ان مظلوم و جلاوطن یہودیوں کو ہمیشہ پناہ ملتی رہی۔

اسی سلسلہ میں اس دجل و فریب کا بھی تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکثر چالاک مورخین جب ہندوستان کے کسی مسلمان بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں تو بڑی گرمجوشی اور ہمدردی کے ساتھ اُس کی خوبیوں اور تعریفوں کے بیان کرنے میں اپنی قابلیت کا اظہار کرکے پڑھنے والے کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ ہم بڑے بے تعصب اور منصف مزاج ہیں لیکن پھر اُس کے عیوب و نقائص کی تفصیل بیان کرکے آخر میں یہ مختصر جملہ لکھدیتے ہیں کہ یہ تمام غلطیاں اس بادشاہ سے اس لئے سرزد ہوئیں کہ وہ مذہب اسلام کا زیادہ پابند تھا اس طرح وہ اپنی کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کو اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اسلام کی پابندی سے انسان ظلم و عصیان اور بے راہ روی پر مجبور ہو جاتا ہے حالانکہ اس سے بڑھکر شرارت اور دروغ بیانی دوسری نہیں ہو سکتی۔ ایسے مورخین کوتاہ نظر اور کم فہم لوگوں کی نگاہ میں بڑے منصف مزاج اور صداقت شعار بھی مشہور ہو جاتے ہیں۔

(۶) ہندوستان میں اسلام کا پہلا قدم

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے اور تیر و شمشیر کے ذریعہ

داخل ہند ہوئے۔ مگر اس بات کے تسلیم کر لینے سے پیشتر بعض ضروری حالات کا زیر مطالعہ آجانا ازبس ضروری ہے۔ سندھ کے ملک میں بھی تیر و شمشیر کے سایہ سے آگے اسلام پہنچ چکا تھا یہ حقیقت آگے بیان ہونے والی ہے۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام سندھ سے بھی پہلے ملابار (دکن) کے علاقے میں بلا تیغ و تبر داخل ہو چکا تھا اور وہاں مستقل طور پر محض اپنی خوبیوں کے سبب نشوونما پاتا رہا۔ سندھ اور پنجاب میں محمد بن قاسم اور محمود بن سبکتگین جب مصروف جنگ تھے اُس وقت جنوبی ہند میں مسلمان نہایت پُر امن طریقہ سے تبلیغ اسلام میں مصروف تھے۔ چونکہ ملابار میں مسلمان فاتحانہ حیثیت سے تیغ و علم لیکر نہیں آئے تھے لہذا ملابار میں اسلام کے داخل ہونے کا مختصر حال اس مقدمہ میں بیان کر دینا مناسب ہے تاکہ ابواب کتاب میں حکومت اسلامیہ کے حالات پڑھتے ہوئے ملابار کے تصور سے ہم بالکل بیگانہ نہ ہوں۔ میں اس سے پیشتر مارچ ۱۹۲۲ء کے عبرت میں ملابار کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ لکھ چکا ہوں۔ جنوری ۱۹۲۴ء کے معارف میں مولوی سید سلیمان صاحب ندوی ہندوستان میں اسلام کی اشاعت پر ایک دلچسپ اور مفید مضمون لکھ چکے ہیں جو اسلام کے ملابار میں شائع ہونے سے متعلق ہے اس وقت عبرت اور معارف کے دونوں مذکورہ پرچے بھی میرے سامنے موجود ہیں۔

جنوبی ہند بالخصوص ملابار میں آنحضرت صلعم کی بعثت کے وقت بدھ مذہب۔ برہمنی مذہب۔ یہودی۔ عیسائی۔ جینی۔ مجوسی۔ ہندوستان کے قدیم غیر آریہ سب موجود تھے انھیں میں عرب کے مشرکین اور صابی لوگوں کو بھی شامل کر لینا چاہیے جو سیکڑوں برس پیشتر سے ملابار کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے اور اس ملک میں بعض رہ بھی پڑے تھے اُس زمانے میں ملابار چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور یہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں حجاز و یمن و مسقط و فارس کے تاجروں کے ساتھ اپنے منافع کی وجہ سے نہایت نرمی اور رواداری کا سلوک روا رکھنے پر مجبور تھیں۔ ایک چھوٹے سے خطۂ ملک میں اس قدر کثیر التعداد مذاہب کا موجود ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شمالی ہند کی طرح ملابار میں مذہبی تعصب کا دور دورانہ تھا۔ اور حکومت کا مذہب بھی غالباً بودھ۔ برہمنی۔ غیر آریہ کا مرکب مذہب تھا مگر اُس کو بدھ مذہب کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حواری سینٹ طوما نے جنوبی ہند میں آکر میلا پور کے راجہ ساگا موس نامی کو عیسوی مذہب کا پیرو بنا لیا تھا جس کی وجہ سے یہ راجہ اپنی رعایا کے ہاتھ سے مقتول ہوا (دیکھو مختصر تاریخ چرچ) یہ بھی دلیل اس بات کی ہے کہ جنوبی ہند میں پہلے ہی سے ہر قسم کے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ عرب لوگ بعثت نبوی سے پہلے شمال کی جانب بحر اسود کے ساحل اور روس تک اور جنوب و مشرق میں ملابار، کارومنڈل، مدراس، جاوا، سماٹرا اور چین کے

ساحل تک بادبانی کشتیوں میں بیٹھکر بغرض تجارت جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے ایک صحابی کا مزار چین کے بندرگاہ کانٹن میں بیان کیا جاتا ہے جن کا نام وہب رضی اللہ عنہ ہے اور دوسرے صحابی عکاشہ رضی اللہ عنہ کا مزار محمود بندر میں اور تیسرے صحابی تمیم انصاری رض کا مزار مدراس سے بارہ میل جنوب کی جانب ساحل کولم (میلاپور) میں بتایا جاتا ہے۔ اگر عرب لوگ پہلے ہی سے ان دور دراز مقامات پر آمد ورفت نہ رکھتے ہوتے تو آنحضرت صلعم کے صحابہ رض ان مقامات پر جہاں اسلامی حکومت سیکڑوں برس بعد تک بھی نہیں پہنچی جاکر فوت نہ ہوتے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ

"پیش از ظہور اسلام و بعد از ظہور اسلام طائفہ یہود و نصاری برسم تجارت از راہ دریا بداں دیار آمد وشدی کردند و در آخر الامر میاں ملیباریاں و ایشاں بواسطہ منافع دنیوی الفتے بہم رسیدہ بعضے از بازرگانان یہود و نصاری در شہرہائے ملیبار ساکن شدہ منازل و بساطین ساختند"

مشہور مورخ لی بان فرانسیسی اپنی کتاب تمدن عرب میں لکھتا ہے کہ شروع اسلام میں

"عربوں نے تجارتی تعلقات کو بہت بڑی وسعت اور ترقی دی وہ بہت جلد ساحل کارومنڈل ملابار۔ سماٹرا۔ جزائر بحر ہند کو طے کرتے ہوئے جنوبی چین تک پہنچ گئے"

چونکہ عربوں کی آمد ورفت پہلے ہی سے ملابار میں تھی لہذا آنحضرت صلعم کی بعثت کا حال ملابار میں آنحضرت صلعم ہی کے زمانے میں لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا۔ اُس زمانے میں ملابار کا راجہ زمورن یا سامری کے نام سے مشہور تھا جو خاندان پلوبا یا پلوبا یا لوبا یلاوا سے تعلق رکھتا تھا۔ اس راجہ نے معجزہ شق القمر کو دیکھکر اس عجیب واقعہ کے متعلق تحقیق و تفتیش شروع کی اور اس واقعہ کو بطور یادداشت سرکاری روزنامچہ میں درج کرایا۔ بالآخر اُس کو معلوم ہوا کہ عرب کے ملک میں ایک پیغمبر پیدا ہوئے ہیں اُنہوں نے یہ معجزہ دکھایا ہے۔ یہ سن کر راجہ نے اسلام قبول کر لیا اور تخت سلطنت اپنے ولی عہد کو سپرد کرکے خود کشتی میں سوار ہو کر ملک عرب کی جانب روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں فوت ہو کر ساحل ملک یمن میں مدفون ہوا۔ راجہ کا یہ سفر چونکہ عام اطلاع کے بغیر پوشیدہ طور پر عمل میں آیا تھا لہذا لوگوں نے راجہ کے اس طرح غائب ہوجانے کی حقیقت کو نہ سمجھا۔ انہیں ایام میں کچھ مسلمان تاجر سراندیپ میں آئے اور اسلام کا پیغام ساتھ لائے جن عربوں نے اس جزیرہ میں تجارتی ضرورتوں کے سبب بود و باش اختیار کرلی تھی اول وہ مسلمان ہوئے اور پھر بہت جلد جزیرہ میں اسلام پھیلنے لگا حتی کہ سراندیپ کا راجہ بھی مسلمان ہوگیا اور اپنے آپ کو خلافت اسلامیہ سے وابستہ کر لیا۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ سراندیپ کا راجہ خلافت راشدہ کے زمانے میں مسلمان ہو چکا تھا یا خلافت بنو امیہ کے ابتدائی زمانے میں مسلمان ہوا۔ بہرحال خلافت بنو امیہ کے ابتدائی زمانے میں

سراندیپ کا راجہ مسلمان تھا۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہر آئینہ حاکم سراندیپ پیشتر از رایان دیگر مواضع ہندوستان بر حقیقت اسلام مطلع شدہ در عہد صحابۂ کرامؓ مقلد قلادۂ شریعت مصطفوی گردیدہ بود"

ابن بطوطہ جب سراندیپ میں گیا ہے تو اُس نے وہاں شیخ عبداللہ بن حنیف شیخ عثمان اور بابا طاہر وغیرہ بہت سے اولیاء اللہ کے مزارات دیکھے۔ سراندیپ کے بعد ہی لکادیپ۔ مالدیپ اور ملابار میں اسلام پھیل چکا تھا۔ ملابار میں اسلام نے اس لیے اَور بھی جلد جلد ترقی کی کہ اسلام کی مساوات و رواداری ذات پات کی قیود کو دور کرکے مظلوم و مغلوب لوگوں کے لیے ابر رحمت اور سامان ترقی تھی۔ جس زمانے میں محمد بن قاسم اپنی فوج لے کر سندھ میں داخل ہوا ہے اُس سے بہت پہلے ملابار میں مسلمانوں کی آبادی موجود تھی اور خود محمد بن قاسم کے حملے کا سبب تلاش کرنے میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سراندیپ و ملابار میں مسلمان پہلے سے آباد تھے کیونکہ جن جہازوں کو راجہ داہر کے آدمیوں نے لوٹا تھا یہ جہاز سراندیپ کے راجہ کے تحائف اور اُس علاقے کے عازمان حج کی ایک تعداد لیے ہوئے خلیج عمان کی طرف آرہے تھے اور انہیں جہازوں کا واقعہ محمد بن قاسم کے سندھ میں آنے کا سبب ہوا تھا۔ محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے بعد صوبۂ سندھ ممالک اسلامیہ میں داخل ہو چکا تھا اور سندھ سے آگے مسلمانوں کی فوجی پیشقدمی رک گئی تھی مگر ملابار اور جنوبی ہند میں مسلمان تاجروں۔ مناّدوں۔ درویشوں اور سیاحوں کے ذریعہ اسلام برابر ترقی کر رہا تھا اُدھر وسط ہند یعنی ملک مالوہ میں سندھ کے مسلمانوں کی ہمسائگی کا یہ اثر تھا کہ مالوہ کا راجہ مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا اور مسلمان سیاحوں کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتا تھا۔ جیسا کہ سلیمان سیرافی نے تیسری صدی ہجری کے ابتدا اور ابوزید سیرافی نے تیسری صدی ہجری کے وسط میں بالتصریح بیان کیا ہے کہ مالوہ اور ملیبار کے راجہ مسلمانوں کے ساتھ اخلاق و مروت سے پیش آتے ہیں۔

دوسری صدی ہجری میں چند مسلمان عراق عرب کے رہنے والے کشتی میں سوار ہو کر خلیج فارس سے اس لیے روانہ ہوئے کہ جزیرہ سراندیپ میں جا کر اُس مقام کو دیکھیں جہاں آدم علیہ السلام کے قدم کا نشان بتایا جاتا ہے نیز سراندیپ کے راجہ سے ملاقات کریں جو مسلمان سیاحوں کی خوب خاطر مدارات بجالاتا ہے اتفاق سے یہ کشتی راستے میں طوفان سے دوچار ہو کر ملابار کے بندرگاہ کالی کٹ میں پہنچی کالی کٹ ملابار کا حاکم نشین شہر تھا۔ ان طوفان زدہ مسافروں کا حال سُن کر ملابار کے راجہ نے اپنے پاس بُلایا اور مذہب اسلام کے متعلق بہت سے سوالات کرکے دلجمعی حاصل کی نیز انھیں سیاحوں کے

ہاتھ پر اسلام قبول کر کے اپنے اسلام کو مصلحتاً پوشیدہ رکھا اور ان سیاحوں سے باصرار اقرار لیا کہ سراندیپ کی سیر سے فارغ ہو کر اسی طرف کو آئیں گے اور ملکر جائیں گے۔ عجائب الاسفار کی روایت کے موافق اُس زمانے میں جو راجہ ملابار میں حکمراں تھا اُس کا نام چیرامن پیرومل تھا اُس نے ان مسلمان سیاحوں کے ساتھ حسنِ اخلاق اور تکریم و تعظیم کا برتاؤ کیا۔ امیر قافلہ نے راجہ کو معجزۂ شق القمر یاد دلایا جس کی شہادت خود اُسی کے ایک بزرگ کی تحریری یادداشت میں موجود تھی پھر حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت اور حالات بیان کرنے کے بعد اسلام کی حقیقت اُس کو سمجھائی راجہ پر اس تقریر و تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ وہ فوراً مسلمان ہو گیا اور خانہ کعبہ کی زیارت کے شوق نے اپنے بزرگ راجہ زمورن یا سامری کی تقلید میں اُس کو مجبور کیا کہ سفر حجاز کے تہیہ میں مصروف ہو۔ چنانچہ اُس نے ملک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اپنے معتمد سرداروں کو تقسیم کر دئے۔ جو سردار سب سے زیادہ معتبر اور راجہ کا رازدار تھا اُس کو دارالسلطنت کا مہتمم اور باقی سرداروں کا سرپرست و نگراں مقرر کیا اور خود گوشہ نشین ہو کر تہیۂ سفر میں مصروف ہوا۔ سامان سفر کی درستی کے بعد پوشیدہ طور پر جہاز میں سوار ہو کر حجاز کی طرف روانہ ہو گیا اسی سفر میں اس کو سفر آخرت پیش آیا اور اپنے ملک میں واپس آنا میسر نہ ہوا۔ مرتے وقت اُس نے اپنے رفیقوں کو وصیت کی کہ ملابار میں تبلیغ اسلام کے کام کو پوری مستعدی اور وسیع پیمانہ پر جاری کیا جائے۔ ساتھ ہی اُس نے اپنے نائب السلطنت کے نام بھی اسی مضمون کا ایک خط لکھدیا۔ چنانچہ شرف بن مالک۔ مالک بن دینار اور مالک بن حبیب وغیرہ راجہ کے اس خط کو لیکر ملابار واپس آئے اور راجہ مرحوم کے نائب کی خدمت میں جو دارالسلطنت کا والی تھا پیش کیا اُس نے ان عربوں کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کیا اور ملک کے تمام سرداروں کو راجہ کے خط کا مضمون لکھکر بھیجا۔ اس راجہ کے متعلق اکثر ملاباریوں کا یہ خیال قائم ہوا کہ وہ زندہ آسمان پر چلا گیا ہے اور آسمان سے پھر واپس آکر ملابار میں حکومت کریگا مسلمانوں کو ملابار میں ہر قسم کی امداد و حمایت میسر ہوئی اور راجہ کی قوم کے آدمی بکثرت اسلام میں داخل ہوئے۔ مالک بن دینار اور مالک بن حبیب نے کدنکلور (کالیکٹ) میں مسجد تعمیر کی اس کے بعد کل ملابار کا دورہ کیا جابجا لوگ اسلام میں داخل ہوے اور مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ ان اسلامی منادوں نے صرف ملابار ہی تک اپنی تبلیغ کو محدود نہیں رکھا بلکہ ساحل کارومنڈل میں بھی تبلیغی سلسلہ جاری کیا اور وہاں بھی بہت سی مسجدیں تعمیر کیں سفرنامہ ابن بطوطہ اور تحفۃ المجاہدین کی روایت کے بموجب ان عرب مبلغین کی بنائی ہوئی مسجدوں میں سے چھٹی صدی ہجری تک مندرجۂ ذیل مقامات کی مسجدیں موجود تھیں (۱) کالیکٹ (۲) کولم یا کولن (۳) ہیلی (۴) سری کنداپورم (۵) درمہ پٹن (یہاں کا حکمراں بھی مسلمان ہو گیا تھا) (۶) فندرینہ یا پیداراانی (۷) چالیام یا پدپٹن (۸) چالیات (۹) ضاکنور یا رکور (۱۰) منگلور (۱۱)

کلنجر کوٹ (۱۲) کولم یہ مقام ساحل کارو منڈل پر واقع ہے۔ اسی مذکورہ واقعہ کو فرشتہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

"کچھ عربی اور عجمی لوگ بابا آدم کے قدم گاہ کی زیارت کے لیے کشتی میں سوار ہو کر سراندیپ کی طرف روانہ ہوئے اتفاقاً کشتی باد مخالف کے تھپیڑوں سے بلیبار پہنچی اور یہ لوگ شہر کدنکلور میں اُترے اُس جگہ کا حاکم موسوم بہ سامری عقل کامل اور اخلاق ستودہ سے متصف تھا ان لوگوں سے ملا اور ہر قسم کی باتیں درمیان میں آئیں یہانتک کہ اُن کا مذہب بھی دریافت کیا اُنھوں نے کہا ہم مسلمان ہیں اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے رسول ہیں سامری نے کہا کہ میں نے یہود و نصاری اور ہندوؤں سے جو تمھارے مذہب کے مخالف ہیں سُنا ہے کہ عرب اور روم و ایران و ترکستان میں یہ مذہب رواج پاگیا ہے لیکن ابھی تک مسلمانوں سے میں نے مسلمانوں کے مذہب کی نسبت دریافت نہیں کیا میری خواہش ہے کہ آپ کچھ حالات مجھکو اپنے رسول کے سنائیں اور اُن کے معجزات کا بھی حال بیان فرمائیں۔ اُن میں سے ایک نے آنحضرت صلعم کے حالات نہایت خوبی سے سُنائے اور سامری کے دل میں آنحضرت صلعم کی محبت پیدا ہو گئی اس کے بعد جب شق القمر کا تذکرہ کیا تو سامری نے کہا کہ یہ معجزہ تو بہت ہی قوی ہے۔ ہمارے ملک کا دستور ہے کہ جب کوئی عظیم الشان واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو ارباب قلم اُس کو دفتر میں لکھ لیتے ہیں اور میرے بزرگوں کے تمام دفاتر موجود ہیں میں اُن دفتروں اور رجسٹروں کو ابھی ملاحظہ کرتا ہوں چنانچہ آنحضرت صلعم کے زمانے کے رجسٹر نکالکر مطالعہ کیے تو اُن میں لکھا ہوا تھا کہ فلاں تاریخ چاند دو ٹکڑے ہو کر پھر مل گیا۔ یہ دیکھکر سامری پر دین اسلام کی صداقت ظاہر ہو گئی اور وہ کلمہ شہادت پڑھکر مسلمان ہو گیا۔ چونکہ اپنی قوم کے سرداروں سے ڈرتا تھا اس لیے اپنے اسلام کو مخفی رکھکر مسلمانوں کو بھی اظہار سے منع کر دیا اور اُن لوگوں پر احسان و انعام کرکے درخواست کی کہ بعد زیارت قدمگاہ اسی طرف کو آئیں جب وہ لوگ واپس آئے تو اُن سے کہا کہ زر و مال لیکر سامان سفر مہیا کرو میں بھی تمھارے ہمراہ چلونگا۔ پھر ایک روز تمام ارکان دولت کو جمع کرکے جلسہ کیا اور کہا کہ مجھکو عبادت الٰہی کا شوق ہے میں چاہتا ہوں کہ تنہا ایک گوشہ میں رہوں اور کوئی شخص میرے پاس نہ بھٹک سکے لہذا میں انتظام کے لیے ایک دستور العمل بنائے دیتا ہوں تمکو چاہیے کہ اسی پر عامل رہو ......"

ان تمام باتوں کے ساتھ ہی یہ تصور بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جنوبی ہند کی طرح بحر الکاہل کے جزیروں جاوا و سماٹرا و سنگاپور و ملایا وغیرہ میں بھی اسی طرح اسلام شائع ہوا تھا۔ اس واقعہ مذکور کے سو برس بعد تک اسلام اپنے اثر و رسوخ کو استوار و وسیع کرتا رہا۔ سندھ میں ملتان و منصورہ کی دو مسلمان ریاستیں قائم تھیں اور اُن کے اخلاقی اثر سے مالوہ کی ہندو ریاست یہاں تک متاثر ہو چکی تھی کہ وہاں کے راجہ

مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی طویل العمری کا سبب جانتے تھے ملک ملابار کی مجموعی آبادی میں سوال حصہ مسلمان آبادی تھی۔ ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صاحب نے اپنی تاریخ ہند میں شنکر اچارج کی پیدائش کا زمانہ سنہ ۹۱۲ء کے قریب کا زمانہ بتایا ہے جو سنہ ۳۰۰ھ کے قریب کا زمانہ ہے یعنی یکم محرم سنہ ۳۰۰ھ مطابق ۱۲ ستمبر سنہ ۹۱۲ء کے۔ اسی زمانے میں مشہور مورخ اور سیاح مسعودی بغداد سے ہندوستان آیا پس مسعودی کے ہندوستان میں آنے اور شنکر اچارج کے ملابار میں پیدا ہونے کا زمانہ قریب ہی قریب ہے مسعودی اپنے سفرنامہ موسومہ مروج الذہب میں ملتان ومنصورہ کی مسلم ریاستوں کا مفصل ذکر کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ ملتان میں ہندوؤں کو اپنے مندروں میں پوجا پاٹ کی مراسم ادا کرنے کی عام اجازت اور آزادی حاصل ہے نیز راجہ بلہرا یعنی ملک مالوہ کے راجہ کی نسبت لکھتا ہے کہ "اس راجہ کی حکومت میں مسلمانوں کی بڑی عزت ہی یہاں کے بادشاہ چالیس چالیس اور پچاس پچاس سال حکومت کرتے ہیں یہاں کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اسی عدل وانصاف اور مسلمانوں کی عزت کرنے کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہیں۔ گجرات کا راجہ مسلمانوں سے نفرت کرتا ہے دکن کا راجہ بھی مسلمانوں کی عزت کرتا ہے" مسعودی سنہ ۳۰۴ھ میں کالیکٹ ملک ملابار میں آیا ہے وہ کہتا ہے کہ یہاں سیراف عمان۔ بصرہ اور بغداد وغیرہ کے بہت سے مسلمان آباد ہیں جنہوں نے یہیں کے باشندوں میں شادی بیاہ کرکے سکونت اختیار کر لی ہے ان کی تعداد دس ہزار ہے۔ ان میں بعض مشہور تاجر ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کا رئیس ابوسعید معروف بن زکریا ہے۔ اب غور کرنے اور سوچنے کی بات یہ ہی کہ اسی ملک ملابار اور اسی زمانے میں شنکر اچارج پیدا ہوتا ہے۔ شنکر اچارج کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ملابار کے ایک برہمن کا بیٹا تھا شنکر اچارج کی ماں شری مہادیوی کی نسبت مرقوم ہے کہ وہ کسی شرمناک گناہ کے سبب برادری اور ذات سے خارج کر دی گئی تھی اور اسی لیے مہادیوی کی وفات پر اس کے جلانے کے لیے شنکر اچارج کو کسی نے آگ بھی نہ دی (دیکھو کیرل اُتپتی) بودھ مذہب ابتدا ہی اپنے اصولوں کی وجہ سے ذات پات کے قیود کو دور کرنا چاہتا تھا مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ بودھ مذہب کی حالت بالکل بگڑ چکی تھی اور جس کا افسوس شنکر اچارج سے تین چار سو برس پہلے چینی سیاح اپنے سفرنامے میں کر چکا تھا ملابار میں یہ تغیر اور بھی زیادہ قوی تھا اور عام طور پر وہاں کے ہندو بودھ مذہب ہی کے زیادہ پیرو تھے اور بتوں کی تکریم و پرستش اُن کا عین مذہب بن چکا تھا شنکر اچارج کے دل پر اس واقعہ کا کہ اُس کی ماں مہادیوی کے پھونکنے میں کسی نے آگ تک بھی گوارا نہ کی کس قدر قوی اثر ہوا ہوگا اس کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ اُس کے ہم وطن بہت سے مسلمان بھی تھے جیسا کہ ابھی اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

شنکر اچارج کا اسلامی مساوات اور رواداری سے باخبر اور متاثر ہونا بالکل یقینی بات ہے ملابار میں مسلمانوں کا بُت پرستی کے خلاف دلائل بیان کرنا اور توحید کا وعظ کہنا سب سے پہلا اور ضروری کام تھا۔
شنکر اچارج کا بودھوں اور بودھوں کی بُت پرستی کے خلاف جہاد پر آمادہ ہوجانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ ملابار یا دکن میں رہکر بُت پرستی کے خلاف وعظ کہنا بودھ مذہب کو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا جو مسلمان واعظوں کے ذریعہ اُس کو پہنچ رہا تھا یا پہنچ چکا تھا بُدھ مذہب کی جو جگہ خالی ہوتی تھی وہ اسلام سے پُرہوتی تھی یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص بُدھ مذہب یعنی بُت پرستی کو چھوڑ دے اور پھر اسلام کے سوا اور کسی مذہب کو قبول کرے لہذا شنکر اچارج نے ملابار سے شمالی ہند کی طرف توجہ کی۔ وہ نوجوانی کے عالم میں ملابار سے چلدیا کیونکہ وہاں اُس کے لیے میدان عمل بالکل تنگ تھا۔ اُس نے بنارس میں پہنچکر پنڈتوں سے مباحثہ کیا اور بُت پرستی کے معاملہ میں اُن کو شکست فاش دی پھر وہ اکثر راج دھانیوں اور مشہور شہروں میں اپنے جدید اور نئے عقیدہ کی تلقین کرتا ہوا پھرا۔ شنکر اچارج کے پاس بت پرستی کی تردید میں سب سے زبردست دلائل وہی تھے جو اُس نے مسلمانوں سے سُنے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بودھ مذہب اپنے عقائد اور حکومت وطاقت کے اعتبار سے بہت کمزور ہوچکا تھا لہذا چند راجے اُس کے مُرید ہوگئے اور بودھ مذہب کے خلاف علانیہ کامیاب تحریک شروع ہوئی۔ شنکر اچارج ملابار میں پیدا ہوا تھا اور کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر فوت ہوا اُس کو شیو کا اوتار مانا گیا اور آج وہ موجودہ آریہ سماج فرقہ کا قابل تکریم بزرگ سمجھا جاتا ہے۔
شنکر اچارج کے زمانے میں اسلام برابر ہندوستان کے اندر ترقی کر رہا تھا۔ محمد بن قاسم کے حملہ کو دو سو سال گذر چکے تھے محمود غزنوی کی حملہ آوری میں ابھی سو برس باقی تھے۔ سندھ میں مسلمانوں کی دو ریاستیں موجود تھیں۔ مالوہ میں مسلمان موجود تھے۔ کنارا۔ ملابار۔ سراندیپ۔ میسور۔ مدراس وساحل کارومنڈل میں مسلمان موجود تھے۔ شنکر اچارج کو ان حالات اور مسلمانوں کے اعمال وعقائد سے آگاہی حاصل تھی مگر اُس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کچھ بھی کہنے کی جرات نہیں کی اور بُت پرستی کے خلاف کوشش کرکے بظاہر اسلام کے لیے زمین تیار کرنے کی خدمت انجام دی۔
اگر شنکر اچارج کا زمانہ نویں صدی عیسوی کا ابتدائی زمانہ فرض کیا جائے جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے تب بھی مسلمان ان مذکورہ تمام مقامات میں موجود تھے اور شنکر اچارج کو اسلامی تعلیمات سے واقف ہونے کا بخوبی موقع حاصل تھا۔ بہرحال اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی حدود میں اسلام مسلمانوں کے فوجی حملے سے پہلے پہنچکر کامیاب اور مقبول ہوچکا تھا۔

اسلام کی اشاعت بذریعہ تبلیغ صرف ملابار اور جنوبی ہند ہی میں نہیں ہوئی بلکہ سندھی قوموں میں بھی اسلام اُسی ابتدائی زمانے میں یعنی جنگی حملوں کے شروع ہونے سے پہلے مقبول ہو چکا تھا۔ جس زمانے میں مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان سلسلۂ جنگ جاری تھا اُسی زمانے میں ہندوستان کے جاٹ اپنا آبائی مذہب اور آبائی وطن چھوڑ چھوڑ کر اسلام اختیار کرنے اور عراق میں جا جاکر آباد ہونے لگے تھے۔ ان نومسلم جاٹوں کو عرب لوگ قوم زط کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ ایران کی سلطنت اور سندھ کی سلطنت کے درمیان کبھی لڑائی ہوتی تھی اور کبھی صلح۔ کبھی ایرانی دریائے سندھ تک کا علاقہ اپنے قبضے میں لے آتے اور کبھی سندھ کے حکمراں مکران کے پہاڑوں اور میدانوں تک پہنچ جاتے تھے۔ جس زمانے میں ایرانیوں اور مسلمانوں کی لڑائیاں شروع ہوئی ہیں اُس زمانے میں سندھ و ایران کے درمیان صلح تھی مگر اس سے پہلے ایرانی سلطنت کے صوبۂ حصیر کا گورنر ہرمز جنگی بیڑہ لیکر بار بار سندھ کے ساحل پر حملہ آور ہوتا رہا اور یہاں سے بہت سے آدمیوں کو پکڑ کر لے گیا تھا یہ لوگ سب جاٹ ہی تھے۔ یہ ہرمز حضرت خالد بن ولید کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ ہرمز کے پاس ایک بہت بڑی فوج انھیں اسیران جنگ جاٹوں کی فراہم ہو گئی تھی کیونکہ سندھی فوج میں بڑی تعداد جاٹوں ہی کی تھی جب مسلمانوں اور ایرانیوں میں جنگ شروع ہوئی تو سلطنت ایران نے سندھ کی سلطنت سے صلح کر لی اور ہرمز نے ان جاٹوں کو جو اسیران جنگ کی حیثیت سے اُس کے قبضے میں تھے اُن کی دلدہی اور خاطر مدارات بجا لاکر اپنی فوج میں بھرتی ہونے پر رضامند کر لیا ہرمز ایران کا سب سے بہادر اور لایق سردار سمجھا جاتا تھا اُس کی بہادری کی دھاک ایران و ہندوستان و عرب میں بیٹھی ہوئی تھی وہ بحری اور بری دونوں قسم کی لڑائیوں کا تجربہ کار اور اعلیٰ درجہ کا سیاست داں تھا۔ جاٹوں کی فوج ہرمز کی فوج کا وہ حصہ تھا جس کے ہر سپاہی کے پاؤں میں ایک زنجیر بندھی ہوئی تھی کہ میدان جنگ سے بھاگ نہ سکیں۔ اسی لیے اس لڑائی کا نام جس میں ہرمز مارا گیا جنگ ذات السلاسل مشہور ہے۔ پاؤں میں زنجیر باندھکر میدان جنگ میں معرکہ آرا ہونا سندھ کے جاٹوں میں پہلے سے رائج تھا۔ ان جاٹوں میں سے بہت سے زنجیریں توڑا کر بھاگ نکلے اور بہت سے مسلمانوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد زور شور سے ایرانیوں کے ساتھ سلسلۂ جنگ جاری ہوا۔ جنگ ذات السلاسل ۱۲ھ میں ہوئی اور پہلی مرتبہ ہندوستان کے جاٹ مسلمانوں کے قبضہ میں آئے اور پھر بخوشی مسلمان ہوکر بجائے قیدی کے آزاد مسلم کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس کے بعد حضرت خالد بن ولید تو شام کی طرف چلے گئے مگر ایرانیوں کے ساتھ سلسلہ جنگ جاری رہا جنگ ذات السلاسل عہد صدیقی کا واقعہ ہے۔ جنگ ذات السلاسل سے دو برس بعد ۱۴ھ میں جنگ قادسیہ ہوئی جس میں ایران کے بادشاہ نے پوری تیاری

اور پوری طاقت کے ساتھ مسلمانوں کو کچل ڈالنا چاہا۔ اس دو سال کے عرصہ میں ایرانی بار بار مسلمانوں سے شکست کھا چکے تھے اس لیے یزدجرد شاہِ ایران نے اپنے تمام صوبوں اور دوسرے بادشاہوں سے بھی مدد طلب کی اُس نے ایک سفارت سندھ میں بھی دوبارہ بھیجی۔ سندھ کے راجہ نے یہاں سے فوج روانہ کی لیکن سب سے بڑی اور قابل قدر مدد یہ تھی کہ اُس نے اپنے جنگی ہاتھی جس قدر بھیج سکتا تھا سب کے سب ایرانیوں کی مدد کے لیے معہ سامان حرب روانہ کیے اور اپنی خاص سواری کا ہاتھی بھی جو سفید تھا روانہ کر دیا۔ چچ نامہ میں لکھا ہے کہ سندھ کے راجہ کی سواری کا ہاتھی سفید رنگ کا ہوتا تھا۔ جنگ قادسیہ تین دن رات برابر جاری رہی اس لڑائی میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ جنگی ہاتھیوں کی قطار نے پریشان کیا تیسرے دن فیل سفید جو تمام ہاتھیوں کا سردار سمجھا جاتا تھا مارا گیا اور مسلمانوں نے ہاتھیوں کو بھگا یا پھر رستم کے مارے جانے پر کامل فتح حاصل ہوئی۔ سندھ کے راجہ نے اپنی خاص سواری کا ہاتھی تو اسی مرتبہ دوسرے ہاتھیوں کے ساتھ بھیجا تھا لیکن وہ اس سے پہلے بھی اپنے ہاتھی ایرانیوں کے پاس بھیج چکا تھا جنھوں نے دریائے فرات کے کنارے اسلامی لشکر پر بڑی آفت نازل کی تھی حضرت ابو عبید ثقفی اسلامی سپہ سالار کو ایک ہاتھی ہی نے شہید کیا تھا۔

جنگ قادسیہ اور جنگ نہاوند کے درمیانی زمانہ کا واقعہ ہے کہ اہواز کے ایرانی گورنر ہرمزان نے یزدجرد کے مدآین کی جانب فرار ہونے کے بعد اپنی ایک خود مختار حکومت قایم کرلی اور ایرانیوں کے علاوہ جاٹوں کو بھی اپنی فوج میں بھرتی کیا اور سندھ کے راجہ سے اعانت طلب کی اسلامی لشکر نے اُس طرف توجہ کی مقابلہ ہوا ہرمزان شکست کھا کر مقام تستر میں پہنچا وہاں کے قلعہ کو مضبوط کر کے دوبارہ مقابلہ کی تیاری کی تستر کی جانب جو اسلامی فوج روانہ ہوئی اُس کے سپہ سالار حضرت ابو موسیٰ اشعری تھے انھوں نے تستر کا محاصرہ کیا۔ اس محاصرہ کے دوران میں سندھی فوج یعنی جاٹوں کے سرداروں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم تمھارے مذہب میں داخل ہونا چاہتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم تمھارے ساتھ شامل ہو کر ایرانیوں سے تو لڑیں گے لیکن اگر تم کسی وقت آپس میں دو گروہ ہو کر لڑنے لگو تو ہم غیر جانب دار رہیں گے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر عرب لوگ ہم پر حملہ کریں تو تم ہم کو اُن کے حملے سے بچاؤ گے اور ہماری حفاظت کرو گے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ہم کو اختیار حاصل ہوگا کہ ہم جہاں چاہیں سکونت اختیار کریں اور عربوں کے جس قبیلہ سے چاہیں اتحاد کریں۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ ہمارے وظائف اور تنخواہیں اعلیٰ درجہ کی ہوں یعنی ہم کو عربوں کے مانند ہر قسم کے حقوق میسر ہوں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم تو نو مسلموں کے معاملہ میں یہی جانتے ہیں کہ ہر ایک نومسلم کے حقوق باقی تمام مسلمانوں کی برابر ہوا کرتے ہیں۔ یہ مختصر اور

مجمل جواب جاٹوں کے لیے موجب تسکین نہ ہوا اور وہ مسلمان ہونے سے باز رہے۔ اس کی اطلاع فوراً امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضؓ کے پاس بھی بھیجی گئی تھی انھوں نے بلا تامل حکم بھیجدیا کہ ان لوگوں کے پیش کردہ شرائط قبول کر لیے جائیں۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ نے جاٹوں کے پاس پیغام بھیجا کہ تمھاری تمام شرطیں ہمکو منظور ہیں دربار خلافت سے ہم نے منظوری منگالی ہے۔ یہ سنتے ہی تمام جاٹ اور تھوڑے سے راجپوت بھی جو ان کے ہمراہ تھے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوگئے۔ ہرمزان بھی گرفتار ہوا اور حضرت ابو موسیٰؓ نے اس کو مدینہ منورہ میں فاروق اعظم کے پاس بھیجدیا جو وہاں جاکر اور فاروق اعظم رضؓ کا طرز عمل دیکھکر بخوشی مسلمان ہوگیا۔ ان جاٹوں نے مسلمان ہو کر اور اپنے اُن بھائیوں کے ساتھ مل کر جو ۱۲ھ میں مسلمان ہو چکے تھے ملک عراق میں سکونت اختیار کی اور عرب قبائل کے ساتھ دوستی و مواخاۃ قائم کرلی۔ یہ لوگ قوم زط کے نام سے مشہور ہوئے۔ مسلمانوں نے اپنے ان نو مسلم بھائیوں کی بڑی عزت کی اور ان کو بڑے بڑے عہدے بھی دئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں بصرہ کے خزانہ کا محافظ دستہ اسی قوم زط (جاٹ) کے افراد پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں میں بڑے بڑے علما اور صلحا بھی پیدا ہوئے اس زط قوم کا تذکرہ تاریخوں میں بار بار آیا ہے حتی کہ معتصم باللہ عباسی کے زمانے تک زط قوم کو عراق میں قابل تذکرہ اہمیت حاصل تھی۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جو امام اعظم کے نام سے عالم اسلام میں عام شہرت رکھتے ہیں اُن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اسی قوم زط سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رح ۸۰ھ میں پیدا ہوئے جس وقت محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا ہے اُس وقت امام اعظم کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ مذکورہ بالا تصریحات سے ثابت ہوا کہ ہندوستانی قوموں میں اسلام محمد بن قاسم کے زمانے سے پہلے ہی داخل ہو کر نشو و نما حاصل کر چکا تھا۔

(۷) اسلام کی آمد کے وقت ہندوستان میں کونسا مذہب رائج تھا

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اسلام سب سے پہلے محض تبلیغ کے ذریعہ نہایت پُر امن طریقہ سے سراندیپ و مالابار میں داخل ہوا اور اُسی زمانے میں سندھ کے جاٹ مسلمان ہو ہو کر عراق عرب میں سکونت اختیار کر چکے تھے ۱۲ھ کے بعد ہی سندھ کے جاٹ ترک وطن اختیار کرتے اور عراق میں مسلمان ہو ہو کر اپنے ہم قوم زطوں میں شامل ہوتے رہے کیونکہ اس زمانے میں سندھ کے راجہ ساہسی کی حکومت میں بھی ایرانیوں کی شکست اور سندھ

کی افواج کے مقتول و دستگیر ہونے سے اختلال پیدا ہو گیا تھا۔ راجہ ساہ سی کا خاندان قدیم سے بودھ مذہب کا پیرو تھا اور بودھ ہی تمام ملک کا مذہب تھا۔ ساہ سی اپنے خاندان کا آخری راجہ تھا سنہ ۱۰ھ میں ساہ سی کے بعد سندھ کے تخت پر چچ نامی ایک شخص نے قبضہ کیا۔ اس کے زمانے میں مسلمانوں کی حملہ آوری کے بعض اسباب پیدا ہو گئے تھے جن کا ذکر ابواب کتاب میں موجود ہے۔ اسی راجہ چچ کا بیٹا راجہ داہر تھا جس کے عہد حکومت میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور راجہ مارا گیا۔ ہمکو اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ ابتدائے سنہ ہجری سے سنہ ۹۳ھ تک ہندوستان کی مذہبی حالت کیا تھی کیونکہ سنہ ۹۳ھ تک اسلام محض تبلیغ کے ذریعہ ہندیوں میں رسوخ حاصل کرتا رہا اور سنہ ۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے حملہ کیا جو مسلمانوں کی پہلی قابل تذکرہ چڑھائی سمجھی جاتی ہے اس بات کی تحقیق میں ہمکو سب سے پہلے چینی سیاح ہیونگ شیانگ کے سفرنامہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے یہ سیاح سنہ ۵۹۶ء میں ملک چین کے اندر پیدا ہوا۔ اُس کا خاندان بہت ذی عزت تھا وہ بچپن سے تحصیل علوم میں مصروف رہا اور چونتیس سال کی عمر میں علامۂ زماں اور چین کا سب سے بڑا عالم شمار ہونے لگا۔ اس کے بعد سنہ ۶۲۹ء مطابق سنہ ۸ھ میں وہ اپنے ملک سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا اُس نے یہ سفر ہندوستان کے بدھ علماء سے ملنے اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے اختیار کیا تھا وہ ہندوستان میں پندرہ سال یعنی سنہ ۶۴۵ء مطابق سنہ ۲۳ھ تک رہا وہ کابل ہوتا ہوا قندھار اور قندھار سے ہندوستان میں داخل ہوا اُس کے ہندوستان میں داخل ہونے کے وقت سندھ کا راجہ ساہ سی حکمراں تھا اور ہندوستان سے روانگی کے وقت راجہ چچ سندھ کا فرمانروا بن چکا تھا۔ جس زمانے میں جاٹوں کی ایک جمعیت نے اسلام قبول کر کے عراق میں سکونت اختیار کی تھی اُس زمانے میں ہیونگ شیانگ ہندوستان میں دورہ کر رہا تھا اور جس زمانے میں سراندیپ کے راجہ نے اسلام قبول کیا ہے اُس زمانے میں بھی ہیونگ شیانگ ہندوستان میں موجود تھا۔ اس چینی سیاح نے پندرہ سال کے عرصہ میں ہندوستان کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ایک دوسری روایت کے موافق جس کو مولوی ذکاءاللہ صاحب نے اپنی تاریخ میں اختیار کیا ہے ہیونگ شیانگ بیس سال یعنی سنہ ۲۵ھ تک ہندوستان میں رہا۔ وہ پنجاب و گجرات سے بنگال واڑیسہ تک اور کوہ ہمالیہ سے میسور و مہاراشٹر تک پھرا اور بعض مقامات پر اُس کو دو دو مرتبہ بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ اُس کا مقصد سفر ہی مذہبی عالموں سے ملنا تھا اُس نے اپنے سفرنامے کو خوب شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے پس ہیونگ شیانگ کا سفرنامہ ہمارے پیش نظر مقصد کے پورا کرنے میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہیونگ شیانگ کی گواہی پیش کی جائے یہ بات بتا دینی ضروری ہی کہ بودھ مذہب نے

ہندوستان میں رائج ہوکر قدیم برہمنی مذہب کو درہم برہم کرڈالا تھا اور ذات پات کی قیود بھی بہت کمزور اور ڈھیلی پڑچکی تھیں اشوک کے زمانے میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دوسو پینسٹھ (۲۶۵) سال پیشتر ہندوستان کا فرماں روا تھا بدھ مذہب کو انتہائی عروج حاصل ہوچکا تھا۔ اشوک نے پتھر کے ستونوں پر جو بودھ مذہب کے احکام کندہ کرائے تھے اور جو آج تک بھی پتھر کی ان لاٹھوں پر موجود ہیں اُن میں علاوہ اور احکام کے تین احکام یہ ہیں (۱) پانچویں سال سب لوگ اپنے گناہوں کا کفارہ دیا کریں (۲) دوسرے مذہب والوں کو تکلیف نہ دی جائے (۳) صلح و آشتی اور محبت بڑھانے کی تاکید کی جائے اور سخت سزائیں نہ دی جائیں۔ مہاراجہ اشوک کے بعد بودھوں کی شہنشاہی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں یا ریاستوں میں منقسم ہوگئی تھی اور بودھ کی اصلی تعلیمات بگڑ کر دوسری صورت اختیار کرچکی تھیں بودھوں میں بہت سے مذہبی فرقے پیدا ہوچکے تھے۔ ہر ایک فرقہ کے عقائد اور عبادات دوسرے فرقے کے عبادات و عقائد سے مختلف تھے۔ جس زمانے میں ہیونگ سنیانگ ہندوستان میں آیا ہے اُس زمانے میں تو سب سے زیادہ اعمال و عبادات و اخلاق بگڑ جانے لازمی تھے کیونکہ اشوک کے زمانے کو نوسو برس اور بودھ کے زمانے کو قریباً بارہ سو برس گذر چکے تھے۔ بودھ مذہب اپنی اصلی صورت سے اگرچہ بہت کچھ متغیر اور مسخ ہوچکا تھا لیکن اُس کا نام بدھ مذہب ہی تھا اور اُس کے ماننے والے گوتم بدھ اور دوسرے بدھ پیشواؤں کا نام عزت سے لیتے تھے اعمال و عبادت کے اعتبار سے چاہے اس زمانے کے مذہبی فرقوں میں برہمنی مذہب کی بھی بعض باتیں داخل ہوچکی ہوں مگر ان فرقوں کو برہمنی مذہب کے فرقے نہیں کہا جا سکتا اشوک کی لاٹھوں کے مذکورہ بالا دوسرے اور تیسرے حکم سے ثابت ہے کہ بدھوں کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی ہندوستان کے اندر دوسرے مذہب کے لوگ موجود تھے اور بدھ ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کرتے تھے چنانچہ برہمنوں اور ہندوؤں کے دعوے کے موافق بنارس۔ الہ آباد۔ قنوج۔ اجمیر میں برہمنی مذہب کے پیرو ضرور مسلسل موجود رہے اور غالباً انھیں کی نسبت اشوک کو یہ حکم کندہ کرانا پڑا تھا کہ غیر مذہب والوں کو تکلیف نہ دی جائے ظاہر ہے کہ ان برہمنی مذہب کے پیرؤوں کی مصاحبت و مقاربت نے بدھوں پر اور بدھوں کی صحبت نے ان پر ضرور اثر ڈالا ہوگا اور اس اثر کو بدھ مذہب کے نئے نئے فرقوں کے پیدا ہونے میں بھی ضرور دخل ہوگا لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں برہمنی مذہب رائج تھا اور بدھ مذہب رائج نہ تھا۔ انگریز مورخین نے بدھ مذہب کے اس آخری زمانے کو بدھسٹ یا بدھ نما لوگوں کا زمانہ کہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اچھے الفاظ میں اس زمانے کو لامذہبی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ گوتم بدھ کی تعلیمات بہت کچھ مسخ ہوچکی تھیں۔ ویدوں کے مذہب کا زمانہ تو منوجی مہاراج ہی کے زمانے

میں ختم ہو چکا تھا۔ کرشن مہاراج کی تعلیمات اور گیتا وغیرہ بھی مسخ ہو چکی تھیں۔ پوران ابھی تصنیف ہی نہیں ہوئے تھے کیونکہ پورانوں کی تصنیف کا زمانہ آٹھویں صدی عیسوی کے بعد کا زمانہ ہے جبکہ سندھ پر اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ لہذا محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے وقت ہندوستان کے مذہب کا اگر کوئی نام رکھا جا سکتا ہے تو وہ بدھ مذہب ہی ہو سکتا ہے۔ اب ہیونگ شیانگ کے سفرنامے پر غور کرو وہ کہتا ہے کہ بدخشاں و بلخ و کابل میں تو بودھوں کی حکومت اور بودھوں کا مذہب رائج ہے لیکن قندھار و بلوچستان میں آتش پرستی یعنی مجوسی مذہب پایا جاتا ہے پھر وہ کشمیر پنجاب۔ سندھ۔ گجرات۔ مالوہ۔ متھرا۔ تھانیسر۔ قنوج۔ بنارس۔ پٹنہ۔ بہار۔ بنگال۔ کامروپ (آسام) اڑیسہ۔ کلنگا (مدراس) اندھرا۔ مہاکوسلا (ممالک متوسط) مہاراشٹر۔ کوکن۔ مدورا (ٹراونکور) وغیرہ سب جگہ کا ذکر کرتا ہے ہر جگہ اُس کو اپنے ہم مذہب راجا ملتے ہیں اور اُس کو ایک جاتری سمجھکر بڑی عزت اور خاطر مدارات سے پیش آتے ہیں نالند کی خانقاہ میں وہ سیکڑوں ودیارتھی اور پاٹھک دیکھتا ہے وہاں وہ بطور تبرک خود بھی طلبا کے ساتھ شامل ہو کر ایک دو سبق پڑھتا ہے اور کوئی بے دین مخالف (برہمنی مذہب کا پیرو) مباحثہ کرنے کے لیے چیلنج دیتا ہے تو ہیونگ شیانگ اُس کے مقابلہ کو نکلتا اور اُس کی اس شرط کو قبول کر لیتا ہے کہ جو شخص مباحثہ میں ہار جائے وہ فتحمند فریق کے ہاتھ سے مارا جائے لیکن ہیونگ شیانگ اپنے حریف برہمن کو ہرا دیتا ہے اور پھر بجائے قتل کرنیکے اُس کو یہ کہکر چھوڑ دیتا ہے کہ ہم انسان کو قتل نہیں کیا کرتے تم آیندہ سوچ سمجھکر کسی سے مباحثہ کرنا۔ ہیونگ شیانگ اپنے سفرنامے میں بار بار ڈاکوؤں کے پنجے میں گرفتار ہونے کا ذکر کرتا اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک سفر کرتے ہیں کئی کئی مرتبہ ڈاکوؤں سے دوچار ہوتا ہے۔ ان ڈاکوؤں کو وہ ہمیشہ کافر اور بے دین لوگ بتاتا ہے اُس نے اپنے سفرنامے میں کسی پہاڑی، چھوٹی سی ریاست یا گاؤں کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کے حاکم کو کافر و بے دین کہا ہے حالانکہ وہ برہمنی مذہب کا پیرو اور بدھ مذہب کا مخالف تھا ہیونگ شیانگ جیسے مذہبی شخص سے یہی توقع بھی ہو سکتی تھی کہ وہ غیر بودھ لوگوں کو کافر کے نام سے یاد کرے چنانچہ اُس نے قندھار والوں کو بھی جو آتش پرست تھے اسی نام سے یاد کیا ہے۔ پس اس بات کے تسلیم کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ ہیونگ شیانگ کو جو ہر صوبے اور ہر علاقے میں ڈاکو ملے وہ سب کے سب برہمنی مذہب کے لوگ تھے اور انھوں نے بدھوں کی ریاستوں میں یہ دیکھکر کہ یہ لوگ کسی شخص کو جان سے نہیں مارتے ڈاکہ زنی اور رہزنی شروع کر دی تھی۔ یہ زمانہ ضرور ایسا تھا کہ ہندو یعنی برہمن لوگ بودھوں کی سلطنت کو مٹا کر اپنی حکومتیں

قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن ابھی تک اُن کو کوئی نمایاں اور قابل تذکرہ کامیابی حاصل
نہیں ہوئی تھی۔ الہ آباد یعنی پریاگ کی چھوٹی سی ریاست کا حاکم بھی برہمن تھا لیکن وہ قنوج کے
راجہ کا محکوم اور نوکر تھا اسی لیے ہیونگ سیانگ اُس کی نسبت وہ خطاب استعمال نہیں کرتا جو دوسرے
ہندوؤں کی نسبت استعمال کرتا ہے۔ وہ قنوج۔ مہاراشٹر۔ مالوہ۔ گجرات۔ کشمیر۔ اودھ۔ بہار۔
بنگال۔ اڑیسہ۔ دکن۔ میسور وغیرہ سب ملکوں کے راجاؤں کو صاف الفاظ میں بودھ مذہب کا
پیرو بتاتا اور ہر جگہ بودھ کے مندروں میں عبادت کرتا۔ اور گوتم بدھ کے تبرکات موجود پاتا ہے
ہندوستان کے ہر حصّے اور ہر گوشے میں اُس نے بودھ کے بڑے بڑے عظیم الشان اور مرصّع بت
دیکھے جن کی مندروں میں خوب دھوم دھام سے پوجا ہوتی تھی اُس نے کوئی گھر ہندوستان میں بودھ
کی مورتیوں سے خالی نہیں دیکھا جو اس بات کی دلیل ہے کہ اُس زمانے میں بودھ مذہب کے
پیرو گوتم بودھ کی مورت کو پوجتے تھے اور بودھوں میں بُت پرستی عام ہوگئی تھی اور غالباً اسی لیے
ہر ایک پتھر یا لکڑی کے مجسمے کو بت (بودھ) کہا جانے لگا۔ اُس زمانے میں قنوج کے راجہ سلادت
دوم (راجہ ہرش) کو ہندوستان بھر کے تمام راجہ اپنا شہنشاہ مانتے اور اُس کے احکام کی تعمیل کو
ضروری جانتے تھے صرف مہاراشٹر (دکن) کا راجہ اُس کی شہنشاہی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے آپ کو
دکن کے راجاؤں کا سردار جانتا تھا۔ مگر مذہب اُس کا بھی بودھ ہی تھا۔ جب ہیونگ سیانگ مہاراشٹر
کے راجہ پلی کیسن کے پاس دکن میں پہنچا ہے تو وہ بڑی خاطر مدارات سے پیش آیا اور اُس کو اجنتہ اور
ایلورا کے معارات کی سیر کرائی۔ قنوج کے راجہ نے جس کو بعض مورخین نے راجہ ہرش کے نام سے بھی
موسوم کیا ہے ہیونگ سیانگ کو لیکر گنگا جمنا کے مقام اتصال یعنی پریاگ کا سفر کیا اور وہاں ہندوستان
کے بیس[20] راجے مہاراجے راجہ قنوج کے حکم سے آکر جمع ہوئے۔ یہاں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ پانچ
لاکھ آدمی اس میدان میں ہر صوبے سے آکر شریک جلسہ ہوئے جن میں بڑے بڑے عالم۔ عابد
بے دین۔ غریب۔ یتیم۔ محتاج سب شامل تھے۔ بودھ مذہب کے عالموں نے وعظ و پند کی تقریریں
کیں اول روز بودھ کی ایک مورت بہت بڑے خیمے میں نصب کی گئی اُس کی سب نے عبادت
کی۔ پھر زر و جواہر نفیس کھانے۔ کپڑے وغیرہ محتاجوں کو تقسیم کیے گئے۔ دوسرے روز ادت دیو (سورج
دیوتا) کی مورت نصب کی گئی اور دوم درجہ کی چیزیں تقسیم کی گئیں۔ تیسرے روز ایشور دیو۔ کی مورت نصب
ہوئی اور سوم درجہ کی چیزیں تقسیم ہوئیں۔ چوتھے دن ایک ہزار بودھ مذہب کی انجمنوں یا جماعتوں
کو ایک ایک ہزار اشرفیاں اور ایک ایک موتی دیا گیا۔ پانچویں دن برہمنوں کو خیرات تقسیم کی گئی۔

چھٹے دن جینیوں اور عام لوگوں کو خیرات وانعام تقسیم ہوا۔ ساتویں دن اُن لوگوں کو خیرات تقسیم ہوئی جو دور دراز یعنی بیرون ہند مقامات سے آئے تھے۔ آٹھویں دن عام غریبوں۔ لاچاروں اور یتیموں کو انعامات تقسیم ہوئے۔ اس خیرات میں راجہ سلادت نے اپنے گھوڑے۔ ہاتھی اور فوج واسلحہ کے سوا تمام دولت اور خزانہ جو پانچ سال میں جمع ہوا تھا سب خرچ کر دیا۔ دوسرے راجاؤں نے بھی جن کی تعداد بتیس[۲] تھی قنوج کے راجہ کی تقلید میں اسی طرح خیرات کی۔ ان راجاؤں میں گجرات سے لیکر آسام تک کے راجہ شریک تھے۔ ہر پانچ سال کے بعد اسی طرح پریاگ میں راجہ جمع ہو کر خیرات کیا کرتے تھے۔ ہیونگ شیانگ کے سفرنامے میں مذکورہ روئداد پڑھکر بعض مورخین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ راجہ سلادت اور اُس زمانے کے دوسرے راجے بودھ اور برہمنی دونوں مذہبوں کے پابند اور پیرو تھے اسی لیے ایشور دیو اور آدت دیو کی مورتیوں کو پریاگ کے میلے میں بودھ کی مورت کے ساتھ نصب کیا گیا لیکن اُنھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ یہ میلہ یا جلسہ جو ہر پانچ سال کے بعد ہوتا تھا اشوک کے اُس فرمان کی تعمیل تھا جس کا اوپر ذکر آچکا ہے اور جس میں لکھا ہے کہ "پانچویں سال سب لوگ اپنے اپنے گناہوں کا کفارہ دیا کریں" بودھ کی مورت کی پوجا کرنے کے بعد آخر میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی جو اُس جگہ موجود ہوتے تھے اپنے اپنے مذہب کے موافق پوجا کرنے کا موقع دیدیا جاتا تھا اور یہ اشوک کے اُس فرمان کی تعمیل تھی جس میں دوسرے مذاہب کے ساتھ صلح وآشتی اور محبت بڑھانے کی ترغیب ہے اور جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ پس ہیونگ شیانگ کی آمد تک ہندوستان کے قریباً تمام راجہ اشوک کے زمانے کے طے شدہ مذہبی احکام کو واجب التعمیل جانتے تھے اگرچہ بہت سی بدعات بھی رائج ہو کر داخل مذہب ہو چکی تھیں۔ ہیونگ شیانگ جب ہندوستان میں وارد ہوا ہے تو سندھ کا راجہ ساہ سی تھا جو بودھ مذہب کا پیرو تھا اور سندھ میں قریباً تمام آبادی بودھوں کی تھی جس طرح بنارس الہ آباد وغیرہ میں برہمن اور برہمنی مذہب کے پیرو اور بودھ مذہب کے مخالف بھی تھوڑی سی تعداد میں آباد تھے اسی طرح ملک سندھ میں بھی یہ لوگ موجود تھے۔ ان برہمنی مذہب کے لوگوں کو سرکاری ملازمتیں بھی سندھ کی بودھ حکومت میں مل سکتی تھیں چنانچہ انھیں لوگوں کی سازش نے راجہ ساہ سی کے بعد راجہ چچ کو تخت حکومت دلوایا۔ راجہ چچ کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ برہمنی مذہب کا پابند تھا مگر حکومت کا مذہب وہی بودھ مذہب تھا کیونکہ راجہ چچ بودھوں ہی کے مندر میں جاکر اپنی پوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتا تھا۔ چچ کے بعد راجہ چندر سندھ کا راجہ ہوا وہ بودھ مذہب کا بڑی سختی سے پابند اور برہمنی مذہب کا دشمن تھا۔ پس یہ خیال کرنا کہ مسلمانوں کی حملہ آوری کے وقت ہندوستان میں بودھ مذہب کے سوا کسی اور مذہب کی حکومت تھی غلط ہے اور اس کے غلط ہونے کی ایک یہ بھی دلیل ہے کہ محمد بن

قاسم کی حملہ آوری کے عرصہ دراز بعد شنکر اچارج نے جب بودھ مذہب کے خلاف جد وجہد شروع کی ہے تو ہندوستان کے راجاؤں میں سے بعض نے پہلی مرتبہ بدھ مذہب ترک کرکے شنکر اچارج کا جدید مذہب اختیار کیا ہے اور اسی زمانے سے بودھ مذہب کی حکومت کا رقبہ تنگ ہونا شروع ہوا ہے اس سے پہلے تو کوئی راجہ بدھ مذہب کا مخالف ایسا موجود نہ تھا جو قابل تذکرہ ہو۔ شنکر اچارج کے زمانے ہی سے پورانوں کی تصنیف شروع ہوئی۔ اور پورے براعظم ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت قائم و مستحکم ہوجانے کے وقت تک پورانوں کی تصنیف کا سلسلہ جاری رہا۔ انھیں پورانوں کے بتائے ہوئے عقائد کا مذہب ہندوستان کے تمام ہندوؤں کا مذہب سمجھا جاتا ہے اس پورانوں کے مذہب کو نہ ویدوں کے مذہب سے کوئی تعلق ہے نہ منوسمرتی کے مذہب سے نہ گیتا کے عقائد سے۔ لطف یہ کہ اٹھارہ پورانوں میں سے تقریباً ہر پوران وید کی تکریم کا قائل ہے لیکن جو اعمال بتاتا ہے وہ اکثر ویدوں کے مخالف اور بالکل ہی جدید اور نئے عقائد پر مبنی ہیں جو برہمنوں کے من گھڑت معلوم ہوتے ہیں اس لیے اس جدید مذہب کو جو ہندو مذہب کہلاتا ہے اور جو ہندوستان میں مسلمانوں کی حملہ آوری کے بعد پیدا ہوا ہے اُس مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے جو مسلمانوں کی آمد اور حملہ آوری کے وقت ہندوستان میں موجود تھا اور بودھ مذہب کہلاتا تھا۔

تاریخ تبت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۱۷ء میں پدما تھا وانامی ایک شخص کو نالندکی خانقاہ سے تبت کے ایک راجہ نے بلایا اور اپنے ملک کا مذہبی افسر مقرر کیا جو دلیل اس بات کی ہے کہ دوسرے ملکوں میں بھی اُس زمانے تک ہندوستان ہی کو بودھ مذہب کے عالموں کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ ۹۰۰ء میں تبت کے ایک راجہ نے بودھ مذہب کے عقائد کو ترک کرکے دوسرا مسلک اختیار کیا تو وہاں کی رعایا نے اُس راجہ کو قتل کر دیا۔ ۱۰۵۰ء میں تبت کے راجہ نے پنڈت کمالا شلا کو ہندوستان سے بلایا اور اُس کو اس عہدہ جلیلہ پر مامور کیا کہ عام لوگوں کو بودھ مذہب کے احکام سے واقف کرنے کے لیے ایک مذہبی محکمہ اپنی نگرانی میں قائم کرے اور تمام ملک کو مذہب کا پورے طور پر پابند بنا دے۔ پھر ایک دوسرے پنڈت کو بلاکر بدھ مذہب کی کتابوں کے ترجمہ کرنے پر مامور و مقرر کیا۔ ہیونگ سانگ کی آمد تک ہندوستان میں جین مذہب کا زیادہ چرچا نہ تھا اگرچہ جین مذہب کے اوتار پارسناتھ اور مہابیر کی نسبت یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ گوتم بدھ کے ہمعصر تھے مگر بعض مورخین کو جنھوں نے مہابیر و پارسناتھ کو بدھ کا ہمعصر لکھا ہے اس لیے دھوکا لگا ہے کہ انھوں نے جین مذہب کی نسبت یہ بات کسی کی لکھی ہوئی دیکھ لی ہے کہ جین مذہب اور بودھ مذہب ایک دوسرے سے

مشابہ اور بالکل قریبی مذہب ہیں۔ حالانکہ اس کو قرب زمانی سے کوئی تعلق نہیں ہیونگ شیانگ کی آمد کے وقت بودھ مذہب میں بہت سے فرقے پیدا ہوگئے تھے اور برہمنوں نے بھی بودھ مذہب کی مساوات سے تنگ آکر اور اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے جد وجہد شروع کردی تھی اور پھر قومی مدارج قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ اسی مذہبی کشمکش میں بودھ مذہب کے ایک فرقہ نے مستقل طور پر اپنا ایک ایسا مسلک قایم کرلیا جو برہمنوں کی خواہشات اور بودھ مذہب دونوں کا مرکب مذہب تھا یعنی انھوں نے جانداروں کی حفاظت کو نیکی قرار دیا۔ ویدوں کو بے حقیقت اور نا قابل تکریم سمجھا آگ کی پوجا اور بلدان کو بھی غیر ضروری ٹھہرایا۔ یہ سب باتیں بودھ مذہب کی تھیں۔ دوسری طرف ذات پات کی قیود کو تسلیم کرلیا۔ برہمنوں کے اوتاروں کو بھی اپنے اوتاروں کے بعد دوم نمبر پر قابل تعظیم مان لیا۔ یہ باتیں برہمنوں کی خواہشات کو پورا کرنے والی تھیں۔ ہیونگ شیانگ کے زمانے میں تاریخ کے اندر پہلی مرتبہ جین مذہب کے لوگوں کا ذکر ایک الگ اور مخصوص فرقہ کی حیثیت سے آتا ہے۔ یہ فرقہ ملک گجرات میں پیدا ہوا پھر سندھ اور دکن کی جانب بھی پھیل گیا۔ وسط ہند اور بنگال تک اس فرقہ کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برہمنوں کی خواہشات کے پورا کرنے اور ذات پات کی قیود کے دوبارہ قائم ہوجانے کو گجرات کے بودھوں نے تسلیم کرلینا اس لئے مناسب سمجھا ہوگا کہ ایک درمیانی حالت پیدا ہوجائے۔ بہرحال جو کچھ بھی صورت ہوئی ہو جین مذہب بھی اسی زمانے کی پیداوار ہے جبکہ اسلام ہندوستان کے باشندوں میں داخل ہونے لگا تھا چونکہ بودھوں کا یہ فرقہ برہمنوں کے اقتدار کا مخالف نہ تھا لہٰذا برہمنوں نے اس کی مخالفت ترک کردی اور اس کو برہمنوں کے ہاتھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

محمد بن قاسم کی حملہ آوری اور سندھ میں اسلامی حکومت قائم ہوجانے کے بعد محمود غزنوی کے زمانے تک کئی سو سال ایسے گذرے کہ ہندوستان پر مسلمانوں نے کوئی حملہ نہیں کیا۔ سندھ کی اسلامی ریاستیں بھی اپنے قریبی ہندو راجاؤں سے مصالحت و آشتی کا برتاؤ رکھتی تھیں اور اُن کی ہندو رعایا امن و امان سے زندگی بسر کرتی تھی۔ اس حالت میں بودھوں کی بُت پرستی کا خلاف عقل ہونا مسلمانوں کی ہمسائگی کے سبب ضرور ثابت ہونے لگا ہوگا۔ ایسی حالت میں جبکہ خود بخود بودھوں کی بُت پرستی قابل مضحکہ ثابت ہو رہی تھی شنکراچارج کو موقع مل گیا کہ وہ برہمنوں کے پرانے مذہب اور منوسمرتی و اسکے قوانین کو ایک بالکل نئے فلسفیانہ قالب میں ڈھال کر اور اسلامی عقائد سے توحید کے دلائل لیکر ایک نیا مذہب پیش کرے اور بودھوں کے استیصال پر آمادہ ہوجائے۔ چنانچہ اُس نے ایک دورا جاؤں

سوا اپنا ہم خیال بنایا اور پھر ایک کڑھائی ہمراہ لیکر اس اعلان کے ساتھ سفر شروع کیا کہ جو شخص مجھ سے مباحثہ کریگا اگر وہ ہار جائیگا تو کھولتے ہوئے تیل میں ڈالکر جلا دیا جائے گا۔ محمد بن قاسم سے محمود غزنوی تک کا زمانہ ہندوستان میں بالکل تاریک زمانہ ہے یعنی اس زمانہ کے متعلق ہندوؤں کے تاریخی حالات بہت ہی کم معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ اسی زمانے میں موجودہ ہندو مذہب کے پوران تصنیف ہونے شروع ہوئے۔ ہندوؤں میں مذہبی فرقے سے نئے نئے سمپردائے اور پنتھ قائم ہوئے۔ ہندوستان میں اسلام کی پُر امن آمد اور محمد بن قاسم کے حملہ پر اس لیے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی قوموں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ دوسرے اسباب کی بنا پر ہندوستان کے مذاہب اور اقوام میں خود بخود شکستگی کا ایک طوفان برپا ہو گیا تھا اسی زمانے میں راجپوتوں کی قوم نے برہمنوں کی امداد سے ترقی پاکر حکومتیں حاصل کرنا شروع کیں یا یوں کہیے کہ برہمنوں نے اپنا اقتدار بڑھانے کے لیے راجپوتوں کو جنگی کاموں کے لیے آگے بڑھایا اور اُن کو سہارا دیکر تخت سلطنت تک پہنچایا اس طوفانی زمانے میں مسلمانوں نے ہندوستان پر کوئی حملہ نہیں کیا یہاں تک کہ محمود غزنوی کے حملے تک ہندوستان کے بعض صوبوں میں راجپوتوں کی مضبوط ریاستیں قایم ہو گئیں اور برہمنوں کے قائم کیے ہوئے جدید فرقے اور جدید مذاہب ہندو مذاہب کے نام سے رواج پانے لگے اور جہاں موقع ملا بودھوں کو قتل اور جلا وطن کرنے کی کارروائیاں عمل میں آتی رہیں۔ وشنو کے پرستار۔ شیو کے پرستار۔ شاکت یعنی شکتی کے پرستار۔ سورج کے پرستار۔ گنیش یعنی گنپتی کے پرستار۔ برہما کے پرستار۔ شیش۔ سوم۔ گندھرپ۔ بیتال۔ اور بھوتوں کے پرستار۔ غرض سیکڑوں فرقے بودھ مذہب کی جگہ پیدا ہونے لگے۔ وشنو اور شیو کے پرستاروں کی بہت کثرت ہوئی ان فرقوں میں سے بھی ایک ایک فرقہ سیکڑوں شاخوں میں منقسم ہوا اور ان شاخوں میں نشو و نما سولھویں صدی عیسوی تک جاری رہی اور پوران تصنیف ہوتے رہے۔ ایسی حالت اور اس مذہبی شکست و انتشار کے زمانے میں اگر مسلمان ذرا بھی تبلیغ اسلام کی طرف متوجہ ہوتے اور ہندوستان والوں کو اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کرتے تو صرف چند سال میں تمام ہندوستان کا دائرہ اسلام میں داخل ہو جانا معمولی بات تھی لیکن مسلمان فرمانرواؤں نے اپنی مذہبی رواداری کو اس سختی کے ساتھ استعمال کیا کہ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے ہندوؤں کے مذہب کو باقی رکھنا اور ہندوؤں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکنا اپنے مقاصد مہمہ میں داخل کر لیا تھا ورنہ آج ہندوستان میں ایک ہی مذہب یعنی اسلام ہوتا۔ بعض مسلمان درویشوں نے ہندوؤں کو جو مسلمان ہونا چاہتے تھے اسلام میں

داخل کرنے سے پرہیز نہیں کیا اور اسی لیے ہندوستان کی جس قدر قومیں اسلام میں
داخل ہوئیں وہ سب انھیں درویشوں اور زاہدوں کے ہاتھ پر مسلمان
ہوئیں۔ حیرت ہے کہ آج مسلمانوں کی اس حد سے بڑھی ہوئی
رواداری اور مسلمان بادشاہوں کی اس ہندو
نوازی کو بالکل برعکس صورت میں
پیش کرنے کی کوشش
ہو رہی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

چند ضروری اشارات اس باب میں ہمکو مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ فوج کشی کے اسباب اور مسلمانوں کی ملک سندھ پر حکمرانی کے حالات بیان کرتے ہیں قبل اسکے کہ مقصود اصلی کو شروع کیا جائے چند باتیں پہلے عرض کردینی ضروری ہیں۔

(۱) آج کل ملک سندھ گورنمنٹ بمبئی کے ماتحت ایک کمشنری یا چھوٹا سا صوبہ ہے۔ ہندوستان کے نقشہ میں علاقہ سندھ کے حدود ہم نے طالب علمی کے زمانے میں جو کچھ دیکھے تھے وہی ہمارے دماغ میں محفوظ ہیں اور ملک سندھ کا نام سن کر اسی چھوٹے سے ملک کا تصور ہمارے پیش نظر ہوتا ہے لیکن اب سے بارہ سو سال پہلے کا سندھ اس موجودہ سندھ سے بہت وسیع اور عریض و طویل تھا۔ اُس زمانے کے مورخین جس ملک کو سندھ کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ مغرب میں مکران تک جنوب میں بحر عرب اور گجرات تک مشرق میں موجودہ ملک مالوہ کے وسط اور راجپوتانہ تک شمال میں ملتان سے اوپر گذر کر جنوبی پنجاب کے اندر تک پھیلا ہوا تھا اُس میں پنجاب کے جنوبی اضلاع بلوچستان کا اکثر حصہ صوبۂ سرحدی کا جنوبی حصہ راجپوتانہ کا اکثر حصہ گجرات کا شمالی حصہ معہ موجودہ ملک سندھ سب شامل تھا۔ مورخین نے راجہ چچ اور اُس کے پیشرو راجہ کے جو حدود حکومت بیان کیے ہیں وہ اس مذکورہ سندھ سے بھی زیادہ وسیع ہیں لیکن عرب حملہ آوروں اور اُن کے مورخوں نے جس ملک کو سندھ کے نام سے تعبیر کیا ہے اُس کے وہی حدود ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔

(۲) اس باب میں اور آئندہ ابواب میں بھی جو کچھ بیان ہوگا وہ تاریخ ہند کا صرف ایک ہی پہلو ہوگا یعنی مسلمانوں نے ہندوستان میں ہندو مخلوق کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ عام اور مکمل حالات اور مفصل تاریخ سے واقف ہونے کے لیے ہندوستان کی جو تاریخ میں نے الگ مرتب کی ہے اس کے شائع ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس باب اور آئندہ ابواب میں بھی اگر واقعات کا تاریخی تسلسل اور ان کے تذکرات موجود نہ ملیں تو اس کا سبب یہی سمجھا جائے کہ صرف ایک ہی پیش نظر مقصد کو چونکہ پورا کرنا تھا لہذا غیر ضروری اور مقصد مذکورہ سے دور دور باتوں کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔

(۳) محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے وقت سندھ کا دارالسلطنت آلور ([illegible]) تھا یہ شہر اب موجود نہیں ہے اس کا محل وقوع موجودہ شہر روہڑی سے آٹھ میل جنوب کی جانب ہے۔ دیبل پرانے زمانے میں ایک شہر تھا اس کا محل وقوع شہر کراچی کے متصل یا شہر کراچی کا ایک جزو سمجھنا چاہیے۔ موجودہ شہر کراچی دو سو سال سے زیادہ کی آبادی نہیں ہے۔ شہر دیبل اس زمانہ میں بندرگاہ بھی تھا اور اس کے وسط میں ایک مندر بودھوں کا تھا جس کو دیول کہتے ہیں اسی لیے شہر کا نام بھی دیول یا دیبل مشہور ہو گیا تھا۔ نیرون کوٹ بھی پرانے زمانے میں ایک شہر تھا جو موجودہ شہر حیدرآباد سندھ کے موجودہ قلعہ کی جگہ آباد تھا حیدرآباد سندھ کا موجودہ قلعہ ۱۷۶۸ء میں غلام شاہ کلہوڑا نے بنایا تھا۔ قدیم زمانے میں ایک شہر برہمن آباد تھا جو موجود نہیں ہے اس کا محل وقوع حیدرآباد سندھ سے شمال و مشرق کی جانب چالیس میل کے فاصلہ پر اور مقام ہالہ سے اکیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ برہمن آباد کو سندھی لوگ بمبرا کا تھل اور دلورائی جو کھاٹ بھی کہتے تھے یہ شہر چار میل کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ برہمن آباد کے تباہ شدہ نشانات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت دریا کی طغیانی نے اس کو تباہ کر دیا ہے۔ برہمن آباد سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر شہر منصورہ آباد تھا وہ بھی اب موجود نہیں ہے۔ منصورہ دریا کے ایک کنارہ پر آباد تھا اس کے بالمقابل دوسرے کنارے پر شہر محفوظہ تھا۔ عمر کوٹ جو اکبر بادشاہ کی جائے پیدائش ہے اس کے قریب جینیوں کے مندر کے خرابے پائے جاتے ہیں۔ سہوان اب بھی موجود ہے یہ ایک پہاڑی پر آباد ہے اور سکھر سے ۸۰ میل اور ٹکی سے گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے یہاں کا قلعہ کافر قلعہ کے نام سے مشہور ہے یہ قلعہ راجہ ساہسی کے قلعوں میں سے ایک تھا۔ پہران یا مہران یا پاران ایک دریا کا نام ہے جو صرف تھوڑا میل لمبا اور کوٹڑی کے پاس دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔ شہر نیرون کا محل وقوع کراچی سے سترہ میل کے فاصلہ پر شمال و مشرق کی جانب اور منصورہ سے جنوب و مغرب کی جانب پینتالیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس سے زیادہ سندھ کے تاریخی مقامات کے محل وقوع کی تحقیق مجھکو

نہیں ہوسکی۔ تاریخوں میں سندھ کے بہت زیادہ مقامات کے نام آتے ہیں لیکن یہ تحقیق نہیں کہا جاسکتا کہ آج کل وہ کن کن ناموں سے مشہور ہیں۔ یا صفحۂ ہستی سے معدوم ہو چکے ہیں تو اُن کے خرابے کہاں کہاں واقع ہیں۔

(۴) سندھ کے ملک پر قدیم سے بودھوں کی سلطنت قائم تھی۔ سندھ کے ایک راجہ جس کا نام سیہرس تھا ملک فارس پر حملہ کیا تھا چنانچہ وہ ایرانیوں یعنی مجوسیوں کے ہاتھ سے میدان جنگ میں مارا گیا۔ اُس کے بعد اس کا بیٹا ساہسی تخت نشین ہوا اور ساہسی کے ہاتھ سے بلوچستان و مکران کا علاقہ نکل کر ایرانیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ساہسی کا وزیر بدھی من نامی ایک شخص تھا بدھی من کا میر منشی یا نائب رام نامی ایک شخص تھا۔ رام کے پاس ایک نوجوان پنڈت جس کا نام چچ بن سلائج تھا اور جس کو چاروں وید پر عبور حاصل تھا آکر نوکر ہوا۔ چند روز کے بعد رام مر گیا اور اُس کی جگہ چچ نائب وزیر یا میر منشی مقرر ہوا۔ چچ نے بہت جلد راجہ ساہسی کی خدمت میں رسوخ و اعتبار حاصل کر لیا۔ راجہ ساہسی کی بیوی کا نام سبھ دیوی تھا۔ رانی سبھ دیوی اور چچ کی خفیہ آشنائی ہو گئی۔ اس خفیہ یارانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ راجہ ساہسی اچانک مر گیا اور رانی نے راجہ کے رشتہ داروں اور سلطنت کے سرداروں کو جو راجہ کی عیادت کو آئے تھے ایک مکان میں بند کر کے سب کو ہلاک یا محبوس کر دیا اور اعلان کیا کہ راجہ کی وصیت کے موافق چچ کو تخت سلطنت سپرد کیا گیا ہے اور چونکہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے لہذا میں چچ کے ساتھ شادی کرتی ہوں۔ اس طرح چچ سندھ کا راجہ ہو گیا اور رانی سبھ دیوی سے اُس کے دو بیٹے دھرسیہ اور داہر اور ایک بیٹی مساۃ مائی پیدا ہوئی۔ چچ نے بدھی من وزیر کو بدستور وزارت پر قائم رکھا کیونکہ اُس نے رانی اور چچ کی کوئی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس طرح سندھ کی حکومت قدیم خاندان کے قبضے سے نکل کر ایک برہمن کے قبضے میں پہنچی۔ چچ مذہب کے اعتبار سے بھی برہمنی مذہب کا پابند سمجھا جاتا تھا مگر چچ کا بھائی چندر بودھ مذہب کا پیرو تھا۔ چچ نے بلوچستان کا علاقہ مکران تک پھر ایرانیوں سے چھین لیا اور چند روز کے بعد ایرانیوں سے صلح ہو گئی کیونکہ ایرانیوں اور مسلمانوں کی لڑائیاں شروع ہو گئی تھیں اور ایرانی سندھ کے راجہ کی صلح و امداد کے خواہاں تھے اگر مسلمانوں سے ایرانیوں کی لڑائی شروع نہ ہو گئی ہوتی تو ایرانی خشکی اور سمندر دونوں جانب سے فوج کشی کر کے سندھ کا ملک ویران و برباد کر دیتے۔ چچ کے بعد اُس کا بھائی چندر تخت نشین ہوا یہ چونکہ بودھ مذہب کا پیرو تھا لہذا اس کی حکومت کو رعایا نے بہت پسند کیا۔ آٹھ سال حکومت کرنے کے بعد چندر فوت ہوا اُس کی جگہ چچ کا چھوٹا بیٹا داہر شہر الور میں تخت نشین ہوا اور چندر کا بیٹا راج برہمن آباد میں حکومت کرنے لگا۔

اس طرح ملک سندھ میں ایک ہی خاندان کی دو حکومتیں قایم ہوگئیں جن میں برہمن آباد کی حکومت کا مذہب خالص بدھ اور الور کی حکومت کا مذہب برہمنی و بودھ ہر دو کا نیم بودھ تھا۔ ایک سال کے بعد آج بن چندر فوت ہوا تو اس کی جگہ چچ کے بڑے بیٹے دھرسیہ نے تخت حکومت پر قبضہ کیا۔ دھرسیہ بھی بودھ مذہب کا پیرو اور برہمنی عقائد سے متنفر تھا۔ دھرسیہ نے اردگرد کے علاقوں کو قبضے میں لاکر اپنی حکومت کو خوب مضبوط کر لیا مگر اپنے چھوٹے بھائی داہر سے جو الور میں فرمانروائی کر رہا تھا کوئی تعرض نہیں کیا۔ دھرسیہ کے پاس اس کی بہن مائی بھی رہتی تھی جس کی عمر تیس سال سے بھی زیادہ ہو گئی تھی مگر ابھی تک اس کی شادی نہ ہوئی تھی دھرسیہ نے کوہ کیکانان کے ایک سرحدی فرمانروا سے اس کی شادی کی تجویز پختہ کرکے اور بہت کچھ ساز و سامان جہیز کا فراہم کرکے داہر کے پاس بہن اور سامان جہیز کو روانہ کیا اور لکھا کہ جو کچھ تم سے ہو سکے تم بھی اس میں اپنا جہیز شامل کرو اور فلاں شخص کے ساتھ اس کی شادی کرکے رخصت کر دو۔ داہر نے بدھی من وزیر کے مشورہ سے اپنی حقیقی بہن کے ساتھ خود شادی کرکے اس کو اپنی بیوی بنا لیا۔ دھرسیہ نے جب یہ حال سنا تو برہمن آباد سے فوج لیکر الور پر چڑھائی کی اور داہر کو محصور کر لیا مگر اسی محاصرہ کی حالت میں دھرسیہ چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا اور داہر نے اس مصیبت سے چھوٹ کر برہمن آباد کی ریاست پر بھی قبضہ کر لیا۔ داہر ابھی برہمن آباد ہی میں مقیم تھا کہ کیکانان کے حاکم نے جس کے ساتھ دھرسیہ نے مائی کی شادی تجویز کی تھی ایک عظیم الشان فوج لیکر الور پر چڑھائی کی۔ داہر اس فوج کشی کا حال سن کر سخت پریشان اور حواس باختہ ہوا۔ بدھی من وزیر نے راجہ داہر کو توجہ دلائی کہ اس مہم کو علافیوں کے سپرد کرنا چاہیے۔ چنانچہ داہر نے محمد بن حرث علافی کو بلوا کر اپنی پریشانی کا حال سنایا۔ محمد بن حرث علافی نے اپنے پانسو عربی سپاہیوں کو لیکر دشمن کے لشکر پر شبخون مارا اور سخت کشت و خون کے بعد دشمن کو بھگا دیا۔ دشمن کے ہزارہا آدمی جو گرفتار ہوئے تھے داہر کے سامنے پیش کیے گئے داہر نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ مگر محمد علافی نے کہا کہ ان کو قتل کرنے کی بجائے ان پر احسان کیجیے اور جاں بخشی کرکے آزاد کر دیجیے۔ داہر نے محمد بن حرث علافی کے اس عظیم الشان کارنامے سے خوش ہو کر اس کو اپنا وزیر اعظم بنایا اور سکہ پر ایک طرف اپنا اور ایک طرف محمد علافی کا نام مضروب کرایا۔ تیس سال حکومت کرنے کے بعد ۹۳ھ میں داہر مارا گیا۔ محمد علافی کا حال آگے آتا ہے۔ یہ تمام حالات چچ نامہ اور تاریخ سندھ معصومی سے ماخوذ ہیں۔

محمد بن قاسم کی حملہ آوری سے پہلے کے ہنگامے

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

عہد خلافت میں مکران تک مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مکران کو جب مسلمانوں نے فتح کیا ہے تو ایرانیوں کے ساتھ سندھیوں نے بھی اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے جب مجوسی شہنشاہ کا تخت چھین لیا تو اُس کی تمام حدود سلطنت تک مسلمانوں کا حق فرمانروائی ثابت ہو چکا تھا۔ ایرانی شہنشاہی کے درہم برہم ہونے پر جن لوگوں نے اُس کے صوبوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا وہ سب کے سب مسلمانوں کو اُن کے قبضے سے واپس لینے ضروری تھے کیونکہ ایرانی شہنشاہی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں درہم برہم ہوئی تھی۔ مکران کے سرحدی صوبہ پر ایک ایرانی سردار نے اپنا قبضہ جمایا تو مسلمانوں نے اُس کو چھین لیا۔ چونکہ سندھیوں نے نہاوند میں بھی جنگ ذات السلاسل میں بھی۔ جنگ قادسیہ میں بھی اور مکران میں بھی مسلمانوں کا مقابلہ کیا تھا لہٰذا مسلمانوں کو سندھ پر حملہ آوری کا حق حاصل ہو چکا تھا۔ مکران کے عامل نے مکران سے آگے بڑھکر اُس حصۂ ملک پر بھی قبضہ کرنا ضروری سمجھا جو سندھ کے راجہ ساہسی کے زمانے میں ایرانیوں کے قبضہ میں تھا اور تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ سندھ کے راجہ چچ نے اُس پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر حضرت فاروق اعظم رضؓ نے مناسب نہ سمجھا کہ انتقام یا ملک گیری کے لیے ایک نئی سلطنت سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری کیا جائے چنانچہ فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں مسلمانوں نے کوئی حملہ ہندوستان کے کسی حصہ پر نہیں کیا فاروق اعظمؓ کے بعد ۲۴ھ میں جبکہ حضرت عثمان غنیؓ تخت خلافت پر جلوہ افروز تھے بصرہ کے حاکم عبداللہ بن عامر نے عبدالرحمن بن سمرہ عامل کرمان کو اجازت دی کہ سندھی فوجوں کو جو راجہ چچ کی ولیعہدی کے سبب حملہ مکران پر جمع ہو کر حملہ کی دھمکی دے رہی تھیں نکال دے چنانچہ عبدالرحمن بن سمرہ نے حملہ کر کے سندھی فوجوں کو بھگا دیا اور مکران سے سرحد کیکانان تک کا تمام علاقہ چھین لیا یہی وہ علاقہ تھا جو راجہ چچ کی حکومت میں صرف چند سال سے شامل ہوا تھا۔ اس حملہ آوری کی اس لیے بھی ضرورت تھی کہ بہت سے مجوسی جو مسلمانوں کے دشمن تھے ایران سے بھاگ کر چچ کی حکومت میں چلے آئے تھے اور اس علاقہ کو مسلمانوں کے لیے موجب خطر بنا دیا تھا۔ عبدالرحمن بن سمرہ سرحد کیکانان سے آگے نہیں بڑھا اور فوراً اس کو کابل کی طرف جانا پڑا جہاں ایک بغاوت کا فرو کرنا ضروری تھا۔ اس حملہ آوری کو بمشکل ہندوستان پر مسلمانوں کی پہلی حملہ آوری کہا جا سکتا ہے کیونکہ اصلی ملک سندھ میں اسلامی لشکر داخل نہیں ہوا تھا اسی مفتوحہ علاقہ میں جس کی مشرقی سرحد بلوچستان کے مشرقی پہاڑوں پر ختم ہوتی تھی ایک بغاوت برپا ہوئی جس کو سندھ کے راجا نے امداد پہنچائی۔ اس بغاوت کے فرو کرنے اور سندھی فوجوں کے پیچھے ہٹانے کے لیے ۳۸ھ میں حارث بن مرہ نامی ایک سردار نے عامل مکران کے حکم سے ایک ہزار سواروں کے ساتھ حملہ کیا اور بیس ہزار کے لشکر کو شکست دیکر امن وامان پھر بحال کر دیا۔ اس مرتبہ بھی اسلامی لشکر نے اپنی پہلی حد سے آگے قدم نہیں رکھا ۴۱ھ یا ۴۲ھ میں پھر اس علاقے کے اندر مرد و سرکشی

علامات نمودار ہوئے اور حضرت امیر معاویہؓ نے عبداللہ بن سوار کو چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ بطور سرحدی
محافظ دستہ کے مشرقی سرحد پر قیام کرنے کا حکم دیا۔ یہاں موقع پاکر اور پہاڑ کے درے میں محصور کرکے باغیوں
نے عبداللہ بن سوار کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد سنان بن سلمہ مقرر ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد سنان کی جگہ راشد
بن عمر مقرر ہوا۔ راشد نے اس ملک کا خوب انتظام کیا اور سرکشوں سے مال گذاری وصول کی لیکن اس پر
پچاس ہزار کے ایک لشکر نے جو باغیوں اور سندھیوں پر مشتمل تھا حملہ کیا۔ راشد اس معرکہ میں شہید ہوا اور اس کی
جگہ پھر سنان بن سلمہ مامور ہوا۔

سنہ ۴۴ھ میں امیر مہلب بن ابی صفرہ نے کابل کی بغاوت فرو کرنے کے بعد قندھار کی طرف توجہ
کی۔ یہاں کے باغی مفرورین کابل کے ساتھ ملکر دریائے سندھ کے اس طرف چلے آتے۔ کابل میں عام
طور پر لوگوں کا مذہب بودھ اور قندھار میں آتش پرستی تھا۔ اس جگہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ
کابل و قندھار فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے وہاں کے باشندوں کو اپنا مذہب بدلنے اور اسلام قبول
کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا بلکہ وہ سیکڑوں برس بعد تک بھی اسلامی حکومت کے ماتحت اپنے اپنے
مذہبوں پر عامل رہے جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ جلد اول میں مقاتل بن حیان خراسانی کی نسبت لکھا ہے
کہ ہرب فی ایام خروج ابی مسلم الخراسانی الی کابل ودعی خلقا الی الاسلام فاسلموا۔ یعنی مقاتل
بن حیان ابو مسلم خراسانی کے خروج کے زمانے میں کابل کی طرف بھاگ گئے اور وہاں لوگوں کو اسلام کی طرف
بلایا اور وہ مسلمان ہوگئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری صدی کا بھی ایک معقول حصہ گذر جانے کے بعد تک
کابل میں غیر مسلم لوگ آباد تھے اور وہ کسی بادشاہ یا سپہ سالار کے خوف سے نہیں بلکہ ایک عالم کے وعظ و پند
سے مسلمان ہوئے تھے۔ غرض کابل اور قندھار کے باغیوں اور سرکشوں نے جو مسلمانوں کی مخالفت میں
متحد ہوگئے تھے سندھ کے راجہ کی عملداری میں آکر پناہ لی اور یہاں اُن کو ہر قسم کی امداد و اعانت ملی۔
مہلب بن ابی صفرہ نے اُن کے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھا اور دریائے سندھ کو عبور کرکے ملتان
تک اُن کا تعاقب کیا۔ ملتان اس زمانے میں ملک سندھ کے شمالی حصہ کا صدر مقام تھا جہاں راجہ
چچ کا ایک وائسرائے قیام رکھتا تھا۔ مہلب نے ملتان کو فتح کرکے راجہ چچ کو ایک سبق دیا کہ سلطنت
اسلامیہ کے باغیوں کو پناہ دینی اور سرحدی علاقوں میں بغاوتیں برپا کرانی نہایت خطرناک کام ہے۔
امیر مہلب ابھی قندھار سے ملتان تک کے مفتوحہ علاقہ کا کوئی بھی بندوبست کرنے نہ پایا تھا کہ
فوراً اُس کو حکم بن عمرو غفاری کی طلب پر یہاں سے واپس جانا اور بلخ و ماوراء النہر کی مہموں میں
شریک ہونا پڑا۔ مہلب جس مختصر سے دستہ فوج کو یہاں چھوڑ گیا تھا وہ یہاں اپنے قدم جما نہ سکا

اور بیج کا علاقہ پھر مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ یہ سب سے پہلا حملہ جس کو ملک سندھ پر پہلا اسلامی حملہ کہہ سکتے
ہیں ایک بگولا تھا کہ آیا اور گذر گیا۔ مسلمانوں نے بلوچستان کے اس حصہ کو جو مکران سے کیکان تک
وسیع تھا اپنے قبضہ میں رکھا اور چونکہ کچھ دنوں یہ علاقہ سندھ کے راجہ چچ کی حکومت میں رہ چکا تھا
اس لیے وہ اس علاقہ کو ملک سندھ کے نام سے تعبیر کرتے اور یہاں کے عاملوں کو ملک سندھ کا عامل کہتے
رہے۔ سندھ کا راجہ چچ ۴۰ھ میں فوت ہوا۔ اس کے بعد ۶۳ھ تک راجہ چندر نے حکومت کی۔ چندر
کے عہد حکومت میں مسلمانوں نے سندھ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ چندر کا رویہ اپنے مسلمان ہمسایوں
کے ساتھ بہت مصالحانہ تھا اسی لیے اس کے عہد حکومت میں مسلمانوں نے کوئی حملہ سندھ کی سرحد
پر نہیں کیا۔ ۶۳ھ میں راجہ داہر سندھ کے تخت حکومت پر متمکن ہوا یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی حکومت
اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے سخت خطرہ کی حالت میں تھی۔ راجہ داہر کی تخت نشینی سے دو برس بعد یعنی
۶۵ھ میں خلیفہ عبدالملک اموی تخت نشین ہوا۔ اگر شام و عراق و عرب و ایران و ترکستان و افغانستان
وغیرہ میں جو جو گورنر مامور تھے وہ سب اسی کے سبب قریباً خود مختار رہے اور یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا تھا کہ
آئندہ عالم اسلامی کا واحد فرمانروا یعنی خلیفۃ المسلمین کون ہوگا اسی افراتفری اور آپا دھاپی کے عالم میں
گورنر قندھار کو ۶۵ھ میں راجہ داہر کے نائب السلطنت یعنی حاکم ملتان کا حملہ روکنا پڑا۔ اور ہندو
لشکر کو اسلامی لشکر کے مقابل ملتان کی دیواروں کے نیچے فرار کی عار گوارا کرنی پڑی۔ اس کے بعد
بہت جلد خلیفہ عبدالملک نے تمام امیدواران خلافت پر غلبہ پا کر اپنی خلافت کو خوب مضبوط و مستحکم بنا لیا
اور آئندہ عرصہ دراز تک کے لیے تمام عالم اسلامی میں عبدالملک اور اس کی اولاد بلا شرکت غیرے فرمانروا
رہی۔ عبدالملک بڑا ذی حوصلہ بہادر اور اولوالعزم شخص تھا مگر اس نے راجہ داہر اور ملک سندھ سے
کسی قسم کا انتقام لینا اور حملہ آور ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ عبدالملک بن مروان نے شوال ۸۶ھ میں
وفات پائی اس کی وفات سے ایک سال پہلے یعنی ۸۵ھ میں ایک زبردست موجب جنگ اور
سبب حملہ آوری پیدا ہوا (جس کا ذکر آگے آتا ہے) مگر عبدالملک نے اپنے وائسرائے حجاج بن یوسف
کو سندھ پر حملہ کرنے سے روکا۔ اور درگذر ہی سے کام لینا مناسب سمجھا۔ اس کا سبب یہ تو ہرگز
نہ تھا کہ مسلمان راجہ داہر اور ملک سندھ کی فوج سے ڈرتے تھے کیونکہ مسلمان چند ہی روز ہوئے
تھے کہ ایران۔ روم۔ مصر۔ ترکستان۔ افغانستان وغیرہ کو فتح کر چکے تھے اور ان کے کسی ہمسایہ سے سردار
کو جب کبھی سندھ کے راجہ کی فوج سے لڑنا پڑا تو سندھیوں کو شکست ہوئی۔ اس درگذر اور چشم پوشی
کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ بلا وجہ اور معمولی اسباب کی بنا پر کسی سے لڑنا نہیں چاہتے تھے

اور اپنی نہایت وسیع سلطنت میں اور اضافہ کے خواہاں نہ تھے یا یوں کہہ لیجیے کہ عراق و فارس کے سبز و شاداب صوبوں کے مقابلہ میں وہ سندھ کے ملک کو کچھ اچھا نہیں جانتے تھے۔ بہر حال مسلمانوں نے سندھ پر حملہ آور ہونے میں بہت ہی در گذر اور دیر کی۔

محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے اسباب

عبد الملک بن مروان اموی خلیفۂ دمشق نے اندرونی خطرات پر غالب آکر اپنے مشہور سپہ سالار حجاج بن یوسف ثقفی کو ممالک مشرقیہ کا وائسرائے مقرر کیا۔ حجاج نے اول کوفہ میں آکر وہاں کا انتظام کیا پھر بصرہ میں پہنچکر ۸۵ھ میں سعید بن اسلم کلابی کو مکران کا عامل مقرر کرکے بھیجا۔ اس سے چند روز پیشتر مکران میں بعض فوجی سردار حجاج سے ناراض ہوکر اُس کے احکام کی تعمیل سے انکار کر چکے تھے اور یہاں کی صورت معاملات بہت نازک ہو رہی تھی۔ سعید بن اسلم نے مکران پہنچکر سرکش و نافرمان لوگوں کے سردار کو گرفتار کرکے بڑی بیدردی سے قتل کیا اور اُس کا سر حجاج کے پاس بھیجدیا قبیلۂ بنی سامہ کے دو شخص جو آپس میں حقیقی بھائی اور حرث کلابی کے بیٹے تھے مکران کے علاقے میں فوجی افسر اور اچھا اثر و اقتدار رکھتے تھے۔ یہ دونوں ایک طرف سعید بن اسلم سے رشتہ داری رکھتے تھے تو دوسری طرف اُس سردار کے بھی رشتہ دار تھے جس کو سعید نے بیدردی سے قتل کیا تھا۔ ان دونوں پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ اُنھوں نے اعلان بغاوت کرکے تمام سرکشوں کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ ان دونوں کا نام محمد و معاویہ تھا ان کے بزرگوں میں کسی شخص کا نام علاف تھا اس لیے یہ علافی کہلاتے تھے۔ محمد بن حرث علافی اور معاویہ بن حرث علافی دونوں بھائیوں نے علاقہ مکران کے بعض شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اور اُن کی جمعیت بڑھ گئی یہ رنگ دیکھکر سعید بن اسلم کلابی عامل مکران نے اُن کی سرکوبی کے لیے خود لشکر لیکر حملہ کیا مگر لڑائی میں گرفتار ہو گیا علافیوں نے سعید کو قتل کرکے اُس کے جسم کی کھال اُتروائی اور اُس کی لاش کو بے عزت کیا۔ پھر مکران پر قبضہ کرکے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ حجاج کو جب علافیوں کی اس شرارت و سنگدلی کا حال معلوم ہوا تو اُس نے علافیوں کے ایک رشتہ دار سلیمان علافی کو جو عراق میں موجود اور اپنے قبیلے کا سردار تھا گرفتار کراکر قتل کیا اور اُس کا سر سعید بن اسلم کے اہل و عیال کے پاس بھجوا دیا کہ وہ اُس کو دیکھکر تسکین حاصل کر لیں۔ اس کے بعد حجاج نے عبد الرحمن بن عشا کو علافیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا علافیوں نے عبد الرحمن بن عشا کو بھی شکست دے کر قتل کر دیا۔ اس کے بعد حجاج نے مجاعہ بن سعید تمیمی کو خراسان کی سند گورنری دیکر بھیجا اور علافیوں کے فتنہ کو مٹانے کی تاکید کی۔ مجاعہ بن سعید کے آنے پر علافیوں یعنی محمد و معاویہ نے پہاڑوں میں

پناہ لی اور کسی میدان میں جم کر مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا مجاعہ بن سعید ایک سال کے بعد فوت ہو گیا۔ مجاعہ کے بعد حجاج نے محمد بن ہارون کو مکران اور سرحد ہند کا حاکم اور مختار کل بنا کر بھیجا کہ جس طرح چاہے علافیوں کو گرفتار کرکے سعید بن اسلم کے خون کا انتقام لے۔ محمد بن ہارون نے آتے ہی علافیوں کا تعاقب شروع کیا اور پانچ سال تک پہاڑوں اور صحراؤں میں علافیوں کے تعاقب سرگردان رہا آخر معاویہ بن حرث علافی گرفتار ہو کر قتل ہوا اور محمد بن ہارون نے اُس کا سر حجاج کے پاس بھیجکر خط لکھا کہ میں محمد بن حرث علافی کو بھی ضرور گرفتار و قتل کرونگا۔ مگر محمد بن حرث علافی پانسو آدمیوں کی جمعیت لیے ہوئے حدود سلطنت اسلامیہ سے نکلکر راجہ داہر کے پاس سندھ میں چلا آیا۔ راجہ داہر جو مسلمانوں کی اس خانہ جنگی کو بڑے اطمینان سے دیکھ رہا تھا محمد علافی کے آنے سے بہت خوش ہوا اور بڑے عزو احترام کے ساتھ اُس کو اور اُس کی جمعیت کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا۔ جس زمانے میں علافیوں نے جنوبی و مشرقی بلوچستان میں بدامنی پھیلا رکھی تھی اُسی زمانے میں افغانستان و شمالی بلوچستان میں عبدالرحمٰن بن محمد مع ایک زبردست لشکر کے حجاج کی مخالفت پر آمادہ اور مصروف بغاوت تھا۔ حجاج کے لیے یہ بہت پریشانی کے ایام تھے اور وہ کسی نئی جنگ کے چھیڑنے کو نامناسب سمجھتا تھا مگر اس نے جب محمد بن حرث علافی کے اس طرح بچکر نکل جانے اور راجہ داہر کی گود میں جا کر بیٹھ جانے کا حال سنا تو خلیفہ عبدالملک بن مروان کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ ملک سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت دی جائے کیونکہ اس ملک میں سلطنت اسلامیہ کے باغیوں کو نہ صرف پناہ دی جاتی ہے بلکہ اُن کی خوب خاطر مدارات کی جاتی ہے خلیفہ عبدالملک نے اس درخواست کے منظور کرنے اور ایک نئی لڑائی کے شروع کرنے میں تامل کیا۔ ابھی یہ درخواست زیر غور ہی تھی کہ عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ ادھر جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے محمد بن حرث علافی نے اپنی شجاعت و بہادری دکھا کر اور راجہ داہر کے دارالسلطنت آلور کو نہایت قوی دشمن کے پنجے سے بچا کر وزارت کا عہدہ حاصل کیا اور اُس کا نام سلطنت سندھ کے ستون میں مسکوک ہوا۔ علافیوں کے اس واقعہ کو اس لیے درج کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ بھی سندھ پر مسلمانوں کی حملہ آوری کا ایک نہایت معقول سبب ہو سکتا تھا مگر مسلمانوں کی طرف سے دانستہ یا مجبورانہ جو کچھ بھی سمجھو درگذر اور چشم پوشی ہی کا اظہار رہا۔ نیز اس واقعہ سے یہ بھی ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری سے آٹھ سال پہلے پانسو بہادر جنگجو مسلمان سندھ میں آکر آباد ہو چکے تھے اور وہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری تک راجہ داہر کی حکومت کے لیے ایک زبردست پشتی بان تھے اور جب اس ملک پر محمد بن قاسم نے حملہ کیا تو اسی علافی لشکر

نے اسلامی لشکر کا سب سے زیادہ بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔

جزیرہ سراندیپ اور علاقہ ملابار میں بکثرت مسلمان آباد تھے لکدیپ اور مالدیپ کے جزیرے بھی مسلمان ہو چکے تھے۔ سراندیپ کا راجہ اس سے پہلے مسلمان ہو چکا تھا مسلمانوں کے ساتھ اس کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ سلطنت اسلامیہ اب چونکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی لہذا سراندیپ کے راجہ کو اپنی حفاظت و عافیت کے لیے بھی اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ سلطنت اسلامیہ سے باقاعدہ تعلق پیدا کرے چنانچہ راجہ نے حجاج بن یوسف ثقفی کی عنایات کو اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے آٹھ جہازوں کا ایک بیڑا تیار کیا۔ ان جہازوں میں سراندیپ کے قیمتی تحائف بار کیے گئے۔ سراندیپ کے رہنے والے مسلمانوں اور مسلمان سوداگروں میں سے بعض اشخاص ان جہازوں میں اس لیے سوار ہوئے کہ اپنے وطن پہنچیں اور حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ بعض عرب سوداگر سراندیپ میں فوت ہو گئے تھے۔ اُن کی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے ملک عرب میں واپس جانے کے خواہاں تھے اُن کو بھی ان جہازوں میں سوار کرا دیا گیا۔ حجاج کے لیے یہ بیڑا جو قیمتی ہدایا کے علاوہ حاجیوں، یتیموں اور بیواؤں کو بھی اُن کی منزل مقصود تک لا رہا تھا نہایت قیمتی چیز تھا۔ یہ جہاز جب بحر عمان میں داخل ہونے لگے تو باد مخالف نے ان کو سمندر میں آوارہ و بے قابو کر کے ساحل دیبل پر پہنچا دیا۔ دیبل سندھ کا بندرگاہ اور راجہ داہر کے مشہور شہروں میں سے ایک شہر تھا۔ یہاں راجہ کا ایک گورنر اور سپہ سالار رہا کرتا تھا۔ ان جہازوں کو بندرگاہ میں خوب دھڑی دھڑی کر کے لوٹا گیا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے جہازوں کو سندھی بیڑے میں شامل کر لیا گیا ان مصیبت زدہ لوگوں میں سے کوئی ایک دو شخص کسی طرح بچ کر نکل بھاگا اور اس نے پہنچ کر جہازوں کے لٹنے۔ عورتوں بچوں اور عازمان حج کے گرفتار ہونے کی دلخراش داستان حجاج کو سنائی اور یہ بھی بتایا کہ ایک بیوہ عورت پر جب تشدد ہوا تو وہ بے اختیار چلا اٹھی کہ یا حجاج اغثنی (اے حجاج مجھے بچاؤ) یہ بھی کہا کہ راجہ سراندیپ کے کارندوں نے بھی ہر چند سمجھایا کہ ہمارے راجہ کے جہاز ہیں اور اس نے ہم کو بطریق سفارت بھیجا ہے تم درگذر کرو اور ہم کو جانے دو مگر انھوں نے کچھ نہیں سنا اور سب کو گرفتار کر لیا۔ حجاج کو اس حادثہ کی کیفیت سن کر سخت ملال ہوا اور اس نے فوراً راجہ داہر کو ایک خط لکھا کہ

”تمھارے سرداروں نے بے گناہ مردوں۔ عورتوں اور بچوں کو گرفتار اور جہازوں پر معہ تحائف و اموال قبضہ کر لیا ہے۔ جہاز معہ سامان ہمارے پاس بھجوا دیجیے اور بے گناہوں کو آزاد کر کے اپنے سرداروں کو سزا دیجیے“

جب حجاج کے قاصد یہ خط لیکر داہر کے پاس پہنچے تو داہر نے اس معقول اور شرافت آموز خط کا جواب نہایت بے پروائی کے ساتھ یہ دیا کہ جہازوں کے لوٹنے والوں پر ہمارا بس نہیں چلتا تم خود اُن سے آکر اپنے قیدی چھڑالو اور اپنا مال و اسباب لے لو۔ راجہ داہر کے اس جواب کے ساتھ جب اس بات کو بھی ذہن میں رکھا جائے کہ جہازوں کے مسافر قیدی حجاج کا خط پہنچنے سے پہلے دارالسلطنت الور میں پہنچے ہوئے جیلخانہ میں موجود تھے تو راجہ کے اس جواب کی نامعقولیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے اب ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے حملہ آوری کا استحقاق پیدا ہو گیا تھا یا نہیں۔ اگر اب بھی اسلامی لشکر حملہ آور ہونے میں تامل کرتا اور اپنے قیدیوں کو چھڑانے اور راجہ داہر کو سزا دینے میں تساہل سے کام لیتا تو اس سے بڑھکر سلطنت اسلامیہ کے وقار کو نقصان پہنچانے والی دوسری بات نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کہنا کہ مسلمان ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے بلاوجہ حملہ آور ہوئے تھے کس قدر غلط اور جھوٹ ہے۔ اسی جھوٹ اور کذب و افترا کا پردہ چاک کرنے کے لیے یہ تمام کیفیت بیان کی پڑی ہے جو تاریخ سندھ معصومی چچ نامہ اور دوسری مختلف تاریخوں سے ماخوذ و ملخص ہے تاریخ فرشتہ کے مختصر الفاظ یہ ہیں کہ

> "حاکم سراندیپ چوں بسلاطین اسلام اعتقاد فراواں داشت از دریا کشتی مملو از تحف و ہدایا و غلامان و کنیزاں جہت ولید روانۂ دارالخلافۃ ساخت و چوں بحوالی باب عجم رسید مردم نوماکہ بحکم حاکم دیبل بر روئے دریا متردد دیدند سر راہ بر آں کشتی گرفتہ با ہفت کشتی دیگر بتصرف در آوردند و اموال و اشیائے کہ در آنہا بود از خود گرفتہ چند زن مسلمان کہ از سراندیپ روانہ حج بودند آنہا را اسیر ساختند و جمعیکہ از دست آں کفار اشرار توفیق گریختن یافتہ بودند نزد حجاج رفتہ داد خواہ شد ند حجاج مکتوبے بحاکم سندھ داہر بن صعصہ نوشتہ نزد محمد ہارون فرستاد تا بدست معتمدان خود نزد داہر فرستد داہر بعد ورود نامہ و اطلاع بر مضمون آں در جواب نوشت کہ ایں عمل از قومے بوقوع آمدہ کہ در کمال شوکت و قوت اند و بہشیاری سعی دفع آں گروہ برشکوہ متصور نیست چوں ایں خبر بحجاج رسید از ولید بن عبدالملک رخصت غزا حاصل کردہ بُدیل شخصے را با سی صد سوار نزد محمد ہارون فرستاد"

فرشتہ کے ان الفاظ سے کہ داہر نے جواب میں لکھا کہ "یہ کام ایک ایسی قوم سے وقوع پذیر ہوا ہے جو بہت بڑی قوت و شوکت رکھتی ہے اور کسی کوشش کے ذریعہ اس گروہ کا دفع کرنا ممکن نہیں" لوگوں کو یہ دھوکا لگا ہے کہ داہر کا یہ مطلب تھا کہ بحری ڈاکوؤں نے جہازوں کو لوٹا ہے اور ہم اُن ڈاکوؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے حالانکہ فرشتہ کے الفاظ میں داہر کا جواب یہ ہے کہ حاکم دیبل کے حکم سے جن لوگو

نے جہازوں کو لوٹا وہ اس قدر شوکت و قوت رکھتے ہیں کہ تم اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مدعا یہ کہ ہاں!
ہم نے تمہارے آدمیوں کو قید کیا اور تمہارے جہازوں کو لوٹا ہے اور تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اسی لیے
حجاج کو ولید بن عبدالملک سے لڑائی کی اجازت لینی پڑی۔ فرشتہ سمندر کے طوفان اور باد مخالف کا
ذکر نہیں کرتا اور اس لیے اُس نے بندر دیبل کے اندر جہازوں کے لٹنے اور گرفتار ہونے کا ذکر نہیں کیا حالانکہ
دوسرے تمام مورخ جہازوں کا طوفان کے سبب بندر دیبل میں آنا بیان کرتے ہیں۔ چونکہ فرشتہ کو اختصار
مدنظر تھا اور اُس کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ کسی آیندہ زمانہ میں یہ واقعہ اس قدر غور و خوض کا مقام بنے گا لہٰذا اس
نے غیر ضروری سمجھکر تفصیلات کو ترک کر دیا۔ بحری ڈاکوؤں کو پرتگیزوں کے بحر ہند میں آنے سے پہلے
کوئی جانتا ہی نہ تھا نہ بحر عرب میں پہلی صدی ہجری کے اندر کسی بحری ڈاکہ زنی کا کہیں ذکر آتا ہے۔
نہ اُس زمانے میں یہ ممکن تھا کہ محض ڈاکو جو کسی سلطنت کے ملازم نہ ہوں اتنا بڑا اور طاقتور جہازوں کا
بیڑا لیے ہوئے سمندر میں گھومتے پھریں کہ نہ صرف ایک جہاز بلکہ آٹھ جہازوں کے بیڑے کو باسانی مغلوب
کر سکیں یہ بحری ڈاکوؤں کی کہانی بارھویں صدی عیسوی سے بعد کی ایجاد ہے۔ اگر اس کہانی کو
صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا ہے تو وہ
عورتیں اور بچے جو ان جہازوں پر سے قید کیے گئے تھے دارالسلطنت آلور کے قید خانے سے برآمد ہوئے
اصلیت یہ تھی کہ راجہ داہر کو سلطنت اسلامیہ کی بغاوتوں سے خصوصی دلچسپی تھی۔ افغانستان و بلوچستان
کے علاقوں میں واقعۂ کربلا کے بعد سے ۸۵ھ تک یعنی بیس پچیس سال تک سلطنت اسلامیہ کا رعب و اقتدار خطرہ
اس لیے معرض خطر میں رہا کہ خود مسلمان عامل مرکزی حکومت سے باغی ہوتے رہے راجہ داہر مسلمانوں
کی اس خانہ جنگی کو بنظر استحسان دیکھتا رہا۔ اگر بات یہیں تک ہوتی تب بھی راجہ داہر خطاوار نہ تھا۔
لیکن اُس نے پیہم باغیوں کو اپنے یہاں پناہ دی اور خارجیوں۔ زندیقوں اور شاہی مجرموں کو سندھ
میں پناہ ملتی رہی چنانچہ ملتان اور آلور میں محمد علافی کے آنے سے بھی پہلے بعض باغیان حکومت
اسلامیہ کے موجود ہونے کا ذکر ابوالفدا و ابن خلدون وغیرہ تاریخوں میں موجود ہے۔ غالباً انھیں باغیوں
کی موجودگی کا یہ اثر ہوگا کہ داہر سلطنت اسلامیہ کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اُس نے خود مسلمانوں
کو حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور سلطنت ایران کے صوبے مسلمانوں کے قبضے میں نہ دیکھ سکا اور اُن
کو خود اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اگر اُس کو مسلمانوں کی طاقت کا صحیح اندازہ
ہوتا تو وہ حجاج کے خط کو ایک نہایت موزوں ذریعہ تعارف اور تحریک اتحاد قرار دیکر قیدیوں کو
عزت کے ساتھ بھیجدیتا اور معذرت کر کے آیندہ کے لیے تعلقات دوستی قایم کر لیتا۔

سندھ پر حملہ حجاج کے پاس جب راجہ داہر کا جواب پہنچا جس میں جہازوں کا مال واپس کرنے اور قیدیوں کے چھوڑنے سے انکار اور خود حجاج کو مقابلہ پر بلانے کا چیلنج موجود تھا تو حجاج نے عبداللہ بن نابہان اسلمی کو ایک مختصر فوج دیکر روانہ کیا کہ جاکر دیبل پر قبضہ کر لے۔ عبداللہ اسلمی ابھی دیبل تک نہیں پہنچا تھا کہ راستے ہی میں داہر کے بیٹے کیشب رجے سیہ نے جنوبی بلوچستان میں پیش قدمی کرکے اُس کا مقابلہ کیا اور عبداللہ اسلمی اس لڑائی میں شہید اور اُس کی فوج شکست یاب ہوئی۔ اس ناکامی کا حال جب حجاج کو معلوم ہوا تو اُس نے بُدیل مجالی کو چار ہزار فوج دیکر روانہ کیا اور محمد ہارون عامل مکران کو لکھا کہ حسب ضرورت بُدیل کی مدد کرے۔ بُدیل اپنا لشکر لیے ہوئے ابھی دیبل نہیں پہنچا تھا کہ کیشب ابن داہر ایک زبردست فوج اور جنگی ہاتھیوں کا بہت بڑا حلقہ لیئے ہوئے سد راہ ہوا۔ طرفین نے خوب خوب دادمردانگی دی اور صبح سے شام تک معرکہ کارزار گرم رہا آخر ہاتھیوں کے حملہ سے بدیل کا گھوڑا ایسا بھڑکا کہ بُدیل گھوڑے سے گرا مگر وہ پیدل ہی لڑتا رہا یہاں تک کہ دشمنوں کے نرغہ میں آکر شہید ہوا اور اسلامی لشکر کے اکثر حصے نے بدیل کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔ چند بقیۃ السیف نے جاکر حجاج کو اس شکست اور اسلامی لشکر کی تباہی کا حال سُنایا۔ اب حجاج کی آنکھیں کُھلیں اور اُس نے سمجھا کہ سندھ کا راجہ مقابلہ کی کافی تیاری کر چکا ہے اور اس کا تدارک خصوصی اہتمام اور خلیفہ کی دوبارہ منظوری کا محتاج ہے چنانچہ اُس نے ولید بن عبدالملک کی خدمت میں پھر ایک درخواست بھیجی اور ملک سندھ پر چڑھائی کرکے اُس کے فتح کرلینے کی اجازت چاہی۔ خلیفہ نے اس درخواست کو بہت تامل کے بعد اُس وقت منظور کیا جبکہ حجاج نے اس مہم کے لیے اپنی ذات پر بہت سی ذمہ داریاں عاید کیں۔ عبداللہ اسلمی اور بدیل کے مقتول ہونے کا حال سن کر شہر نیرون (ملک سندھ) کے امرا نے جو سب بودھ مذہب کے پیرو تھے آپس میں مشورہ کیا کہ راجہ داہر نے مسلمانوں سے جنگ چھیڑ کر بڑی غلطی کی ہے۔ اگرچہ ان ابتدائی معرکوں میں راجہ کی فوج کو فتح حاصل ہوئی ہے لیکن اب مسلمان اپنے مقتولوں کا عوض لیے بغیر ہرگز باز نہ آئیں گے اور وہ ضرور ملک سندھ پر حملہ آور ہوکر اس کو فتح کرلیں گے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کی اس حملہ آوری سے پہلے ہی اپنے لیے امان طلب کریں ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں گیہوں کے ساتھ گھُن نہ پس جائے۔ چنانچہ اہل نیرون نے خفیہ طور پر اپنا ایلچی حجاج کی خدمت میں روانہ کرکے درخواست کی کہ ہم اپنے اوپر آپ کی مالگذاری تسلیم کرتے ہیں جو بلاچون وچرا ادا کی جائے گی آپ ہمکو امان نامہ لکھدیجیے۔ حجاج نے فوراً امان نامہ لکھکر ایلچی کے

سپرد کیا اور اہل بیرون اس سے بہت مطمئن ہو گئے۔

محمد بن قاسم کی سندھ کی جانب روانگی

حجاج نے جب ملک سندھ پر حملہ کی تیاری کرنا چاہی تو سب سے پہلے عامر بن عبد اللہ نے اپنے آپ کو پیش کیا کہ مجھے اس مہم کا سردار بنایا جائے مگر حجاج نے اپنے داماد محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابی عقیل ثقفی کو جو فارس کا گورنر اور صرف سترہ سال کی عمر کا نوجوان تھا انتخاب کیا۔ محمد بن قاسم شیراز میں مقیم اور فارس کی فرمانروائی میں بڑی قابلیت اور دانائی کا اظہار کر چکا تھا۔ حجاج نے محمد بن قاسم کو شیراز سے اپنے پاس طلب کر کے مناسب ہدایات کیں عراقیوں کے مقابلے میں چونکہ شامیوں پر زیادہ اعتماد تھا اس لیے ملک شام کے چھ ہزار شریف و تجربہ کار اور بہادر سپاہی جنھوں نے ملک حجاز سے آ کر شام میں سکونت اختیار کر لی تھی محمد بن قاسم کے ساتھ کیے۔ یہ تمام وہ لوگ تھے جن کی نسبت حجاج کو یقین تھا کہ یہ ہمیشہ اپنے سردار کے وفادار و خیر خواہ رہیں گے اور کسی موقع پر بھی بزدلی یا پست ہمتی کا اظہار نہ کریں گے نہ کبھی اپنے سردار کی نافرمانی کا خیال دل میں لائیں گے۔ یہ چھ ہزار سوار بمنزلہ شاہی معتمد رسالہ کے تھے۔ حجاج نے محمد بن قاسم کو حکم دیا کہ تم ان چھ ہزار سواروں کو لیکر شیراز میں پہنچو اور میری ہدایات اور باقی فوج کا انتظار کرو چنانچہ محمد بن قاسم شیراز پہنچا حجاج نے چھ ہزار عراقی فوج جو شتر سوار تھی عقب سے بھیجی تین ہزار اونٹ بار برداری کے لیے الگ روانہ کیے اس طرح بارہ ہزار اسپی و شتری سوار اور تین ہزار بار برداری کے اونٹ تھے یعنی ہر چار سپاہیوں کا سامان ایک ایک اونٹ پر لدا ہوا تھا۔ تمام سامان یہاں تک کہ سوئی تاگا تک بھی سپاہیوں کے لیے مہیا کر دیا گیا تھا تاکہ کسی چیز کی اُن کو سفر میں تکلیف نہ ہو۔ محمد بن قاسم کو حجاج نے حکم دیا تھا کہ روزانہ اپنے اور تمام لشکر کے حالات میرے پاس لکھکر بھیجتے رہو اور میرے احکام جو تمھارے پاس برابر پہنچتے رہیں گے اُن کی پوری پوری تعمیل کرو۔ یہ لشکر شیراز سے روانہ ہو کر مکران پہنچا تو محمد بن ہارون عامل کرمان نے محمد بن قاسم کا استقبال کیا اور اپنی تین ہزار فوج لیکر محمد بن قاسم کے ہمراہ ہو گیا۔ مکران سے چلکر یہ لشکر جب ارمن بیلہ میں پہنچا تو یہاں راجہ داہر کا لشکر موجود تھا جو شکست کھا کر فرار ہوا۔ اسی جگہ یعنی ارمن بیلہ یا اربابیل میں محمد بن ہارون فوت ہو گیا۔ محمد بن قاسم اُدھر شیراز سے فوج لیکر روانہ ہوا ادھر حجاج نے بصرہ سے حزم بن مغیرہ کی سرکردگی میں جہازوں کا ایک بیڑا روانہ کیا جس میں سامان رسد کے علاوہ قلعہ کشائی کے آلات اور منجنیقیں بھی تھیں ان میں ایک منجنیق جس کا نام عروساک تھا سب سے بڑی تھی جس کو پانچسو آدمی کھینچتے تھے۔ اس منجنیق کو چلانے والا استاد جعونہ نامی ایک شامی تھا جو بڑا

قادر انداز تھا۔ محمد بن قاسم جب دیبل پہنچا تو بیڑا بھی دیبل پہنچ گیا اور اس سے لشکر اسلام کو بڑی قوت
حاصل ہوئی۔

دیبل کی فتح

اسلامی لشکر نے آتے ہی دیبل کا محاصرہ کیا آٹھ دن تک میدان کارزار گرم رہا اور
داہر کے بیٹے کیشب نے جس کو اسلامی تاریخوں میں جیسیہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے
محصور ہو کر بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ دیبل شہر کے وسط میں ایک بہت بڑا مندر تھا اُس کے اندر بودھ
کی مورت براجمان تھی مندر کا گنبد بہت بڑا اور بلند تھا جو دور دور سے نظر آتا تھا اس گنبد کی چوٹی پر
ایک بہت لمبے بانس میں.... پھریرا آویزاں تھا۔ اس عَلم کی نسبت شہر والوں کا اعتقاد تھا کہ جبتک
یہ ہوا میں لہرا رہا ہے شہر کو کوئی فوج فتح نہیں کر سکتی شہر والوں کے اس عقیدے کا حال محمد بن قاسم کو
معلوم ہوا تو اُس نے جعونہ منجنیقی کو بلا کر حکم دیا کہ اس جھنڈے کو نشانہ بناؤ جعونہ نے منجنیق میں پتھر رکھکر
اس خوبی کے ساتھ پھینکا کہ پہلے ہی پتھر میں وہ جھنڈا ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔ اس کا شہر والوں اور خود
اُن کے سپہ سالار جے سیہ پر یہ اثر ہوا کہ سب نے ہمّت ہار دی۔ جے سیہ چار ہزار فوج لیکر راتوں
رات شہر سے نکل بھاگا اور کچھ فوج شہر کی حفاظت اور مدافعت کے لیے چھوڑ گیا جو برابر مصروف مدافعت
اور مشغول جنگ رہی۔ آخر مسلمانوں نے بزور شمشیر دیبل کو فتح کر لیا۔ سب سے پہلے جو شخص فصیل شہر
پر چڑھا وہ خزیمہ کوفی اور اُس کے بعد دوسرا شخص عجل بن عبدالملک بصری تھا۔ جو شخص ہتھیار بند اور برسر
مقابلہ تھے گرفتار کر کے محمد بن قاسم کے سامنے لائے گئے۔ عام باشندگان شہر کے لیے معافی اور امن وامان
کا اعلان ہوا۔ دیبل کے جیلخانہ کا محافظ بھی گرفتار ہو کر محمد بن قاسم کے روبرو آیا اُس نے ترجمان کے ذریعہ
اپنی بے گناہی اور مسلمانوں کی خیرخواہی کا ثبوت اس طرح پیش کیا کہ بدیل کی فوج کے جو لوگ سندھی
فوج نے گرفتار کیے تھے وہ دیبل کے جیلخانہ میں میرے زیر نگرانی رکھے گئے تھے میں نے ان مسلمان قیدیوں
کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کیا اور روزانہ اُن کو تمھاری فتوحات اور آمد کی خبریں سُنا سُنا کر مسرور
کرتا رہا اور اب جبکہ جے سیہ یہاں سے چلا گیا اور آپ نے فصیل شہر پر قبضہ کیا تو میں نے اُنکو جیلخانہ سے
رہا کر دیا جو سب کے سب وہاں سے نکلتے ہی آپ کے لشکر میں شامل ہو گئے آپ ان تمام باتوں کو
اُن سے تصدیق فرما سکتے ہیں۔ محمد بن قاسم نے اُن کو بُلا کر تصدیق چاہی تو اُنھوں نے کہا کہ یہ ایک
بہت بڑا پنڈت اور اپنے مذہب کا عالم فاضل شخص معلوم ہوتا ہے اس نے ہمارے ساتھ بڑی مہربانی کا
برتاؤ کیا ہے اور یہ اسلام کا دل سے معتقد ہو چکا ہے محمد بن قاسم نے اُس پنڈت کا بہت شکریہ ادا
کیا اور اُس حسن سلوک کے عوض اُس کو شہر دیبل کا حاکم اعلیٰ مقرر کر کے حمید بن ذراع کو اُس کی ماتحتی

ہیں دیبل کا شحنہ یا پولیس افسر مقرر کیا۔ غیر مصافی لوگ اور اُن کی جائداد و اموال بالکل محفوظ رہے۔ سامان جنگ۔ شاہی اموال و خزائن جو دیبل میں موجود تھے وہ فاتحین کے قبضے میں آئے۔ ان اموال کا پانچواں حصّہ حجاج کے پاس روانہ کیا گیا باقی فوج میں تقسیم ہوئے۔ دیبل کے مفتوح ہونے کا حال سنکر راجہ داہر نے محمد بن قاسم کو ایک خط لکھا جس میں اُس کو اپنی قوت و شوکت سے ڈرایا گیا تھا کہ تم اس فتح پر مغرور نہ ہو جانا ہم تمھارا تسمہ بھی لگا نہ چھوڑیں گے اور اچھی طرح اس گستاخی کا مزا چکھائیں گے۔ محمد بن قاسم نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ۔

"ہم نے آپ پر آپ کی اس بداعمالی کے سبب چڑھائی کی ہے کہ آپ نے سراندیپ کے جہازوں کا مال جو خلیفہ کے لیے جاتا تھا لوٹ لیا اور بے گناہ مسلمانوں کو پکڑ کر قید کیا۔ عورتوں بچوں کو لونڈی غلام بنایا ہمارے خلیفہ کے فرمان کا ادب ساری دنیا کرتی ہے مگر آپ نے اس کا کچھ بھی پاس نہ کیا۔ مجھکو خلیفہ نے حکم دیا ہے کہ آپ کو اس گستاخی و بداعمالی کی سزا دوں۔ آپ نے جو اپنی شوکت و قوت کی نسبت لکھا ہے اُس سے اطلاع حاصل ہوئی مگر ہم لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔"

محمد بن قاسم کے اس جواب میں حملہ آوری کی وجہ صاف طور پر مذکور ہے اس لیے ہمکو اب زیادہ تلاش و جستجو میں رہنے کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں نے سندھ کو کس طرح فتح کیا

دیبل کی فتح اور انتظام سے فارغ ہوکر محمد بن قاسم نیرون کی جانب گیا۔ اس شہر کے امرا نے پہلے ہی حجاج سے امان طلب کر لی تھی چنانچہ یہ لوگ مناسب تحف و ہدایا اور سامان رسد لیکر اپنے شہر سے چلے اور راستے میں لشکر اسلام سے ملکر محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوئے سامان رسد اور تحف و ہدایا پیش کیے اور نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ محمد بن قاسم کو اپنے شہر میں لے گئے۔ محمد بن قاسم نے بھی ان لوگوں کے ساتھ نہایت محبت و اخلاق کا برتاؤ کیا اور کسی قسم کا نقصان اس شہر کو نہیں پہنچا۔ یہاں سے محمد بن قاسم بہروج کی طرف روانہ ہوا وہاں راجہ داہر کے بھتیجے نے قلعہ بند ہوکر سات روز تک مقابلہ کیا۔ آخر ایک روز رات کو موقع پاکر فرار ہوا اور شہر کو مسلمانوں نے فتح کر لیا اس کے بعد جاٹوں کے ایک لشکر نے اسلامی فوج پر شبخوں مارنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے بہت سے جاٹ گرفتار ہوکر آئے محمد بن قاسم نے اُن کو نصیحت کرکے رہا کر دیا اور کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ ان لوگوں نے جب مسلمانوں کو اس قدر رحم دل اور بُردبار دیکھا تو اُن کے دلپر

اسلامی اخلاق کا بہت ہی گہرا اثر ہوا اور یہی عفو و درگذر کا سلوک تھا جس نے جاٹوں کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ بخوشی دین اسلام قبول کر لیں۔

سیوستان میں راجہ داہر کا بھتیجا بجھرا (بجے رائے) حکمراں تھا جب محمد بن قاسم نے اس طرف کا عزم کیا تو وہ مقابلہ پر آمادہ ہوا لیکن باشندگان شہر نے جن میں بدھ مذہب کے بڑے بڑے عالم بھی تھے ایک جلسہ کر کے یہ طے کیا کہ چونکہ مسلمانوں سے جو شخص امان طلب کرتا ہے وہ اس کو امان دیتے اور اپنے وعدوں کو ضرور پورا کرتے ہیں اس لیے ان سے لڑنا اور جنگ کرنا مفید نہیں ہے چنانچہ انھوں نے بجے رائے کی خدمت میں عرض کیا کہ مسلمانوں کا مقابلہ نہ کیجیے اور صلح و آشتی سے کام لیجیے مسلمان درخواست صلح کو رد نہیں کرتے اور کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیتے لہذا کشت و خون کا ہنگامہ برپا کرنا فضول ہے۔ مگر بجے رائے نے اُن کی بات کو نہ مانا اور فوج آراستہ کر کے مقابلہ پر آ ڈٹا۔ کئی روز تک لڑائی جاری رہی ایک روز بجے رائے نے اپنا ایک جاسوس مسلمانوں کے لشکر میں بھیجا اس جاسوس نے مسلمانوں کو نماز با جماعت پڑھتے ہوئے دیکھا اور جا کر کہا کہ یہ لوگ اس قدر متحد و متفق ہیں کہ ان کا مغلوب کرنا سخت دشوار ہے۔ بجے رائے مرعوب ہو کر رات ہی کو سیوستان سے فرار ہو گیا اور مسلمانوں کا سیوستان پر قبضہ ہوا۔ محمد بن قاسم نے یہاں کے باشندوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور یہاں کے پنڈتوں کو انعام و اکرام سے بہرہ ور کر کے ملک کے انتظامی عہدوں پر مامور کیا۔ فتح سیوستان کے بعد اسلامی لشکر مقام بدھیہ کی طرف بڑھا یہاں کا حاکم کاکا نامی بڑا بہادر اور سیاست داں تھا اُس کے پاس جاٹوں کی ایک زبردست فوج تھی اس فوج کے سپہ سالار کا نام بہن تھا۔ کاکا کو مسلمانوں کی فتوحات اور اُن کے اخلاق و عادات کا بخوبی علم تھا۔ اُس نے ایک مجلس مشورت منعقد کر کے کہا کہ مسلمان ہندوستان کو ضرور فتح کر لیں گے جیسا کہ میں نے پرانے نوشتوں میں بزرگوں کی پیشگوئیاں دیکھی ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنا خطرات سے خالی نہیں تم کو معلوم ہے کہ میری بہادری اور جنگ جوئی مسلمہ ہے میں بہت سے بڑے بڑے معرکوں میں ناموری حاصل کر چکا ہوں میری رائے یہ ہے کہ ہم کھلے میدان اور دن کی روشنی میں اُن کا مقابلہ نہ کریں بلکہ اُن پر شبخون ماریں اسی طرح کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے چنانچہ نہایت تجربہ کار اور بہادر جاٹ انتخاب کر کے ایک ہزار کا لشکر شبخون مارنے پر متعین کیا گیا یہ لشکر راستہ بھول جانے کی وجہ سے اسلامی لشکر گاہ تک نہ پہنچ سکا اور صبح تک ریگستان میں آوارہ رہا۔ اس ناکامی کو دیکھ کر اگلے دن کاکا معہ اپنے سرداروں اور امیروں کے لشکر اسلام کی طرف روانہ ہوا راستہ میں نباتہ بن حنظلہ سے جو اسلامی لشکر کے مقدمۃ الجیش کا سردار تھا ملاقات ہوئی

کاکا کی خواہش پر بنانہ کا کاکو محمد بن قاسم کے پاس لے گیا محمد بن قاسم بڑی عزت کے ساتھ کا کا سے ملا۔ اُس نے شبخون کا حال سُنا کر کہا کہ اب میں آپ کی فرمانبرداری کا اقرار کرتا ہوں۔ محمد بن قاسم نے کا کا کو "امیر ہند" کہکر مخاطب کیا اور کہا کہ تمھارے یہاں خلعت کا کیا دستور ہے اُس نے کہا کہ ہم لوگ قوم کے جاٹ اور بودھ مذہب کے پیرو ہیں ہمارے یہاں کا دستور ہے کہ جب راجہ کسی شخص کو معزز قرار دیتا ہے تو اُس کو سردربار ریشمین لباس پہنا کر اور سر پر پگڑی باندھکر کرسی پر بٹھایا جاتا ہے محمد بن قاسم نے اسی طرح کا کا کو خلعت پہنا کر کرسی پر بٹھایا اور اُس کی عزت کو بڑھایا اس کے بعد کاکا محمد بن قاسم کے ہمراہ بطور مشیر و مصاحب رہنے لگا محمد بن قاسم نے انتظام ملک اور امور مہمہ میں کاکا کے مشورہ کو ضروری خیال کیا کاکا کو اسلامی لشکر کے ایک حصہ کی سپہ سالاری بھی عطا کی گئی کاکا کی تحریک سے بہت سے جاٹ اسلامی لشکر میں بھرتی ہوگئے کاکا کے بعد اور بھی چھوٹے چھوٹے رئیسوں نے اطاعت قبول کی اور محمد بن قاسم نے کاکاہی کے مشورہ سے اُن پر زرخراج مقرر کیا۔ اس طرح محمد بن قاسم دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا تمام ملک فتح کرتا ہوا شمال کی جانب دور تک چلا گیا۔ بجے رائے نے قلعہ سیسم پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ محمد بن قاسم کا مقابلہ کیا اور لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ابھی چونکہ راجہ داہر کا مقابلہ باقی تھا لہذا بجے رائے سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم جنوب کی جانب واپس ہوا اور مقام نیرون میں آکر قیام کیا جس قدر علاقہ فتح کر چکا تھا اُس کا بخوبی بندوبست کر دیا۔ نیرون میں مسلمانوں کے لیے ایک مسجد بنوائی اور باشندگان سندھ نے اسلام سے واقف ہوکر بخوشی اسلام میں داخل ہونا شروع کیا۔ ان نومسلموں میں جاٹوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی محمد بن قاسم کے پاس حجاج کا خط پہنچا کہ اب دریا کو عبور کرو اور راجہ داہر سے فیصلہ کن جنگ کرنے اور بے گناہ مظلوم مسلمانوں کا انتقام لینے میں پس وپیش اور تامل نہ کرو چنانچہ محمد بن قاسم نیرون سے لشکر لیکر چلا دریا کے کنارے ایک ہندو سپہ سالار موکا پسر بسایا اور اُس کے بھائی راسل پسر بسایا نے مقابلہ کیا۔ اسلامی لشکر کو فتح حاصل ہوئی۔ راسل تو دریا کو عبور کر کے داہر کے پاس چلا گیا مگر موکا معہ تیس سرداروں کے محمد بن قاسم کے پاس چلا آیا۔ محمد بن قاسم نے اُس کی خوب خاطر مدارات کی اور جس حصۂ ملک پر وہ حاکم تھا اُس کی سند حکومت لکھکر اُس کو دیدی اور موکا کو کاکا کی طرح خلعت عطا کرکے بہت سا نقد انعام بھی اپنے پاس سے دیا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ دیبل کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے وہاں کا حاکم اعلی ایک پنڈت کو مقرر کیا تھا۔ اس پنڈت نے اگرچہ شروع ہی سے اپنے آپ کو مسلمانوں کا ہمدرد ثابت کیا تھا۔ اب اسلام سے کماحقہ واقف ہوئے اور مسلمانوں کی بلند حوصلگی کا معائنہ کرنے کے بعد

اُس نے نیرون میں آکر محمد بن قاسم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور مولائے اسلام یا مولانا اسلامی کا
خطاب پایا محمد بن قاسم نے مولانا اسلامی کو سفارت کے لیے منتخب کیا اور اُن کے ہمراہ ایک شامی سردار
کو بھی راجہ داہر کے پاس روانہ کیا۔ یہ سفارت جب راجہ داہر کے دربار میں پہنچی تو داہر نے شامی سے تو
کچھ نہ کہا مگر مولانا اسلامی سے کہا کہ تو نے قدیمی دستور کے موافق مجھکو سلام کیوں نہیں کیا مولانا اسلامی
نے کہا کہ میں اب مسلمان ہو چکا ہوں ہم مسلمان نہ غیر اللہ کے سامنے جھکتے ہیں نہ کافروں کو سلام کرنا
ضروری سمجھتے ہیں داہر نے کہا اگر تو ایلچی بنکر نہ آیا ہوتا تو میں تجھکو ابھی قتل کرا دیتا مولانا اسلامی نے کہا
کہ اگر تو مجھکو قتل کرتا تو مسلمان تجھ سے ضرور میرے خون کا بدلہ لیتے آخر اس سفارت نے محمد بن قاسم کا پیغام
سُنایا کہ یا تو تم اپنا لشکر لیکر دریا کے اس طرف آجاؤ یا ہمکو اجازت دو کہ ہم دریا کے اُس طرف عبور کر آئیں
اور تم سے نبرد آزما ہوں اس پیغام کو سُن کر راجہ داہر نے وزیر سی ساگر سے مشورہ کیا۔ سی ساگر نے کہا کہ
مسلمانوں کو دریا کے اس طرف اُتر آنے دو اُن کی پشت پر دریا اور سامنے ہمارا لشکر ہوگا اس طرح
سب کے سب مارے جائیں گے اور فرار ہو کر جان بچانے کا موقع نہ پا سکیں گے۔ راجہ داہر نے سی ساگر
کے بعد محمد علافی سے مشورہ لیا تو اُس نے کہا کہ سی ساگر نے عربوں کی بہادری کا صحیح اندازہ نہیں کیا
اور اُس کو شاید یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ملک سندھ کے تمام باشندے عربوں سے مرعوب و خائف
ہو رہے ہیں ایسی حالت میں اگر یہ لوگ دریا کو عبور کر آئے تو تمام ملک میں بد دلی پھیل جائے گی
اور ان کا مقابلہ سخت دشوار ہوگا کیونکہ یہ لوگ میدان جنگ سے فرار ہونا جانتے ہی نہیں اور مرنے کے
اس طرح خواہشمند ہیں جیسے کہ دوسرے لوگ زندگی کے باقی رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ مناسب یہ
ہے کہ دریا کے تمام گھاٹوں کا فوراً انتظام کر دیا جائے اور ان کو ہرگز دریا کے اس طرف نہ آنے دیا جائے
راجہ داہر نے ان دونوں مشوروں کو سُننے کے بعد محمد بن قاسم کے ایلچیوں کو جواب دیا کہ ہم ہر طرح تم
سے لڑنے کو تیار ہیں چاہے تم اس طرف آجاؤ یا ہم اُس طرف آجائیں۔ موکا بن بسایا کا علاقہ
چونکہ دریا کے اُس طرف تھا اور وہ محمد بن قاسم کا شریک و ہمدرد بن چکا تھا لہذا راجہ داہر نے موکا کے
بھائی راسل کو ایک زبردست فوج دیکر دریا کے اُس طرف فوراً بھیجدیا کہ دریا کے متصلہ قلعوں پر
قابض رہکر مسلمانوں کی فوج کو عبور دریا سے روکے اور اپنے بیٹے جے سیہ کو ایک دوسری زبردست فوج
دیکر دریا کے اس طرف مقرر کیا کہ تمام گھاٹوں پر فوجی دستے مقرر کرکے مسلمانوں کو اس طرف آنے
کا موقع نہ دے۔ راسل نے دریا پار ہو کر مسلمانوں سے جنگ شروع کر دی اور داہر نے اپنے ایک
اور سردار چندر بن بالا کو بھیجکر سیوستان کو مسلمانوں کے قبضہ سے نکال لیا ان تدبیروں سے راجہ

داہر کا خیال یہ ہوگا کہ محمد قاسم دریا پار ہی لڑائیوں میں مصروف رہے مگر محمد بن قاسم نے مصعب بن عبدالرحمٰن کو تین ہزار فوج دیکر سیستان کی طرف روانہ کیا اور خود راسل سے مصروف جنگ ہوا۔ مصعب نے چندر کو مقابلہ کر کے قتل کیا اور سیوستان میں پھر اسلامی حکومت قائم کر دی ادھر محمد بن قاسم کے مقابلے میں راسل کو بھی شکست ہوئی مگر وہ دریا کے اسی کنارے کشتیوں کو تباہ اور عبور دریا کے تمام سامانوں کو برباد کرتا پھرا۔ محمد بن قاسم نے مصعب کو سیوستان سے بلوالیا اور وہ اپنے ہمراہ نومسلم جاٹوں کی بھی ایک فوج بھرتی کر کے لایا۔

عبور سندھ اور قتل داہر

محمد بن قاسم نے موکا بن بسایا کو کشتیوں کے فراہم کرنے پر مامور کیا موکا نے بڑی کوشش و تلاش سے کشتیوں کی ایک مناسب تعداد فراہم کی۔ مگر ان کشتیوں پر بیٹھ کر دوسرے کنارے پر پہنچنا کسی طرح ممکن نہ تھا کیونکہ اس کنارے راجہ داہر کی فوج موجود تھی جو کشتیوں کو کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی غرق کر سکتی تھی۔ آخر یہ تدبیر عمل میں لائی گئی کہ دریا کے مغربی کنارے کے متصل پانی میں کشتیوں کو ایک دوسری سے باندھکر ایک قطار بنائی گئی کشتیوں کی یہ قطار اس قدر طویل تھی جس قدر اس مقام پر دریا کی چوڑائی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں دریا کا پاٹ بہت کم اور پانی کی روانی بہت تیز تھی۔ ان کشتیوں کی قطار میں بہادر اور تجربہ کار تیر انداز بٹھا دئے گئے کشتیوں کی قطار کا نیچے کا سرا یعنی پانی کے بہاؤ کی جانب کا سرا کنارے سے مضبوط باندھ دیا گیا اور اوپر کا سرا چھوڑ دیا گیا کشتی والوں نے کشتیوں کو دریا کی دھار کی جانب متحرک کیا اور اوپر کا سرا کنارے سے کسی قدر جدا ہوا پھر پانی کے بہاؤ نے خود بخود اس قطار کو پرکار کے متحرک سرے کی طرح دریا کی چوڑائی میں شرقاً غرباً سیدھا کر دیا اور ایک سرا مرکز کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہا کیونکہ وہ بندھا ہوا تھا جوں ہی دوسرا سرا دریا کے مشرقی ساحل تک پہنچا اگلی کشتی کے سپاہیوں نے کنارے پر اتر کر رسوں اور میخوں کے ذریعہ اس کو ساحل سے باندھ دیا اس طرح یکایک کشتیوں کا ایک پل قائم ہو گیا کشتی نشین سپاہی بڑی تیزی اور چابک دستی کے ساتھ کنارے پر اترے ان کے پیچھے تمام فوج اس پل کے ذریعہ اترنا شروع ہو گئی۔ دوسرے کنارے پر جو تھوڑی سی فوج جے سیہ کی مقرر کی ہوئی موجود تھی اس نے مقابلہ کیا۔ مگر بہت جلد شکست کھا کر بھاگی اور تمام اسلامی لشکر مع سامان دریا کے اس طرف پہنچ گیا اس عبور میں صرف ایک مسلمان سپاہی دریا میں گر کر شہید ہوا۔ اس کے بعد ہی راجہ داہر کے بیٹے جے سیہ نے ایک زبردست فوج کے ساتھ حملہ کیا مگر شکست کھا کر اور بمشکل اپنے ہاتھی کو میدان جنگ سے نکال کر فرار ہوا۔ اور باپ کو جا کر اس لڑائی کا حال

سُنایا۔ راجہ داہر یہ سنتے ہی تہیۂ جنگ میں مصروف ہوا اور محمد علافی کو بطریق مقدمۃ الجیش ایک فوج کے ساتھ آگے روانہ کیا۔ محمد علافی کو بھی سخت مقابلہ کے بعد شکست حاصل ہوئی اور اسلامی لشکر آگے بڑھکر مقام جے وار میں مقیم ہوا۔ یہاں راجہ داہر بھی اسلامی لشکر کے سامنے پہنچکر خیمہ زن ہوا۔ دونوں لشکروں کے درمیان ایک جھیل جس کا نام کولاب کنجری تاریخوں میں لکھا ہی حائل تھی۔ اسلامی لشکر کی تعداد پندرہ ہزار کے قریب تھی۔ داہر کی فوج میں پچیس تیس ہزار زرہ پوش سپاہی دس ہزار نیزہ بردار۔۔۔۔ اور ساٹھ جنگی ہاتھی تھے۔ اسلامی لشکر نے جھیل کو عبور کرکے دوسرے کنارے پہنچکر ہنگامہ پیکار گرم کردیا۔ محمد بن قاسم نے لڑائی شروع کرنے سے پیشتر کہدیا تھا کہ اگر میں مارا جاؤں تو محرز بن ثابت میری جگہ سردار لشکر تسلیم کیا جائے اور وہ بھی مارا جائے تو سعید کو سپہ سالار سمجھا جائے مگر یہ دونوں بہادر اس لڑائی میں محمد بن قاسم کے سامنے شہید ہوئے۔ شام تک لڑائی جاری رہی راجہ داہر کے ہاتھیوں نے اسلامی لشکر کو بہت نقصان پہنچایا۔ رات کی تاریکی نے لڑائی کو ملتوی کیا۔ اگلے دن صبح سے پھر میدان کارزار گرم رہا اور شام تک کوئی فیصلہ جنگ کا نہ ہوسکا۔ تیسرے روز بھی بڑے زور شور کی لڑائی شام تک جاری رہی شام ہوتے ہوتے لشکر اسلام کو فتح حاصل ہوئی۔ داہر کی فوج بہت سی مقتول اور بقیہ فرار ہوئی مگر راجہ داہر ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ میدان میں ڈٹا رہا آخر معرکہ دار وگیر میں ایک عرب سے اُس کا مقابلہ ہوا عرب نے تلوار کا ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ سر کے عین وسط میں پڑا اور سر کے دو ٹکڑے کرتا ہوا ناک تک اُتر گیا اس طرح روز پنجشنبہ دہم رمضان ۹۳ھ وقت نماز مغرب داہر کے مارے جانے پر یہ ثابت ہوگیا کہ آیندہ سندھ کا ملک مسلمانوں کے زیر حکومت رہے گا۔ داہر کے مارے جانے پر بہت سے برہمنوں۔ ہندؤں اور فوجی سرداروں نے آکر محمد بن قاسم کی خدمت میں درخواست کی کہ ہم مسلمان ہونا چاہتے ہیں چنانچہ اُن کو اُن کی خوشی کے موافق اسلام میں داخل کیا گیا۔ اگلے دن محمد بن قاسم نے اعلان کرادیا کہ جو شخص چاہے اسلام قبول کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے ہماری طرف سے کوئی تعرض نہوگا۔ جو اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے گا اُس سے بھی ایک معمولی ٹیکس وصول کیا جائیگا جس کا نام جزیہ ہے اور جو مسلمان ہوجائے گا اُس کو بھی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔ راجہ داہر کا وزیر سی ساگر۔ محمد علافی۔ راجہ کا بیٹا جے سیہ۔ راجہ کی بیوی مائی (جو راجہ کی حقیقی بہن بھی تھی) راجہ کے عزیز واقارب اور بقیۃ السیف سردار و امراسب قلعہ روہڑی یا راور میں جمع ہوئے۔ جب راجہ کے مارے جانے کی خبر تصدیق ہوگئی تو راجہ کے بیٹے

جے سیہ نے ارادہ کیا کہ اب ہمکو بھی میدان میں نکلکر اور لڑ کر مرہنا چاہیے مگر وزیر سی ساگر نے کہا کہ آپ کی یہ رائے درست نہیں ہے ابھی ملک کا بڑا حصہ ہمارے زیر نگین ہے قلعہ برہمن آباد میں ہر قسم کا سامان اور خزانہ موجود ہے ملک کے دوسرے قلعوں اور شہروں سے فوج فراہم ہو سکتی ہے ہمکو یہاں سے برہمن آباد کی طرف جاکر وہاں قیام اور مقابلہ کی تیاری کرنا چاہیے وہاں ہمکو ہر قسم کی طاقت حاصل ہو سکے گی۔ جے سیہ نے محمد علافی سے مشورہ کیا تو اُس نے بھی سی ساگر کی رائے کو پسند کیا مگر رانی مائی نے برہمن آباد جانے سے انکار کیا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ چتا میں بیٹھکر ستی ہوگئی جے سیہ معہ لشکر و سامان و خزانہ قلعہ راور سے برہمن آباد کی طرف روانہ ہوا۔ محمد بن قاسم نے قلعہ راور کو فتح کیا۔ چھ ہزار آدمی جو رانی مائی کے ساتھ اس قلعہ میں رہ گئے تھے انھوں نے مقابلہ کیا اور مقتول ہوئے۔

برہمن آباد کی فتح برہمن آباد میں پہنچکر اپنے رشتہ داروں اور سرداروں کو جو ملک کے مختلف شہروں میں برسر حکومت تھے داہر کے مارے جانے کی اطلاع دی اور سب کو اپنی مدد اور مقابلہ کی تیاری میں شریک ہونے کے لیے برہمن آباد میں بُلایا۔ ادھر محمد بن قاسم نے اپنے احکام و اعلانات برہمن آباد اور سندھ کے اُن تمام شہروں میں جو ابھی فتح نہیں ہوئے تھے بھجوا دیے کہ جو شخص اطاعت قبول کریگا اور پُرامن رہنے کا یقین دلائے گا اُس کی تمام خطائیں معاف کردی جائیں گی اور کسی قسم کی باز پرس اُس سے نہ ہوگی۔ وزیر سی ساگر کی ہوشیاری اور مآل اندیشی دیکھو کہ اُس نے اُن عورتوں اور بچوں کو جنھوں نے بندر دیبل پر گرفتار ہوتے وقت یا حجاج اغثنی کہکر پکارا تھا اور جو دارالسلطنت الور میں تھے اپنے زیر حفاظت رکھا اور جب قلعہ راور سے جے سیہ کے ہمراہ برہمن آباد آیا تو ان قیدیوں کو بھی اپنے ہمراہ لایا۔ سی ساگر کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ اب دشوار ہے۔ اُس نے جب برہمن آباد میں محمد بن قاسم کے اعلان کا حال سُنا تو اپنے بعض معتمد خفیہ طور پر محمد بن قاسم کے پاس بھیجے اور لکھا کہ وہ عورتیں اور بچے جنھوں نے حجاج کی دہائی دیبل بندر پر دی تھی میرے قبضے میں اب تک موجود ہیں اُن کو آپ کی خدمت میں پیش کردوں گا بشرطیکہ آپ مجھکو جان کی اماں دیں اور کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں محمد بن قاسم نے فوراً سی ساگر کے نام کا امان نامہ لکھکر اُس کے معتمدوں کو سپرد کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے مقام دہلیلہ کو فتح کیا اور نبویہ پسر دہارن کو جو یہاں کا رئیس تھا اپنی طرف سے حاکم مقرر کیا پھر برہمن آباد کی طرف لشکر اسلام روانہ ہوا جب قریب پہنچا تو وزیر سی ساگر چپکے سے معہ مسلمان قیدیوں کے برہمن آباد سے نکلکر محمد بن قاسم

کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ جے سیہ کو جب سی ساگر کے نکل جانے کا حال معلوم ہوا تو اُس نے دوسرے سرداروں اور امیروں کو چالیس ہزار فوج کے ساتھ برہمن آباد کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا اور خود تھوڑی سی فوج لیکر اس لیے شہر سے نکل گیا کہ مسلمانوں پر باہر سے حملہ کرنے کے لیے امدادی فوجیں لیکر آئیگا۔ محمد بن قاسم نے سی ساگر کی آمد کا حال سنکر اُس کے استقبال کے لیے امرا کو روانہ کیا اور جب وہ سامنے آیا تو اُس کو نہایت عزت کے ساتھ اپنی برابر بٹھایا۔ اپنے تمام ارادوں اور رازوں سے اُس کو مطلع کیا اور اپنی وزارت کا منصب جلیلہ اُس کو عطا کیا اس وزیر با تدبیر نے محمد بن قاسم کے عدل وانصاف اور رحم وکرم کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ نے باشندگان سندھ کے ساتھ ایسا اچھا سلوک کیا ہے اور مالگذاری و ٹیکس کے معاملے میں اس قدر نرمی اختیار کی ہے کہ تمام ملک آپکا گرویدہ ہوگیا ہے لہذا بہت جلد ملک کے باقی حصے بھی آپ کے قبضے میں آجائیں گے۔ محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے مشرق کی جانب نہر جلوالی کے کنارے قیام کیا اور لشکر گاہ کے گرد خندق کھدوا کر برہمن آباد کی تسخیر کے درپے ہوا اول اُس نے اپنا ایلچی بھیجکر شہر والوں کو اطاعت قبول کر لینے کی ترغیب دی مگر شہر والوں نے مقابلہ کی تیاری کی یہاں راجہ داہر کی دوسری رانی جس کا نام لاڈی تھا موجود تھی اُس نے سرداران لشکر کو معرکہ آرائی کی تاکید کی سلسلہ جنگ شروع ہوا۔ شہر والے ڈھول بجاتے ہوئے شہر سے نکلتے اور شام تک معرکہ آرا رہکر قلعہ میں واپس چلے جاتے اور مسلمان اپنی لشکر گاہ میں آکر آرام کرتے اس طرح چھ مہینے تک برہمن آباد نے مقابلہ کیا۔ برہمن آباد کا قلعہ ہندوستان کے قلعوں میں بہت زبردست اور ناقابل تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا اسی لیے محاصرہ کو اس قدر طول ہوا۔ جے سیہ نے دوسرے شہروں سے امدادی فوجیں حاصل کرکے اسلامی لشکر گاہ پر چھاپے مارنے شروع کیے اور مسلمانوں کی رسد بالکل بند کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی لشکر محاصر ہونے کے باوجود محصور کی حالت میں تبدیل ہوگیا۔ محمد بن قاسم نے بنانہ بن حنظلہ کلابی۔ عطیہ ثعلبی۔ صارم بن ابی صارم ہمدانی۔ عبدالملک مدنی سرداران لشکر کو معہ اپنے اپنے متعلقہ سواروں کے الگ کرکے ایک مخصوص فوج بنائی اور موکا بن بسایا کو اس فوج کا افسر اعلیٰ بناکر جے سیہ کے مقابلہ اور تعاقب پر مامور کیا۔ جے سیہ کے ساتھ محمد علافی بھی موجود تھا۔ موکا نے اس شدت سے ان کا تعاقب کیا کہ جے سیہ اور محمد علافی دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے اور دو مختلف سمتوں کو فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔ جے سیہ نے راجپوتانہ کے کسی مقام میں جاکر پناہ لی پھر وہاں سے وہ کشمیر کے راجہ کے پاس چلا گیا (کشمیر سے مراد پنجاب کا شمالی حصہ ہے نہ کہ موجودہ ریاست کشمیر) جے سیہ و محمد علافی کو آوارہ کرکے موکا نے سامان رسد فراہم

کیا اور اس طرح اسلامی لشکر کی مصیبت دور ہوئی۔ چھ مہینے تک محصور رہنے کے بعد برہمن آباد کے باشندوں نے سامان رسد کی نایابی سے پریشان ہو کر محمد بن قاسم کے پاس درخواست بھیجی کہ اگر آپ ہمکو جان و مال کی امان دیں تو ہم شہر کا دروازہ کھولدیں۔ یہ درخواست باشندگان شہر کی جانب سے تھی فوج اور فوجی سرداروں کی طرف سے نہ تھی لہذا محمد بن قاسم نے کہلا بھجوایا کہ ہم اُن تمام لوگوں کو جان و مال کی امان دیتے ہیں جو ہتھیار بند نہ ہوں جو شخص مسلح نظر آئے گا وہ گرفتار کر لیا جائے گا اور جو مقابلہ کرے گا وہ قتل ہوگا۔ شہر والوں نے موقع پاکر دروازہ کھولدیا اور مسلمانوں نے فصیل شہر پر چڑھکر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اندرونی فوج نے دوسرا دروازہ کھولکر اُس طرف سے بھاگنا شروع کیا۔ اسلامی فوج نے چاہا کہ ان کا تعاقب کرے اور سب کو روک کر کیفر کردار کو پہنچائے مگر محمد بن قاسم نے منع کیا اور کہا کہ جو شخص اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا ہے اُس کو بھاگ جانے دو۔ رانی لاوی (راجہ داہر کی دوسری بیوی) نے اپنے محل میں کچھ فوجی سرداروں کو جمع کرکے مقابلہ کیا بالآخر وہ بھی گرفتار ہو کر محمد بن قاسم کے پاس لائی گئی باشندگان شہر سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ سوداگر دکان دار اور اہل حرفہ بدستور اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ امن و امان کا اعلان کر دیا گیا۔ رانی لاوی نے اسلام قبول کرکے محمد بن قاسم سے نکاح کرنا قبول کیا۔ جنگی قیدی جب محمد بن قاسم کے سامنے پیش ہوئے تو اُس نے اُن کو رہا کر دیا۔ اس کے بعد برہمن آباد کے برہمنوں کی ایک بڑی جماعت سر و ریش منڈوائے اور زرد کپڑے پہنے ہوئے محمد بن قاسم کے سامنے آئی اُس نے دریافت کیا کہ تم کس فوج کے سپاہی ہو اور تم نے کیوں ایسی صورت بنائی ہے۔

برہمنوں نے عرض کیا کہ اے امیر عادل ہم سب برہمن اور راجہ داہر کے ہم قوم ہیں تو نے ہمارے راجہ کو قتل کر دیا ہے ہم نے اُس کے ماتم میں زرد لباس پہنا اور سر و ریش منڈوایا ہے ہمارے لیے تیرا کیا حکم ہے محمد بن قاسم نے کہا کہ میں تم سب کو امان دیتا ہوں تمکو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچیگا۔ اس کے بعد اعلان کیا گیا کہ جو لوگ امرا کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اُن سے چودہ[۱۴] تولہ جو دوم درجہ کے خوش حال لوگ ہیں اُن سے ساٹھ[۶۰] تولہ اور عوام سے پونے چار تولہ چاندی سالانہ بطور جزیہ وصول کی جائے گی جو اسلام قبول کریگا وہ اس جزیہ سے معاف کیا جائیگا اُس سے اسلامی قانون کے موافق زکوٰۃ لی جائے گی۔ جو شخص اپنے باپ دادا کے مذہب پر چلے اُس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا نہ اُن کے مندروں اور عبادت خانوں میں کسی قسم کی مداخلت کیجائیگی نہ زمینیں چھینی جائیں گی نہ مکان و اموال کو کسی قسم کا نقصان..... پہنچایا جائیگا۔ مالکان آراضی

بدستور اپنی اپنی زمینوں کے مالک رہیں گے اور زمینوں کی مالگذاری وغیرہ کی وصولی کا انتظام خود باشندگان سندھی کے ہاتھوں میں رہے گا وغیرہ۔ اس کے بعد محمد بن قاسم نے شہر کے دروازوں پر اپنے سپاہی مقرر کر دئے۔ شہر کے سمجھدار اور با اثر لوگوں کی ایک انجمن بنا کر انفصال خصومات کا انتظام اُس کے سپرد کیا اور وہاں سے لوہانہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور اُس کو فتح کیا۔

الور کی فتح

محرم ۹۳ھ میں محمد بن قاسم لوہانہ سے روانہ ہو کر مقام سَتھ کی جانب روانہ ہوا یہاں کے لوگوں نے آمد کی خبر سُن کر ننگے سر اور ننگے پاؤں شہر سے نکل کر استقبال کیا اور رحم و عفو کی التجا کی جو منظور ہوئی۔ یہاں سے رہبر ہمراہ لیکر محمد بن قاسم الور کی جانب روانہ ہوا۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دار السلطنت الور میں راجہ داہر اپنے چھوٹے بیٹے فیوفی نامی کو حاکم مقرر کر کے لڑائی کے لیے نکلا تھا فیوفی ابھی تک وہاں حکمراں تھا جے سیہ نے اپنے چھوٹے بھائی فیوفی کو برہمن آباد سے روانہ ہوتے وقت لکھا تھا کہ تم فوج کی فراہمی اور لڑائی کی تیاری میں مصروف رہو۔ چنانچہ الور بھی اسلامی لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے پورے طور پر تیار ہو چکا تھا۔ الور کے قریب پہنچکر شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر اسلامی لشکر نے قیام کیا۔ الور کے لوگوں کو ابھی تک راجہ داہر کے مارے جانے کا یقین نہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ راجہ داہر میدان جنگ سے ہندوستان کی طرف چلا گیا ہے۔ وہاں سے بہت بڑی فوج لے کر آئیگا اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹا ڈالے گا۔ بہرحال اب اہل الور کو اس بات کا یقین ہوا کہ راجہ داہر ضرور مارا جا چکا ہے۔ شہر والوں نے آپس میں مشورے کرنے شروع کیے کہ مسلمان اپنے وعدے کے بڑے پکے ہیں۔ برہمن آباد والوں کی طرح اگر ہم بھی امان طلب کر لیں تو ہم کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچیگا اور اگر ہم نے لڑائی میں شرکت کی تو ممکن ہے کہ مسلمان پھر جان و مال کی اماں نہ دیں۔ ان چہ میگوئیوں کا حال فیوفی کو معلوم ہوا تو وہ مقابلہ اور معرکہ آرائی سے ہمت ہار بیٹھا۔ اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے ہمراہیوں کو لے کر شہر سے نکل جائے چنانچہ وہ راتوں رات شہر سے نکل گیا اور اپنے بھائی جے سیہ کے پاس جو راجپوتانہ کے کسی مقام میں ٹھیرا ہوا تھا پہنچ گیا۔ شہر والوں نے اپنا قاصد محمد بن قاسم کے پاس بھیجا اور عرض کیا کہ ہمارا راجہ داہر مارا جا چکا ہے۔ داہر کا بیٹا فیوفی بھی ہمکو چھوڑ کر شہر سے بھاگ گیا ہے ہم نے آپ کے عدل و انصاف اور رحم دلی کی بڑی تعریف سُنی ہے اسی امید پر ہم درخواست پیش کرتے ہیں کہ ہم کو جان و مال کی اماں دی جائے تاکہ ہم آپ کے لیے شہر کے دروازے کھولدیں۔ محمد بن قاسم نے کہا کہ میں نے ہر ایک مقام پر خود لوگوں کو اطاعت قبول کرنے کی ترغیب دیکر یہ وعدہ کیا کہ تمکو جان و مال کی اماں دی جائے گی مگر تم نے چونکہ میرے پیغام سے بھی پہلے اطاعت پر اپنی آمادگی ظاہر کی ہے لہذا

میں تمکو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے بعد دروازہ کھل گیا اور محمد بن قاسم شہر آور میں داخل ہوا
شہر میں داخل ہوکر محمد بن قاسم نے دیکھا کہ شہر کے سب سے بڑے بت خانہ میں جس کا نام نودھار تھا لوگ
بُت کے آگے سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اُس نے تعجب کے ساتھ دریافت کیا کہ یہ مکان کس کا ہے
جہاں بہت سے آدمی سجدہ کر رہے ہیں۔ اُس کو بتایا گیا کہ یہ ایک عظیم الشان بُت خانہ ہے اور
یہاں یہ لوگ بُت کے آگے سجدہ کر رہے ہیں۔ محمد بن قاسم نے اُس بت خانہ کے اندر جانے کی
خواہش ظاہر کی۔ مندر کا پجاری برہمن بطور رہبر ساتھ ہوا۔ محمد بن قاسم نے اندر داخل ہوکر دیکھا کہ
ایک پتھر کی مورت گھوڑے پر سوار ہے۔ اس مورت کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن یاقوت و
جواہر سے مرصع پڑے ہوئے ہیں۔ اُس نے مورت کے قریب پہنچکر ایک کنگن اُتار لیا اور پجاری
کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ یہ تمھارا معبود ہے اس نے کہا "ہاں" محمد بن قاسم نے کہا کہ پہلے
اُس کے دونوں ہاتھوں میں کنگن تھے اب ایک ہی ہاتھ میں رہگیا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ دوسرا
کنگن کون لے گیا۔ پجاری نے گردن نیچی کرلی اور محمد بن قاسم نے ہنس کر وہ کنگن پھر اُس کے ہاتھ میں
ڈالدیا اور مندر سے نکل آیا۔ اس کے بعد شہر میں عام اعلان کر دیا گیا کہ اس شہر کے باشندے ہر قسم کے
ٹیکس اور محصول سے معاف کیے جاتے ہیں۔ یہاں محمد بن قاسم نے روح بن اسد کو حاکم مقرر کیا اور امور
شرعی کے لیے موسیٰ بن یعقوب قاضی مقرر ہوا آلور کے بہت سے باشندے آکر محمد بن قاسم کے ہاتھ
پر مسلمان ہوگئے باقی اپنے آبائی مذہب پر نہایت آزادی کے ساتھ قائم رہے۔ محمد بن قاسم روح اور
موسیٰ کو رعیت پروری کی تاکیدی ہدایات کرکے آلور سے قلعہ بابیہ کی طرف روانہ ہوا جو دریائے
بیاس کے جنوبی کنارے پر تھا۔ اس قلعہ میں کاکسا بن چندر بن سلائج یعنی راجہ داہر کا چچازاد بھائی مقیم
تھا کاکسا بن چندر میدان جنگ میں راجہ داہر کے ساتھ موجود تھا۔ داہر کے مقتول ہونے پر وہ اس قلعہ
میں آکر پناہ گزین ہوا تھا۔ یہ بہت بڑا عالم فاضل اور نہایت عقلمند شخص تھا۔ جب محمد بن قاسم اُس قلعہ
کے قریب پہنچا تو کاکسا بلا تامل محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ محمد بن قاسم بڑی عزت اور محبت
کے ساتھ پیش آیا۔ اُس کے خاندان اور علم و فضل سے واقف ہوکر محمد بن قاسم نے اُس کو اپنا مصاحب
و وزیر و سپہ سالار بنایا اور تمام فوجی سرداروں کو حکم دیا کہ میرے بعد کاکسا تم سب کا افسر اعلیٰ ہے۔ ساتھ ہی
اُس کو اپنی مُہر اور خزانہ کا چارج بھی سپرد کر دیا اور دربار میں اُس کے لیے اپنے تخت کے برابر کرسی دی
اور آیندہ اُس کے مشوروں کو تمام معاملات میں مقدم اور قابل عمل سمجھا۔

فتح ملتان | سندھ کے مشہور مرکزی مقامات میں سے اب صرف ملتان فتح ہونے سے باقی رہ گیا

تھا۔ یہاں سے محمد بن قاسم دریائے بیاس کے پار گیا قلعہ اسکلندہ پر پہنچکر لڑائی شروع ہوئی اس قلعہ کا حاکم ملتان کے حاکم کا بھتیجا تھا اُس نے نہایت سختی سے مقابلہ کیا۔ سات روز تک لڑائی کا ہنگامہ برپا رہا۔ آٹھویں روز حاکم اسکلندہ فرار ہو کر ملتان پہنچا اور قلعہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم قلعہ سکہ کی طرف گیا یہ قلعہ دریائے راوی کے جنوب میں واقع تھا یہاں کے حاکم کا نام بجے رائے تھا۔ سترہ روز تک اس قلعہ نے اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا آخر یہ قلعہ بھی فتح ہوا اور محمد بن قاسم نے اہل قلعہ کو امان دے کر عتبہ بن سلمہ تمیمی کو یہاں کا حاکم مقرر کیا یہاں سے روانہ ہو کر دریائے راوی کو عبور کیا اور ملتان کا محاصرہ شروع ہوا۔ یہاں کا حاکم گور سیہ بن چندر تھا جو کسا کا حقیقی اور داہر کا چچا زاد بھائی تھا۔ دو مہینے تک اُس نے ملتان میں محصور رہ کر لشکر اسلام کا مقابلہ کیا۔ آخر وہ ملتان سے نکلکر راجہ کشمیر پاس چلا گیا اور مسلمانوں نے بزور شمشیر ملتان پر قبضہ کیا اور اہل شہر کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر امن و امان اور معافی کا اعلان کیا۔ محمد بن قاسم نے ہر جگہ شہروں کے لوٹنے اور رعایا کے اموال پر قبضہ کرنے سے اپنے سپاہیوں کو روکا تھا۔ اُس نے اب تک صرف فوجی سامان اور سرکاری روپیہ پر ہی قبضہ کیا تھا۔ مندروں کی مورتیوں کو جو جواہرات سے مرصع اور سونے چاندی کی بنی ہوئی تھیں کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ برہمن آباد۔ آلور اور ملتان میں سرکاری خزانے اُس کے ہاتھ آ سکتے تھے کیونکہ یہ مرکزی مقامات تھے لیکن ان تمام شہروں میں ایک ہی صورت پیش آئی یعنی حاکم شہر تمام خزانوں کو لیکر پہلے فرار ہوا اور اس کے بعد شہر والوں نے شہر مسلمانوں کے سپرد کیا لہذا بچے کھچے خزانے جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے وہ کچھ زیادہ نہ تھے۔ سندھ کی اس مہم میں حجاج نے بہت روپیہ خرچ کیا تھا جو اب تک اس ملک سے وصول نہیں ہو سکا تھا اور ممکن تھا کہ اس اعتبار سے محمد بن قاسم کو دارالخلافہ میں ملزم یا نا قابل سپہ سالار ٹھیرایا جاتا مگر اُس کی نیک نیتی کا ثمرہ اس طرح ظہور پذیر ہوا کہ ملتان کا ایک برہمن محمد بن قاسم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اب ہندوؤں کی سلطنت کا تو خاتمہ ہو چکا ہے لہٰذا میں آپکو ایک خزانے کا پتا بتاتا ہوں جس کا کسی کو حال معلوم نہیں۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ قدیم زمانہ میں جسوبن نامی ایک راجہ تھا وہ برہمن اور جوگی تھا رات دن بتوں کی پرستش میں مصروف رہتا تھا اُس کے خزانہ میں بیشمار روپیہ جمع ہو گیا تو اُس نے ملتان کی شرقی سمت میں سو گز لمبا اور سو گز چوڑا ایک حوض بنوایا اُس کے اردگرد درخت لگوائے حوض کے بیچ میں پچاس گز لمبا اور پچاس گز چوڑا ایک بُت خانہ بنایا اُس میں ایک بت خالص سونے کا بنوا کر رکھا اور اُس کے نیچے چالیس دیگیں تین سو تیس من سونے کے ٹکڑوں سے بھر کر دفن کیں۔ یہ بت خانہ اور خزانہ اب تک

موجود ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اس خزانہ پر قبضہ کر لیں محمد بن قاسم اُس برہمن کی رہبری میں اُس جگہ پہنچا سونے کا بت موجود پایا جو دوسو تیس من وزنی تھا۔ پھر دیگیں نکلوائیں تو اُن میں سے تیرہ ہزار دوسو من سونا نکلا۔ یہ خزانہ دیبل بندر کی طرف روانہ کیا جہاں سے جہاز کے ذریعہ وہ بصرہ اور بصرہ سے دمشق پہنچا۔ رعایائے ملتان کو ان کے اطمینان کے لیے محمد بن قاسم نے ایک فرمان جان و مال کی اماں کے متعلق لکھدیا۔ داؤد بن نصر بن ولید عمانی کو ملتان کا حاکم مقرر کیا اور ایک مسجد یہاں تعمیر کرائی۔
جس طرح برہمن آباد۔ الور اور دوسرے مقامات میں لوگ جوق درجوق اپنی خوشی سے اسلام میں داخل ہوئے اُسی طرح ملتان میں بھی بہت سے لوگوں نے دین اسلام قبول کیا۔ ملتان کی فتح کے وقت محمد بن قاسم کے پاس پچاس ہزار فوج تھی حالانکہ حدود سندھ میں داخل ہونے وقت اُس کے ہمراہ صرف بارہ ہزار شامی وعراقی تھے۔ اب ہر شخص بآسانی غور کر سکتا ہے کہ حجاج نے بعد میں فوجیں محمد بن قاسم کے پاس روانہ نہیں کیں۔ اس ملک میں محمد بن قاسم کے داخل ہوتے ہی لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا اور محمد بن قاسم نے بھی ان نومسلموں پر ہر جگہ پورا پورا اعتماد اور بھروسہ کیا۔ فتح ملتان کے وقت زیادہ حصہ ان نومسلموں ہی کا فوج میں شامل تھا۔ محمد بن قاسم نے مولانا اسلامی۔ کاکا۔ موکا۔ سی ساگر۔ کاکسا وغیرہ ہندو سرداروں پر ایسا ہی بھروسہ کیا جیسا کہ وہ مسلمان سرداروں پر کرتا تھا اُس نے اُن میں سے کسی کو بھی مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ ابھی تک یہ امر مشتبہ ہے کہ ان سرداروں میں سے مولانا اسلامی کے سوا اور کس کس نے اسلام قبول کر لیا تھا مگر یہ بالکل یقینی امر ہے کہ ان کو ذمہ داری کے عہدے اور سرداریاں دیتے وقت محمد بن قاسم نے ان کے غیر مسلم ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔ اگر مسلمانوں نے سندھ میں داخل ہو کر یہاں کے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنا لیا تھا اور اُن مسلمان ہونے والوں نے اسلام میں کوئی خوبی اور صداقت نہیں دیکھی تھی اور اُن کے دل اندر سے اسلام کے مخالف تھے تو وہ عرب سے آئے ہوئے مٹھی بھر مسلمانوں کے اس قدر باوفا اور اپنے بھائیوں کے قتل میں اس قدر چست و چالاک کیسے ہو گئے تھے محمد بن قاسم نے جب ملتان کو فتح کر کے ملک سندھ کی فتوحات کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے تو اُس وقت عراقی و شامی لوگ جو اُس کے ہمراہ تھے وہ یقیناً چار پانچ ہزار سے زیادہ ہرگز نہ ہونگے کیونکہ ان دو ڈھائی سال کے پیہم معرکوں اور خونریز لڑائیوں میں یہ لوگ ضرور شہید ہوتے رہے ہونگے۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ محمد بن قاسم نے جس قدر نقد و جنس وغیرہ مال سندھ سے خزانۂ خلافت میں روانہ کیا ہے وہ اُس روپیہ کا جو خزانۂ خلافت سے مہم سندھ کے لیے صرف ہوا نصف تھا یعنی اس

مہم سے خزانۂ خلافت کو کوئی نفع نہیں پہنچا بلکہ نقصان ہی ہوا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے
کہ مسلمان جس قدر روپیہ اور مال سندھ میں لے کر آئے تھے وہ واپس نہیں بھیج سکے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فوج
کے سپاہی خوب مالا مال ہو گئے تھے اور اُن میں سے ہر ایک سپاہی نے خزانے جمع کر لیے تھے تو بھی سندھ
سے عراق و شام میں روپیہ کا جانا ثابت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ محمد بن قاسم کے ساتھ جو لوگ سندھ میں آئے
تھے وہ سب کے سب محمد بن قاسم کے سامنے یا محمد بن قاسم کے بعد ملک سندھ ہی کی خاک میں مدفون ہوئے
اُن کا واپس جانا کسی طرح ثابت نہیں۔ لہٰذا مال و دولت کے حصول اور لوٹ مار کے شوق کو بھی فتح
سندھ کا سبب ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

فتح سندھ کی تکمیل اور محمد بن قاسم کی معزولی

ملتان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے پنجاب (کشمیر) کی طرف رُخ کیا جہاں خاندان داہر
کے کئی شہزادے راجہ کشمیر کے یہاں پناہ گزین اور اُس راجہ کی مدد سے سندھ کو واپس لینے کی کوششوں
میں مصروف تھے۔ سندھ کے شمال کی جانب سلطنت کشمیر اور مشرق کی جانب سلطنت مالوہ و قنوج تھی
ان سلطنتوں سے سندھ کی سلطنت اسلامیہ کے حدود کا تعین اور معاہدات کا ہو جانا ازبس ضروری تھا ورنہ
ہر وقت لڑائی کا اندیشہ اور سندھ کی حکومت اسلامیہ کا خطرہ میں ہونا یقینی تھا۔ محمد بن قاسم بیحد عقلمند اور مآل
اندیش شخص تھا اُس کے مشیر و صلاح کار ملک سندھ کے مسلمہ اہل الرائے موکا و کاکسا وغیرہ تھے جن کے مشوروں
کے بغیر وہ کوئی کام نہ کرتا تھا اُدھر حجاج بن یوسف ثقفی مشہور سیاست داں وائسرائے عراق کی ہدایات
اُس کے پاس مسلسل پہنچ رہی تھیں لہٰذا کشمیر و قنوج کی حکومتوں کے ساتھ حدود سلطنت کی تعیین پر محمد بن قاسم کا
فتح ملتان کے بعد فوراً آمادہ ہو جانا کوئی بعید از قیاس بات نہ تھی۔ محمد بن قاسم خود تو ملتان سے کشمیر[1] کی
طرف روانہ ہوا اور ابو حکیم شیبانی کو قنوج کی طرف روانہ کیا۔ راجہ چچ نے اپنی شمالی سرحد پر صنوبر کے چند
درخت لگا دیے تھے اور ان درختوں ہی کو سندھ و کشمیر کی حد فاصل قرار دیا تھا محمد بن قاسم بھی صنوبر کے
ان درختوں تک ہی گیا اور یہاں پہنچکر زید بن عمرو کلابی کو بطور سفیر قنوج کے راجہ ہرچند پسر راجہ جے پل
کے پاس بھیجا۔ قنوج کے راجہ نے اس سفارت کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ مقابلہ اور مقاتلہ پر آمادگی
ظاہر کی لہٰذا محمد بن قاسم نے کشمیر کی طرف سے واپس ہو کر اور قنوج کے راجہ کا ارادہ معلوم کر کے اتمام
حجت کے طور پر پھر ایک خط اپنی طرف سے روانہ کیا۔ یہ سلسلہ خط و کتابت ابھی کوئی نتیجہ پیدا کرنے نہ پایا

[1] کشمیر سے مراد موجودہ ملک سندھ کا شمالی مقام کشمورہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اُس زمانہ میں موجودہ مقام کشمورہ کا کسی
ریاست یا سلطنت کا صدر مقام ہونا قطعاً ثابت نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تھا کہ محمد بن قاسم کی معزولی کا فرمان دربار خلافت سے آگیا اور وہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کی حکومت کا چارج دیکر عراق و شام کی طرف روانہ ہوگیا۔

ملتان کی فتح کے وقت شوال ۹۵ھ میں حجاج کا عراق میں انتقال ہوگیا۔ حجاج نے فوت ہوتے وقت اپنے بیٹے عبداللہ بن حجاج کو اپنی جگہ وائسرائے مقرر کرکے یزید بن ابی کبشہ کو افواج کوفہ و بصرہ کا سپہ سالار اور یزید بن ابی مسلم کو صیغۂ مال کا افسر مقرر کردیا تھا۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کو جب حجاج کی وفات کا حال معلوم ہوا تو اُس نے حجاج کے مقرر کیے ہوئے عہدہ داروں کو بحال رکھا محمد بن قاسم کے پاس بھی ملک سندھ کی سند گورنری بھیجدی۔ محمد بن قاسم کے پاس حجاج کے فوت ہونے کی خبر اور خلیفہ کی طرف سے سندھ کی حکومت کا فرمان ملتان ہی میں پہنچ گیا تھا۔ حجاج کے فوت ہونے کی خبر نے محمد بن قاسم کی اولوالعزمیوں کو ضرور صدمہ پہنچایا ہوگا۔ حجاج کی وفات کے بعد خلیفہ ولید بن عبدالملک نے ممالک مشرقیہ کے تمام گورنروں کے پاس احکام بھیجدیئے تھے کہ اب تم فتوحات اور پیشقدمیوں کو روک کر اپنے آپ کو کسی نئے خطرے میں ہرگز نہ ڈالو مشہور سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کے پاس بھی جو چین کی طرف فتوحات حاصل کررہا تھا اسی قسم کا حکم پہنچا تھا اور وہ آگے بڑھنے سے رُک گیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ولید بن عبدالملک اپنے بھائی سلیمان بن عبدالملک کو ولیعہدی سے معزول کرکے اپنے بیٹے کو ولیعہد بنانا چاہتا تھا۔ اس کام میں حجاج اور اُس کے گروہ کے تمام سردار ولید کے طرفدار۔ اور سلیمان کی معزولی کے خواہاں تھے مگر سلیمان کے طرفدار بھی بہت سے سردار اور با اثر علما رتھے اس لیے ولید کو اپنے ارادے کے پورا کرنے میں حجاج کی وفات کے سبب خطرات نظر آنے لگے تھے اور وہ محمد بن قاسم اور قتیبہ وغیرہ ممالک مشرقیہ کے سرداروں کو ضرورت کے وقت کام میں لانے کے لیے فارغ رکھنا ضروری سمجھتا اور جب تک کہ اپنے بھائی سلیمان کو ولیعہدی سے معزول کرکے اپنے بیٹے کو ولیعہد نہ بنالے اُس وقت تک محمد بن قاسم اور حجاج کے گروہ کے تمام سرداروں کو کسی لڑائی میں مصروف ہونے سے باز رکھنا چاہتا تھا مگر حجاج کی وفات سے سات مہینے بعد جمادی الاول ۹۶ھ میں ولید بن عبدالملک فوت ہوگیا اور اُس کی جگہ سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا سلیمان بن عبدالملک خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ حجاج میرا سب سے بڑا دشمن تھا کیونکہ وہ مجھکو تخت سے محروم رکھنے کی تدبیروں میں ولید بن عبدالملک کا معاون اور ہم خیال تھا لہذا سلیمان نے تخت نشین ہوکر تمام حجاجی سرداروں کو معزول کیا قتیبہ بن مسلم بھی اسی سلسلہ میں قتل ہوا سندھ سے محمد بن قاسم کو بھی معزول کرکے بلوایا۔ عراق کی گورنری پر صالح بن عبدالرحمن کو مقرر کیا جو حجاج کا جانی دشمن تھا۔ صالح بن عبدالرحمن نے محمد بن قاسم کو واسط کے جیلخانے میں قید کرکے قتل کرادیا۔

محمد بن قاسم نے اپنی معزولی اور عراق کی جانب روانگی سے پہلے ملتان و دیپالپور کے شمال کیرج کو جو ابھی تک ملک سندھ پر مفتوح ہونے سے باقی رہ گیا تھا فتح کیا۔ یہاں کے راجہ کا نام دوہر رائے تھا۔ کیرج کو محمد بن قاسم کی آخری فتح سمجھنا چاہیے۔

مسلمانوں نے سندھ پر کیسی حکومت کی

محمد بن قاسم کی بہادری۔ دانائی اور میانہ روی جس طرح مسلّم اور مشہور آفاق ہے اسی طرح اُس کی یہ صفت خاص بھی معلوم عوام ہے کہ وہ اپنے محسن و مربّی حجاج بن یوسف ثقفی کے کسی حکم۔ کسی مشورے اور کسی ہدایت کی رتی برابر بھی مخالفت نہیں کرتا تھا۔ اور اُس نے اس معاملہ میں حیرت انگیز طور پر احتیاط سے کام لیا تھا۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اُن ہدایات و نصائح پر نظر ڈالنی چاہیے جو حجاج نے محمد بن قاسم کے پاس لکھ لکھ کر سندھ میں بھیجیں۔ فتح دیبل کی خوشخبری سُن کر حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا کہ

"جب ملک پر تم قابض ہو جاؤ تو قلعوں کی استواری اور لشکر کی رفع احتیاج کے بعد تمام اموال و خزائن کو بہبودِ رعایا اور رفاہ خلق میں خرچ کرو اور یاد رکھو کہ کاشتکاروں، کاریگروں۔ سوداگروں اور پیشہ وروں کی خوشحالی و فارغ البالی سے ملک آباد و سرسبز ہوتا ہے۔ رعایا کے ساتھ ہمیشہ رعایت کرو تاکہ وہ تمہاری طرف محبت کے ساتھ راغب ہوں"

محمد بن قاسم جب نیرون میں مقیم تھا تو اس کے پاس حجاج کا خط پہنچا کہ

"اہل نیرون کے ساتھ نہایت نرمی اور دلدہی کا سلوک کرو ان کی بہبودی کے لیے کوشش کرو۔ لڑنے والوں میں جو تم سے اماں طلب کرے اُس کو ضرور اماں دو۔ کسی مقام کے اکابر و سردار تمہاری ملاقات کو آئیں تو اُن کو قیمتی خلعت اور انعام و اکرام سے سرفراز کرو۔ عقل و دانائی کو اپنا رہبر بناؤ جو وعدہ کسی سے کرو اُس کو ضرور پورا کرو۔ تمہارے قول و فعل پر سندھ والوں کو پورا پورا اعتماد و اطمینان ہو"

فتح سیوستان کے بعد حجاج کا خط پہنچا کہ

"جو کوئی تم سے جاگیر و ریاست طلب کرے تم اُس کو ناامید نہ کرو۔ التجاؤں کو قبول کرو امان و عفو سے رعایا کو مطمئن کرو سلطنت کے چار ارکان ہیں۔ اول مدارا و درگذر و محبت دوم سخاوت و انعام۔ سوم دشمنوں کی مزاج شناسی اور اُن کی مخالفت میں عقل کو ہاتھ سے نہ دینا۔ چہارم قوت و شہامت۔ تم راجاؤں سے جو عہد کرو اُس پر قائم رہو۔

جب وہ مالگذاری دینے کا اقرار کرلیں تو ہر طرح اُن کی اعانت و امداد کرو۔ جب کسی کو سفیر بنا کر بھیجو تو اُس کی عقل و امانت کو جانچ لو اور جو شخص توحید آلہی کا اقرار اور تمھاری اطاعت کرے اُس کے تمام مال و اسباب اور ننگ و ناموس کو برقرار رکھو لیکن جو اسلام قبول نہ کرے اُس کو صرف اس قدر مجبور کرو کہ وہ تمھارا مطیع ہو جائے۔ جو شخص بغاوت و سرکشی اختیار کرے اُس سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ شریف اور رذیل میں امتیاز کرو۔ ایسا بھی نہ ہو کہ تمھاری صلح جوئی کو دشمن تمھاری کمزوری محسوس کریں "

محمد بن قاسم نے جب دریا کو عبور کر لیا اور راجہ داہر کی فوجوں سے مقابلہ شروع ہو گیا تو اُس کے پاس حجاج بن یوسف ثقفی کا خط پہنچا کہ۔

"پنج وقتہ نماز پڑھنے میں سستی نہ ہو۔ تکبیر و قرأت۔ قیام و قعود اور رکوع و سجود میں خدائے تعالیٰ کے روبرو تضرع و زاری کیا کرو۔ زبان پر ہر وقت ذکر آلہی جاری رکھو کسی شخص کو شوکت و قوت خدائے تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی۔ اگر تم خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھوگے تو یقیناً مظفر و منصور ہوگے "

راجہ داہر کے مارے جانے کا حال محمد بن قاسم نے حجاج کو لکھا۔ قاصد حجاج کے پاس سے یہ خط لیکر آیا۔

"تمھارا اہتمام و انتظام اور ہر ایک کام شرع کے موافق ہے۔ مگر ہر خاص و عام کو اماں دینے اور دوست و دشمن میں تمیز نہ کرنے سے ایسا نہ ہو کہ کام بگڑ جائے۔ جو لوگ بزرگ اور ذی وقعت ہوں اُن کو ضرور اماں دو لیکن شریر اور بدمعاشوں کو دیکھ بھال کر آزاد کیا کرو اپنے عہد و پیمان کا ہمیشہ لحاظ رکھو اور امن پسند رعایا کی استمالت کرو "

اس کے بعد برہمن آباد سے محمد بن قاسم نے جو عریضہ بھیجا اس کے جواب میں حجاج نے لکھا کہ۔

"اے ابن عم محمد بن قاسم تم نے رعیت نوازی اور رفاہ عام میں جو کوشش کی ہے وہ نہایت تعریف کے قابل ہے "

برہمن آباد کی فتح کے بعد محمد بن قاسم جب وہاں کا تمام انتظام کر چکا تو بہت سے مندروں کے پجاری اس نوجوان عرب سپہ سالار کے پاس آئے اور کہا کہ اے محمد بن قاسم ہندوؤں نے مسلمان سپاہیوں کے ڈر سے بتوں کی پوجا کے لیے مندروں میں آنا کم کر دیا ہے جس سے ہماری آمدنی میں فرق آ گیا ہے۔ مندروں کی مرمت بھی نہیں ہوئی۔ لڑائی کے ہنگاموں اور محاصرے کے ایام میں منجنیقوں کے پتھروں سے ہمارے بعض مندر کہیں کہیں سے شکستہ ہو گئے ہیں تو اپنے اہتمام سے

ہمارے مندروں کو درست کرا اور ہندوؤں کو مجبور کر کہ وہ مندروں میں آکر بتوں کی پوجا کریں۔ تونے کاشتکاروں، سوداگروں اور کاریگروں کے حال پر تو بڑی مہربانیاں کی ہیں۔ ہم لوگ جو مندروں کے متولی ہیں تیری عنایات سے کیوں محروم رہیں۔

محمد بن قاسم نے کہا کہ تمھارے مندروں کا انہدام تو شہر الور سے متعلق ہے۔ میں کیسے دخل دے سکتا ہوں (الور ابھی فتح نہیں ہوا تھا) برہمنوں نے کہا کہ ان مندروں کے مالک و منتظم ہم خود ہیں اور اب ہم تیری رعایا بن چکے ہیں تونے مذہبی آزادی کا اعلان کیا ہے لہٰذا ہمارے مندروں کی تعمیر و مرمت اور ہماری آمدنی کے نقصان کی تلافی تجھ کو کرنی پڑے گی۔ محمد بن قاسم اس معاملے میں اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے فوراً حجاج کے پاس ایلچی روانہ کیا اور برہمنوں کے مطالبہ کی تفصیل لکھ کر مشورہ طلب کیا کہ مجھ کو اس معاملے میں کیا کرنا چاہیے؟ حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا کہ۔

"تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ برہمن آباد کے سردار اپنے مندروں کی عمارت درست کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے اطاعت قبول کر لی ہے۔ لہٰذا ان کو اپنے معبودوں کی عبادت میں آزادی حاصل ہونی چاہیئے اور کسی قسم کا جبر کسی پر مناسب نہیں ہے۔"

یہ خط محمد بن قاسم کے پاس اس وقت پہنچا جبکہ وہ برہمن آباد سے لوہانہ کی جانب روانہ ہوکر برہمن آباد سے ایک منزل کے فاصلہ پر مقیم تھا۔ اس خط کے پہنچنے پر محمد بن قاسم نے برہمن آباد واپس آکر وہاں کے تمام اکابر و امراء کو بلایا اور برہمنوں یعنی پجاریوں کے حقوق و مراسم کی تحقیق کی اور راجہ داہر کے زمانہ میں سلطنت کی طرف سے کیا کیا رعائتیں برہمنوں کو حاصل تھیں سب کو معلوم کیا۔ اس کے بعد اس نے شہر میں اعلان کرا دیا کہ جو لوگ اپنے باپ دادا کی مراسم کے پابند ہیں ان کو ہر قسم کی آزادی ان مراسم کے بجا لانے میں حاصل ہے کوئی شخص معترض نہ ہو سکے گا۔ برہمنوں کو دان پن۔ دکشنا بھینٹ۔ جس طرح پہلے دیتے تھے اب بھی دیں اپنے مندروں میں آزادانہ پوجا پاٹ کریں۔ محاصل ملکی یعنی سرکاری مالگذاری میں سے تین روپیہ فی صدی برہمنوں کے لیے الگ خزانے میں جمع کیا جائے گا۔ اس روپے کو برہمن جس وقت چاہیں اپنے مندروں کی مرمت اور ضروری سامان کے لیے خزانہ سے برآمد کرا سکتے ہیں۔ غرض محمد بن قاسم نے تین روپیہ فی صدی مندروں کے لیے خزانہ سرکاری میں حصہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد اس نے برہمنوں کے سب سے بڑے پنڈت کو رانا کا خطاب دیکر ان کے امور مذہبی کا مہتمم اور افسر مقرر کر دیا۔ محمد بن قاسم نے برہمنوں کو سمجھایا کہ شام و عراق و ایران میں مسلمانوں نے یہودیوں، عیسائیوں اور آتش پرستوں کے معبدوں کو جس طرح کوئی نقصان نہیں پہنچایا اسی

طرح تمھارے عبادت خانوں کو بھی ہم کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے۔ اس کے بعد محمد بن قاسم کے پاس حجاج کا یہ خط آیا۔

"میں تمھارے ملکی انتظام سے بہت خوش ہوا ہوں۔ تم ایسے کام کرو کہ تمھارا نام روشن ہو اور تمھارے دشمن عاجز و پریشان ہوں۔ تمھارا ہر ایک کام میں مجھ سے صلاح پوچھنا تمھارے حزم و احتیاط کی دلیل ہے۔ مگر فاصلہ اس قدر دراز ہے کہ خط کا جواب پہنچنے میں دیر ہوتی ہے اور اس سے کاموں میں التوا ہوتا ہے لہذا تم اب بطور خود رعیت نوازی اور عدل گستری کے طریقوں پر آزادانہ عملدرآمد کرو۔"

اس کے بعد محمد بن قاسم نے ایک مقام کو فتح کر کے وہاں کے تمام حربی اور غیر حربی لوگوں کو امان دے دی اور ہر قسم کا محصول و لگان بھی ان کو معاف کر دیا اور تمام کیفیت حجاج کو لکھ بھیجی حجاج نے اس کے جواب میں لکھا کہ۔

"جو لوگ اہل حرب ہیں ان کو قتل کرو۔ جو مطیع ہوں اُن کو امان دو۔ صناع و تاجر پر کوئی محصول یا ٹیکس عائد نہ کرو۔ جو شخص زراعت میں زیادہ توجہ اور جانفشانی سے کام لیتا ہے اُس کی مدد کرو اور اس کو تقاوی دو۔ جو لوگ اسلام سے مشرف ہوں ان سے زمین کی پیداوار کا عشر یعنی دسواں حصہ وصول کرو اور جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہیں ان سے وہی مالگذاری وصول کرو جو وہ اپنے راجاؤں کو دیا کرتے تھے۔"

الور کی فتح کے بعد محمد بن قاسم کے پاس کچھ لوگ ایسے پکڑے ہوئے آئے جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑے تھے اور ہر ایک اعتبار سے کشتنی و گردن زدنی تھے۔ محمد بن قاسم نے اُن کو جلاّدوں کے سپرد کر دیا کہ ان کو قتل کر دو۔ ان کو جب مقتل میں لے گئے تو ان میں سے ایک شخص نے مسلمانوں کے ایفائے وعدہ کی صفت سے فائدہ اُٹھانے کی عجیب تدبیر سوچی اس نے اپنے محافظوں سے کہا کہ میرے پاس ایک ایسی عجیب چیز ہے جو کسی نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ جلاّدوں نے کہا دکھاؤ۔ اس نے کہا کہ میں تمھارے سردار محمد بن قاسم کو دکھا سکتا ہوں۔ چنانچہ اس کی اطلاع محمد بن قاسم کو ہوئی۔ محمد بن قاسم نے اسکو اپنے سامنے طلب کیا اور کہا کہ تو کیا دکھاتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک ایسی عجیب و غریب چیز ہے جو کسی نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ مگر میں اس کو اُس وقت دکھاؤں گا جبکہ مجھ کو اور میرے سارے کنبہ کو امان دی جائے۔ محمد بن قاسم نے کہا کہ میں نے اماں دی۔ اس نے کہا کہ اپنا تحریری اور دستخطی امان نامہ دو تو دکھاؤں۔ محمد بن قاسم نے سمجھا کہ کوئی بڑی ہی بیش قیمت چیز ہوگی۔ لہذا اماں نامہ پر دستخط کر کے اس کے حوالے کیا۔ اماں نامہ لیکر اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ سر کے بالوں کو بکھیر دیا۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور پاؤں کی انگلیوں کو اپنے سر سے لگایا۔ پھر ناچنے لگا اور کہنے لگا کہ کسی شخص نے میرا یہ عجیب

غریب تماشا نہ دیکھا ہوگا۔ محمد بن قاسم اپنی غلطی پر حیران تھا۔ اور لوگوں نے جو وہاں موجود تھے کہا کہ یہ کیا عجیب تماشا ہے جس کے لیے اماں دی جائے۔ اس نے ہمکو دھوکا دیا ہے اسے قتل کرنا چاہیے۔
محمد بن قاسم نے کہا کہ "قولِ مرداں جاں دارد" میں چونکہ اس کو اماں دے چکا ہوں اس لیے اپنے عہد سے نہیں پھر سکتا ہاں یہ مناسب ہے کہ اس کو قید رکھا جائے اور اس معاملے میں حجاج سے فتویٰ طلب کیا جائے جب حجاج کے پاس یہ تمام کیفیت لکھی ہوئی پہنچی تو اس نے خلیفہ ولید بن عبد الملک اور کوفہ و بصرہ کے علماء کو لکھا اور اس معاملے میں فتویٰ طلب کیا۔ خلیفہ نے بھی اور علمائے کوفہ و بصرہ نے بھی حجاج کو لکھا کہ اس مجرم کے ساتھ جو وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہونا چاہیے۔ چنانچہ حجاج کے پاس سے جواب آنے پر وہ شخص اور اس کے کُنبے کے بائیس[۲۲] آدمی جو واجب القتل تھے رہا کردئے گئے (ماخوذ از تاریخ معصومی)
ملتان کا بُت خانہ سندھ کے مرکزی بُت خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں سورج کا مندر تھا جس میں ایک بُت رکھا ہوا تھا جس کی آنکھوں میں لعل لگے ہوئے تھے۔ محمد بن قاسم نے اس بُت خانے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور برہمن آباد کی طرح یہاں بھی پجاریوں کو ہر قسم کی رعایت و آزادی حاصل رہی
محمد بن قاسم اور اس کے بعد کے مسلمان گورنروں نے ملک سندھ میں ہندوؤں کے مندروں کے لیے بڑی بڑی جاگیریں وقف کیں جیسا کہ مسجدوں کے لیے بھی انھوں نے اوقاف مقرر کیے مسلمان جو عراق و شام سے آئے تھے۔ مال غنیمت میں ان کا ایک حصہ مقرر تھا۔ مال غنیمت کا پانچواں حصہ سلطنت کے مرکزی خزانہ کا حق تھا۔ یا پانچواں حصہ رفاہِ عام کے کاموں میں لازماً خرچ کیا جاتا تھا۔ اکثر اوقات مرکزی خزانہ کا حق بھی رفاہِ رعایا کے لیے خرچ کردیا جاتا تھا۔ نومسلموں کو ان کی زمینوں اور جائدادوں پر بدستور قابض رکھا گیا تھا۔ ان سے عشر وصول کیا جاتا تھا۔ ان نومسلموں میں سے جو لوگ فوج میں بھرتی ہوکر کام کرتے تھے ان کو اس خدمت کے عوض اور زمینیں دی جاتی تھیں۔ غیر مسلم جو مسلمانوں کی فوج میں بھرتی ہوکر کام کرتے تھے ان کو تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ نومسلموں کو بھی اگر وہ خواہش کرتے تھے تو نقد تنخواہیں ملتی تھیں۔ غیر مسلم جو اسلامی لشکر میں شامل ہوتے تھے اس کے صلے میں ان کا سرکاری لگان معاف کردیا جاتا تھا مسلمانوں نے جب کسی حصہ ملک کو فتح کیا تو عموماً وہاں کے پرانے حاکم ہی کو اقرار اطاعت لیکر اس ملک کا حاکم مقرر کردیا۔ عام انتظام کی نگرانی اور عدل کے قائم رکھنے کے لیے مرکزی مقامات میں عرب سرداروں کو بھی مقرر کردیا جاتا تھا۔ مگر اس انتظامی پولیس یا فوج میں زیادہ تر سندھ کے نومسلم ہوتے تھے۔ ہندو سرداروں کے علاوہ جن کا براہِ راست سلطنت اسلامیہ کے انتظامی عہدوں سے تعلق تھا سندھ میں مسلمانوں نے جابجا ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کردی تھیں۔ اس طرح ملک کا تقریباً تمام

حصہ راجاؤں کے ماتحت تھا۔ ان راجاؤں سے جو مالگذاری یا خراج وصول کیا جاتا تھا۔ وہ بہت ہی قلیل بلکہ برائے نام لیا جاتا تھا۔ زمین کی پیداوار اور آمدنی کی باقاعدہ تشخیص نہیں کی گئی تھی۔ زر لگان اور خراج کے لیے عام طور پر مراسم قدیمہ کو معلوم کر کے اس سے بھی کم روپیہ وصول کیا جاتا تھا۔ اس روپیہ کا بہت بڑا حصہ رفاہ رعایا کے لیے خرچ ہوتا تھا۔ ہندو راجاؤں کی حکومت میں سندھ کی رعایا کے اکثر طبقات بہت پست اور خراب حالت میں تھے۔ راجا اور اس کے رشتہ داروں اور مصاحبوں کی گویا پرستش ہوتی تھی اور یہ اعلیٰ طبقہ مال و دولت اور عیش و راحت کا حقیقی وارث و مالک سمجھا جاتا تھا مسلمانوں کی حکومت کے شروع ہوتے ہی یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ کیونکہ مسلمانوں کا اعلیٰ حاکم اور ایک ادنیٰ خادم دونوں ایک ہی حالت میں نظر آتے تھے۔ تہذیب و متانت اور عدل و انصاف کے ساتھ عام انسانی مساوات کا نقشہ مسلمانوں نے اہل سندھ کے آگے پیش کیا اس نے سب کو متاثر و مدہوش کر دیا۔ رعایا کے دل خوشی سے لبریز ہو گئے اور ہر طرف سے اسلامی سلطنت کی مدح و ستایش کے ترانے بلند ہونے لگے۔ عربی و شامی سرداروں اور سپاہیوں کو بھی کہیں کہیں جاگیریں اور قطعات زمین دیئے گئے تھے۔ مگر وہ تمام زمینیں اور قطعات ان کے اصلی مالکوں کے پاس بدستور رہے جو زر مالگذاری سرکاری خزانے میں داخل ہوتا وہ ان جاگیرداروں کو مل جاتا مگر چند ہی روز کے بعد پرانے مالک خود جاگیردار بن گئے اور عرب سردار کہیں سے کہیں تبدیل ہو گئے اور انھوں نے ان جاگیروں کی کبھی پروا نہیں کی۔

مسلمانوں نے اس بات کا حد سے زیادہ خیال رکھا کہ ہماری حکومت سے ملک سندھ کے کسی طبقہ اور کسی قوم کو بھی اذیت نہ پہنچے۔ انھوں نے پست لوگوں کو ابھارا تو سہی لیکن بلند رتبہ لوگوں کو پست کرنا نہیں چاہا۔ محمد بن قاسم نے شہروں کو مفتوح کرنے کے بعد دیکھا کہ اہل حرفہ۔ صناعوں۔ سوداگروں اور کاشتکاروں کو جنگ کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے تو اس نے حکم دیا کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک کو بارہ درم وزن چاندی دی جائے۔ تاکہ اپنے کاموں کو جاری کر سکیں اور جس کا نقصان زیادہ ہوا ہے اس کو بعد تحقیق زیادہ امداد دی جائے۔ یہ سن کر کہ حکومت کی طرف سے یہ مہربانی عام لوگوں پر ہوئی ہے برہمنوں نے آ کر درخواست کی کہ راجہ داہر ہمارا ہم قوم تھا اور ہم ہی سلطنت کے تمام معزز عہدوں پر مامور تھے سب ہماری حکومت کو مانتے اور ہم کو سب سے زیادہ معزز جانتے تھے۔ ہمارے لیے آپ نے کیا انتظام کیا ہے۔ محمد بن قاسم نے یہ تحقیق کرنے کے بعد کہ برہمن واقعی ایک معزز اور امور سلطنت سے واقف قوم ہے حکم دیا۔ کہ برہمنوں کو سلطنت اسلامیہ کے معزز عہدوں پر مامور کیا جائے۔ چنانچہ محکمہ مال کا تمام انتظام برہمنوں کے سپرد کر دیا گیا۔ محمد بن قاسم نے ان کو یقین دلا دیا کہ مجھ کو تمہارے اوپر پورا پورا

اعتماد ہے۔ اور امید ہے کہ تم بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دو گے۔ تو مالگذاری کا وصول کرنا۔ اس کا حساب رکھنا۔ خزانہ کی حفاظت کرنا سب برہمنوں کے سپرد کر دیا گیا۔ چنانچہ محمد بن قاسم کے زمانے سے لیکر آئندہ ہر ایک زمانے میں ملک سندھ کا مالی محکمہ برہمنوں ہی کے ہاتھ میں رہا۔ اس محکمہ میں مسلمانوں کو خلافت عباسیہ کے زمانے میں بھی دخل و تصرف حاصل نہیں ہوا۔ برہمن محمد بن قاسم سے جس شخص کی سفارش کرتے وہ اس کے مرتبے کو بلند کر دیتا تھا۔ محمد بن قاسم نے برہمنوں کو تاکید کر دی تھی کہ کاشتکاروں سے محصول یا بٹائی وصول کرنے میں ہرگز کوئی سختی نہ کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو کاشتکاروں کو سہولتیں دی جائیں جس کاشتکار کے یہاں پیداوار کم ہو اس کو سرکاری لگان معاف کر دیا جائے۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ برہمن لوگ خود مواضعات میں جا جا کر سلطنت اسلامیہ کی خوبیوں کا وعظ کرنے اور رعایا کو حکومت وقت کی وفاداری کی ترغیب دینے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ سندھ میں عام طور پر اشاعت اسلام کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اور یہی سبب تھا کہ اردگرد کے ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کے ساتھ محبت و ہمدردی کا برتاؤ کرنا ضروری سمجھا۔

اوپر کے تمام حالات پڑھنے کے بعد جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم ہندوستان میں صرف ساڑھے تین سال رہا اور اسی قلیل مدت میں اس نے تمام ملک سندھ کو فتح بھی کیا اور ایسا اچھا نظام سلطنت قائم کیا تو حیرت ہوتی ہے اور یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ تصور کیا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم کی عمر سندھ میں داخل ہوتے وقت سترہ سال کی تھی اور جب یہاں سے رخصت ہوا ہے تو بیس یا اکیس سال کی عمر رکھتا تھا۔ محمد بن قاسم کی قابلیت اور حقیقی کامیابی اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ جب ملک سندھ سے رخصت ہوا ہے تو عام طور پر تمام ملک میں رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔ شہر کیرج کے ہندوؤں اور بودھوں نے اپنے شہر میں محمد بن قاسم کا ایک بت بنا کر رکھا اور اس کی پرستش شروع کر دی۔

محمد بن قاسم کے ساتھ جو عراقی و شامی آئے تھے۔ ان میں سے کچھ شہید ہو چکے تھے جو باقی تھے انھوں نے محمد بن قاسم کے بعد اپنے وطن کو واپس جانا چاہا تو خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کا امتناعی حکم آ گیا کہ تم کو سندھ سے واپس آنے کی اجازت نہیں ہے اگر آؤ گے تو بلا تامل قتل کر دیئے جاؤ گے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہو گا کہ محمد بن قاسم کے ہمراہیوں سے خلیفہ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں ملک شام میں واپس آ کر کوئی شورش و بغاوت برپا نہ کریں۔ غرض یہ لوگ یہیں رہ پڑے محمد بن قاسم چونکہ ایک ہر دلعزیز سپہ سالار تھا اس لیے اس کے ہمراہیوں نے سلطنت کے کاموں اور انتظاموں میں بھی حصہ لینا ترک

پامال کر دیا۔ ان نومسلموں اور ہندوؤں کو بھی محمد بن قاسم کے قتل کی خبر سے رنج ہوا۔ جن پر محمد بن قاسم نے احسانات کی بارشیں کی تھیں۔ نئے گورنر یزید بن ابی کبشہ کا محمد بن قاسم سے چارج لینے کے بعد اٹھارھویں روز انتقال ہو گیا اور اس خبر کے دارالخلافہ جانے اور وہاں سے نئے عامل کے مقرر ہو کر آنے میں دیر ہوئی۔ لہذا راجہ داہر کے بیٹے جے سیہ نے اس فرصت کو غنیمت سمجھکر حکومت کے حاصل کرنے اور اپنے آبائی ملک پر قابض ہونے کی کوشش کی اور یکایک پہنچکر برہمن آباد پر قابض ہو گیا۔ شامی و عراقی مسلمان دربار خلافت کی طرف سے چونکہ مایوس ہو چکے تھے لہذا انھوں نے کچھ زیادہ کوشش ملک کے بچانے کی نہ کی اُدھر سردار کے نہ ہونے سے کافی مقابلہ ہو بھی نہیں سکتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جے سیہ کی حکومت برہمن آباد میں قایم ہو گئی۔ مگر باقی ملک پر اسلامی قبضہ قائم رہا۔

محمد بن قاسم کے بعد عہد بنو اُمیہ میں سندھ کی حالت

یزید بن ابی کبشہ کے فوت ہونے پر عامر بن عبد اللہ سندھ کا گورنر مقرر ہو کر آیا۔ اور تمام ملک کا بندوبست کیا لیکن جے سیہ برہمن آباد پر قابض و متصرف رہا۔ ابھی برہمن آباد کی فتح کا کوئی بندوبست نہ کرنے پایا تھا کہ عامر بن عبد اللہ بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نے حبیب بن مہلب کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا حبیب بن مہلب اپنے ساتھ کافی فوج لے کر آیا۔ اس عرصہ میں جے سیہ کو کامیاب دیکھکر اور بھی چند راجے خود مختار ہو چکے تھے ان کو حبیب نے آکر مطیع و منقاد بنایا۔ ابھی وہ جے سیہ کی طرف متوجہ نہ ہونے پایا تھا کہ کسی ضرورت سے واپس جانا پڑا۔ اس کے جاتے ہی وہ راجے جن کو اس نے ابھی مطیع کیا تھا پھر خود مختار ہو گئے اور برہمن آباد میں جے سیہ کی حکومت اور بھی زیادہ مستحکم ہو گئی۔ یہ راجے جو جابجا سندھ کے شہروں پر قابض ہو کر اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنا لینے میں کامیاب ہوئے۔ عموماً راجہ داہر کے بیٹے بھتیجے اور خاندان کے لوگ تھے۔ ان میں اکثر ایسے تھے جن کو محمد بن قاسم نے اقرار اطاعت لیکر حکومتوں پر قائم رکھا تھا صرف ایک جے سیہ ایسا تھا جو باہر سے آکر برہمن آباد پر قابض ہوا تھا۔ سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسلام کا اخلاقی اثر اس قدر قوی ہو چکا تھا کہ اس بغاوت و سرکشی کے زمانے میں بھی مسلمانوں اور نومسلموں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا نہ نومسلموں نے اسلام ترک کرنے اور مرتد ہونے کا ارادہ کیا۔ ۲۰ ماہ صفر ۹۹ھ کو خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے۔ محمد بن قاسم کے بعد سے اب تک دو برس سے زیادہ مدت گذر چکی تھی اس عرصہ میں سندھ کا نظام حکومت بہت ہی ابتر رہا یعنی جلد جلد گورنر آتے اور جاتے رہے کسی کو

دیر تک رہنا نصیب نہ ہوا حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے تخت خلافت پر متمکن ہو کر عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کا گورنر مقرر کر کے بھیجا اور ان تمام ہندو راجاؤں کے نام اس مضمون کے خطوط روانہ کیے کہ۔

"تم اسلام قبول کر لو۔ بت پرستی کی تاریکی سے نکل آؤ۔ اگر تم مسلمان ہو جاؤ گے تو ہم تمکو تمھاری ریاستوں پر بدستور قائم رکھیں گے تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ تمھارے ساتھ مسلمانوں کی مانند سلوک کریں گے اور اپنا بھائی سمجھیں گے"

یہ خطوط جب روسائے سندھ کے پاس پہنچے تو سب سے پہلے جے سیہ بن داہر نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ وہ اس عرصہ میں مسلمانوں کے اعمال و عبادات و اخلاق کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا لہذا اس کو اسلام کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی باقی تمام راجاؤں نے بھی جو عموماً اس کے رشتہ دار تھے اسلام قبول کیا اور سب نے اپنے پرانے ناموں کو چھوڑ کر نئے اسلامی نام رکھے۔ ان راجاؤں کے مسلمان ہوتے ہی عام رعایا پر بھی بڑا اثر پڑا اور جوق در جوق لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ کے ملک کا ایک بڑا حصہ پھر مستقل طور پر پرانے حکمران خاندان کی حکومت میں چلا گیا۔ یہ مسلمان راجہ خلیفہ کی سیادت و حکومت کو تسلیم کرتے اور اسلامی شریعت کے پابند تھے اور ان کو اپنی حکومت و ریاست میں ہر قسم کی آزادی و خود مختاری حاصل تھی۔ ایک حصہ ملک سندھ کا ایسا تھا جو براہ راست گورنر سندھ کے قبضہ میں تھا۔ اس علاقے میں بھی ہندو روسا جا بجا سلطنت اسلامیہ کی طرف سے برسر حکومت تھے اور باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا عہد خلافت سندھ میں نہایت امن و امان اور اشاعت اسلام کا زمانہ تھا۔ اس مبارک عہد میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سندھیوں نے اسلام قبول کیا سنہ ۱۰۱ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی جگہ یزید بن عبد الملک خلیفہ ہوا۔ یزید بن عبد الملک نے جنید بن عبد الرحمٰن بن حرث بن خارجہ بن سنان بن ابی حارثہ مزنی کو سندھ کا گورنر مقرر کر کے بھیجا۔ جنید سنہ ۱۱۱ھ تک سندھ کا گورنر رہا۔ یہ ایک اولو العزم اور واقعہ پسند شخص تھا۔ اس نے ملک کے ہر حصے میں اپنا اقتدار قائم کرنے اور ماتحت راجاؤں کو مرعوب رکھنے کی کوشش کی۔ سندھ کے جنوب کی جانب کسی گورنر نے توجہ نہیں کی تھی۔ جنید نے گجرات کے راجہ کو بھی اطاعت قبول کرنے اور باجگزار بننے پر مجبور کیا۔ ادھر اجین کے راجہ کو اپنا ماتحت اور خراج گزار بنایا۔ جنید کی ان کارروائیوں کو دیکھ کر جے سیہ اور دوسرے نو مسلم فرمانروا کچھ تردد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اتفاق کی بات کہ جنید نے برہمن آباد کے متصل دریائے سندھ کو عبور کر کے دوسری طرف یعنی حدود ریاست برہمن آباد میں جانے کا

قصد کیا۔ ممکن ہے کہ وہ گورنر سندھ ہونے کی حیثیت سے ریاست برہمن آباد کو بھی اپنا ماتحت علاقہ سمجھکر بتقریب دورہ جاتا ہو لیکن جے سیہ نے دریا کے اس طرف آنے سے جنید کو روکا اور پیغام بھیجا کہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تحریک سے مسلمان ہوا ہوں۔ یہ ریاست اُنھوں نے مجھکو دی ہے۔ تمکو میری ریاست میں قدم رکھنے اور بغیر میری اجازت کے یہاں آنے کا کوئی حق نہیں۔ جنید نے لکھا کہ میں تمھاری ریاست میں کوئی مداخلت کرنے نہیں آتا ہوں۔ جے سیہ نے کہا کہ مجھکو تمھاری بات کا اعتبار نہیں اور اندیشہ ہے کہ کہیں تم مجھکو حکومت سے معزول نہ کردو۔ جنید نے کہا کہ میں ضمانت دینے کو موجود ہوں کہ تمکو معزول نہ کرونگا۔ مگر ہاں تم سے بطور نشان اطاعت خراج ضرور وصول کیا جائیگا۔ غرض جنید کو دریا کے پار جانے اور جے سیہ کو اس کے روکنے پر اصرار رہا آخر دونوں طرف سے قوت کا استعمال ہوا۔ ادھر سے روکنے کے لیے اور ادھر سے دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتیاں بڑھیں۔ دریا کے بیچ میں جنگ ہوئی۔ اس بحری لڑائی میں جے سیہ کو شکست ہوئی اور جنید دریا کے پار پہنچ گیا۔ وہاں بڑی لڑائی ہیں جے سیہ مقتول ہوا جے سیہ کا بھائی اس واقعہ کے بعد دمشق کی جانب روانہ ہوا کہ وہاں پہنچکر خلیفہ سے جنید کی شکایت اور اپنے بھائی کا قصاص طلب کرے۔ جنید کو جب یہ خبر لگی تو اس نے اپنے معتمد بھیجکر اور دھوکا دیکر راستہ ہی سے جے سیہ کے بھائی کو واپس بلوایا۔ جب وہ جنید کے پاس واپس آیا تو جنید نے اس کو بھی قتل کر دیا۔ یہ پہلی وعدہ خلافی اور ظالمانہ کارروائی تھی جو سندھ میں مسلمانوں سے سرزد ہوئی۔ اس حادثہ کا تمام ملک سندھ پر بہت ہی بُرا اثر پڑا۔ اگرچہ یہ صرف ایک شخص کی غلط کاری تھی۔ مگر سندھیوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ مسلمانوں میں پاس عہد کے خلاف بھی عمل دیکھا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۰۵ھ میں خلیفہ یزید بن عبد الملک فوت ہوا تھا اس کی جگہ ہشام بن عبد الملک تخت نشین ہوا۔ ہشام نے جنید کو بدستور سندھ کی گورنری پر مامور رکھا تھا۔ سنہ ۱۰۷ھ میں جب جنید نے جے سیہ اور اس کے بھائی کو قتل کیا اور اس کا حال خلیفہ کو معلوم ہوا تو اس نے فوراً جنید کو سندھ کی حکومت سے معزول کرکے اس کی جگہ ایک نہایت رحمدل اور نرم مزاج شخص تمیم بن زیاد کو سندھ کا گورنر مقرر کرکے بھیجا۔ تمیم جس قدر رحمدل تھا اُسی قدر فیاض بھی تھا۔ تمیم کی نرمی و فیاضی کا سندھیوں پر اس لیے زیادہ اثر نہیں ہوا کہ وہ اپنے ساتھ کوئی فوج لیکر نہیں آیا تھا۔ اور اس نے آکر اس ملک میں طاقت کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ جے سیہ اور اس کا بھائی چونکہ مسلمان تھے اس لیے نومسلموں کو ان دونوں شہزادوں کے مقتول ہونے کا سخت صدمہ تھا۔ سوء اتفاق سے تمیم کا چند روز کے بعد

انتقال ہوگیا اور کچھ دنوں یہ ملک بلا کسی گورنر کے خالی رہا۔ اس وقفہ میں سندھ کے اندر بدامنی کی اور شورش پیدا ہوگئی۔ اس شورش میں بہت سے نومسلم بھی حکومت اسلامیہ کے خلاف برہمنوں کے شریک ہوگئے۔ نومسلم روسا، مرتد ہونے لگے اور برہمنوں نے ہندوستان کے دوسرے راجاؤں سے خط وکتابت شروع کی کہ سندھ پر آکر قبضہ کرلو۔ کاکسا بن چندر جس کا اوپر ذکر آچکا ہے ابھی تک زندہ اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانے میں مسلمان ہوکر ایک ریاست کا فرمانروا تھا۔ اس نے اس شورش کے زمانے میں بڑے استقلال اور وفاداری کا ثبوت پیش کیا وہ خود بھی صدق دل سے اسلام پر قائم رہا اور اس نے دوسرے نومسلموں کو بھی مرتد ہونے سے روکا۔ تمیم کی وفات کا حال سن کر عراق کے گورنر خالد بن عبد اللہ نے حکم بن عوانہ کلبی کو ۱۱۱ھ میں سندھ کا حاکم مقرر کرکے بھیجا۔ حکم بن عوانہ نے آکر دیکھا کہ سندھ کے اکثر علاقے میں بغاوت پھیلی ہوئی ہے اور تحریک ارتداد نے ان عراقی وشامی عربوں کو بھی جو یہیں سکونت پذیر ہوگئے تھے خطرے میں مبتلا کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں مختلف شہروں اور قصبوں میں بکھرے ہوئے آباد تھے اور اپنے محبوب سپہ سالار محمد بن قاسم کے مقتول ہونے کے بعد نہایت افسردہ خاطر ہوکر اور اپنے ہتھیار کھول کر اپنی نومسلم بیویوں اور بچوں کی پرورش کے لیے نومسلموں کے ساتھ کھیتی باڑی کے کاموں میں مصروف ہوگئے تھے۔ ان لوگوں نے سلیمان بن عبد الملک کے اس امتناعی حکم کے بعد جس میں ان کو ملک شام میں واپس جانے سے روکا گیا تھا۔ یہ طرز زندگی اختیار کرلیا تھا۔ حکم بن عوانہ کلبی نے سندھ میں آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ان تمام عربوں کو مختلف و منفرق مقامات سے بلوا بلوا کر ایک جگہ فراہم کیا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک زبردست اسلامی طاقت اس اجتماع سے پیدا ہوجائے۔ اور یہ منتشر و پراگندہ مسلمان خطرے سے بھی بچ جائیں۔ یہی لوگ چونکہ سندھ کے اولین فاتح تھے۔ اس لیے اس کو ان کی بہادری اور تدبر پر بھی سب سے زیادہ اعتماد ہوسکتا تھا اس جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ محمد بن قاسم چونکہ دربار خلافت کی فوری طلبی پر بلا توقف سندھ سے روانہ ہوگیا تھا اور اس کو پہلے سے سلیمان بن عبد الملک کی مخالفت وعداوت کا حال معلوم تھا لہذا وہ روانگی کے وقت اپنی بیوی رانی لاڈی اور اپنے نوزائیدہ بچے کو جس کا نام اس نے عمر رکھا تھا یہیں اپنے دوستوں کے پاس چھوڑ گیا تھا جو اپنی ماں اور اپنے باپ کے دوستوں کی نگرانی میں پرورش پا رہا تھا۔ حکم بن عوانہ کلبی کی طلب پر عمر بن محمد بن قاسم بھی مع اپنے رفیقوں کے اس کے پاس آگیا۔ عمر بن محمد کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ حکم نے دریا کے مشرقی کنارے پر ان عربوں کو جو مختلف مقامات سے آکر جمع ہوئے تھے ۱۱۳ھ میں آباد کرکے اس جدید بستی کا نام محفوظہ رکھا اور

اسی کو اپنا قیام گاہ بنا کر سندھ کا دار الصدر قرار دیا۔ اس کے بعد حکم بن عوانہ نے عمر بن محمد کو سندھ کی اسلامی فوج کا سپہ سالار بنا کر باغیوں اور سرکشوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ عمر نے جا بجا فتوحات حاصل کیں تمام سرکشوں کو مطیع و منقاد بنایا اور اپنے باپ کی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے سب کو رضامند بھی کر لیا۔ ملک سندھ میں حکومت اسلامیہ کے مستحکم کرنے کے بعد عمر بن محمد نے دریا کے مغربی کنارے پر محفوظ کے بالمقابل ایک دوسرا شہر آباد کیا جس کا نام منصورہ رکھا۔ سنہ ۱۲۰ھ میں حکم بن عوانہ کلبی فوت ہو گیا اور عمر بن محمد قاسم کے پاس دربار خلافت سے سندھ کی گورنری کا پروانہ آ گیا۔ اس کے بعد محفوظ کی رونق گھٹنے اور منصورہ کی آبادی بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ آیندہ منصورہ ہی سندھ کا حاکم نشین شہر رہا۔

سنہ ۱۲۶ھ میں عمر بن محمد کا بھی انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ منصور بن جمہور سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔ سنہ ۱۳۲ھ میں خلافت بنی امیہ کا چراغ گل ہو گیا۔ اس کی جگہ خلافت عباسیہ قائم ہوئی۔ عباسی بنو امیہ کے دشمن تھے سندھ کے گورنر منصور نے جو اموی خلیفہ کا مقرر کردہ حاکم تھا عباسی خلیفہ کی بیعت سے انکار کیا۔ اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہاں چونکہ شامی لوگ موجود تھے اور وہ سب امویوں کے طرفدار اور عباسیوں کے مخالف تھے۔ لہذا سب کے سب منصور کی حمایت و اعانت پر آمادہ ہو گئے۔

عباسیوں کے مشہور سپہ سالار ابو مسلم خراسانی نے منصور کو معزول اور سندھ پر حکومت کرنے کے لیے عبدالرحمٰن نامی ایک سپہ سالار کو مامور کیا۔ منصور نے مقابلہ کیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد عبدالرحمٰن مارا گیا اگر اس زمانے میں کوئی اموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل کی طرح بچ کر سندھ کی طرف چلا آتا تو جس طرح عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس میں ایک شاندار حکومت و خلافت قائم کی اسی طرح سندھ و ہند میں بھی ضرور ایسی ہی شاندار اموی سلطنت قائم ہو جاتی اور محمود غزنوی کو ہندوستان کی طرف آنے کی مطلق ضرورت پیش نہ آتی۔ مگر افسوس اس طرف کوئی ایسا با اقبال متوجہ نہ ہوا ابو مسلم خراسانی نے عبدالرحمٰن کے مقتول ہونے کی خبر سن کر موسیٰ بن کعب تمیمی کو جو محکمہ پولیس کا افسر اعلیٰ تھا ایک زبردست فوج دے کر بھیجا۔ منصور نے سندھ کی مغربی سرحد پر آگے بڑھ کر موسیٰ کو روکا اور معرکہ آرا ہو کر مقتول ہوا۔ اسی لڑائی میں منصور بن جمہور کا بھائی منظور بن جمہور بھی مارا گیا۔ منصور جس شخص کو اپنا نائب بنا کر منصورہ میں چھوڑ آیا تھا۔ اس نے منصور کے مقتول ہونے کی خبر سنتے ہی اپنے اہل و عیال اور خاندان بنو امیہ کے ہمدرد شامیوں کو لے کر منصورہ سے کوچ کیا اور شہر کو ویران چھوڑ کر سندھ و بلوچستان کے درمیانی پہاڑوں میں جا کر پناہ گزین ہوا۔ اس طرح سنہ ۱۴۲ھ میں ملک سندھ بھی خلافت عباسیہ کے حدود حکومت میں داخل ہو گیا۔

خلافت بنو امیہ کے زمانے میں جس طرح تمام دوسرے ملکوں پر حکومت اسلامیہ کا رنگ خالص اسلامی تھا۔ اسی طرح سندھ میں بھی وہی عربی اسلامی رنگ غالب رہا، چالیس سال تک خلفائے بنی امیہ کے ماتحت مسلمانوں نے سندھ میں حکومت کی۔

اس چالیس سال میں اسلام کا اثر و اقتدار برابر روبہ ترقی رہا۔ سندھ میں پہلے ہی سے ہندو اور بدھ مذہب کی مذہبی کشمکش جاری تھی۔ اسی مذہبی معرکہ میں اسلام بھی شریک ہو گیا اور شریک ہوتے ہی اس کو غلبہ حاصل ہوا۔ حکومت و طاقت نے اور بھی اس غلبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر ثابت کر دیا کہ آیندہ اس ملک کے ہر ایک باشندے کا مذہب اسلام ہو سکتا ہے۔ اسلام اس ملک میں اس طرح داخل ہوا کہ سندھ کے قدیم باشندوں کو اسلام سے کوئی رقابت یا عداوت پیدا نہیں ہوئی اگر رقابت یا عداوت تھی تو وہ محض قومی و نسلی اعتبار سے تھی کہ ہماری قوم سے نکل کر ایک عرب قوم میں حکومت کیوں چلی گئی۔ مذہب کی تبدیلی رقیبانہ جذبہ میں بہت ہی کم اثر انداز تھی کیونکہ اسلام کی مساوات و روا داری اور اسلام کا سادہ اور فطرت انسانی کے موافق ہونا ایک ایسی زبردست اور دلربایانہ کشش رکھتا تھا جس کے آگے رقیبانہ و معاندانہ جذبات نشوونما ہی نہیں پا سکتے تھے۔ خلفائے بنو امیہ کے آخری عہد میں انتظام سلطنت بہت ہی کمزور ہو گیا تھا اسی لیے بعض سردار تو یہ کوشش بھی کرنے لگے تھے کہ ہماری ماتحت رعایا اسلام قبول نہ کرے بلکہ غیر مسلم ہی رہے تاکہ اس کو تمام اسلامی حقوق حاصل ہو کر حکومت اسلامیہ میں ہماری ہمسری کا استحقاق حاصل نہ ہو سکے۔ خلافت عباسیہ کو خلافت بنو امیہ کے مقابلے میں جو جو امتیازات حاصل تھے وہ سب ملک سندھ میں بھی نمایاں اور اثر انداز ہوئے۔

سندھ خلافت عباسیہ میں موسیٰ بن کعب نے سندھ پر قبضہ کر کے بہت جلد تمام ملک میں امن و امان اور انتظام قائم کر دیا اور سب سے پہلے دار السلطنت منصورہ کی آبادی و رونق رفتہ کے بحال کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ چند روز میں منصورہ پھر آباد اور پُر رونق شہر بن گیا۔ موسیٰ نے سندھ کے نظام سلطنت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں کی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے عبداللہ سفاح عباسی خلیفہ کی اطاعت کا اقرار تمام روسائے سندھ سے لیا اُمویوں کے طرفدار دور دراز کے ریگستانی مقاموں اور پہاڑوں میں روپوش ہو گئے سنہ ۱۴۱ھ میں موسیٰ بن کعب کا سندھ میں انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے ذی الحجہ ۱۳۶ھ میں خلیفہ عبداللہ سفاح فوت ہو کر اس کی جگہ خلیفہ منصور عباسی تخت نشین ہو چکا تھا۔ موسیٰ کے بعد خلیفہ منصور نے موسیٰ کے بیٹے عیینہ بن موسیٰ کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ سال بھر کے بعد عیینہ کو معزول کر کے عمر بن حفص بن عثمان بن قبیصہ بن ابی صفرہ ملقب بہ ہزار مرد کو سنہ ۱۴۲ھ میں سندھ کا

گورنر مقرر کیا۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عباسیوں کی خلافت ایرانیوں کی مدد سے قایم ہوئی تھی۔ لہذا تمام ذمہ داری کے عہدوں پر ایرانی نومسلم ہی ہر جگہ نظر آنے لگے تھے۔ خاندان خلافت تو عربی قریشی تھا۔ مگر اپنے اثر۔ اخلاق اور نظام کے اعتبار سے عباسی خلافت کو ایرانی خلافت کہا جا سکتا تھا۔ یہ تغیر کوئی معمولی تغیر نہ تھا۔ اس کو نظر انداز کر دینے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ خلافت عباسیہ کو قائم ہوئے بارہ سال ہی گذرے تھے کہ علویوں یعنی سادات نے خروج کیا اور خلافت عباسیہ کے لیے موت اور زیست کا سوال پیدا ہو گیا۔ علویوں کی بغاوتوں کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اور علویوں کی اس رقابت نے عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ کرنے میں بڑا کام کیا۔ ایرانیوں نے برسر اقتدار ہو کر عربوں کو پیچھے ہٹانے اور نیچا دکھانے کی مسلسل کوششیں کیں اور اس کام میں خلفائے عباسیہ کی امداد ان کو حاصل رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کو خاندان خلافت سے ہمدردی نہ رہی اور سلطنت اسلامیہ عربوں کی انتظامی قابلیت اور حقیقی اسلامی سادگی اور مساوات سے محروم ہو گئی۔ ایرانی تکلفات اور شاہ پرستی نے دخل پایا۔ خلیفہ منصور عباسی علم کا شائق اور علماء کا قدردان تھا۔ اس کے زمانے میں تصنیف و تالیف کتب کا سلسلہ مسلمانوں میں جاری ہوا۔ دارالترجمے قائم ہوئے۔ یونانی علوم کو عباسی خلفاء نے عربی میں ترجمہ کرا کر شائع کیا۔ فلسفہ۔ منطق۔ علم کلام وغیرہ کی گرم بازاری ہوئی۔ حکومت کی طرف سے ہر شخص کو آزادانہ مذہبی عقائد و اعمال پر اعتراض کرنے کا حق تسلیم کیا گیا۔ اس مذہبی آزادی کو مجوسیوں نے بُری طرح استعمال کیا اور اپنی مجوسی سلطنت دوبارہ قائم کرنے اور سلطنت اسلامیہ کا تختہ اُلٹ دینے کی کوششوں میں مصروف ہو کر نئے نئے مذاہب ایجاد کرنے لگے۔ چنانچہ استاجیس ابن مقنع بابک خرمی۔ قرامطہ وغیرہ کا ظہور اسی قبیل سے ہے۔ جنھوں نے سلطنت اسلامیہ کو سخت پریشان رکھا۔ خلافت عباسیہ میں صرف ہارون الرشید اور مامون الرشید کا زمانہ جو ۱۷۰ھ سے شروع ہو کر ۲۱۸ھ تک ختم ہوتا ہے۔ نسبتاً اچھا اور امن و امان کا زمانہ تھا۔ جس میں یہ مذکورہ فتنے سر نہیں اُبھار سکے اور سلطنت اسلامیہ کو زیادہ نقصان بھی نہیں پہنچا سکے اس کے بعد تو گویا فتنوں کا دروازہ کھل گیا تھا جس کے سبب سلطنت اسلامیہ پارہ پارہ ہو گئی۔ ان اشارات کو ذہن میں رکھکر اب سندھ کی مختصر تاریخ ملاحظہ فرمائیے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سنہ ۱۴۲ھ میں خلیفہ منصور عباسی نے عمر بن حفص کو سندھ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ یہ عمر بن حفص بباطن شیعیت کی جانب زیادہ مائل تھا۔ یعنی اس کو سادات و علویین سے زیادہ ہمدردی تھی۔ ابھی تک سادات نے کوئی قابل تذکرہ جنگی اور اہم کارروائی خلافت عباسیہ کے خلاف

نہیں کی تھی۔ وہ اب تک خفیہ تیاریوں میں مصروف تھے۔ آخر ۱۴۴ھ میں عبداللہ بن حسن بن علی بن ابی طالب کے بیٹوں محمد و ابراہیم نے خروج کیا۔ حجاز و عراق میں ان کے ہزارہا طرفدار اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ہنگامہ اس قدر قوی اور خطرناک تھا کہ خود خلیفہ منصور کے دل پر فکر و ناامیدی نے غلبہ پا لیا تھا۔ ۱۴ رمضان ۱۴۵ھ کو محمد بن عبداللہ جو محمد المہدی کے نام سے مشہور ہیں مقتول ہوئے۔ مگر ابراہیم بن عبداللہ ان کے بھائی کئی برس بعد تک منصور کو پریشان کرتے رہے۔ محمد المہدی نے اپنے بیٹے عبداللہ بن محمد کو جو عبداللہ اشتر کے نام سے مشہور تھا ۱۴۴ھ میں ملک سندھ کی طرف روانہ کر دیا تھا کہ وہاں جا کر خلافت عباسیہ کے خلاف ہماری خلافت کی دعوت دو۔ عبداللہ اشتر بصرہ ہوتا ہوا ۱۴۵ھ میں جب عمر بن حفص کے پاس سندھ پہنچا تو عمر بن حفص نے فوراً اس کی دعوت کو قبول کر لیا۔ خود بھی محمد المہدی کی بیعت اختیار کی اور اپنے ماتحت ارکان سے بھی بیعت لی۔ عمر بن حفص نے دربار سے تمام عباسی علامات و نشانات دور کر کے محمد المہدی کی خلافت کے نئے جھنڈے بھی تیار کر لیے۔ اسی اثناء میں عمر بن حفص کے پاس محمد المہدی کے مقتول ہونے کی خبر پہنچی۔ عمر نے عبداللہ اشتر کو یہ خبر سُنا کر تعزیت کی۔ عبداللہ اشتر نے کہا۔ اب مجھ کو اپنی جان کی فکر ہے مجھے کسی طرح بچاؤ۔ عمر بن حفص نے کہا کہ سندھ کے سرحدی راجاؤں میں ایک راجہ جو سب سے زیادہ طاقتور ہے اور کافی فوج رکھتا ہے وہ آنحضرتؐ کے ساتھ بڑی محبت رکھتا ہے۔ تم اس سے معاہدہ کر کے اس کے پاس چلے جاؤ۔ عبداللہ اشتر نے اس سے خط و کتابت کی۔ اس نے فوراً اپنے یہاں بُلا لیا اور شہزادوں کی طرح تعظیم و توقیر کے ساتھ رکھا اپنی بیٹی کی شادی بھی عبداللہ اشتر سے کر دی۔ رفتہ رفتہ چار سو آدمی اِدھر اُدھر سے آ کر عبداللہ کے پاس جمع ہو گئے۔ یہ سب کے سب عرب اور مسلمان تھے۔ منصور کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اس نے عمر بن حفص کو معزول کر کے اس کی جگہ ہشام بن عمرو تغلبی کو ۱۴۶ھ میں سندھ کی حکومت دے کر روانہ کیا اور روانگی کے وقت تاکیدی طور پر ہدایت کی کہ عبداللہ اشتر کو گرفتار یا قتل کرنے کی ضرور کوشش کرنا اور اگر سندھ کا راجہ اس کے دینے سے انکار کرے تو اس پر حملہ کر کے اس کا ملک چھین لینا۔ ہشام نے سندھ پہنچ کر اس راجہ سے عبداللہ اشتر کو طلب کیا۔ اس نے دینے سے انکار کیا۔ ہشام نے اپنے بھائی سُفیح بن عمرو کو فوج دے کر راجہ سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اتفاقاً عبداللہ اشتر مع دس سواروں کے دریا کے کنارے سیر کرتا ہوا سفیح کی نظر پڑا اس نے حملہ کیا۔ عبداللہ اشتر اور اس کے ہمراہی مقتول ہوئے۔ راجہ کے ملک پر حملہ ہوا لڑائی میں راجہ مارا گیا اور اس کا ملک مفبوضات خلافت میں شامل ہوا۔ عبداللہ اشتر کی بیوی اور اُس کا بیٹا جو شیر خوار بچہ تھا اور اس کا نام بھی عبداللہ ہی تھا گرفتار کر کے خلیفہ منصور کے پاس دوسرے

قیدیوں کے ساتھ بھیجے گئے۔ منصور نے اس لڑکے عبداللہ بن عبداللہ اشتر کو اس کی ماں کے ساتھ مدینہ بھیجدیا کہ عبداللہ اشتر کے رشتہ داروں کے سپرد کر دیا جائے۔ ابھی علویوں کا مذکورہ ہنگامہ پورے طور پر فرو نہ ہونے پایا تھا کہ ۱۵۰ھ میں استاجیس (افراسیاب) نے نبوت کا دعوی کر کے خروج کیا اور منصور کی تمام تر ہمت اس فتنہ کے فرو کرنے میں صرف ہونے لگی۔ ۱۵۱ھ میں منصور نے ہشام بن عمرو کو سندھ کی حکومت سے معزول کر کے اس کی جگہ معبد بن خلیل کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ ذوالحجہ ۱۵۸ھ میں منصور کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ مہدی خلیفہ ہوا۔ ۱۵۹ھ میں خراسان کے اندر ابن مقنع نے دعوی الوہیت کے ساتھ ظہور کیا۔ یہ تناسخ کا بھی قائل تھا۔ اسی سال معبد بن خلیل گورنر سندھ کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ روح بن حاتم سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔ ۱۶۹ھ میں خلیفہ مہدی کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ ہادی خلیفہ مقرر ہوا۔ اسی سال حسین بن علی بن حسن مثلث بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی بن ابی طالب نے مدینہ میں خروج کیا۔ اور مکہ میں آکر ماہ ذی قعدہ مقتول ہوئے۔ مکہ میں جب حسین بن علی کا عباسی لشکر سے مقابلہ ہوا تو وہاں بعض ترکوں اور ہندی غلاموں نے حسین کا ساتھ دیا تھا۔ سندھ کی گزشتہ لڑائی میں عبداللہ اشتر کے مقتول ہونے پر اس کی بیوی (سندھ کے مذکورہ راجہ کی بیٹی) اور بیٹے کے ساتھ بعض برہمن بھی جو راجہ کے رشتہ دار تھے گرفتار ہو کر بطور جنگی قیدی کے منصور کے پاس پہنچے تھے۔ منصور نے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے ان کو مدینہ بھیجدیا تھا۔ یہ جنگی قیدی جو ہندی غلام کہلاتے تھے حسین مذکور کے ساتھ ہو گئے تھے اور حسین بن علی بن مثلث مذکور کی کامیابی کو عین اپنی کامیابی سمجھتے تھے۔ حسین مذکور کے ساتھ ان میں سے بعض مقتول ہوئے اور بعض فرار ہو کر کسی نہ کسی طرح پھر سندھ میں واپس پہنچ گئے تھے۔ انہیں لوگوں کی اولاد ہے جو اپنے آپ کو حسینی برہمن کہتے ہیں اور دعوی کرتے ہیں کہ ہم نے کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین علیہ السّلام کا ساتھ دیا تھا۔ کربلا کے میدان میں ان کا موجود ہونا تو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے مگر ہاں حسین بن علی بن حسن مثلث کو حسین بن علی بن ابی طالب سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ لوگ راجہ داہر یا اس کے قریبی رشتہ داروں کی اولاد ہیں اور آج تک سندھ و پنجاب میں پائے جاتے ہیں اور ہندو و مسلمانوں کے قدیمی ہمدردانہ تعلقات کا زندہ ثبوت ہیں۔ ۱۷۰ھ میں ہادی کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ ہارون الرشید خلیفہ ہوا۔ ابوتراب حاجی گورنر سندھ کے فوت ہو جانے پر ۱۷۱ھ میں ہارون الرشید نے ابوالعاص کو سندھ حکومت دیکر بھیجا۔ ۱۷۴ھ میں ابوالعاص کی جگہ اسحق بن سلیمان سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جس طرح عباسیوں کی خلافت اپنے معراج کمال کو پہنچی اسی طرح سندھ کا گورنر بھی ہندوستان کے تمام راجوں مہاراجوں میں سب سے بڑی طاقت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ قنوج کے راجہ نے خود کوشش کر کے ابوالعاص گورنر سندھ کی معرفت

دارالخلافہ بغداد سے اپنے نیازمندانہ تعلقات قائم کیے۔ پنجاب وگجرات کے راجاؤں نے گورنر سندھ
کے پاس خراج بھیجنا منظور کیا۔ سندھ کا ملک علم وفضل وتہذیب میں یہاں تک ترقی کرچکا تھا کہ اس کی
شعاعیں بنگال وتبت تک پڑنے لگیں اور علم وعلماء کی قدردانی نے ہندوستان کے باکمالوں کو
عزت کے ساتھ بغداد تک پہنچا دیا۔ اس زمانے میں قنوج کے راجا کو بغداد میں ملک الہند کے نام سے
یاد کیا جاتا تھا۔ ملک الہند کی طرف سے خلیفہ بغداد کے لیے سوغاتیں اور تحائف پہنچا کرتے تھے۔ قنوج
کے اندر اسلام اور مسلمانوں کو بڑی عزت وتعظیم کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ اسحق بن سلیمان دس سال تک
سندھ کا گورنر رہا۔ ۱۸۴ھ میں اس کی جگہ داؤد بن یزید بن حاتم سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔ یہ بڑا علم
دوست اور عادل وعاقل شخص تھا۔ اس کے زمانہ میں صوبہ سندھ کی رونق وآبادی اور شان وشوکت
نے بڑی ترقی کی ۱۹۲ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے مقام رقہ سے بغداد آکر خراسان کے دورے کا
ارادہ کیا۔ اس زمانے میں ہارون الرشید کی طبیعت ناساز تھی۔ شاہی طبیب حکیم جبرئیل بن بختیشوع
خلیفہ کے ہمراہ تھا۔ خلیفہ نے داؤد بن یزید گورنر سندھ کی معرفت قنوج کے راجہ کو خط لکھا کہ ہم ایک طویل
سفر کے لیے دارالخلافہ سے روانہ ہو رہے ہیں۔ ہماری طبیعت ناساز ہے لہٰذا تم اپنے خاص طبیب مانک چند
کو ہمارے پاس بھیج دو کہ وہ اس سفر میں ہمارے ساتھ رہے۔ ہم جس وقت بلخ پہنچ جائیں گے تو اس کو
تمہارے پاس بحفاظت روانہ کردیں گے۔ اس واقعہ کو ابن جریر طبری نے جو صرف تینتیس سال بعد
۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے۔ تاریخ طبری کا ترجمہ ابوصالح بن منصور بن نوح
سامانی کے وزیر ابوعلی محمد نے ۳۵۰ھ کے قریب فارسی زبان میں کیا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہارون از نہرواں بیرون کرد براہ عمان بسوئے ملک ہندوستان فرستاد با خواستہ بسیار
وگفت مرا علت بسیار شدہ است وسفرے دراز درپیش آمدہ است آں پزشک (حکیم) راکہ
منکیہ (مانک چند) نام است بفرست تا بخراسان آمد چوں بلخ آئیم اورا بسوئے تو باز فرستیم
وملک ہندوستان منکیہ حکیم را نام است بفرست تا بخراسان وعلاجش کرد .... پس ہارون
راآں بیماری بگرگان زیادت شد اورا گفتند از ہوا ہا ہوائے طوس تندرست۔ ہارون از گرگان برفت
بماہ صفر بسال نود وسہ بطوس شد وآں جا بمرد ومیان بختیشوع (جبرئیل بن بختیشوع) ومنکیہ خلاف
(اختلاف) افتاد مدار دہاکہ ہارون را بداد ند .... ومنکیہ باز نزد ملکان خود ہندوستان آمد"

طوس میں پہنچ کر خلیفہ ہارون الرشید ماہ جمادی الثانی ۱۹۳ھ اسی مرض میں فوت ہوگیا مگر مرنے
وقت یہ حکم دے گیا کہ ہندی طبیب کو حسب وعدہ قنوج ضرور پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ مانک چند کو

طوس سے قنوج پہنچا دیا گیا۔ اس واقعہ سے کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور بہم پہنچتا ہے کہ اس زمانے میں ہندو راجا مسلمانوں کے خلیفہ کی فرمائشوں کا پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے چاہیے اس فرض کا نام اخلاقی فرض ہی رکھ لیجیے۔ یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ دربار خلافت کو ہندو درباروں کے طبیبوں تک کے نام بھی معلوم تھے جو تعلقات کے گہرے اور قوی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہارون الرشید کے بعد اس کا بیٹا امین تخت نشین ہوا۔ مگر ایران و خراسان وغیرہ ممالک مشرقیہ دوسرے بیٹے مامون کی حکومت میں رہے۔ پانچ سال تک دو عملی اور دونوں بھائیوں کی مخالفت رہی۔ مگر داؤد بن یزید گورنر سندھ کی قابلیت نے سندھ میں کوئی مضر علامت پیدا نہ ہونے دی۔ داؤد بن یزید نے اس زمانے میں سندھ کا خراج بھی دربار خلافت کو روانہ نہیں کیا بلکہ تمام خزانہ اسی ملک کے انتظام اور رفاہ رعایا کے کاموں میں خرچ کر کے اپنی قبولیت اور شوکت کو ترقی دی ۱۹۸ھ میں امین قتل ہوا۔ اور مامون الرشید خلیفہ بنا۔ مامون الرشید کے تخت نشین ہوتے ہی پھر ہارون الرشید کے زمانے کی شوکت خلافت عباسیہ میں واپس آ گئی۔ داؤد بن یزید نے بھی مامون کے نام پر لوگوں سے بیعت لی اور اپنی اطاعت کا اقرار نامہ بھیجدیا۔ مامون نے اس تجربہ کار اور لائق گورنر کو اس کی جگہ پر قائم رکھا اور سندھ کے خراج کا بھی اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ ۲۰۵ھ میں داؤد کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ اس کے بیٹے بشر بن داؤد کو سندھ کی حکومت ملی اسی سال قوم زط نے عراق میں بغاوت کی۔ عیسیٰ بن یزید اس مہم پر مامور ہوا۔ یہ بغاوت ۲۱۹ھ تک تھوڑی بہت جاری رہی۔ بشر بن داؤد نے مقررہ رقم (جو دس ہزار درم سالانہ تھی) دار الخلافہ کو نہیں بھیجی۔ لہٰذا ۲۱۱ھ میں حاجب بن صالح کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ مگر بشر نے حاجب کو چارج دینے سے انکار کیا اور مقابلہ پر آمادہ ہو گیا دو برس تک حاجب پریشان و ناکام رہکر واپس ہوا تو خلیفہ مامون الرشید نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار غسان بن عباد کوفی کو ۲۱۳ھ میں بشر کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ بشر نے غسان کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر مجھکو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ اور خلیفہ کے پاس بغداد بھیجدو تو میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرتا ہوں غسان نے اس شرط کو قبول کر لیا اور بشر کو خود ہمراہ لے کر بغداد گیا۔ خلیفہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بشر نے تمام روپیہ رعایا کی فلاح و بہبود میں خرچ کیا ہے تو اس کا قصور معاف کر دیا۔ غسان اپنی طرف سے سندھ میں موسیٰ بن یحییٰ کو حاکم مقرر کر گیا تھا خلیفہ نے اس تقرر کو پسند کر کے موسیٰ بن یحییٰ کے پاس سند حکومت بھیجدی۔ ۲۱۶ھ میں موسیٰ نے ایک ماتحت راجہ کو جس نے بغاوت و سرکشی اختیار کر لی تھی قتل کیا۔ ۲۱۸ھ میں خلیفہ مامون الرشید عباسی کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی معتصم

بن ہارون تخت نشین ہوا۔ اور موسیٰ بن یحییٰ کو بدستور سندھ کی حکومت پر مامور رکھا۔ سنہ ۲۲۱ھ میں موسیٰ بن یحییٰ کا انتقال ہوا۔ اور مرتے وقت اپنے بیٹے عمران کو سندھ کی حکومت سپرد کر گیا خلیفہ معتصم نے بھی عمران بن موسیٰ کے پاس سند حکومت بھیجدی۔ عمران کے زمانہ میں سرحد بلوچستان کے قریب رہنے والے جاٹوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ اس بغاوت کا سبب عراق عرب کے جاٹوں یعنی زطوں کی بغاوت تھی جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ عمران نے اس بغاوت کو فرو کیا۔ اور اس علاقے میں ایک شہر البیضا کے نام سے آباد کیا۔ یہاں سے ملتان گیا پھر وہاں سے قندابیل نامی شہر میں گیا جو پہاڑ پر آباد تھا۔ قندابیل میں خلیل بن محمد گورنر سندھ کے ماتحت حکومت کرتا تھا اس سے آثار سرکشی معائنہ کر کے عمران نے اس کو قتل کر دیا۔ عمران کا دو سال کے بعد انتقال ہوگیا۔ اس کی جگہ فضل بن ماہان سندھ کا فرمانروا ہوا۔ چند ہی روز کے بعد وہ بھی فوت ہوا تو اس کا بیٹا محمد بن فضل سندھ کا حاکم ہوا۔ محمد بن فضل نے ایک بیڑہ جہازوں کا تیار کر کے مہاراشٹر و ملابار کے ساحل پر چڑھائی کی۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے بھائی ماہان نے سندھ پر قبضہ کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور خلیفہ معتصم کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ مجھکو سند حکومت عطا ہو۔ مگر ماتحت راجاؤں اور رئیسوں نے مل کر اس کو قتل کر دیا اور اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ سنہ ۲۲۷ھ میں معتصم کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ واثق خلیفہ ہوا خلیفہ معتصم کے زمانے میں بابک خرمی کا فتنہ برپا ہوا اور خلیفہ کی تمام تر توجہ اسی طرف منعطف رہی اُدھر ماوراء النہر میں سرکشیوں اور بغاوتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ خاص بغداد میں عربوں اور ترکوں کی رقابت کے ہنگامے نے خطرناک صورت اختیار کی اور سندھ کے صوبے کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی دربار خلافت کو نہ مل سکی۔ سندھ کے صوبے کی یہ خودمختاری مرکزی حکومت یعنی دربار خلافت کے مصروف آلام ہونے کا لازمی نتیجہ تھا۔ نہ صرف سندھ بلکہ اور بھی صوبے جو بغداد سے زیادہ فاصلے پر تھے خودمختار ہونے لگے۔ سندھ کی خودمختاری کی نوعیت یہ تھی کہ اس ملک کے چھوٹے چھوٹے قطعات پر کہیں مسلمان اور کہیں ہندو گورنر سندھ کی ماتحتی میں حاکم تھے۔ ان تمام حاکموں نے خودمختار ہو کر زر خراج ادا کرنا بند کر دیا اور ہر ایک نے یہ کوشش کی کہ دربار خلافت سے براہ راست کچھ نہ کچھ تعلق قائم رہے اور گورنر سندھ کی ماتحتی سے آزادی حاصل ہو۔ چنانچہ ایک ملک سندھ میں کئی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ خلافت میں دمبدم ضعف آتا گیا دربار خلافت پر جاہل ترکی غلاموں کا قبضہ ہوگیا۔ ایران و خراسان پر صفاریوں نے تسلط بٹھا لیا۔ بحرین و کوفہ میں زنگیوں پھر قرمطیوں کے ہنگامے شروع ہوگئے۔ سندھ کے تعلقات حقیقتاً دربار خلافت سے منقطع ہوگئے۔ مگر بظاہر سنہ ۲۵۸ھ

تک باقی رہے۔ ۲۲۵ھ تک سندھ پر باقاعدہ گورنروں نے حکومت کی۔ ۲۲۵ھ سے ۲۵۷ھ تک یہ حالت رہی کہ سندھ کے رئیسوں نے خلفائے بغداد کی سیادت کو برابر تسلیم کیا۔ باقاعدہ خراج تو سندھ سے جانا بند ہوگیا۔ مگر اس خوف سے کہ کہیں دارالخلافہ کے جھگڑوں سے فارغ ہو کر خلیفہ اس طرف فوجیں روانہ نہ کر دے اور ہماری خود مختاری کا مزا نہ چکھائے۔ رؤسائے سندھ معمولی ہدیئے اور تحفے روانہ کرتے۔ خوشامدانہ عرضیاں بھیجتے اور اپنی وفاداری و اطاعت کا یقین دلاتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی شکایت بھی کرتے اور اپنے آپ کو مصروف پریشانی ظاہر کر کے زر خراج کے نہ بھیجنے کا عذر بھی پیش کرتے رہتے تھے۔ خلیفہ چونکہ کوئی مؤثر کارروائی اس ملک میں نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ اس زبانی اطاعت اور اقرار فرمانبرداری ہی کو غنیمت سمجھ کر سندھ کو اپنا صوبہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۲۳۵ھ میں جب خلیفہ متوکل نے اپنے تینوں بیٹوں محمد۔ طلحہ اور ابراہیم کی بیعت ولیعہدی لے کر تینوں میں اپنے مقبوضہ ملکوں اور صوبوں کو تقسیم کیا ہے تو اس تقسیم نامہ میں صوبہ سندھ کا نام بھی موجود ہے۔ خلیفہ معتمد علی اللہ کے زمانے میں یعقوب بن لیث صفار نے سندھ پر قبضہ کیا اور سندھ کے رئیسوں سے خراج وصول کر کے اقرار اطاعت بھی لیا۔ مگر چند ہی روز کے بعد ۲۶۵ھ میں یعقوب کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ممالک مشرقیہ پر سامانیوں کا تسلط ہوا۔ وہ سندھ کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملتان اور منصورہ میں دو بڑی خود مختار اسلامی ریاستیں قائم ہوگئیں اور انھوں نے اپنی ہمسایہ ہندو ریاستوں کے ساتھ دوستانہ و ہمدردانہ تعلقات قائم کر لیے۔

عہد عباسیہ میں ہندو مسلم تعلقات

ملک سندھ پر پورے چالیس (۴۰) سال خلفائے بنو امیہ کی حکومت رہی۔ ان کے بعد پورے نوے سال تک سندھ خلفائے عباسیہ کی شہنشاہی میں شامل رہا۔ جس پر خلفائے عباسیہ کے مقرر کیے ہوئے گورنر حکومت کرتے تھے۔ ۲۲۵ھ سے ۲۵۷ھ تک یعنی بتیس (۳۲) سال سندھ میں چھوٹے چھوٹے رئیس خود مختار مگر خلیفۂ بغداد کو اپنا آقا تسلیم کرتے رہے۔ ۲۵۷ھ سے ۲۶۵ھ تک یعنی آٹھ سال بجائے عباسی خلیفہ کے یعقوب بن لیث صفار کی سیادت و شہنشاہی مسلّم رہی اور اس نے غیر مقررہ طور پر کچھ خراج بھی وصول کیا۔ اس کے بعد سندھ کا ملک خلفاء یا کسی دوسری شہنشاہی کے اثر سے بالکل آزاد ہوگیا جس میں ملتان و منصورہ کی دو وسیع اور طاقتور خود مختار اسلامی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ خلفائے بنی امیہ کے چالیس سال ایسے تھے کہ مسلمانوں نے سندھ پر خالص اسلامی اصول کے موافق حکومت کی۔ انھوں نے سندھی رعایا کے مذہب میں قطعاً کوئی دخل نہیں دیا اور اس ملک کے پرانے مروجہ

مذہب کے ساتھ اس قدر رواداری و مسالمت کا برتاؤ کیا کہ اس سے بڑھکر رواداری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس عرصہ میں سندھی لوگ اسلام کی خوبیاں، وسیع النظری، فراخدلی اسلام میں داخل ہوتے رہے یعنی اسلام کے محض نمونے نے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا۔ خلفائے عباسیہ نے شروع ہی سے تصنیف و تالیف، علوم کی تدوین اور یونانی علوم کے تراجم کی طرف توجہ مبذول کی۔ حکمت و فلسفہ اور علم کلام کا زور شور ہوا۔ عقائد و اعمال مذہبی عقل کی کسوٹی پر کسے جانے لگے اور دلیل و برہان سے مذہبی عقائد و احکام کی خوبی ثابت کیجانے لگی۔ یہ علمی سرگرمی بجائے خود ایک اعلیٰ درجہ کی مذہبی رواداری تھی اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی رواداری کو اس طرح عباسیوں نے پہلے سے دگنا کر دیا تھا۔ محمد بن قاسم جب سندھ میں داخل ہوا ہے تو یہاں برہمنی مذہب اور بودھ مذہب میں مقابلہ اور رقابت کا سلسلہ جاری تھا۔ دونوں مذہبوں کے پیرو ملک سندھ میں موجود تھے۔ اسلامی حکومت کے قائم ہوتے ہی چونکہ مذہبی آزادی کا اعلان ہو گیا تھا اور برہمنوں کی مرادیں اسلامی حکومت میں خاطرخواہ عہدے پا لینے سے پوری ہو چکی تھیں لہذا بودھوں اور برہمنی مذہب کے حامیوں کا آپس میں مباحثے کرنا اور ایک دوسرے کی تخریب کے لیے کوششیں کرنا بھی موقوف ہو گیا تھا۔ دونوں مذہبوں کے ماننے والے امن و امان اور صبر و سکون کے ساتھ اسلامی حکومت کے سایہ میں اپنے اپنے طریقوں پر قائم رہکر زندگی بسر کرنے لگے۔ عباسیوں کی خلافت میں چونکہ دلیل و برہان کی قوت سے مذہب کی صداقت ثابت کرنے کا رواج ہو گیا تھا لہذا سندھ میں بھی مذہبی مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری ہوا۔ ہندوؤں اور بودھوں کو اپنی اپنی سمجھ اور قابلیت کے موافق عقائد اسلامی پر آزادانہ اور علانیہ اعتراضات کرنے کی ترغیب حاصل ہوئی۔ مسلمانوں نے ہر طرح ان کی تسکین کی اور مباحثہ میں لاجواب ہو کر ان کو اسلام کی صداقت کا اقرار کرنا پڑا۔ یہ گویا ہندوؤں اور بودھوں کے مسلمان ہونے کا ایک نیا باب تھا جو خلافت عباسیہ کے عہد میں کھلا۔ چنانچہ جہم بن صفوان سے جو علم کلام کے بانی واصل بن عطا کا شاگرد اور فرقہ جہمیہ کا بانی ہے۔ چند بودھ مذہب کے عالموں کا وجود باری تعالیٰ کے مسئلہ میں مباحثہ ہوا۔ بودھ مذہب والے ہستی باری تعالیٰ کے قائل نہ تھے اس مباحثہ میں جہم اپنے حریفوں کو خاموش نہ کر سکا۔ اس نے بودھوں کے اعتراضات لکھکر واصل کے پاس بصرے میں بھیجے وہاں سے واصل نے ان کے جوابات لکھکر جہم کے پاس سندھ میں بھیجدیئے جہم نے جب بودھوں کو ان کے اعتراضوں کے جواب سنائے تو انھوں نے کہا کہ جس شخص نے یہ جوابات لکھکر بھیجے ہیں ہم کو اس کا پتہ بتاؤ۔ تاکہ ہم خود اس کے پاس پہنچکر تسکین حاصل کریں۔ آخر یہ بودھ علماء بصرہ پہنچے۔ واصل سے گفتگو کی اور اسلام کی صداقت کے دلائل سُن کر مسلمان ہوئے۔ ہارون الرشید

کے عہد خلافت میں اس ملک کے ایک بودھ راجہ نے اسلام کی حقانیت کے دلائل سُن سُن کر اپنا میلان طبع اسلام کی طرف ظاہر کیا۔ درباری پنڈتوں نے راجہ کے خیالات کو اسلام کی طرف سے پھیرنے کے لیے اسلام کے خلاف دلائل بیان کرنے شروع کئے۔ راجہ نے ہارون الرشید کو خط لکھا کہ آپ اپنے مذہب کے کسی عالم کو میرے پاس بھیج دیجیے تاکہ اس سے مباحثہ کیا جائے۔ اگر اس نے اپنے مذہب کی صداقت و حقانیت ثابت کر دی اور ہمارے پنڈت مباحثے میں ہار گئے تو میں اسلام قبول کر لونگا ہارون الرشید نے ایک محدث کو بھیجدیا۔ محدث صاحب چونکہ علم کلام سے ناواقف تھے اس لیے وہ بُدھ پنڈتوں کے سوالات کا مسکت جواب نہ دے سکے۔ راجہ نے ہارون الرشید کو لکھا کہ کوئی ایسا شخص بھیجیے جو دلائل عقلی سے بحث کر سکے۔ چنانچہ ہارون الرشید نے معمر یا ابوخلدہ نامی ایک متکلم کو روانہ کیا جب وہ حدود ہندوستان میں داخل ہوا تو پنڈتوں نے اپنا ایک آدمی بھیجکر رستہ ہی میں اس کی قابلیت کا اندازہ کیا اور جب ان کو معلوم ہوا کہ اس شخص سے مباحثے میں مقابلہ کرنا دشوار اور راجہ کا مسلمان ہو جانا یقینی ہے تو اُنھوں نے اس مسلمان عالم کو راجہ کے دربار تک پہنچنے سے پہلے ہی زہر دلوا کر مروا ڈالا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ہارون الرشید نے قنوج کے دربار سے مانک چند کو طلب کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی ہندی اور سندھی طبیب بغداد میں جا چکے تھے جو اپنے اپنے آبائی مذہب کے پابند تھے سندھ کے بہت سے نومسلموں نے قبول اسلام کرنے کے بعد مکہ و مدینہ کا سفر اختیار کیا بعض تحصیل علم کے شوق میں وہاں برسوں رہے۔ بعض وہیں رہ پڑے چنانچہ ابو معشر نجیح جو مدینہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور فن مغازی و سیر کے امام سمجھے جاتے تھے ایک سندھی نومسلم تھے جو ۱۷۰ھ میں فوت ہوئے اور ہارون الرشید نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ رجار نامی ایک بزرگ جو رجاء السندھی اسفرائینی مشہور ہیں۔ علم حدیث کے اُستاد اور سندھی نژاد تھے۔ اوپر موسیٰ بن یحییٰ اور اس کے بیٹے عمران بن موسیٰ گورنران سندھ کا ذکر آچکا ہے۔ جس زمانے میں عمران بن موسیٰ سندھ کا حاکم تھا۔ دوابہ سندھ ساگر میں ایک راجہ بودھ مذہب کا پیرو حکمراں تھا اس کی راجدھانی میں بودھ کا ایک بہت بڑا مندر تھا۔ اتفاقاً راجہ کا بیٹا بیمار ہوا۔ اس نے مندر کے پوجاریوں کو بلا کر التجا کی کہ میرے بیٹے کے تندرست ہونے کے لیے اپنے بُت سے التجا کرو۔ پوجاری مندر میں گئے اور پوجا پاٹ کے بعد واپس آکر راجا سے کہا کہ بُت نے ہماری دعا قبول کر لی ہے۔ اب آپ کا بیٹا تندرست ہو جائیگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد راجہ کا بیٹا مر گیا۔ راجہ اس واقعہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے بُت خانہ کو مسمار کرا دیا اور بُت کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ اتفاقاً اس کی راجدھانی

ہیں چند مسلمان سوداگر گئے ہوئے تھے۔ اس نے ان کو بلوا کر کہا کہ میں اپنے مذہب کو تو جھوٹا اور غلط سمجھنے لگا ہوں۔ تم اپنے مذہب کے اصول بیان کرو۔ مسلمان سوداگروں نے خدائے تعالیٰ کی وحدانیت اور رسالت محمدیہ کا حال سُنایا راجہ نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ یہ واقعہ ۲۲۳ھ کے قریب کا ہی جبکہ چند ہی سال بعد خلفائے عباسیہ کی باقاعدہ حکومت سے سندھ کا ملک آزاد ہونے والا تھا۔ مذکورہ بالا واقعات سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ عہد عباسیہ کے ابتدائی نوے سال کی مدت میں اسلام کو سندھی اور ہندی لوگ اچھی طرح سمجھنے لگے تھے اور اسلام کی طرف ہندی راجاؤں کی توجہ محض اس لیے نہیں تھی کہ مسلمانوں کی سلطنت دنیا میں سب سے بڑی سلطنت تھی بلکہ وہ اسلام کی ذاتی خوبیوں سے واقف ہو کر مسلمانوں کو واجب التکریم اور مستحق رعایت سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے قنوج و پنجاب تک مسلمان سوداگر اور مسلمان سفرا آمد و رفت رکھتے تھے۔ سندھ کا ملک اس عرصہ میں مسلمانوں کا وطن مالوف بن چکا تھا۔ سندھی تو مسلم اسلام اور علوم اسلامیہ سے واقف ہو کر عربی مسلمانوں کے لیے واجب التعظیم اور امام فن بننے لگے تھے۔ برہمنی مذہب کوئی با اصول اور علمی میدان میں آنے کے قابل مذہب نہ تھا بلکہ اس وقت تک وہ برہمنوں کی ایک قومی تحریک تھی جو بودھوں کی جگہ اپنا اقتدار محض ذات پات کی قیود کے ذریعہ قائم کرنا چاہتے تھے اور اپنے مذہب کے محکم اصول پیش نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بودھ مذہب ہی ہر جگہ اسلام کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان مناظرہ میں آیا جس کے پاس سب سے زبردست اور حقیقتاً سب سے زیادہ کمزور ایک ہی ہتھیار تھا یعنی انکار ہستی باری تعالیٰ۔ ہندوستان کے جس جس حصہ میں اسلام پہنچا۔ وہاں من حیث المذہب نہ اس کی قابل تذکرہ مخالفت ہوئی۔ نہ کوئی ہندوستانی مذہب اس کے مقابلہ میں ٹھہر سکا۔ مسلمانوں نے نہ اس ملک کے مندروں کو ڈھایا۔ نہ اس ملک کے رہنے والوں کو خوف یا لالچ کے ذریعہ مسلمان بنانا چاہا۔ جس قدر لڑائیاں ہندو اور مسلمانوں میں ہوئیں وہ ایسے اسباب کی بنا پر ہوئیں کہ ان اسباب کی بنا پر ہندو ہندوؤں اور مسلمان مسلمانوں سے لڑ سکتے تھے۔ لڑتے رہے تھے۔ لڑ سکتے ہیں اور لڑتے رہیں گے۔ غرض ان لڑائیوں کا سبب مذہبی اختلاف ہرگز نہ تھا۔ با کم از کم مسلمانوں نے تو ہرگز کسی کو محض اس لیے نقصان نہیں پہنچایا کہ اس کا مذہب اسلام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو سندھ میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے ماتحت وہ مذہبی آزادی اور ہر قسم کی مراعات کبھی حاصل نہ ہو سکتیں جن کا بالتفصیل اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

سندھ کی خود مختار اسلامی ریاستیں

۲۶۵ھ سے ملتان و منصورہ کی دونوں اسلامی ریاستیں بالکل آزاد و خود مختار ہو گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علویوں اور شیعوں کے طرفداروں نے

عجیب عجیب چالاکیوں اور نئی نئی ترکیبوں سے تمام عالم اسلام میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ مصر، افریقہ و شام و عراق و خراسان غرض ہر ملک میں عباسیوں کی حکومت کا تختہ الٹ دینے کی تیاریاں ہو چکی تھیں ۲۷۸ھ میں مذہب قرامطہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ان لوگوں نے بجائے خانہ کعبہ کے بیت المقدس کو اپنا کعبہ قرار دیا تھا ۲۸۶ھ میں ابو سعید قرمطی نے بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ ان لوگوں کی طاقت و شدت یہاں تک بڑھ گئی کہ انھوں نے حج بیت اللہ میں سخت رکاوٹیں پیدا کیں ۲۸۹ھ میں یحییٰ بن ذکرویہ قرمطی لڑائی میں مارا گیا تو اس کے بھائی حسین نے اس کی جگہ متمکن ہو کر امیر المومنین مہدی اپنا لقب رکھا سنہ ۲۹۳ھ میں قرامطہ نے حاجیوں کو قتل کیا اور خلیفہ کو خود ان کے مقابلے کے لیے نکلنا پڑا۔ سنہ ۳۱۲ھ میں قرامطہ بحرین یعنی ساحل خلیج فارس سے فلسطین تک اور بصرہ سے کہ معظمہ تک چھا گئے۔ ماوراء النہر اور خراسان پر سامانی حکومت قائم ہو گئی۔ آذربائیجان و فارس پر علوی اور علویوں کے طرفدار مسلط ہو گئے۔ سامانیوں کو تو عباسی خلیفہ کی روحانی سیادت تسلیم تھی۔ لیکن قرامطہ اور شیعہ عباسیوں کے سخت دشمن تھے۔ ان حالات میں قرامطہ کا سندھ کی اسلامی ریاستوں کی طرف متوجہ ہونا ضروری تھا۔ دربار بغداد کی طرف سے چونکہ مزاحمت اور طاقت کے استعمال کا سلسلہ قرامطہ کے خلاف جاری تھا۔ لہذا قرامطہ کوئی فوج اور جنگی مہم تو نہیں بھیج سکے لیکن ان کے مناد اس ملک میں آتے رہے۔ یہاں کے مرکزی مقاموں یعنی ملتان و منصورہ وغیرہ میں ان کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن متصلات میں قرمطی تحریک کا چرچا ضرور کچھ نہ کچھ ہوا۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ دربار خلافت سے تعلق منقطع ہونے کے بعد سندھ میں ملتان و منصورہ کی دو طاقتور ریاستیں قائم ہو گئی تھیں لیکن یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ان دونوں اسلامی ریاستوں کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستیں سندھ میں ان کے ساتھ ہی قائم ہو گئی تھیں جو مختلف سرداروں اور بعض اُن لوگوں نے قائم کر لی تھیں جو محمد بن قاسم کے ہمراہیوں کی اولاد اور زیادہ تر پہاڑوں اور ریگستانوں کے دشوار گذار مقامات میں آباد تھے۔ سندھ جب خلافت عباسیہ کے دربار سے منقطع ہوا تو ان لوگوں نے بھی جو بنو امیہ کے طرفداروں کی اولاد تھے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی حالت کے مضبوط کرنے اور اولوالعزمی سے کام لینے میں مصروف ہوئے۔ ان تمام اسلامی ریاستوں کی مجمل کیفیت جو مسعودی کی کتاب مروج الذہب اور اسی کے قریبی زمانے کے سفرناموں سے مستفاد ہوتی ہے یہ ہے کہ ملتان سے جنوب کی جانب ساحل بحر تک یقیناً ملتان و منصورہ کی دونوں زبردست اسلامی ریاستیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان دونوں ریاستوں کی حدود و مقام اتوزپر

جو راجہ داہر کا دارالسلطنت تھا ملتی تھیں۔ شہر الور ریاست منصورہ میں تھا۔ الور سے شمال کی جانب ریاست ملتان کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ ان دونوں ریاستوں کی مشرقی اور مغربی حدود کا صحیح تعین اور پتہ اس وقت بتانا دشوار ہے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ ان ریاستوں کی مشرقی حدود پر چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستیں پیدا ہو گئی تھیں اور یہ مشرقی ہندو ریاستیں سابق صوبہ سندھ کا جزو تھیں۔ ان ہندو ریاستوں کے رئیس وہی ہندو سردار تھے جن کو مسلمانوں نے اپنی ماتحتی میں حاکم مقرر کیا تھا۔ ان ریاستوں سے ملتان و سندھ کی ریاستوں کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ملتان و منصورہ کے مغرب کی جانب چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستیں تھیں ان سے بھی منصورہ و ملتان کے اسی طرح دوستانہ تعلقات تھے جیسے ہندو ریاستوں سے تھے۔ مسعودی ۳۰۳ھ میں داخل سندھ ہوا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ملتان کے اندر بنو سامہ بن لوی بن غالب کی حکومت ہے۔ سامہ بن لوی بن غالب قبیلہ قریش کا وہ شخص تھا جس نے آنحضرت صلعم کی ولادت سے پہلے بحر اعمان کے ساحل پر اقامت اختیار کر لی تھی اسی شخص کی نسل سے ملتان کا فرمانروا تھا۔ مسعودی کا بیان ہے کہ ملتان کی سلطنت میں ایک لاکھ کے قریب گاؤں آباد ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ملتان میں ہندوؤں کا ایک بہت بڑا بت خانہ ہے جس کی پرستش اور زیارت کے لیے دور دور سے جاتری آتے ہیں اور موتی۔ سونا۔ چاندی۔ زیتون کا تیل اور خوشبودار چیزیں چڑھاتے ہیں جب کوئی ہندو راجہ ملتان پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ملتان کا امیر اس کو دھمکی دیتا ہے کہ میں تمہارے مندر کو تباہ کر دونگا اس لیے وہ حملہ آوری سے رک جاتا اور امیر ملتان سے دوستانہ تعلقات قائم رکھتا ہے۔ ابن حوقل کا بیان ملتان کی نسبت یہ ہے کہ ملتان بہت بڑا شہر ہے۔ اس میں ایک قلعہ بنا ہوا ہے۔ ملک سرسبز ہے اور غلہ ارزاں مگر منصورہ کی سرسبزی کو نہیں پہنچتا منصورہ کھیتی باڑی کے معاملہ میں ملتان پر فضیلت رکھتا ہے۔ امیر ملتان شہر سے باہر اپنے قلعہ میں رہتا۔ اور جمعہ کے دن ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کے اندر جامع مسجد میں آتا ہے۔ یہاں کوئی خاص سکہ نہیں ہے۔ تمام ملکوں کے درہم و دینار یہاں چلتے ہیں سندھی لوگ عراقیوں کا سا لباس پہنتے اور عراقی لوگ سندھی لباس استعمال کر لیتے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ملتان اور منصورہ دونوں ریاستوں کے فرمانروا مطلق العنان ہیں ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا ماتحت نہیں ہے۔

منصورہ کی ریاست میں بھی ایک قریشی امیر فرمانروا تھا۔ ریاست منصورہ سمندر کے ساحل سے شہر الور تک وسیع تھی۔ اس ریاست کا رقبہ ملتان کی ریاست سے بڑا تھا۔ اس میں تین لاکھ

گاؤں آباد تھے۔ زراعت خوب ترقی پر تھی۔ باغات کی کثرت تھی۔ تمام ملک اپنی سرسبزی و آبادی کے اعتبار سے قابل رشک حالت میں تھا۔ یہاں کا امیر ہبار بن اسود قریشی النسل تھا۔ ہبار بن اسود کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ یہ ان اشخاص میں سے تھا جن کی نسبت فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلعم نے حکم دیا تھا کہ جہاں ملیں ان کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن بعد میں ہبار نے اسلام قبول کر لیا اور آنحضرت صلعم نے اس کی خطاؤں کو معاف کر دیا تھا۔ ریاست منصورہ کی فوج بھی زبردست اور ہمہ اوقات کیل کانٹے سے درست اور مستعد مقابلہ رہتی تھی۔ ریاست منصورہ کو بلوچستان کی طرف سے حملہ آور ہونے اور لوٹ مار کرنے والے قبائل کا مقابلہ کرنا اور اپنی حدود کو محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ منصورہ کی فوج میں زرہ پوش جنگی ہاتھی بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ شہر الور میں امیر منصورہ کا ایک نائب رہتا تھا۔ شہر الور کی دوہری فصیل تھی اس کے علاوہ اور بھی کئی مضبوط قلعے اور بڑے بڑے شہر اس ریاست میں موجود تھے۔ منصورہ اور ملتان کی ریاستوں میں عربی اور سندھی دونوں زبانیں بولی جاتی تھیں۔ مسلمانوں کی یہ دونوں اسلامی ریاستیں اس قدر طاقتور تھیں کہ کوئی ہندو ریاست ان پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ ملتان کی ریاست منصورہ سے کسی قدر کمزور تھی۔ لیکن ملتان کے مندر کی اہمیت نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا۔

مسلمانوں کی ایک ریاست مغربی سندھ میں توران نامی تھی۔ مسعودی کے زمانے میں یہاں کے امیر کا نام ابوالقاسم تھا جو بصرہ کا رہنے والا تھا۔ کیکانان میں بھی ایک اسلامی ریاست تھی۔ جہاں کے حاکم کا نام معین بن احمد تھا۔ یہ اپنی ریاست میں خلفائے عباسیہ کے نام کا خطبہ پڑھواتا تھا۔

ایک اور ریاست قصدار تھی جو ملتان سے بیس منزل کے فاصلہ پر شمال و مغرب کی جانب واقع تھی۔ اس ریاست میں خارجی لوگ زیادہ آباد تھے اور ملک میں ہر قسم کا امن و امان تھا۔

سندھ کی ہندو ریاستوں میں بھی مسلمان آباد تھے۔ مسلمانوں کی مسجدیں بھی آباد اور مسلمانوں کو ہر قسم کے ہمسرانہ حقوق حاصل تھے اور ہندو راجہ ان کی بہت کچھ رعایت اور خاطر مدارات کرتے تھے۔ ۲۷۰ھ میں پنجاب کے ایک راجہ نے جس کا نام مہروگ بن رایگ تھا۔ ابوالمنذر عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز فرمانروائے منصورہ کو خط لکھا کہ میرے پاس کسی ایسے مسلمان عالم کو بھیجے جو ہندی زبان جانتا ہو۔ اور اسلام کے اصول و عقائد مجھ کو سمجھا سکے۔ فرمانروائے منصورہ نے عراق کے ایک عالم کو جو عرصہ سے ہندوستان کے شہروں میں سفر کرتا رہا تھا اور اس ملک کی زبان سے خوب اچھی طرح واقف تھا بلا کر اس خط کا مضمون سنایا اس نے تمام اسلامی عقائد و احکام کو اس ملک کی زبان میں نظم کر کے یہ نظم راجہ کے پاس بھجوا دی۔ راجہ اس نظم کو پڑھ کر بہت ہی خوش ہوا۔ اور ابوالمنذر فرمانروائے منصورہ کو لکھا کہ اس نظم کے

مصنف کو میرے پاس بھیج دیجیے۔ حاکم منصورہ نے اس عراقی عالم کو راجہ کے پاس بھیج دیا وہ ۲۷۳ھ تک راجہ کے پاس رہا۔ اس عرصہ میں راجہ مسلمان ہو گیا۔ مگر اپنی رعایا کے خوف سے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کر سکا عراقی عالم نے واپس آکر ابو المنذر عبد اللہ حاکم منصورہ سے بیان کیا کہ راجہ نے مجھ سے قرآن مجید کا ترجمہ ہندی زبان میں شروع سے سورۂ یٰسین تک سنا جب یہ آیت آئی کہ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ قُلْ یُحْیِیْھَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَھَآ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ط وَھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ ط تو اس کا ترجمہ سن کر راجہ نے کہا کہ مجھکو دوبارہ سنا و۔ میں نے دوبارہ ترجمہ سنایا۔ راجہ اپنے تخت سے اترا اور چند قدم چلکر خاک پر جو پانی چھڑکنے کی وجہ سے گیلی تھی اپنے گال اور پیشانی رکھدی اور زار و قطار روتا رہا اس کا چہرہ گل آلودہ تھا اور وہ بے اختیار کہتا تھا کہ یہی وہ ازلی معبود ہے جس کی مانند کوئی نہیں اس عراقی عالم نے یہ بھی کہا کہ راجہ مہروگ نے ایک گھر بنالیا ہے اس میں جاکر وہ تنہائی میں نماز پڑھتا ہے اور لوگوں سے کہہ رکھا ہے کہ اس مکان میں تنہائی حاصل کرنے کے لیے چلا جاتا ہوں۔ اس واقعہ کو بزرگ بن شہر یار نے اپنے سفر نامہ عجائب الہند میں بیان کیا ہے۔

۳۷۵ھ کے قریب زمانہ کا حال بشاری مقدسی نے لکھا ہے کہ ملتان کے لوگ شیعہ ہیں مگر دوسرے شہروں اور منصورہ میں عام طور پر لوگ اہل حدیث اور داؤدی مذہب کے پیرو ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے پیرو اس ملک میں موجود ہیں۔ مگر مالکی و حنبلی نہیں ہیں۔ ۳۰۳ھ میں مسعودی نے یہ مذہبی تفریق نہیں دیکھی تھی۔ مگر ۳۷۵ھ تک مسلمانوں میں مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ اسی عرصہ میں ملتان کے اندر شیعوں کی کثرت ہوئی۔ ۳۶۵ھ میں قریباً تمام عالم اسلامی شیعی طاقت سے مرعوب و مغلوب نظر آنے لگا تھا حکومت بغداد پر دیلمیوں کا تسلط تھا۔ انھیں کے نام کا خطبہ بغداد کے ممبروں پر پڑھا جاتا تھا۔ فارس و ایران اور مکران و بلوچستان سب پر دیلمیوں کی خود مختارانہ حکومت تھی۔ بحرین و نجد و شام پر قرامطہ مسلط تھے مصر و فلسطین وغیرہ سب عبیدیوں کے تسلط میں تھے۔ حجاز پر کبھی قرامطہ کبھی عبیدی قابض ہو جاتے تھے صرف ماوراء النہر کی سامانی سلطنت سُنّی مذہب رکھتی تھی۔ مگر سامانیوں میں ضعف و انحطاط پیدا ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں غالباً دیلمیوں کے اثر سے شیعیت کا رواج تھا۔ مگر منصورہ کی ریاست نے اس اثر کو مطلق قبول نہیں کیا۔ اسی زمانے سے ملتان اور منصورہ اور تمام دوسری سندھی مسلم ریاستوں کے درمیان نا اتفاقی پیدا ہوئی اور ایک دوسرے سے برسر جنگ رہنے لگے اس حالت کے پیدا ہوتے ہی سندھ میں مسلمانوں کے اثر و اقتدار اور اشاعت اسلام کو سخت نقصان پہنچا۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ قرامطہ کے واعظین نے اس ملک میں آکر بعض لوگوں کو اپنے مذہب کی دعوت دی تھی۔ اب دیلمیوں کے اقتدار اور قرامطہ کی فتحمندیوں کے افسانوں نے اس ملک کے بہت سے جاہلوں کو گمراہ کیا اور قرامطہ کی

ایک جماعت نے مکران و نوشکی کی ریاستوں میں داخل ہوکر اور بلوچوں کے غارت گر فرقوں کو اُبھار کر
ریاست منصورہ کے مغربی حدود پر حملہ آوری شروع کردی۔ اُدھر سے ملتان کی ریاست حملہ آور ہوئی
اس طرح منصورہ کے خلاف دوسری اردگرد کی ریاستیں بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں اور سب نے حملہ آور ہوکر ۳۱۶ھ
میں منصورہ کی ریاست کا خاتمہ کردیا۔ منصورہ کی ریاست کے برباد ہونے ہی سندھ میں اسلامی عہد اور
اسلامی طاقت کا زوال شروع ہوگیا۔ قرامطہ نے منصورہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور مسلمانوں کی نااتفاقی
نے سندھ کے اندر اسلامی حکومت کا گویا خاتمہ کردیا۔ ریاست منصورہ کا اکثر حصہ ہندوؤں کے قبضہ میں
چلا گیا اور ملتان کی ریاست جو منصورہ سے کمزور تھی تنہا رہ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ امیر ناصر الدین سبکتگین نے
غزنی میں اپنی ایک الگ مستقل سلطنت قائم کرلی تھی۔ ریاست منصورہ کی بربادی کے بعد قرامطہ کا زور شور
بڑھ گیا اور پہاڑی قبیلوں میں اس مذہب بلکہ لامذہبی کی خوب ترقی ہوئی۔ سامانی سلطنت اور ان کے
بعد غزنوی سلطنت قرامطہ کی سخت دشمن تھی اور اسی لیے کوہ سلیمان اور دریائے سندھ کے ساحل
تک سامانی فوجیں اور ان کے بعد سبکتگین کی فوجیں قرامطہ کے تعاقب میں آتی رہتی تھیں۔ لہٰذا پنجاب کے راجہ
جے پال کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں میری حدود مملکت میں یہ فوجیں دست درازی نہ کریں۔ اس نے قرامطہ
کی اس کوشش کو کہ انھوں نے ریاست منصورہ کو برباد کردیا۔ بڑے اطمینان سے دیکھا۔ اور ملتان کی متصلہ
ہندو ریاست بھاطنہ کے راجہ کو شریک مشورہ کرکے یہ تدبیر سوچی کہ سلطنت غزنی کے مشرقی سرحدی
قبائل کو جو بوجہ جہالت قرامطہ کی جانب مائل تھے ترغیب دی جائے۔ اور ملتان پر حملہ کرا کر انکی حکومت
ملتان میں قائم کرادی جائے۔ چنانچہ جے پال اور بھاطنہ کے راجہ نے سرحدی قبائل کے سردار حمید خاں
لودی سے اول ایک معاہدہ لکھایا اور پھر اپنی فوجوں کے ذریعے مدد دیکر ۳۵۸ھ میں حمید خاں کے
ہاتھوں ملتان کے قریشی عربی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کرادیا۔ حمید خاں کا تسلط ملتان پر اس لیے
اور بھی جلدی قائم ہوگیا کہ ہندو راجاؤں کے علاوہ قرامطہ بھی اس کے دوست تھے اور وہ خود قرمطی
مسلک کا پیرو تھا۔ جے پال نے حمید خاں لودی کو حاکم ملتان بنانے میں محض اسی لیے دلچسپی لی تھی کہ وہ
قرمطی تھا اور جے پال جانتا تھا کہ سبکتگین کے لیے اس طرح بہت سی مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔ مگر حمید خاں لودی
بھی یقیناً بہت بیدار مغز اور دور اندیش شخص تھا کہ اس نے ملتان کی فرمانروائی حاصل کرتے ہی ایک
درخواست سبکتگین کی خدمت میں بھیجی کہ میں مسلمان اور شریعت اسلام کا پابند ہوں مجھکو قرامطہ سے کوئی تعلق
نہیں اس لیے توقع رکھتا ہوں کہ آپ میرے علاقے کو اپنی فوجوں کا جولانگاہ نہ بنائیں گے۔ سبکتگین نے
حمید خاں کی اس درخواست کے جواب میں اس کو تسلی و تشفی کا خط لکھا اور ملتان میں اس کی حکومت

کو بنظر استحسان دیکھا۔

مذہب قرامطہ

عباسیوں کی خلافت و حکومت کے خلاف علویوں نے جو نا گزیر جد و جہد جاری رکھی تھی اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے بعض ایرانی الاصل چالاک لوگوں نے تحریک قرامطہ جاری کر کے اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس جگہ صرف یہ بتادینا ضروری ہے کہ قرامطہ کا مذہب اس قدر جلد اور سرعت کے ساتھ کیوں پھیل گیا تھا۔ قرامطہ کا مذہب در حقیقت کوئی خاص مذہب نہ تھا بلکہ ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد دنیا سے اسلام کو مٹانا اور عربوں کی فوقیت و برتری کو نیچا دکھانا تھا۔ اس تحریک کو مذہبی جامہ پہنایا گیا تھا لوگوں کو نماز روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اور تکالیف شرعیہ سے آزادی دیکر بتایا جاتا تھا کہ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ خدا کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ ساتھ ہی محمد بن حنفیہ کو خدا کا رسول منوایا جاتا تھا۔ حضرت علیؓ کی تکریم محض اس لیے رکھی گئی تھی کہ علویوں کے طرفدار تمام شیعہ ہمدرد بن جائیں اور مخالفت کا اظہار نہ کریں۔ مسلمانوں کا قتل کرنا موجب ثواب بتایا جاتا تھا۔ قتل و غارت اور اپنے ہم مشربوں کے سوا دوسروں کو اذیت پہنچانا اور ستانا کوئی جرم نہ تھا۔ حلال و حرام کی قید کو بھی اٹھا دیا گیا تھا۔ غرضکہ اچھی خاصی لامذہبی اور بدمعاشی کا نام مذہب رکھا گیا تھا۔ چونکہ جاہل اور غارتگر لوگوں کے مزاج اور خواہشات سے اس مذہب کو خصوصی مناسبت تھی۔ لہٰذا ایرانیوں اور ہر قوم کے جاہل و بدوضع لوگ اس مذہب کو بڑی آسانی سے قبول کر لیتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ فارس و خراسان کے شہروں میں یہ وبا پھیل چکی تھی۔ شیعوں نے قرامطہ کو عباسیوں کا دشمن دیکھکر ان کی کوئی مخالفت نہیں کی۔ علویوں کی سازشوں اور عباسیوں کی اس دار و گیر نے جو انھوں نے بنو امیہ اور سادات کے مقابلہ میں کی مذہب قرامطہ کے لیے پہلے سے زمین تیار کر دی تھی۔ لوگوں نے قرامطہ کو شیعہ مذہب کی ایک شاخ سمجھا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ سخت بے دین، مسلمانوں کے جانی دشمن اور بدترین دشمن تھے۔ ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے مورخین نے عام طور پر قرامطہ اور ان کے اس تعلق کی طرف جو ہندوستان کی تاریخ سے ان کو ہے کوئی توجہ نہیں کی کیونکہ جس زمانے میں یہ تاریخیں لکھی گئی ہیں قرامطہ کا اثر و اقتدار صفحۂ ہستی سے فنا ہو چکا تھا لہٰذا بہت سے واقعات جن کا سبب قرامطہ کے سوا دوسرا نہ تھا ان مورخین نے غلط اور بے حقیقت اسباب سے وابستہ کر دیئے مثلاً امیر سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی قرامطہ کے جانی دشمن تھے اور انھوں نے شروع ہی سے اس خطرے کو محسوس کر کے تمام ملک خراسان یعنی اپنی حدود سلطنت سے چن چن کر ان کا سرکشوں کے اس گروہ کو نا پید کیا اور اپنی تمام تر ہمت ان کے استیصال میں صرف کر دی۔ لیکن تاریخوں میں قرامطہ کے خلاف سلطان محمود غزنوی کی کوششوں کو بہت ہی معمولی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور آج کل کی درسی تاریخوں میں تو

سلطان محمود کو ہندوؤں کا جانی دشمن ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ سلطان محمود کی زندگی کے اہم اور قابل تذکرہ کارناموں میں سب سے زیادہ نمایاں کارنامہ قرامطہ کی مخالفت ہے۔ اس ایک بات کے سمجھ لینے سے محمود غزنوی کے بہت سے حملوں کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ بعض مورخوں نے ان قرامطہ کو جو قطیف و بحرین و ہجر میں اپنا مرکز رکھتے تھے فراموش کر کے حسن بن صباح کے قائم کیے ہوئے مرکز قلعہ الموت کے فدائیوں کو قرامطہ کا اولین دور سمجھ لیا ہے اور جب حمید خاں لودی کے قرمطی ہونے کا حال وہ لکھتے ہیں تو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ حمید خاں قلعہ الموت کی سلطنت سے وابستہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں حسن بن صباح اور قلعہ الموت کی حکومت کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ حسن بن صباح ۴۲۸ھ میں سلطان محمود کی وفات سے سات سال بعد پیدا ہوا تھا۔ حسن بن صباح اور اس کی جماعت واقعی قرامطہ یا قرامطہ سے بہت ہی مشابہ اور خطرناک تر جماعت تھی۔ لیکن یہ قرامطہ بحرین جنھوں نے ہزارہا حاجیوں کو خانہ کعبہ میں قتل کیا خانہ کعبہ کی بے حرمتی انتہا کو پہنچا دی اور حجر اسود کو بیس بائیس سال تک مقام ہجر میں لاکر رکھا اور خانہ کعبہ بلا حجر اسود کے رہا۔ حسن بن صباح کی جماعت سے بہت زیادہ طاقتور اور عالم اسلام کے لیے بے حد موجب خطر تھے۔ سلطان محمود نے انھیں کے مٹانے کے لیے ہندوستان پر حملے کیے اور مرتے دم تک انھیں کی بیخ کنی میں مصروف رہا۔ محمود غزنوی کو جب یہ معلوم ہوا کہ حمید خاں لودی خود قرمطی ہو گیا ہے تو اس نے اس کی خراج گذاری کی بھی پروا نہیں کی اور اس پر چڑھائی کر دی۔ آخر حمید خاں نے قرمطی ہونے سے توبہ کر کے اپنی جان اور حکومت بچائی اسی زمانے میں ہندوؤں نے موقع پاکر تمام ملک سندھ پر اپنی حکومتیں قائم کر لیں اور کسی مسلمان کو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی مہلت نہ ملی۔ حمید خاں لودی کے بعد اس کا پوتا ابو الفتح داؤد بن نصر بن حمید ملتان کا حاکم بنتے ہی قرمطی ہو گیا اور قرامطہ کا ملتان میں اس قدر زور ہوا کہ ملتان کی جامع مسجد جو خلفائے بنی امیہ کے زمانے کی تعمیر شدہ تھی اس کو نمازیوں کے لیے بند کر دیا گیا اور الحاد و بے دینی تمام ریاست میں پھیل گئی۔ یہ سن کر محمود غزنوی کو ملتان پر پھر چڑھائی کرنی پڑی اور ابو الفتح نے مسلمانوں کو قرمطی بنانے اور خود بھی قرمطی بننے سے توبہ کر کے اپنی جان بچائی۔ بہر حال اب ہم محمد بن قاسم کے زمانے سے لے کر محمود غزنوی کے زمانے تک پہنچ گئے ہیں محمود غزنوی کے حملوں کا حال آئندہ بیان ہونے والا ہے۔ اس وقت سندھ سے رخصت ہوتے ہوئے چند باتیں اور بھی سن لینی چاہئیں۔

عربوں کا اثر ملک سندھ پر

جس زمانے میں مسلمانوں کی فاتحانہ آمد ملک سندھ میں ہوئی ہے۔ یہاں عام طور پر بت پرستی رائج تھی۔ مجرموں کی شناخت کے لیے ان کو جلتی

ہوئی آگ میں سے گذارنے کا عام رواج تھا۔ اگر آگ میں جل گیا تو مجرم اور بچ گیا تو بے گناہ تھا۔ کبھی لوہے کا گولا انگارے کی مانند سرخ کرکے مجرم کے ہاتھ پر رکھا جاتا تھا۔ کبھی گہرے پانی میں مشتبہ شخص کو اتنی دیر تک ڈوبا رکھا جاتا تھا کہ ایک شخص تیر کمان میں رکھکر چھوڑے اور دوسرا شخص جاکر اس تیر کو واپس اٹھالائے اس عرصہ میں اگر پانی کے اندر دم نکل گیا تو مجرم تھا اور زندہ نکل آیا تو بے گناہ۔ جادو کا عام طور پر رواج تھا۔ غیب کی باتیں اور شگون کی تاثیرات بتانے والوں کی بڑی گرم بازاری تھی۔ کثرت البعول اور محرمات ابدی کے ساتھ شادیاں کرلینے میں بھی تامل نہ تھا۔ چنانچہ راجہ داہر نے اپنی حقیقی بہن کے ساتھ پنڈتوں کے ایماء سے شادی کی تھی۔ راہزنی اکثر لوگوں کا پیشہ تھا۔ ذات باری تعالیٰ کا تصور معدوم ہو کر اعلیٰ و ادنیٰ پتھر کی مورتیوں اور بتوں کو حاجت روا سمجھتے تھے۔ مسلمانوں نے سندھ میں فاتحانہ داخل ہونے کے بعد اس ملک کے باشندوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ ان کو اپنے مذہب کے تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔

عدل و انصاف اور اعلیٰ اخلاق کا نمونہ جو مسلمانوں نے پیش کیا اس کا یہ اثر ہوا کہ سندھیوں میں روشن خیالی پیدا ہوئی۔ انھوں نے مسلمانوں کے اخلاق۔ تمدن اور معاشرت سے بہت سے مفید سبق حاصل کرکے اپنے اخلاق و معاشرت میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ مسلمانوں سے محبت و دوستی کے تعلقات بڑھائے۔ مسلمان یہاں کے ہندوؤں اور بودھوں کے لیے اچھے دوست۔ اچھے ہمسایہ اور اچھے معلم ثابت ہوئے۔ انھوں نے بخوشی مسلمانوں کو اپنی بیٹیاں دیں اور تمام کاروبار حتیٰ کہ سرکار دربار میں بھی مسلمانوں کے ساتھ شریک رہے۔ اعلیٰ خیال اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ برہمنوں نے خود مسلمانوں کی تعریف میں تقریریں کیں اور ان کو اچھا حاکم بتایا۔ وحشیانہ سزائیں اور وحشیانہ طریق انصاف موقوف و معدوم ہوئے۔ مسلمانوں نے ہندی اور ہندوؤں نے عربی زبان سیکھی۔ اس محبت و دوستی اور ہم آغوشی کا اثر آج بھی سندھی زبان کے رسم الخط اور خود سندھی زبان میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ سندھی زبان میں ماں کو اُمّا اور عربی میں اُم کہتے ہیں۔ سندھی زبان میں باپ کو ابّو۔ اور عربی میں اَبْ بولتے ہیں۔ بیوی کو سندھی میں صاحیان اور عربی میں صاحبہ۔ سندھی میں بات کو گھال اور عربی میں قال کہتے ہیں۔ غرض اسی طرح ہزارہا الفاظ ہیں جو موجودہ سندھی زبان میں عربی کے بولے جاتے ہیں۔ سندھیوں کے لباس میں بھی عربی شان موجود ہے۔ سندھ کا جبّہ و عمامہ ہرگز ہندوستانی چیز نہیں ہے۔ سندھ کی مہمان نوازی بھی عربوں کی مہمان نوازی کا نمونہ ہے۔ سندھ میں ایک قوم چاچڑ ہے جو اپنے آپ کو راجہ داہر کے وزیر کی اولاد بتاتے ہیں اور اسلام کے بڑے پابند ہیں۔ ایک قوم ڈاہر کہلاتی ہے جو راجہ داہر کی اولاد ہے اور مسلمان ہے۔ صدیقی۔ انصاری۔ فاروقی۔ عباسی۔ سادات وغیرہ خالص عربی قومیں بھی سندھ میں بکثرت آباد ہیں۔ پنوار۔ پرہار وغیرہ

خالص راجپوت قومیں بھی سندھ میں موجود ہیں۔ کچھ قومیں ایسی بھی موجود ہیں جو عام لوگوں کی نگاہ میں ہندی قومیں سمجھی جاتی ہیں حالانکہ وہ خالص عربی قومیں ہیں ان میں سب سے زیادہ قابل تذکرہ ارائیں قوم ہے۔ اوپر کئی جگہ محمد بن قاسم کے ہمراہیوں کا ذکر آچکا ہے کہ وہ شامی و عراقی دو گروہوں پر مشتمل تھے شامی لوگ سب سے زیادہ با اعتماد اور خلافت بنو امیہ کے حامی و ہمدرد تھے انہیں لوگوں کو شاہی فوج اور شاہی قوم سمجھا گیا تھا۔ یہ عموماً بنی امیہ اور حجازی تھے جو حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں حجاز سے شام میں جاکر آباد ہوگئے تھے۔ ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد ملک شام کے مقام اریحا میں آباد تھی۔ اور حجاج بن یوسف ثقفی نے محمد بن قاسم کے ساتھ جو چھ ہزار شامی فوج بھیجی تھی اس میں ایک معقول تعداد اریحا کے باشندوں کی بھی تھی۔ ان شامی لوگوں کو جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ملک شام میں واپس جانا نصیب نہ ہوا اور ان کو مجبوراً یہیں اقامت اختیار کرنی پڑی۔ خلافت عباسیہ کے زمانے میں ان پر مصائب آئے۔ پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ منصورہ کی خود مختار ریاست کا قیام ان کے لیے پھر راحت و اطمینان کا زمانہ تھا۔ اس ریاست کی بربادی ان کے لیے پھر مصائب و نوائب کا نزول تھا۔ کچھ کوہ سلیمان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کچھ ملتان میں آکر آباد ہوئے اور جہاں جس کے سینگ سمائے چلے گئے۔ ملتان میں اگرچہ قرامطہ کا طوفان آیا اور اس طوفان میں ملتان کا مشہور مرکزی مندر بھی قرامطہ کے ہاتھ سے تباہ ہوا۔ لیکن محمود غزنوی نے جلد اس فتنہ کو فرو کر دیا۔ اور اس طرح ان عربی باقیات یعنی شام سے آئی ہوئی نسلوں کو زیادہ تر ملتان ہی کی ریاست میں جمع ہونا پڑا۔ چند ہی روز کے بعد پنجاب کا تمام ملک سلطنت غزنی کا صوبہ بن گیا اور مستقل طور پر پنجاب میں محمود غزنوی نے اسلامی حکومت قائم کر دی ملتان سے اکثر قبائل پنجاب کی طرف چلے آئے۔ انھیں قبائل میں ایک قبیلہ وہ تھا جو شام کے علاقہ اریحا سے آیا تھا اور اریحائی کہلاتا تھا۔ پنجابی لہجے اور پنجابی تلفظ نے اس کو آرائیں بنا دیا۔ ان تمام مذکورہ حوادث اور تغیرات کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ یہ لوگ پنجاب کے سرسبز و شاداب علاقے میں آکر افغانی فاتحوں اور ہندو مفتوحوں سے بے تعلق رہکر زراعت و کاشتکاری کے کاموں میں مصروف ہو جائیں اور اپنے ان تجربات کو کام میں لائیں جو ریاست منصورہ کی سرسبزی و شادابی کے لیے وہ کام میں لا چکے تھے۔ عرب کا ملک زرعی ملک نہیں ہے۔ لیکن عربی قومیں جب کبھی کسی زرعی ملک میں پہنچیں وہ بہتر کاشتکار اور نہایت قابل کسان ثابت ہوئیں۔ یہی عربی قومیں جب اندلس میں پہنچیں تو انھوں نے اندلس کو گلزار سدا بہار بنا دیا۔ اور ایک چپہ بھر زمین ایسی نہیں چھوڑی جہاں کھیتی اور سبزی موجود نہ ہو۔ جب اندلس سے نکلے داخل ہوئے تو وہ ملک پھر بنجر اور ویران نظر آنے لگا آج تک بھی اندلس میں وہ سرسبزی واپس نہیں آئی جو عربوں نے

وہاں پیدا کر دی تھی۔ اسی طرح منصورہ کو عربوں نے گلزار بنا دیا تھا ان کے جاتے ہی وہ پھر بنجر اور غیر آباد علاقہ بن گیا۔ پنجاب میں آکر بھی انھوں نے اپنی اسی قابلیت کا اظہار کیا۔ غالباً عربوں کے اسی ذوقِ کشتکاری اور جذبۂ فطرت کا اندازہ فرما کر آنحضرت صلعم نے ان کو کاشتکار بننے سے روکنے کے لیے کاشتکاری اور آلاتِ کشاورزی کی نسبت ہمّت افزا الفاظ بیان نہیں فرمائے چنانچہ ان ہمراہیانِ محمد بن قاسم نے سیاسی زندگی سے دور و بے تعلق رہنے اور کشتکاری میں ہمہ تن مصروف ہو جانے کی وجہ سے اپنی حیثیت کو بہت کچھ گھٹا اور مٹا دیا۔ ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر حصے میں ایسی قومیں آباد اور موجود ہیں جو ملتان سے ان صوبوں میں جا کر آباد ہوئی ہیں۔ ایک قوم جو پنجاب سے بہار و بنگال تک پائی جاتی ہے ملتانی قوم کے نام سے مشہور ہے اور اپنا کوئی دوسرا نام نہیں بتا سکتی۔ یہ ملتانی لوگ عموماً نجاری۔ آہنگری اور معماری کا پیشہ کرتے ہیں۔ ملتان ہندوستان کی صدہا قوموں کا مرکز و منبع ہے اور جس قدر قومیں ملتان سے تعلق رکھتی ہیں وہ سب کی سب عربی النسل سمجھی جاتی ہیں اور یقیناً عربی باپوں۔ ہندو ماؤں کی اولاد ہیں۔ یہ عربی قومیں پنجاب کے سلطنتِ غزنی میں شامل ہو جانے کے بعد پنجاب میں آئیں۔ اور شہاب الدین غوری کے بعد جب مسلمانوں کی حکومت تمام شمالی ہند میں قائم ہوئی تو بہار و بنگال تک پھیل گئیں۔ پنجاب کے اعوان۔ کشمیر کے ککّے اور نجبے بھی یقیناً انھیں لوگوں میں سے ہیں مسلمانوں کا سندھ پر حملہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ محمد بن قاسم اپنی تلوار کے سایہ میں جس محبت و مدارات اور درگذر و رعایت کو لایا تھا وہ ہرگز ضائع نہیں ہوئی اس کے ہمراہیوں میں سے ایک ایک شخص غالباً ایک ایک قوم کا مورثِ اعلیٰ بنا اور ان قوموں نے ہندو مسلم تعلقات کو پائدار و استوار بنانے میں وہ کام کیا کہ آج تک باوجود سخت کوششوں کے ہندو مسلم تعلقات کے جوڑ بند جدا کرنا بے حد دشوار ثابت ہو رہا ہے۔

محمد بن قاسم سے محمود غزنوی تک ہندوستان کی حالت

اوپر کے صفحات میں سندھ کی قریباً تین سو سال کی نہایت مجمل و مختصر تاریخ جو اس کتاب کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ بیان ہو چکی ہے۔ اس کے بعد محمود غزنوی کے حملوں کی داستان شروع ہونے والی ہے۔ محمود غزنوی کا حال شروع کرنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تین سو سال کے ہندوستان کی کیفیت پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ تاکہ دوسرے باب کا مطالعہ کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ مسلمانوں کو چونکہ سندھ کے سوا ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بہت ہی کم تعلق رہا لہٰذا ان کی تصانیف میں اس زمانہ کی تاریخ نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوؤں سے دنیا کے مورخوں اور تاریخی

مطالعہ کرنے والوں کو یہ عام شکایت ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے ملک کی صحیح تاریخ نہیں لکھی اور ہمیشہ فرضی افسانوں اور کہانیوں ہی سے اپنا دل بہلاتے اور اسی کو مایۂ ناز سمجھتے رہے۔ ان افسانوں یا فرنگستانی محققوں کی کوہ کاویوں سے جو قابل التفات حالات مرتب و مدون ہوئے ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے وقت کشمیر و پنجاب کا راجہ للتا وردھن یا اس کا بیٹا چندر پیدیا تھا جو بودھ مذہب کا پیرو تھا۔ چندر پیدیا کے بعد اس کا چھوٹا بھائی للتادتیا تخت نشین ہوا جو بڑی شان و شوکت کا راجا تھا۔ اسی خاندان میں کشمیر کا ایک راجہ آٹھویں صدی ہجری میں مسلمان ہوا تھا۔ قنوج میں وہی خاندان فرمانروا تھا جو چینی سیاح ہیونگ شیانگ کی آمد کے وقت حکمراں تھا۔ اس کا مذہب بھی بودھ تھا۔ یہ خاندان قنوج میں اس وقت تک حکمراں رہا جبتک کہ خلفائے بنو امیہ نے حکومت کی۔ جس سال خلافت بنو امیہ برباد ہوئی۔ اس سے ایک سال بعد یعنی ۱۳۳ھ میں قنوج کے اندر ایک نئے خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔ اس خاندان کا اول راجہ یا سودرمن نامی تھا۔ ۱۸۵ھ میں اس خاندان کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اور راجہ ناگ بھٹ نے قنوج کے ملک پر قبضہ کیا۔ اسی راجہ نے اپنے طبیب مانک چند کو ہارون الرشید کے پاس بھیجا تھا۔ اسی کی اولاد میں راجہ بھوج تھا جس نے ۲۲۶ھ سے ۲۷۲ھ تک حکومت کی اور شمالی ہند کا بڑا حصہ اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ اسی راجہ بھوج کی نسل سے قنوج کا وہ راجہ تھا جس نے محمود غزنوی کی اطاعت قبول کی تھی اور جس کو کالنجر کے راجہ نے محمود کی واپسی کے بعد قتل کردیا تھا۔ پنجاب کے ملک میں ترکوں یا مغلوں کے ایک خاندان نے جو بودھ مذہب کا پیرو تھا کابل کی طرف سے آکر اپنی جداگانہ سلطنت دوسری صدی ہجری میں قائم کرلی تھی۔ اسی خاندان کے آخری راجہ جے پال اور انند پال تھے۔ جنھوں نے محمود غزنوی سے شکستیں پائیں اور ان کے بعد پنجاب حکومت اسلامیۂ غزنی کا صوبہ بنا۔ بنگال میں ۱۸۴ھ میں راجہ گوپال نے اپنی حکومت قایم کی۔ گوپال کے بعد دھرمپال۔ دھرمپال کے بعد دیوپال۔ غرض اسی طرح اس خاندان کے ہر ایک راجہ کے نام کا جزو لفظ پال ضرور ہوتا تھا۔ اور اسی لیے اس کو پال خاندان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پال خاندان محمود غزنوی کے حملوں تک بنگال کا فرمانروا رہا۔ اس کے بعد سین خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔ جن کے نام وجیا سین۔ بلال سین۔ لچھمن سین۔ وغیرہ تھے۔ یہ دونوں خاندان بودھ مذہب کے پیرو تھے۔ سین خاندان کے بعد بنگال پر مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی۔ کالنجر میں چندیل خاندان کی حکومت تھی جو محمود غزنوی کے زمانے تک قائم رہی۔ اس سے زیادہ توضیح و تفصیل کچھ نہیں کی جاسکتی۔ اس تین سو سال کی مدت یعنی محمد بن قاسم سے محمود غزنوی تک

کے زمانے کا اندازہ کرنے کے لیے میں مسٹر کے ایم پانیکر ایم۔اے کی کتاب تاریخ ہند قدیم سے ذیل کی عبارت نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں وہ لکھتے ہیں۔ کہ۔

"ہندوستان کا نظم و نسق منتشر ہو گیا۔ شمالی ہند کی مرکزی حکومت (خاندان گپتا کی حکومت) جاتی رہی۔ طوائف الملوکی نے کشمیر سے آسام تک تسلط جما لیا۔ چھوٹے چھوٹے اضلاع خود مختار بن بیٹھے۔ چار سو برس تک شمالی ہند کی یہی حالت رہی۔ اس عرصے میں چھوٹے چھوٹے غیر معروف خاندان جن کی مجہول الذکر داستان تاریخ ہند کا عقدۂ لاینحل ہے اٹھے اور فنا ہو گئے۔ جن میں سے ایک کو بھی شاہانہ عظمت نصیب نہ ہوئی"

اسی زمانے کا ذکر کرتے ہوئے مصنف مذکور راجپوتوں کی نسبت رقمطراز ہے کہ۔

"آٹھویں اور نویں صدی عیسوی (دوسری اور تیسری صدی ہجری) میں قوم راجپوت کا ستارہ چمکا۔ راجپوتوں کا نسب اور ان کی قومیت تاریخ ہند کا لاینحل معمہ ہے اور ان کی اصل ابھی تک سربستہ راز بنی ہوئی ہے غالباً زیادہ تر راجپوت قوم مغول یعنی تاتاری فاتحین کی نسل سے ہیں۔ قوم کشن مرور ایام سے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب اختیار کر کے آریہ ورت کے فرزندوں میں داخل ہو چکی تھی۔ بعد میں آنے والے تاتاری قبائل بھی جنھوں نے دولت گپتا کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا اور علاقہ پنجاب میں زبردست حکومت قائم کر لی تھی آریہ مذہب اختیار کر چکے تھے۔ قیاس غالب ہے کہ یہی تاتاری قبائل آریہ مذہب میں داخل ہو کر راجپوتوں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ راجپوت روایات کے مطابق یہ قوم اگنی کولا یعنی آگ کی نسل سے پیدا ہوئی ہے۔ پرمر۔ پرہار۔ چوہان اور سولنکی چاروں مشہور راجپوت ذاتوں کا سلسلہ نسب آگ پر جا کر ختم ہوتا ہے شاید آگ سے پاک ہونا مراد ہے۔ پاک کرنے کی رسم راجپوتوں کو ہندو مذہب میں داخل کرتے وقت ادا کی گئی ہوگی۔ ان ذاتوں کے علاوہ کچھ ایسی ذاتیں بھی راجپوت قوم میں شامل ہو گئی ہیں جو نسلاً ہندوستان کے قدیم باشندوں سے تعلق رکھتی تھیں اس دور کی عام طوائف الملوکی اور بے ربطی سے فائدہ اٹھا کر یہ ذاتیں ذی اثر اور ذی اقتدار ہو گئیں اور سیاسی اقتدار نے انھیں راجپوت بنا دیا۔ چندیل۔ گڑھور۔ اور رہتور راجپوت اسی شاخ سے ہیں۔ یہ تینوں ذاتیں جنوبی راجپوت کہلاتی ہیں۔ شمالی راجپوت یعنی پرمر۔ پرہار اور چوہان جنوبی راجپوتوں سے ہمیشہ سرگرم پیکار رہتے تھے"

مندرجہ بالا اقتباس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے وقت سے راجپوتوں کا عروج شروع ہوا۔ راجپوت ہندی قوم نہیں ہے بلکہ مغول وتاتار ہیں جو مسلمانوں کی آمد کے وقت یا اس سے کچھ ہی پہلے ہندی قوم میں شامل ہوئے تھے۔ جنوبی راجپوت ہندوستان کی غیر آریہ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں بودھوں کی حکومت و سلطنت کمزور ہو کر بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں

میں تقسیم ہو گئی۔ تو برہمنی مذہب کے ماننے والوں یا یوں کہیے کہ برہمنوں نے بودھوں کی حکومت کے اس ضعف و انحلال سے فائدہ اٹھانے اور منو کے عہد کے برہمنی اقتدار کو پھر واپس لانے کی کوشش کی۔ اس کوشش کی کامیابی کا انحصار چونکہ بہت کچھ جنگی طاقت پر بھی منحصر تھا۔ منو کے زمانے کی تقسیم کے موافق چھتری لوگ طاقت کے وارث اور جنگی کاموں کے لیے مخصوص تھے اور برہمن۔ چھتری ویش۔ شودر کی تقسیم بالکل مع آبادی مذہب کی تقسیم کے موافق تھی۔ چھتریوں کی نسل کو چونکہ پرسرام۔ تخم سوخت کر چکا تھا۔ لہذا برہمنوں نے اب بودھوں کے مذہب اور حکومت کو مٹانے کے لیے ایک نئی جنگی قوم تیار کر کے اس سے وہ کام لیا جو چھتریوں سے لیا جاتا۔ یہ نئی قوم مغلوں اور تاتاریوں کے جنگجو قبائل اور غیر آریوں یعنی شودروں کے ذی حوصلہ اور بہادر لوگوں کو اپنا ہمدرد اور ہوا خواہ بنا کر تیار کی گئی اور ان کو راجپوت کا خطاب دیا گیا۔ یہ مغول و تاتار اور غیر آریہ یقیناً وہ لوگ تھے جو ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کا پیشہ رکھتے تھے انکو برہمنوں نے اپنی سازش میں شریک کر کے باقاعدہ طور پر اپنی قوم و مذہب کا ایک رکن بنا لیا۔ اس جگہ لالہ لاجپت رائے صاحب مشہور ہندو لیڈر کی مصنفہ تاریخ ہند کے حصہ اول سے بھی راجپوتوں کی اصلیت کے متعلق عبارت کا نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ ہندو سوسائٹی کی ورن ووستھا میں بہت سے آدمی ایسے شامل ہیں جو خالص آریہ نسل سے نہیں جو مشرق یا مغرب سے ہندوستان میں آئے اور جن کو ہندوؤں نے اپنے مذہب میں شامل کر کے اپنی سوسائٹی کا معزز جبر بنا لیا۔ اسی طریقہ سے انھوں نے بہت سی ایسی قوموں کو بھی ہندو سوسائٹی میں داخل کر لیا۔ جو اس ملک کے ابتدائی باشندوں گونڈ۔ بھیل وغیرہ سے ہیں یہ طریقہ نہایت قدیم زمانے سے جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ ہندو سماج میں نئی جاتیاں روز بنتی ہیں اور ہمیشہ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے کہ بعضوں کو اونچا ورن اور بعضوں کو نیچے ورن کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ امر بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ سمجھ لینا چاہیے کہ شاک اور یوچی قوم کے بہت سے آدمی جو کہ ترکمانی نسل سے تھے سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں اس ملک میں آئے اور ہندو سوسائٹی میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ یورپین محقق راجپوتوں۔ اہیر۔ اور گوجروں کو بھی ان ہی قبیلہ جات میں سے گنتے ہیں۔ لیکن یہ بحث بہت حد تک فضول ہے۔ راجپوتوں کو جاٹوں کو۔ گوجروں اور اہیروں کو ہندو سماج اپنا رکن سمجھتی ہے اور یہ امر کہ وہ کب اور کس طرح ہندو سوسائٹی میں داخل ہوئے بالکل غیر متعلق ہے اور اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں جس طرح بیسیوں خاندان برہمنوں کے اصلی آریہ نسل سے نہیں ہیں اور جس طرح سے بہت سی اور جاتیاں بھی اصلی آریہ نسل سے نہیں ہیں بلکہ مخلوط ہیں۔ اسی طرح سے موجودہ راجپوت

بھی ہو سکتے ہیں۔"

لالہ لاجپت رائے بھی راجپوتوں کی قوم کو برہمنوں کی ترتیب دادہ نئی قوم تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرتے اور ان کا مغول و تاتار یا غیر آریہ نسل سے ہونا مانتے ہیں۔ بہرحال جس طرح یہ نئی قوم تیار ہوئی اسی طرح مذہب بھی بالکل نیا ترتیب دیا گیا۔ پرانے برہمنی مذہب یا ویدک دھرم میں عناصر پرستی کا زور شور تھا۔ جس کو سمرتیوں کے عہد اور منو کے زمانے میں متغیر اور تبدیل کیا گیا۔ اس کے بعد بودھ مذہب نے اس کو بالکل مٹا ڈالا اور ذات پات کی قیود کو جو منو کے زمانے میں بہت ہی سخت ہو گئی تھیں بالکل اٹھا دیا۔ بودھ مذہب میں بت پرستی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اب برہمنوں نے چونکہ مغلوں اور تاتاریوں کو جو بودھ مذہب کے پیرو تھے اپنی سازش میں شریک کیا۔ لہذا بہت سی باتیں بودھ مذہب کی بھی اپنے اس جدید مذہب میں شامل کر کے ان کے بہت سے بتوں کی پرستش کو جائز رکھا اور بودھ کو بھی وشنو کا اوتار تسلیم کر لیا۔ اسی طرح غیر آریوں کی بھی بہت سی باتوں کو اپنے جدید مذہب میں شامل کر لیا۔ یہ سلسلہ غالباً مسلمانوں کی آمد سے تھوڑے ہی دنوں پہلے جاری ہوا ہوگا۔ مسلمانوں کا مذہب چونکہ سب سے پہلے جنوبی ہند۔ لنکا اور ملابار میں آیا تھا لہذا کمار یلا برہمن اور شنکراچارج نے اسلامی دلائل سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھا کر شمالی ہند کی طرف خروج کیا اور بودھوں سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری کیا۔ جس زمانے میں سندھ پر اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں شنکراچارج یقیناً پیدا نہیں ہوا تھا۔ شنکراچارج غالباً خلافت عباسیہ کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوا ہے۔ شنکراچارج سے پہلے راجپوتوں کی اس نوزائیدہ قوم میں جان پڑنے لگی تھی اور وہ بعض چھوٹے چھوٹے قطعات پر قابض ہونے لگے تھے۔ شنکراچارج نے جب بودھوں کے خلاف جہاد شروع کیا۔ اور نوزائیدہ جدید برہمنی مذہب کی تائید شروع کی تو راجپوتوں کی اس جدید قوم اور جدید طاقت نے شنکراچارج کی خوب اعانت کی اور شنکراچارج نے راجپوتوں کی طاقت سے فائدہ اٹھانے میں خوب تعدی دکھائی۔ قنوج۔ بنارس۔ وسط ہند۔ اور دامن کوہ ہمالہ تک برہمنوں اور راجپوتوں کو نمایاں غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس جدید مذہب اور جدید قومیت کی تعمیر میں چونکہ شنکراچارج سب سے پہلا مصنف اور مقنن تھا۔ لہذا اس کی تعلیمات خصوصی وقعت و عزت کی نظر سے دیکھی گئیں۔ چونکہ برہمنوں کی مجوزہ یہ تحریک ایک سیاسی تحریک تھی۔ لہذا جابجا نئے نئے مذہبی اصول قائم ہوئے۔ کہیں وشنو کو سب سے بڑا اوتار مانا گیا۔ کہیں برہما کو اور کہیں مہیش کو اس طرح ہندو مذہب کے نام سے ہزارہا فرقے پیدا ہو گئے جن میں کوئی اصولی اتفاق بجز لفظ ہندو کے نہیں پایا جاتا۔ غرض مسلمانوں کی آمد اور حملہ آوری کے وقت بودھوں کی قومیت۔ مذہب اور حکومت پر برہمنوں اور راجپوتوں نے حملہ آوری

شروع کر رکھی تھی اور ملک میں ضرور ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کشمکش اور زدوخورد کا سلسلہ محمد بن قاسم کے حملہ سے شہاب الدین غوری کے حملوں یعنی قریباً پانسو سال تک ملک کے کسی نہ کسی حصے میں جاری رہا۔ اس طویل مدت میں کوئی علامت ایسی ظاہر نہیں ہوئی جس سے قطعی طور پر یہ حکم لگایا جاسکے کہ اگر مسلمان اس ملک میں نہ آتے تو جدید ہندو مذہب بودھ مذہب پر غلبہ پاکر اپنی حکومت قائم کرلیتا کیونکہ سندھ میں مسلمانوں کو بودھوں کی حکومت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سندھ کے فرمانروا کی قوم تو برہمن تھی لیکن مذہب اس حکومت کا بودھ ہی تھا۔ پنجاب کو فتح کرتے ہوئے محمود غزنوی کو بھی بودھوں کی حکومت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ کیونکہ راجہ جے پال اور اس کے بیٹے انند پال کی قوم مغول یا تاتار رکھتی اور مذہب بودھ تھا۔ بنگال اور آسام کو بھی مسلمانوں نے بدھ حکومتوں سے چھینا۔ علاء الدین خلجی نے دکن کا ملک بھی بودھ حکومت کو شکست دیکر فتح کیا۔ صرف قنوج وکالنجر کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کے راجہ جدید برہمنی مذہب کو اختیار کر چکے تھے۔ لیکن پنجاب وسندھ کے راجاؤں نے جس بہادری کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ کیا ہے قنوج وکالنجر سے اس ہمت کا اظہار نہیں ہوا۔ قنوج کے راجہ نے محمود غزنوی کی بلاتامل اطاعت قبول کرلی جس پر کالنجر کے راجہ کو بہت غصہ آیا۔ لیکن اگلے ہی سال خود اس نے بھی محمود غزنوی کی فرمانبرداری کا جوا اپنے کندھے پر رکھا اور محمود غزنوی کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی لکھا۔ پس موجودہ ہندو مذہب یا جدید برہمنی مذہب جس کام کو پانسو سال میں بھی پورا نہ کرسکا تھا۔ اس کو مسلمانوں نے آسانی انجام دیا۔ اگر مسلمان اس ملک میں نہ آتے تو بہت زیادہ ممکن بلکہ یقینی تھا کہ بودھ مذہب اپنی قوت کو مجتمع کرکے اس جدید مذہب اور جدید طاقت کو جو بودھوں کے مقابلہ میں پیدا ہوگئی تھی۔ بالکل کچل ڈالتا اور ان مظالم کا انتقام لیتا جو قنوج۔ بنارس و الہ آباد وغیرہ میں برہمنوں اور راجپوتوں نے بودھوں پر شنکر اچاریہ وغیرہ کی رہبری میں کیے تھے۔ لیکن سندھ کی اسلامی حکومت اور کابل وخراسان و ماوراء النہر میں مسلمانوں کی فتوحات نے ہندوستان کے بودھ حکمرانوں کو ششدر و حیران بناکر قنوج وغیرہ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا اور انند پال فرمانروائے پنجاب کو مجبور کیا کہ وہ تمام ہندو اور بودھ راجاؤں کو متحد ہونے اور متفقہ طاقت سے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دے اگر فرض کرلیا جائے کہ ہندوستان کی بودھ حکومت کے خلاف برہمنوں اور راجپوتوں کی تحریک کامیاب ہوجاتی اور وہ تمام ملک ہندوستان پر قابض و متصرف ہوجاتے تو غیر ممکن تھا کہ کابل وخراسان وکشمیر و تبت وغیرہ کے بودھ خاموش

بیٹھے ہوئے تماشا دیکھتے۔ بلکہ کابل وخراسان و بخارا کے جنگجو لوگ جو بودھ مذہب کے پیرو تھے۔ یقیناً ہندوستان پر حملہ آور ہوتے اور جس طرح ان لوگوں نے کنشک کے زمانے میں اپنی شہنشاہی اس ملک میں قائم کر لی تھی پھر قابض و متصرف ہوتے اور تمام ملک میں بودھ مذہب کا دور دورہ ہوتا۔ لیکن مسلمانوں نے چونکہ پہلے ہی کابل وخراسان و ماوراءالنہر کو فتح کر کے بیرونی بودھوں کے حملوں کو غیر ممکن بنا دیا اور اس کے بعد ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے۔ لہذا برہمنوں کو اگنی کولا راجپوتوں کے پیدا کرنے اور جدید قوم و مذہب کے ترتیب دینے کی ترغیب ہوئی۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں کافی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ آخر مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کر کے ہندوؤں کے اس جدید مذہب کو باقی رہنے دیا اور بربادی کے خطرے سے بچا لیا۔ مسلمانوں کے فتحمند ہونے کے بعد موجودہ ہندو مذہب اور موجودہ ہندو قومیت بالکل محفوظ و مامون ہوگئی اور اس نے مسلمانوں کے سایہ میں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے قومی و مذہبی اصول مرتب کیے۔ چنانچہ موجودہ ہندو مذہب کی تصانیف اور مذہبی اصولی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ اسلامی عہد حکومت میں تیار ہوا۔ اور بڑے بڑے عظیم الشان مذہبی فرقے جو آج اپنی آغوش میں تقریباً تمام ہندو آبادی کو لیے ہوئے ہیں سب کے سب اس زمانے میں مرتب و مدون ہوئے جبکہ اسلامی شہنشاہی ہندوستان میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ قائم تھی۔ اسلامی مساوات، اسلامی مسالمت، اسلامی درگذر، اسلامی مذہبی آزادی کا غالباً اس سے بڑھکر اور کوئی ثبوت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب ہم کو یہ باتیں ختم کر کے ملک سندھ سے رخصت ہو جانا چاہیے اور آخر میں مسٹر کے ایم پانیکار کی رائے بھی سن لینی چاہیے جو انھوں نے جدید ہندو مذہب کی نسبت ظاہر کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ۔

"شنکر اچاریہ نے جس ہندو مذہب کی تعلیم و تلقین کی وہ اس جھنڈا و قربانی والے مذہب سے بالکل جدا تھا جس کے خلاف گوتم بدھ صدائے احتجاج بلند کر چکا تھا۔ سر آرڈی بھنڈارکر نے ایک فاضلانہ تصنیف میں بتلایا ہے کہ کرشنا اور شیوا فرقوں نے کس طرح بتدریج ہندو مذہب کی شکل اختیار کی اور یہ فرقے ابتدا میں کس قدر مرکب اور مخلوط نظر آتے تھے ادھر مدرسوں میں ماہرین مذہب مخالف فرقوں پر نکتہ چینیاں کر رہے تھے ادھر عوام میں عام پسند مذہب کے عقائد پختہ پڑ رہے تھے۔ مذہب کے فنا ہو جانے سے شنکر اچاریہ کو وید کے فلسفہ پر عام مذہب کے ڈھالنے میں آسانی ہوئی۔ نئے مذہب کا بانی شنکر اچاریہ بدہیتی برہمن مالابار کا رہنے والا تھا...... شنکر اچاریہ نے ایک طرف مقامی دیوتاؤں کی پوجا جائز قرار دیکر چھوٹے چھوٹے مقامی مخلوق خدا وندوں کو پوران کے ایک نہ ایک دیوتا سے ملا دیا۔ دوسری طرف ایسے فلسفہ کی بنیاد رکھی جسے وحدانیت سے تعبیر کر سکتے ہیں"

اس پہلے باب میں تاریخی کتابوں کے نام اور حوالے کہیں کہیں موجود ہیں لیکن اس باب کے مندرجہ تمام مطالب تاریخ اسلام۔ تاریخ ابن خلدون۔ تاریخ فرشتہ۔ چچ نامہ۔ تاریخ سندھ معصومی۔ تاریخ التواریخ۔ جامع التواریخ۔ تاریخ ذکاء اللہ۔ روضۃ الصفا سے ماخوذ ہیں جو بطور حاصل مطلب ترتیب دیکر پیش کیے گئے ہیں۔ جن نتائج کو میں نے اخذ کیا ہے یا جو میری ذاتی رائے ہے وہ ہر شخص مطالعہ کرتے وقت الگ معلوم کرسکتا ہے اور اس کتاب کے پڑھنے والے خود فیصلہ کرینگے کہ میں نے کہاں کہاں نتائج کے اخذ کرنے میں غلطی کی ہے۔ میں انسان ہوں مجھ سے غلطیاں بہت ہوسکتی ہیں لیکن میری نیت نیک ہے اور کسی کے دل کو رنج پہنچانا میرا منشا ہرگز ہرگز نہیں ہے ؎

نمی خواہم کہ در عالم دلے از من غمیں باشد
ز فیض دوستی آگاہ گرداں دشمنانم را

باب دوم

عربوں کا سندھ پر حملہ آور ہونا اور تین سو سال تک سندھ میں حکومت کرنا اوپر بیان ہو چکا ہے۔ جس میں مندروں کے ڈھانے۔ مورتیوں کے توڑنے اور ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے یا ناجائز طور پر نقصان پہنچانے کا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا۔ خود سندھ کے راجہ نے مسلمانوں کو حملہ آوری پر مجبور کیا تھا اور مسلمانوں نے سندھ پر قابض ہوکر یہاں عدل وداد اور مہربانی و انصاف قائم کیا۔ جہالت کی تاریکی دور کرکے علم و تہذیب کی روشنی پھیلائی اور ہندوؤں پر احسانات کی بارشیں کیں۔ اس باب میں مسلمانوں کے ان حملوں کا ذکر ہوگا۔ جو انھوں نے ہندوستان کے شمالی و مغربی پہاڑوں یعنی افغانستان کی طرف سے کئے۔ مسلمانوں کی اس حملہ آوری کی فرضی داستانوں نے ہمارے زمانے میں حیرت انگیز طور پر ہندوؤں کو مصروف سوگواری بنا دیا ہے۔ تعجب ہے کہ مغول و تاتار۔ تھین۔ ہن۔ آتش پرست ایرانی سکندر یونانی سب ہی ان شمالی و مغربی پہاڑوں کے دروں سے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور بڑی بڑی بربادیاں اور تباہیاں ہندوستان کے باشندوں پر وارد کیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی مجرم نہیں بتایا جاتا۔ مسلمانوں ہی نے کچھ ایسے ستم ڈھائے ہوں گے کہ ان کی یاد کا تازہ ہو جانا اور تقریباً ایک ہزار سال کے بعد پرانے زخموں کا ہرا ہو جانا ضروری تھا۔ غیر آریہ یعنی شودر قوموں کی توہنیا

مجال ہے کہ وہ سب سے پہلے حملہ آوروں یعنی آریوں کے ان مظالم کا ذکر زبان تک لاسکیں جنہوں نے نسل انسانی کے ایک بہت بڑے حصے یعنی ہندوستان کی تمام قدیمی آبادی کو حقوق انسانی سے محروم کرکے ان کو درندوں کی طرح قتل کیا اور بقیۃ السیف کے گلے میں ذلت وخواری کا ایسا طوق ڈالا کہ وہ آجتک بھی چوپایوں کے درجے سے کچھ ہی بلند نظر آتے ہیں۔ آریوں یعنی دوجنموں کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہونے کا تو خیال بھی شاید اپنے دلمیں نہیں لاسکتے۔ بہرحال ہمکو اس وقت مسلمانوں کے اس جرم عظیم کی کیفیت ملاحظہ کرنی ہے۔ پہلا مسلمان حملہ آور محمد بن قاسم تو اپنی برائت کا ثبوت پیش کرچکا ہے۔ اب دوسرے سب سے بڑے مجرم محمود غزنوی کی باری آئی ہے۔

امیر ناصر الدین سبکتگین سلطان محمود غزنوی کے تخت نشین ہونے سے پہلے پنجاب اور غزنی کی سلطنتوں میں لڑائی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ لہذا ہمکو سلطان محمود غزنوی کے باپ سبکتگین اور پنجاب کے راجہ جے پال کی طرف متوجہ ہونا پڑیگا۔ جے پال بن ست پال کے بزرگوں میں پہلا شخص جس نے حکومت وسلطنت کی بنیاد ڈالی اس کا نام ستر تان یا درتمان تھا۔ وہ قوم سے مغول تاتاری اور بودھ مذہب کا پیرو تھا۔ اس نے غالباً ہارون الرشید کی تخت نشینی سے پہلے اور خلافت بنو امیہ کی بربادی کے بعد یعنی دوسری صدی ہجری کے درمیانی زمانہ میں پنجاب وکشمیر کے راجہ چندر بیدیا کی اولاد میں کسی راجہ سے پنجاب کا ملک چھین کر اپنی حکومت قائم کی تھی اور چندر بیدیا کی اولاد صرف کشمیر ہی پر قابض رہ گئی تھی۔ جے پال بڑا اولوالعزم اور چالاک شخص تھا۔ اس کی دوربینی اور مآل اندیشی کا ثبوت اس کے اس کارنامے سے دستیاب ہوتا ہے کہ اس نے حمید خان لودی کو ملتان پر قابض ہونے اور قریشی خاندان کا خاتمہ کرنے میں امداد پہنچائی اور اس طرح سبکتگین کے لیے قرامطہ کی مسلم کش طاقت کی ہمت افزائی کرکے خود سبکتگین کی رعایا میں سے مضبوط سرحدی قبائل کو حریف بناکر کھڑا کردیا۔ جو دلیل اس بات کی ہے کہ جے پال غزنی کی نوزائیدہ سلطنت کو کچل ڈالنے اور اپنی اولوالعزمی کے سبب مملکت غزنی پر (جو سلطنت سامانیہ اسلامیہ کا ایک حصہ تھا) خود قابض ہونے کا خواہاں تھا۔

الپتگین۔ ایک سامانی سردار علاقہ غزنی کا صوبہ دار تھا اور موقع پاکر اپنی خودمختاری کا اعلان کرکے اپنی جُداخودمختار سلطنت قائم کرچکا تھا۔ ۳۶۵ھ میں الپتگین فوت ہوا تو اس کا بیٹا ابو اسحٰق غزنی کا فرمانروا ہوا۔ وہ بھی چند ہی مہینے کے بعد فوت ہوا تو امراء نے ایک ترکی امیر بلکاتگین کو اپنا حاکم منتخب کیا چند روز کے بعد وہ بھی فوت ہوا تو ۳۶۶ھ میں امراء نے سلطنت غزنی کے سپہ سالار سبکتگین کو

اپنا حاکم بنایا۔ سبکتگین نے بست و قصدار کی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ یہ ریاستیں مسلمان حاکموں کے قبضے میں تھیں جے پال کے حدود مملکت میں اس نے قطعاً کوئی دخل نہیں دیا۔ بعض مورخین نے جے پال کے ملک کی مغربی سرحد کو دریائے سندھ کے مغربی کنارے سے بھی آگے جلال آباد و لمغان تک بڑھا دیا ہے۔ مگر یہ سراسر غلط اور حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ یہ دھوکا محض اس لیے لگا ہے کہ جے پال کے دوسرے حملے کو سبکتگین کا جوابی حملہ تصور کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ جے پال دوسری مرتبہ بھی لشکر لے کر سبکتگین کے ملک میں دور تک داخل ہو گیا تھا اور لڑائی لمغان کے قریب یعنی سلطنت غزنی کے وسطی علاقے میں ہوئی تھی۔ اس میدان کو غلطی سے پنجاب و غزنی کی حد فاصل سمجھ لیا گیا ہے۔ کابل کی ریاست کو جس کے حاکموں کا لقب رتبیل تھا مسلمان پہلے ہی فتح کر چکے تھے رتبیل کی حکومت دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک وسیع تھی یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ کابل و غزنی کا علاقہ سامانی سلطنت میں شامل ہو اور سامانی سلطنت جلال آباد تک کا ملک پنجاب کے راجہ کو فتح کر لینے دے یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ دریائے سندھ یا زیادہ سے زیادہ درۂ خیبر اور اس کے پہاڑی سلسلہ کی قدرتی حدود کو چھوڑ کر پنجاب کی ریاست اور اسلامی سلطنت کی غیر قدرتی حد لمغان کے میدان میں قائم ہوتی۔

درۂ خیبر اور کابل کے لوگ سب مسلمان ہو چکے تھے حالانکہ جے پال کی رعایا میں کسی مسلمان گروہ یا مسلمان آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ لہذا کسی طرح فرض نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ سرحدی علاقہ جے پال کے پاس تھا۔ غرض اس بلا دلیل اور بے اصل دروغ بے فروغ کی تردید میں کہ جے پال کی مغربی حد مغربی دروں کے اندر تک پھیلی ہوئی تھی ہم کو زیادہ وقت صرف کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔

امیر ناصر الدین سبکتگین نے غزنی کا فرمانروا بننے کے بعد بست و قصدار پر قبضہ کر لیا تھا اس کے بعد وہ سلطنت بخارا کے خرخشوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے لیے کبھی یہ موقع نہ آیا کہ وہ پنجاب کو فتح کرنے کا ارادہ کرتا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سنہ ۲۵۰ھ میں ابوالفوارس عبد الملک بن نوح سامانی شہنشاہ بخارا چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر فوت ہوا۔ دار السلطنت بخارا میں جو امیر موجود تھے انھوں نے ان بڑے بڑے سرداروں کے پاس جو مختلف صوبوں کی حکومت پر مامور تھے خطوط بھیج کر رائے طلب کی کہ خاندان شاہی سے کس شہزادے کو تخت نشین کیا جائے۔ اس مضمون کا خط غزنی کے عامل الپتگین کے نام بھی آیا الپتگین نے اپنی رائے لکھ کر بخارا کی جانب روانہ کر دی۔ الپتگین کا خط پہنچنے سے پہلے وہاں ابو صالح منصور بن نوح سامانی تخت نشین ہو چکا تھا۔ الپتگین کا خط اس کے ہاتھ میں پہنچا۔ جس میں ابو صالح منصور کے خلاف رائے ظاہر کی گئی تھی۔ اب الپتگین کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور اس نے اپنی حفاظت اسی میں دیکھی کہ غزنی اور کابل کے علاقے

پر قابض رہ کر خود مختاری کا اعلان کر دے۔ چنانچہ ابو صالح منصور الپتگین کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور ملک کا یہ صوبہ سلطنت سامانی سے جدا ہو گیا۔ ابو صالح منصور کے بعد اس کا بیٹا ابو القاسم نوح بن منصور تخت نشین ہوا۔ چند روز کے بعد اسی سال الپتگین بھی فوت ہو گیا اور دو سالی تک غزنی کا انتظام ابو اسحٰق اور بلکاتگین کے جلد جلد فوت ہونے کے سبب کمزور رہا اس زمانے میں نوح بن منصور سامانی غزنی کو ضرور فتح کر لیتا لیکن سلطنت بخارا کے دو ابہر یعنی نیشاپور اور ہرات کے عامل باغی ہو گئے اور دربار بخارا غزنی کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ سبکتگین کو اس بات کا سخت اندیشہ تھا کہ سلطان بخارا ضرور غزنی پر چڑھائی کریگا۔ اس خطرے اور اندیشے میں وہ کسی بڑی سلطنت سے لڑائی چھیڑنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ نیشاپور کے عامل ابو علی نے ہرات کے عامل فائق کو شکست دیکر بھگا دیا اور تمام خراسان پر قبضہ کرکے اپنی ایک جداگانہ سلطنت قائم کر لی۔ فائق ابو علی سے شکست پاکر دیلمیوں کے پاس پہنچا۔ فخر الدولہ دیلمی نے اپنا لشکر اس کے ساتھ بخارا پر چڑھائی کرنے کے لیے بھیجدیا اُدھر دوسری طرف بغرا خاں حاکم ترکستان نے بخارا پر چڑھائی کر دی۔ اس طرح نوح بن منصور تین زبردست دشمنوں میں گھر گیا۔ اس نے اس پریشانی اور مجبوری کے عالم میں سبکتگین کو خط لکھا کہ میری مدد کو پہنچو۔ سبکتگین نے اس کو اپنے لیے تائید غیبی سمجھا اور غزنی سے فوج لیکر بخارا کی طرف چلا۔ شاہ ترکستان تو خود ہی بیمار ہو کر فوت ہو گیا اور اس کی فوج اپنے ملک کو واپس چلی گئی۔ اب دو دشمن باقی رہ گئے جو آپس میں نوح بن منصور کے خلاف متحد ہو چکے تھے ہرات کے متصل نوح بن منصور اور سبکتگین نے ملکر ابو علی اور فائق اور فخر الدولہ دیلمی کی متحدہ افواج کو شکست فاش دی۔ اس لڑائی میں سبکتگین کے ہمراہ اُس کا بیٹا محمود بھی موجود تھا۔ ابو علی لڑائی میں مارا گیا اور فائق ترکستان کے نئے بادشاہ ایلک خاں کے پاس چلا گیا نوح بن منصور نے بعد فتح سبکتگین کو ناصر الدین اور اُس کے بیٹے محمود کو سیف الدولہ کا خطاب دیا اور غزنی کی سند حکومت کے علاوہ خراسان کا تمام ملک بھی ناصر الدین سبکتگین کے سپرد کر دیا۔ فائق نے ترکستان پہنچکر بغرا خاں یا بغرا خاں کے جانشین ایلک خاں کو بخارا پر چڑھائی کرنے کی ترغیب دی چنانچہ ایلک خاں حملہ آور ہوا۔ نوح بن منصور نے پھر سبکتگین کو بلایا۔ سبکتگین کے پہنچنے پر دونوں بادشاہوں میں صلح ہو گئی۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ان ایام میں قرامطہ کا بہت زور تھا اور سبکتگین ان کے استیصال کو نہایت ضروری سمجھتا تھا۔ ایک طرف قرامطہ کی خفیہ سازشوں کا اندیشہ دوسری طرف دیلمیوں کی مخالفت تیسرے فائق و ابو علی کے مذکورہ خرخشے چوتھے خود ہی اپنے خاندان کی سلطنت کا بانی اور نیا بادشاہ ہونے کی وجہ سے اندرونی بغاوتوں کا خوف ان حالات میں اس کی توجہ حدود ہندوستان کی طرف صرف اسی قدر مبذول ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی مشرقی و جنوبی سرحد کی طرف جہاں قرامطہ کا چرچا تھا متوجہ ہو کر ہر قسم کی احتیاط اور مضبوطی سے کام لیکر اس مسلّم کش بلکہ انسانیت کش تحریک

کا استیصال کرے۔ چنانچہ اس نے کوہ سلیمان کے پہاڑی قبائل میں قرامطہ کو چن چن کر پکڑا۔ اور لوگوں کو نماز روزے کی تاکید کرکے مسجدیں بنوا کر ان کے آباد رکھنے کا انتظام کیا۔ اسی سال یعنی ۳۸۵ھ کے اواخر میں حمید خاں لودی نے متوہم ہو کر امیر سبکتگین کو اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلا کر اطمینان حاصل کیا۔ ابھی سبکتگین پورے طور پر اپنی مغربی حدود کے انتظام سے فارغ نہ ہوا تھا کہ نوح بن منصور سامانی کی طلب پر اس کو ایلک خاں کے مقابلے کے لیے بخارا کی سمت روانہ ہونا پڑا اور صلح پر جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ اس مہم کا خاتمہ ہوا۔ اب سوچنے اور غور کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ اس وقت تک سبکتگین نے بجز اس کے کہ اپنی سرحد کے قرامطہ کا قلع قمع کیا اور لوگوں کو نماز روزے کا پابند بنایا۔ راجہ جے پال یا اس کے ملک سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ مگر راجہ جے پال نے یا تو اپنے دوستوں یعنی قرامطہ کے انتقام میں یا اولوالعزمی اور ملک گیری کے شوق میں سبکتگین کی اس جدید سلطنت کو ایک تر لقمہ سمجھ کر نہایت عظیم الشان اور جرار لشکر کے ساتھ اس وقت چڑھائی کی جبکہ یا غیوں اور دیلمیوں کے لشکر نے سیف الدولہ محمود بن سبکتگین کو نیشا پور میں تنہا پا کر چڑھائی کر دی تھی اور یہ خبر سن کر سبکتگین اپنے بیٹے کی حفاظت و امداد کے لیے غزنی سے گیا ہوا تھا۔ وہاں طوس کے قریب سبکتگین نے دشمنوں کے ساتھ میدان کارزار گرم کر رکھا تھا اور اس کا بیٹا محمود بھی نیشا پور سے اسی میدان میں پہنچ کر باپ کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کر رہا تھا اور یہاں راجہ جے پال لاہور سے پشاور اور پشاور سے جمرود ہوتا ہوا سلطنت غزنی میں داخل ہو کر سیلاب کی طرح سیکڑوں میل سفر طے کر چکا تھا۔ سبکتگین نے طوس کے میدان میں فتح پا کر اس غیر مترقبہ مصیبت کا حال سنا کہ پنجاب کے راجہ نے عظیم الشان لشکر کے ساتھ داخل ہو کر ملک کو روند ڈالا ہے اور عنقریب شہر غزنی پر بھی قابض ہوا چاہتا ہے۔ سبکتگین بلا تامل اپنے اہل و عیال کی محبت اور دار السلطنت کے بچانے کے خیال میں دیوانہ وار دو منزلہ اور سہ منزلہ یلغار کرتا ہوا طوس سے غزنی کی جانب چلا اور شہر غزنی کے متصل جنوب کی جانب جے پال کے لشکر کے مقابل پہنچا۔ یہاں پہنچتے ہی لڑائی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تمام مورخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ لڑائی ایک ایسے چشمے کے قریب ہوئی جس میں اگر نجاست ڈال دی جائے تو فوراً برف باری شروع ہو جاتی تھی۔ اور یہی چشمہ راجہ جے پال کی شکست کا موجب ہوا۔ ہم کو اس وقت اس چشمہ کی پاکی اور برف باری کے اسباب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اس بات پر غور کرنا ہے کہ ایک عجیب الاثر چشمہ کا اس نواح میں ہونا تمام ہندو مسلمان مورخین نے بالاتفاق بیان کیا ہے۔ اگر اس چشمے کا محل وقوع معلوم ہو جائے تو پھر اس بات کا فیصلہ بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے کہ اس سب سے پہلی معرکہ آرائی میں جے پال سبکتگین پر حملہ آور ہوا تھا۔ یا سبکتگین بلا وجہ جے پال پر چڑھ کر آیا تھا۔ اس چشمے کا محل وقوع معلوم کرنے کے لیے ایک ایسے ہندو کی گواہی ضرور قابل قبول ہونی چاہیے جس نے افغانستان کا جغرافیہ بھی لکھا ہے

اور جو آج سے ڈھائی سو سال پیشتر ایک ایسی تاریخ کی کتاب لکھ کر چھوڑ گیا ہے جو آج تک مورخین کے زیر مطالعہ چلی آئی ہے اور ہمارے زمانہ میں خاص اہتمام کے ساتھ چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ سنئے منشی المنشیا سجان رائے بھنڈاری بٹالوی ۱۱۰۷ھ میں جبکہ کابل و غزنی ہندوستان کی سلطنت میں شامل تھے اس عجیب الاثر چشمہ کا حال اس طرح لکھتا ہے کہ۔

"طومان غزنی (پرگنہ غزنی) کہ آنرا زابل گویند در زمان باستان تخت گاہ سلاطین خراسان بود۔ خصوص پائے تخت سلطان ناصر الدین سبکتگین و سلطان محمود غزنوی و سلطان شہاب الدین غوری و نیز خوابگاہ حکیم سنائی و بسیارے اولیا ست از کثرت برف و شدت سرما آنرا ابر بزیر و سمرقند نشان دہند۔ دراں حدود درویش فراواں پیدا شود و بہ ہندوستان رود و در نزدیکی آں چشمہ ایست کہ اگر قاذورات (پلیدی و نجاست) دراں افتد شورش ابر و برف پدیدار گردد"

پس معلوم ہوا کہ وہ چشمہ پرگنہ غزنی میں تھا جیسا کہ منشی سجان رائے کے بیان سے ثابت ہے پھر یہی منشی سجان رائے .... بٹالوی اپنی تاریخ خلاصۃ التواریخ میں راجہ جے پال کے حملہ آور ہونے کا حال ان الفاظ میں لکھتا ہے کہ۔

"راجہ جے پال با بسیارے لشکر و فیلان صف در بر سر غزنی رفت۔ سلطان بدریافت ایں خبر با لشکر بسیار و مبارزاں جرار در حدود ولایت خویش رسیدہ آمدہ پیکار گردید"

لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے سجان رائے کہتا ہے کہ جے پال کے لشکر کو فتح اور سلطان کے لشکر کو شکست ہونے والی تھی۔ مگر سلطان نے یہ تدبیر کی کہ اس چشمے میں پلیدی ڈلوادی جس سے برفباری شروع ہو گئی اور ہندی لشکر سردی کی شدت کا تحمل نہ ہو سکا بہت سے آدمی اکڑ کر رہ گئے۔ باقیوں کے ہاتھ پاؤں بیکار تھے سبکتگین اور اس کے لشکری سردی کے عادی تھے لہذا جے پال نے اپنی شکست کا اعتراف کر کے سلطان سے جاں بخشی چاہی۔ اس جگہ سجان رائے کے الفاظ اس چشمے کی نسبت یہ ہیں۔

"سلطان چوں دید کہ کار شمشیر پیش نمیرود خرد را پیشوائے دلیری و تدبیر را رہنمائے دلاوری ساخت یعنی دراں نواح چشمہ بود کہ اگر بحسب اتفاقات چرک یا قاذورات درون آں افتادے برف عظیم باریدے سلطان فرمود تا دراں چشمہ قاذورات انداختند"

غرض راجہ جے پال نے سلطنت غزنی پر حملہ آور ہو کر توقع کے خلاف شکست و ذلت حاصل کی۔ راجہ نے یہ حملہ پوری تیاری اور بڑی قوت کے ساتھ کیا اور تاک کر ایسے اچھے موقع سے کیا تھا کہ اس کی کامیابی اور سلطنت غزنی پر قابض ہو جانے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ کیونکہ سبکتگین دوسری جانب دشمنوں کے دفع

کرنے میں مصروف اور اپنے دارالسلطنت سے دور تھا۔ مگر ہندی فوج شدت سرما کا مقابلہ نہ کر سکی۔ جب راجہ جے پال نے اپنے آپ کو مجبور دیکھا۔ تو سبکتگین کے پاس درخواست بھیجی کہ مجھ سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے آپ اس مرتبہ میرا قصور معاف کر دیں۔ میں آئندہ ہمیشہ آپ کا فرمانبردار رہونگا اور پنجاب پہنچکر بہت سا چاندی سونا بطور جرمانہ آپ کے پاس بھیجونگا۔ آپ اپنے آدمی میرے ہمراہ بھیجد یجیے میں ان کے ہمراہ خزانہ اور قیمتی تحفے مع پچاس ہاتھیوں کے بھیجدونگا۔ سبکتگین کے فوجی سرداروں نے اس صلح کو ناپسند کیا اور قابو میں آئے ہوئے دشمن کو رہائی دینا عقل کے خلاف بتایا مگر سبکتگین نے اسلامی تعلیم یعنی وان جنحوا للسلم فاجنح لھا پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔ اور عاجز دشمن کی درخواست صلح کو رد کرنا مردانگی کے خلاف سمجھ کر راجہ کو پنجاب کی طرف مراجعت کرنے کی اجازت دی اور اس کی درخواست کے موافق اپنے چند معتمد اس کے ہمراہ کر دئے جیپال نے دریائے سندھ کو عبور کرتے ہی ہندوستان کے تمام راجاؤں کے پاس ایلچی روانہ کر دئے کہ سبکتگین پنجاب پر حملہ کرنے والا ہے۔ اگر میں اس کو روک نہ سکا تو پھر پنجاب پر قابض ہو کر وہ تم کو بھی سلامت نہ چھوڑیگا۔ اس وقت آپس کے تمام جھگڑوں کو طاق میں رکھو اور سب متحد ہو کر غزنی کی سلطنت کا خاتمہ کر دو تاکہ آئندہ کے خطرے سے سب کی حفاظت ہو جائے۔ یہ چٹھیاں راجہ جے پال نے ایسے الفاظ میں لکھیں اور اس طرح سب کو اپنی مدد کے لیے بلایا کہ اجمیر و قنوج ہی نہیں بلکہ گجرات و کالنجر تک کے راجہ بیتاب ہو گئے اور فوراً اپنی اپنی فوجیں جے پال کی مدد کے لیے روانہ کیں جے پال نے لاہور پہنچکر سبکتگین کے آدمیوں کو گرفتار کر کے اپنے عہد و اقرار کو پورا کرنے سے انکار کیا تو اس کے درباریوں نے اس بدعہدی سے اس کو روکنا چاہا۔ مگر راجہ نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ اس واقعہ کو فرشتہ نے تو ان الفاظ میں لکھا ہے کہ۔

"گویند دراں زماں قاعدہ چناں بود کہ ہنگام دیوان داری راجہ ہا چندیں از دانایان برہمن بر یمین مے نشستند و جمعے از کھتریان بر یسار وہرگاہ مہمے عمدہ رو نمودے ایشاں رایان را رائے وادندے چوں دیدند کہ جے پال چناں کارے ناشائستہ میخواہد کہ بکند باتفاق در خدمت راجہ معروض داشتند کہ در آئین حزم و عاقبت اندیشی چناں مشاہدہ مے کنیم کہ از شامت نقض عہد ادبار دو اسپہ تاخت بریں دیار آوردہ و مار از روزگار ما برآید با کہ بایں ترک ستیزہ نمودہ بارسال انچہ کہ مقرر گشتہ خود و خلقے را در مہد امن و امان نگاہداری جے پال را چوں وقت ادبار رسیدہ بود قبول نہ نمود"

مگر سجان رائے صرف اس قدر لکھتا ہے کہ۔

"پس از رسیدن بمسکن خود از قرارداد برگشتہ کسان سلطان را کہ برائے سپردن فیل و مال ہمراہ آوردہ بود بہ مبادلہ مردم خود کہ نزد سلطان گزاشتہ آمدہ گرد بندی کرد"

سبکتگین کے پاس جے پال کی بدعہدی کی خبر پہنچی تو اس کو یقین نہ آیا اور سمجھا کہ یہ جھوٹی افواہ ہے لیکن جب اپنے آدمیوں کے واپس پہنچنے کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو اس نے اس خبر کی تصدیق کے لیے جاسوس روانہ کیے۔ اس عرصہ میں ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کی فوجیں جن میں کالنجر و گجرات کی فوجیں بھی شامل تھیں لاہور پہنچ گئیں جاسوسوں نے واپس جاکر سبکتگین کو اطلاع دی کہ جے پال عنقریب حملہ آور ہونے والا ہے اور آپ کے معتمدوں کو اس نے قید کر لیا ہے۔ سبکتگین اب اس تیاری میں مصروف ہوا کہ جے پال پر حملہ کرکے اپنے آدمیوں کو قید سے چھڑائے اور اس کے حملہ کو روکے۔ لیکن جے پال کی تیاری بہت زبردست اور سریع تھی سبکتگین ابھی غزنی ہی میں تھا کہ اس کے پاس خبر پہنچی کہ جے پال نے اس کے معتمدوں کو جام شہادت پلا کر دریائے سندھ کو عبور کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ غزنی سے چلا اور لمغان کے میدان میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ اس جگہ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ لمغان کس مقام کا نام ہے اور وہ کہاں واقع ہے کوئی تو لمغان کو جلال آباد کے متصل بتاتا ہے۔ کسی کا بیان ہے کہ لمغان وادی بامیان کا دوسرا نام ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے باپ کا نام ازلام تھا ان کو الملک بھی کہتے تھے۔ ان کا مزار بامیان میں ہے۔ وہاں کے آدمی کاف کو غین بولتے ہیں اس لیے الملک کو الملغ کہتے ہیں لہذا اس علاقے کو الملغان کہنے لگے کثرت استعمال سے لمغان رہ گیا۔ تزک بابری اور دوسری تاریخوں میں لمغان کی جمع لمغانات استعمال ہوئی ہے جو دلیل اس بات کی ہے کہ یہ نام کئی متصلہ مقامات پر بولا جاتا ہے۔ لمغانات جس علاقے پر بولا گیا ہے وہ ایک وسیع علاقہ ہے جو جلال آباد۔ کابل اور غزنی کے درمیان پھیلا ہوا ہے بعض مورخوں نے درہ خورک متصل جلال آباد کا نام لمغان بتایا ہے۔ بہرحال اس لڑائی کا مقام جلال آباد کے جنوب اور غزنی کے شمال میں سمجھنا چاہیے۔ یہ مقام بھی سلطنت غزنی کا وسطی مقام تھا سبکتگین بیچارا اب بھی اپنی سلطنت کے اندر حملہ آور دشمن کو روکنے اور مدافعت کرنے کا گنہگار ہے۔ کس قدر حیرت ہوتی ہے کہ اس دوسری لڑائی کو جو جے پال کا دوسرا حملہ تھا سبکتگین کا دوسرا حملہ بتایا جاتا ہے۔ اور بعض یورپی مورخوں نے تو اس کو محمود غزنوی کا دوسرا حملہ قرار دیا ہے۔ ع۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔

زینت التواریخ میں لکھا ہے کہ اس مرتبہ لمغان کے میدان میں جے پال کے ہمراہ تین لاکھ جرار فوج اور بہت سے جنگی ہاتھی تھے سبکتگین کی کل فوج ساٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی ملکم صاحب نے بھی فوجوں کی یہی تعداد بتائی ہے۔ سبکتگین جب سامنے پہنچا تو اس نے ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر جے پال کے لشکر کا معائنہ کیا اور اس کی کثرت دیکھ کر گھبرایا۔ لیکن پھر اپنے دل کو قوی کرکے یہ تصور کیا کہ کلنگوں کی کثرت سے باز کو اور گوسفندوں کی کثرت سے قصاب کو جس طرح خوف نہیں ہوا کرتا۔ اسی طرح مجھکو بھی خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ آخر لڑائی

ہوئی اور جے پال شکست کھا کر بھاگا سبکتگین نے دریائے سندھ کے کنارے تک تعاقب کیا اور ہندی لشکر کو دریا پار بھگا کر دس ہزار لشکر کے ساتھ ایک سردار کو پشاور میں متعین کیا کہ ہمیشہ سرحد کی حفاظت کرتا رہے۔ اس لڑائی میں جے پال اس قدر ساماں اور زر و زیورات سراسیمگی کی وجہ سے میدان میں چھوڑ آیا تھا کہ سبکتگین کے تمام مصارف جنگ پورے ہو گئے۔ ہندوستان کی متفقہ افواج کو یہ ایسی شکست فاش ہوئی کہ پنجاب سے بہار و بنگال اور گجرات و دکن تک حیرت و حسرت چھائی اور تمام ملک میں برہمنوں اور بودھوں کے جو مباحثے اور مناظرے جاری تھے۔ وہ سب یک لخت ملتوی ہو کر غزنی کی اس نئی ریاست کی قوت کو فنا کرنے کی تدبیروں کا سوچنا ایک دلچسپ اور ضروری مسئلہ بن گیا۔ لمغان کی لڑائی کا تمام ہندوستان پر اس لیے زیادہ اثر پڑا کہ اس لڑائی میں ہندوستان کے قریباً ہر حصے اور ہر ریاست کی فوج شامل تھی اس شکست کو ہر ایک راجہ نے اپنی شکست تصور کیا اور ہزیمت خوردہ سپاہیوں نے اپنے اپنے وطن میں پہنچکر روئداد جنگ سنائی۔ جس سے سبکتگین کی حیرت انگیز قابلیت سپہ سالاری کا سکہ بیٹھ گیا۔ سبکتگین کا حق تھا کہ وہ راجہ جے پال کے ملک پر حملہ کرتا اور کم از کم اس کو اپنے اس وعدے کے ایفا پر مجبور کرتا جو وہ پہلی مرتبہ فرمانبرداری اور خراج گذاری کا کر آیا تھا۔ مگر اس نے اپنی اس فتح ہی کو غنیمت سمجھا اور اپنے معتمدوں کے مظلومانہ خون کا بدلہ جے پال کی فوج کے ان مقتولوں کو تصور کر لیا جو لمغان کے میدان اور دوران فرار میں غزنوی تلواروں سے ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے بعد سبکتگین کو فوراً شمال کی جانب سامانی سلطنت کے جھگڑے سلجھانے کے لیے جانا پڑا اور ابھی اپنے دارالسلطنت غزنی میں واپس نہیں آنے پایا تھا کہ بلخ کے متصل ۳۸۷ھ میں فوت ہو گیا۔

سلطان محمود غزنوی جس وقت امیر ناصر الدین سبکتگین کا انتقال ہوا ہے تو اس کا چھوٹا بیٹا امیر اسمٰعیل جو الپتگین کی بیٹی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا اس کے ہمراہ موجود تھا اور بڑا بیٹا محمود نیشاپور میں تھا۔ ہمراہی سرداروں نے اسمٰعیل کو بلخ میں لیجا کر تخت نشین کیا۔ محمود نے نیشاپور سے بھائی کو لکھا کہ میں بڑا ہوں تم چھوٹے ہو مناسب یہ ہے کہ تخت مجھکو ملے اور تم میری اطاعت کرو۔ تاکہ ملک میں فتنہ برپا نہ ہو سکے۔ تم ناتجربہ کار ہو۔ امور سلطنت کا بار تم سے نہ اٹھ سکے گا۔ میں تمہارے لیے یہ رعایت روا رکھتا ہوں کہ تم کو بلخ و خراسان کا مستقل حاکم بنا دونگا۔ لیکن دارالسلطنت غزنی اور بقیہ تمام ملک میرے تصرف میں ہونگے۔ اسمٰعیل نے اس مناسب تجویز اور ملک کی تقسیم کو نا منظور کیا اور لڑائی پر آمادہ ہو گیا۔ آخر لڑائی ہوئی اور اسمٰعیل گرفتار ہو کر محمود کے سامنے پیش ہوا۔ محمود نے اس کو عزت و آرام کے ساتھ نظر بند کر کے ایک قلعہ میں رکھا اور خود باپ کے ملک کا مالک ہوا۔ محمود و اسمٰعیل کے تنازعے میں چھ مہینے سے زیادہ مدت تک

ہوئی۔ اسمٰعیل کی طرف سے مطمئن ہوکر اور سلطنت غزنی کا فرمانروا بننے کے بعد اگر محمود کو جے پال سے لڑنے کا شوق ہوتا تو وہ سب سے پہلے دریائے سندھ کو عبور کرکے پنجاب پر حملہ آور ہوتا۔ لیکن اس کو تین سال تک جے پال کا خیال بھی نہ آیا جبتک کہ جے پال خود ہی اس کے ملک پر حملہ آور نہ ہوا۔ جے پال یہاں سلطنت غزنی پر حملہ آور ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہاں محمود نے تخت نشین ہوتے ہی بخارا کے سامانی سلطان منصور سے اس امر کی شکایت کی کہ بلخ و خراسان کی امیر الامرائی میرا حق ہے۔ آپ نے خراسان میں اپنی طرف سے بکتوزن نامی سردار کو کیوں امیر الامرا مقرر کیا۔ اس کا جواب منصور سامانی کی طرف سے محمود کے حسب منشا نہ آیا تو محمود نے لشکر فراہم کرکے خراسان کو بزور شمشیر اپنے قبضے میں لانا چاہا۔ بکتوزن نے محمود کے مقابلہ کی ہمت اپنے اندر نہ دیکھ کر منصور سامانی کو لکھا۔ منصور سامانی خود بخارا سے فوج لے کر خراسان کی حفاظت اور محمود کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ محمود اس خوف سے کہ لوگ مجھ کو نمک حرام کہیں گے منصور سامانی کے مقابل نہ ہوا۔ اور نیشاپور میں قیام کر دیا۔ بکتوزن نے یہ کور نمکی کی کہ منصور سامانی کو جو اس کی امداد کے لیے آیا تھا موقع پاکر قتل کر دیا اور اس کی جگہ ایک ناتجربہ کار نوعمر لڑکے عبدالملک کو تخت نشین کرکے خود بخارا کی سلطنت کا مدارالمہام بن گیا۔ محمود نے یہ خبر سن کر حملہ کیا۔ بکتوزن شکست کھا کر بھاگا اور دوسرے سردار عبدالملک کو لے کر بخارا چلے گئے وہاں ترکستان کے بادشاہ ایلک خاں نے بخارا پر حملہ کرکے عبدالملک سامانی کو قتل کیا اور اس طرح سامانی خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ محمود نے خراسان پر قابض ہوکر ہرات و بلخ وغیرہ کا انتظام کیا۔ ان تمام ہنگاموں میں تین سال ختم ہوگئے۔ سنہ ۳۹۰ھ میں محمود ہرات سے سیستان کی جانب آیا۔ جہاں صفاری خاندان کا آخری بادشاہ خلف بن احمد جو یعقوب بن لیث صفار کا نواسا تھا فرمانروائی کر رہا تھا۔ خلف بن احمد کے قبضے میں سیستان و مکران کے صوبے تھے۔ اس نے اپنے بیٹے کو جو اس کی فوج کا سپہ سالار اور رعایا میں ہردلعزیز تھا۔ بغاوت کے شبہ میں نہایت ظالمانہ طور پر قتل کیا تھا۔ لہذا سیستان کی رعایا نے محمود غزنوی کے پاس خلف بن احمد کے مظالم کی شکایت اور اس کے قرمطی ہو جانے کا حال لکھ کر درخواست کی کہ آپ اس ملک پر چڑھائی کریں محمود نے سیستان پہنچ کر خلف کو محصور کر لیا۔ اس نے اپنے آپ کو محمود کے حوالے کیا اور رحم کی درخواست کرتے ہوئے محمود کو سلطان کہہ کر مخاطب کیا۔ محمود کو سلطان کا لفظ بہت پسند آیا اور اسی روز سے اپنے آپ کو سلطان محمود کے لقب سے ملقب کیا۔ خلف چونکہ قرمطی ہو چکا تھا لہذا اس کو اپنے ہمراہ غزنی لاکر نظر بند کیا۔ جہاں وہ چار برس تک بحالت نظر بندی زندہ رہا۔ اس طرح سامانی خاندان کے بعد ہی خاندان صفاریہ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ یہ تمام حالات ملکم صاحب نے زینت التواریخ کے حوالے سے لکھے ہیں۔ بخارا ایلک خاں کے قبضے میں آچکا تھا۔ فارس و آذربائیجان اور بغداد کے دربار خلافت پر دیلمی مستولی تھے

اور محمود کو یہ فکر درپیش تھی کہ تاتاریوں اور دیلمیوں کے خطرے سے محفوظ رہنے کا کوئی انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایلک خاں کے پاس ایلچی بھیجکر اس سے مصالحانہ و دوستانہ تعلقات قائم کر لینے مناسب سمجھے مگر یہ دوستی زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکی ایلک خاں سے دوستی پیدا کرنے کے بعد سلطان محمود نے خلیفہ بغداد قادر باللہ عباسی کی خدمت میں درخواست بھیجکر اقرار اطاعت کیا اور خلیفہ سے سند حکومت کی استدعا کی خلیفہ نے سلطان کے پاس ایک گرانبہا خلعت بھیجا اور "امین الدولہ یمین الملت" کا خطاب عطا کیا،

جے پال کا تیسرا حملہ سلطان محمود ابھی اپنے ملک کے محفوظ رکھنے کی تدبیروں سے فارغ نہ ہونے پایا تھا کہ محرم ۳۹۱ھ میں اس کے پاس عامل پشاور کی عرضداشت پہنچی کہ پنجاب کا راجہ جے پال ایک عظیم الشان لشکر فراہم کرکے سلطنت غزنی پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ اوپر جو واقعات درج ہو چکے ہیں ان سے اس بات کا سمجھ لینا کچھ بھی دشوار نہیں ہے کہ محمود غزنوی کی تمامتر توجہ بخارا و آذربائیجان و فارس کی طرف منعطف تھی۔ وہ جانتا تھا کہ صفاریوں اور دیلمیوں نے کس طرح دربار خلافت پر اپنا تسلط قائم کرکے رعب داب قائم کیا۔ اس کو ترکستان کی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ وہ اپنی تمام اولوالعزمی اور ہمت اس بات میں صرف کرنی چاہتا تھا کہ دیلمیوں کو جن کا آفتاب اقبال زوال پذیر ہو چکا تھا اور جو مذہب و عقیدے کے اعتبار سے محمود کے مخالف تھے ہٹا کر خلیفہ کو جو محمود کا ہم عقیدہ اور مخدوم تھا آزادی دلائے اور دربار خلافت میں اپنا رسوخ قائم کرکے تمام عالم اسلامی میں شہرت و عظمت حاصل کرے۔ یہ کام محمود کے لیے کچھ دشوار بھی نہ تھا وہ یقیناً افغانستان۔ خراسان و ایران و آذربائیجان و عراق و شام و حجاز و ایشیائے کوچک وغیرہ پر اپنی حکومت و سطوت قائم کر سکتا تھا۔ جیسا کہ اس کے بعد سلجوقیوں نے کیا۔ لیکن راجہ جے پال نے ان کاموں کی طرف سے اس کی توجہ زبردستی اپنی جانب منعطف کی اور اس کو مجبور کر دیا کہ وہ فوج لیکر ایک ایسے بدعہد۔ باغی۔ ضدی مزاج دشمن کی گوشمالی کے لیے روانہ ہو جو اس سے پہلے دو مرتبہ سخت ذلت اٹھانے کے بعد بھی سلطنت غزنی کے رحم و درگذر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اب تیسری مرتبہ پھر بلا وجہ حملہ آور ہو رہا ہے۔ محمود نے غزنی میں جے پال کی تیاریوں کا حال محرم ۳۹۱ھ میں سنا لیکن وہ فوراً ہی مقابلہ پر روانہ نہ ہوا۔ کیونکہ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ خبر غلط ثابت ہو جائے۔ اس نے اس خبر کو عامل پشاور کی بدگمانی اور غیر ضروری احتیاط پر محمول کرکے تحقیق حالات کے لیے جاسوس روانہ کیے۔ وہ اس وقت تک اس خبر کو غلط ہی سمجھتا رہا جب تک کہ ماہ شوال ۳۹۱ھ میں اس کے پاس یہ خبر نہ پہنچ گئی کہ جے پال اپنی فوجوں کو دریائے سندھ کے کنارے لے آیا ہے۔ اب ہندوستان کا حال سنئے یہاں جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے جے پال اور ہندوستان کی متحدہ افواج کے میدان لمغان میں شکست یاب ہو کر بھاگنے کے بعد سنگھٹن کی

تحریک پورے زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی تھی نیز بودھ عالم اور ہندو پنڈتوں کے مناظرے ملتوی ہو کر بھارت واسیوں کو محبت و یکجہتی کی فضا میں متفق ہو کر سلطنت غزنی کے فتح کرنے کی تیاریوں کا نہایت زریں موقع حاصل ہو چکا تھا۔ سبکتگین کی وفات نے جے پال کی ہمت میں ایک نئی جان ڈال دی تھی۔ اس نے گذشتہ ہزیمتوں کے تجربہ سے فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کی اور اسی لیے وہ کئی سال تک محمود کو غزنی سے باہر بلخ و ہرات و سیستان کے قضیوں میں مبتلا دیکھ کر اس کے زوال و انحلال کا متوقع رہا اور برابر فوجی تیاریوں میں مصروف رہکر اپنے آپکو خوب طاقتور بناتا رہا۔ جے پال پنجاب جیسے وسیع و زرخیز ملک کا راجا۔ ہندوستان کے راجاؤں میں سب سے بڑا اور مشہور و معزز راجا تھا۔ اس کو دو مرتبہ سبکتگین سے شکست پانے کی سخت ندامت تھی وہ سب سے زیادہ اس بات کا خواہاں تھا کہ کسی طرح کھوئی ہوئی عزت واپس حاصل ہو اور دو مرتبہ کی کھائی ہوئی شکست کی کافی تلافی ہو جائے۔ اس کی ہمت اس لیے بھی ترقی کر گئی تھی کہ سبکتگین جیسا تجربہ کار سپاہی مر چکا تھا۔ اب ایک نوعمر و نا تجربہ کار لڑکا یعنی محمود اس کا مد مقابل تھا غرض جیپال نے اس مرتبہ وہ بڑا ایک [illegible] زبردست فوج لیے بہت ہی زبردست قوت سے افغانستان کو فتح کر کے ناموری حاصل کرنا چاہتی تھی ڈیڑھ لاکھ سوار و پیادہ اور تین سو جنگی ہاتھی لیکر دریائے سندھ کو عبور کیا ادھر محمود غزنوی بھی غزنی سے پشاور کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ پشاور کے قریب دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے خیمہ زن ہوئے۔ نظام الدین احمد ہروی نے اپنی طبقات میں جیپال کی فوج کے سواروں کی تعداد تو دس ہزار بتائی ہے مگر پیدلوں کے لیے لفظ بسیار استعمال کیا ہے اور ہاتھیوں کی تعداد تین سو ظاہر کی ہے۔ فرشتہ جے پال کے پیدلوں کی تعداد تیس ہزار بتاتا ہے اور سوار بارہ ہزار۔ سجان رائے فوج کی تعداد کچھ نہیں بتاتا۔ سیر المتاخرین والے نے اپنی کتاب میں سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ کو حرف بحرف نقل کر دیا ہے۔ روسی میجر جنرل سیولف اپنی کتاب میں جے پال کے پیدلوں کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار بتاتا ہے۔ پشاور کے میدان میں جے پال کی فوج کس قدر تھی اس میں اختلاف ہے مگر بیالیس ہزار سپاہی اور تین سو ہاتھیوں سے کم ہرگز نہ تھی محمود کی فوج کو تمام مورخین نے یک زبان ہو کر صرف دس ہزار بتایا ہے۔ جس میں سوار اور پیدل سب شامل ہیں جے پال کی فوج کی تعداد بیان کرنے میں اختلاف کیوں ہوا؟ اس کا جواب رامچندر صاحب کی تاریخ حالات ہند کے ان الفاظ میں تلاش کرنا چاہیے کہ

"اس لڑائی کے بعد محمود نے اُن سرحدی قبائل کو سزائیں دیں جن کو راجہ جے پال نے سازش کر کے پہلے سے اپنا شریک بنا لیا تھا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ جو فوج لاہور سے راجہ جے پال کے ساتھ اٹک کی جانب روانہ ہوئی وہ صرف بیالیس ہزار سپاہی اور تین سو ہاتھیوں پر مشتمل تھی لیکن دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد سرحدی قبائل جن کو انواع و اقسام کے لالچ دیے گئے ہونگے اُس کے لشکر میں شامل ہوئے ہونگے۔ محمود جب جے پال کے مقابل پہنچا تو دشمن کے لشکر کی کثرت اور اپنی قلت سے مطلق مرعوب نہ ہوا۔ لڑائی شروع ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ جے پال کی فوج دس ہزار محمودی لشکر کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکی پانچ ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر اور جے پال کو مع پندرہ سرداروں کے گرفتار کرا کر باقی فوج لاہور کی جانب بھاگ آئی۔ محمود غزنوی نے اس فتح کے بعد سرحدی چوکیوں کا انتظام کیا اور جیپال کو معہ پندرہ جیپالی سرداروں کے لیے ہوئے غزنی پہنچا۔ غزنی پہنچکر اُس نے جیپال سے پوچھا کہ تم نے کیوں ہم کو بار بار دق کرنے کا ارادہ کیا۔ جیپال نے کہا کہ اس مرتبہ میری خطا معاف کی جائے اور مجھکو چھوڑ دیا جائے میں اب تا زیست فرمانبرداری سے انحراف نہ کرونگا اور پنجاب کو غزنی کا ایک صوبہ سمجھ کر آپ کی جانب سے حکومت کرونگا اور سالانہ خراج بلاعذر و حیلہ بھیجتا رہونگا۔ محمود نے انتہائی شرافت کو کام میں لا کر راجہ کی اس استدعا کو قبول کر لیا اور غزنی سے لاہور کی جانب رخصت کر دیا۔ پشاور کے میدان میں ۸ محرم ۳۹۲ھ مطابق ۵ اگست ۱۰۰۱ء کو محمود نے فتح پائی تھی اور شعبان ۳۹۲ھ مطابق مارچ ۱۰۰۲ء میں جیپال کو غزنی سے رخصت کیا۔ اس طرح راجہ جے پال قریباً آٹھ مہینے محمود کے ہمراہ رہا۔ لاہور میں جیپال کا بیٹا انندپال جو معرکہ جنگ سے فرار ہو کر اپنی جان سلامت لے آیا تھا ملک کا بندوبست کرتا رہا۔ اب سوچنے اور غور کرنے کا مقام ہے کہ راجہ جیپال تیسری مرتبہ سلطنت غزنی پر حملہ آور ہوتا ہے اُس کی رعایا کو سازش کے ذریعہ باغی بنا کر اپنے ساتھ شامل کرتا ہے اور محمود کی مٹھی بھر فوج سے شکست پا کر دوسری مرتبہ گرفتار ہوتا ہے محمود نے ابھی تک دریائے سندھ کے اس طرف قدم نہیں رکھا ہے لیکن اس لڑائی کو محمود کا پہلا حملہ قرار دیا جاتا ہے اور ای مارسڈن صاحب۔ جے سی ایلن صاحب۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صاحب۔ لیتھبرج صاحب اور سب سے بڑھکر یہ کہ سرجان ملکم صاحب بھی یک زبان ہو کر فرماتے اور ہمارے بچوں کو مدرسوں اور کالجوں میں یقین دلاتے ہیں کہ محمود غزنوی نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے اور ہندوستان کی دولت سمیٹ کر غزنی لیجانے کے لیے بلاوجہ بیچارے ہندوؤں پر حملے کیے اور وہ ہندوؤں کا بلاسبب قتل کرنا ثواب کا کام سمجھتا تھا۔ ای مارسڈن صاحب اپنی طرف سے محمود کے اس فرضی حملہ کا ایک سبب یہ بھی تصنیف فرماتے ہیں کہ

"محمود ابھی بچہ ہی تھا کہ اُس نے اکثر اوقات گراں بہا مال و منال سے لدی ہوئی اونٹوں کی لمبی لمبی قطاریں اپنے باپ کے شہر میں ... دیکھی تھیں وہ سوداگروں سے بات چیت کیا کرتا تھا جو

بڑے بڑے شہروں اور پُر از دولت مندروں کا کچھ حال سُنا تے تھے اس پر وہ کہتا کہ جب میں بڑا ہو کر بادشاہ ہونگا تو ہند کے راجاؤں کے ساتھ لڑونگا اور ان سے سارا سونا چاندی اور بیش قیمت مال واسباب چھین کر غزنی لے آؤں گا "

دوسرے صاحب یعنی لیتھبرج صاحب فرماتے ہیں کہ

"محمود کا ہند کی دولت پر تو دانت تھا ہی مگر ساتھ ہی یہ بھی آرزو تھی کہ بڑے بڑے مانے ہوئے اجودھیا کو تلوار کے زور سے مسلمان کرے "

تیسرے صاحب جے سی ایلن صاحب لکھتے ہیں کہ

"محمود لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے شہروں کو برباد کر دیتا تھا جو مسلمان ہونے سے انکار کرتا اُس کو قتل کر ڈالتا تھا۔ اُس نے شہروں کو برباد کیا۔ مندروں کو گرا دیا۔ متبرک برہمنوں کو جن کی ہندو عزت کرتے تھے قتل کر ڈالا۔ گاؤں اور قصبوں کو اُجاڑ دیا۔ پختہ غلوں کے کھیتوں کو جلا کر خاک کر دیا اور خوش و خرم گھروں کو ماتم کدہ بنا دیا ...... راجہ جے پال والی لاہور نے اپنے ملک کو بچانے کی بیحد کوشش کی۔ سلطان محمود ایک جرار فوج لیکر کوہستانی علاقوں سے گذرتا ہوا ہندوستان کے میدانوں پر حملہ آور ہوا اور شہر پشاور کے نزدیک اپنے ڈیرے ڈالدیے راجہ جے پال راجپوت سوار پیدل اور بہت سے ہاتھی ساتھ لیکر حملہ آور فوج کو پسپا کرنے کے لیے آگے بڑھا گھمسان کی لڑائی ہونے لگی مسلمان سپاہیوں نے تلواروں سے ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹ ڈالیں اور نیزوں سے ان کی ٹانگیں زخمی کر دیں۔ مسلمانوں نے مذہب کے جوش میں متاثر ہو کر ہندوؤں پر اس زور سے حملہ کیا کہ اُن کی فوج تتر بتر ہو کر بھاگ گئی محمود کے سپاہی راجہ جے پال کو رسیوں سے باندھکر اپنے بادشاہ کے سامنے لے گئے اور نیز انھوں نے بہت سے ہندوؤں کو قید کر لیا کچھ قیدیوں کے ہاتھ اُن کی کمر سے باندھ دیے بعضوں کو اُن کے کان پکڑ کر اور بعضوں کی گردن پر تھپڑ مارتے ہوئے لے چلے "

اب بڑے سنجیدہ مزاج مورخ ملکم صاحب کی مضمون آفرینی بھی ملاحظہ ہو اُن کو اپنے مقصد کے پورا کرنے میں اس قدر جلدی تھی کہ جو کچھ اوروں نے محمود کے سر تھوپا تھا انھوں نے اُس کو سبکتگین کا حال لکھتے ہوئے اُسی کے یعنی محمود کے باپ کے سر پر لاد دیا چنانچہ وہ سبکتگین کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"اس نے ہندوستان پر اس لیے حملہ کیا تھا کہ ہندوستان کی دولت کا حال وہ سُن چکا تھا اور لوٹ کی چاٹ اُس کو بیٹ سے لگی تھی اور علاوہ اس کے بڑی غرض یہ تھی کہ بُت پرستوں کے دین و مذہب کو خاک میں ملا دے اور اپنے پیغمبر کی ملت اُجالے چنانچہ اُس نے پہلی پہل راے جیپال کو شکست فاش

دی جو اُن دنوں شمالی ہندوستان کا راجہ تھا اور کابل پر قبضہ کیا اور پنجاب کو لوٹا کھسوٹا اور دوسری
مہم میں پہلی مہم کی بہ نسبت بڑی کامیابی حاصل ہوئی یعنی ہندوستان کے راجا پر بڑے معرکہ میں غالب آیا۔"

(تاریخ ایران حصہ دوم مصنفہ ملکم صاحب)

جے پال و سبکتگین کی دو لڑائیوں اور جیپال و محمود کی ایک پہلی لڑائی کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے اُس کو
پڑھو اور ان یورپی مورخوں کی بیان کو پڑھو اور تحقیق کرو کہ آج تک کسی نے اُن عالی جاہ مورخوں سے
یہ دریافت کرنے کی بھی جرأت کی کہ جناب آپ کے محمود کو اپنے باپ کی سلطنت میں سوداگروں سے
باتیں کرتے اور ہندوستان کے راجاؤں سے لڑنے اور ہندوستان کی دولت غزنی لیجانے کا ارادہ ظاہر
کرتے ہوئے خود سُنا تھا اور جے پال کو رسیوں سے باندھتے اور اُس کے ہمراہیوں کو کان پکڑ کر لیجاتے
اور دھولیں مارتے ہوئے دیکھا تھا یا محض زینتِ کلام کے طور پر آپ کے دماغ کا اختراع ہے اور یہ حالات
و اسباب جو آپ نے بیان کیے ہیں کس تاریخ یا کس ماخذ سے آپ کو معلوم ہوئے ہیں۔ کس قدر حیرت کا مقام
ہے کہ انھیں یورپی مورخین کی لکھی ہوئی کتابوں کے حوالوں کو اثبات مدعا کے لیے تمام ہندو و مسلمان مصنفین اس
طرح پیش کرکے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ گویا انھوں نے اپنی تحقیق حد کمال تک پہنچا دی اور اب اُن کے مخاطب کو
علم الیقین اور عین الیقین کے مدارج سے گذر کر حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچ جانا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ
جو لوگ ہندوستانیوں کی نفسیات سے واقف ہو چکے ہیں اُن کو موقع حاصل ہے کہ وہ بلا تکلف ان
کو احمق اور اُلّو بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کریں اور اُن کی جہالت مآبیوں اور حماقت پناہیوں کا تماشا دیکھ دیکھ کر
لطف اُٹھائیں اور قہقہے لگائیں۔ آمدم بر سر مطلب محمود غزنوی اگر واقعی لوگوں کو مسلمان بنانے اور جو
انکار کرے اُس کو فوراً قتل کر ڈالنے کا شوقین تھا تو تعجب ہے کہ جے پال آٹھ مہینے تک اُس کے پاس رہا
اور مسلمان نہ ہوا بلکہ ہندو کا ہندو ہی رہا اور صحیح و سلامت واپس آیا۔ محمود نے اُس سے خراج گذاری اور
فرمانبرداری کا اقرار تو لیا مگر مسلمان ہونے کی فرمایش نہ کی اگر فرمایش کی تھی تو اُس کے انکار پر اُس کو
قتل کیوں نہیں کیا۔ جیپال تو اُس کے باپ سے بھی دو مرتبہ پہلے لڑ چکا تھا۔ اُس نے پہلی مرتبہ اقرار
اطاعت اور خراج گذاری کے وعدہ پر رہائی پاکر دوبارہ حملہ کیا اور اب سہ بارہ حملہ آور ہو کر محمود کے پنجہ
میں گرفتار ہوا تھا۔ ایسے بد عہد دروغگو اور فتنہ برپا کرنے والے کو سوائے محمود کے اور کون ہے
جس نے اس طرح رہائی دی ہو اور عزت کے ساتھ اُس کے ملک کی طرف رخصت کیا ہو۔ کیا دُنیا میں
اس سے بڑھکر بھی کوئی سفید جھوٹ ہو سکتا ہے کہ محمود کو ظالم اور جے پال کو مظلوم بتایا جاتا ہے اور جیپال
کی یورش کو محمود کا حملہ قرار دیا گیا ہے؟ محمود نے جیپال کو قول و قرار لے کر غزنی سے ہندوستان کی طرف

روانہ کیا اور خود چند مہینے بعد یعنی محرم ۳۹۳ھ میں سیستان کی طرف گیا اس نو مفتوحہ ملک میں آثار بدامنی پیدا ہوئے تھے جن کو محمود نے جا کر رفع کر دیا اور وہاں سے غزنی واپس آکر دو تین سال تک غزنی میں مقیم رہا اس عرصہ میں اُس نے کیا کیا کام کئے اور کن مشاغل میں مصروف رہا اُن کے بیان کرنیکی یہاں ضرورت نہیں مگر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا اُس کو بھول کر بھی خیال نہ آیا حدود ہند کی جانب سے وہ بالکل مطمئن اور بے فکر تھا کیونکہ سلطنت پنجاب سے اُس کی صلح تھی اور برائے نام خراج جس کا وعدہ جے پال سے اُس نے لیا تھا سالانہ غزنی پہنچ رہا تھا۔

وشنومت کی ایجاد راجہ جے پال جب غزنی سے لاہور پہنچا تو اُس نے اپنے بیٹے انندپال کو فرمانروائے پنجاب پایا۔ بیٹے نے باپ کے لیے تخت خالی کرنا چاہا مگر جے پال نے انکار کیا اور انندپال کو محمود کی مخالفت نہ کرنے اور سالانہ خراج بھیجتے رہنے کی وصیت کر کے خود اپنے مذہبی عقیدے کے موافق آگ میں جل مرا اس واقعہ کو تمام مورخین نے متفقہ طور پر اس طرح لکھا ہے کہ جیپال ایک مذہبی عقیدے کے موافق کہ جو راجا دومرتبہ دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہو جائے اُس کو آگ میں جلکر مرجانا چاہیے آگ میں جلکر مرا تھا۔ راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند نے اپنی کتاب آئینۂ تاریخ نما میں ایک سنسکرت زبان کا لفظ تشانل استعمال کر کے بتایا ہے کہ تشانل بھوس کی آگ کو کہتے ہیں اور جیپال بھوس کی آگ یعنی تشانل میں جلکر مرا تھا۔ ظاہر ہے کہ جیپال کے اس طرح مرنے نے ہندوستان کے مذہبی گروہوں پر خاص اثر کیا ہوگا اور مذہبی پیشواؤں یعنی برہمنوں نے راجہ کے اس حسن عمل کا حال سُن کر اُس کو یقیناً ایک مذہبی شہید کا مرتبہ دیا ہوگا۔ جس کے ساتھ ہی محمود غزنوی سے نفرت وعداوت اور جیپال کے جانشین انندپال سے محبت وہمدردی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ ہندوستان کی آب وہوا کے مخصوص اثر اور تمام مذکورہ واقعات کو ذہن میں رکھکر غور کرو کہ اُس زمانہ کے ہندوستان میں کس طرح سلطان محمود کے متعلق نفرت وانتقام کے جذبات مشتعل ہوئے ہونگے۔ اور نوزائیدہ برہمنی مذہب اور پُرانے مسخ شدہ بودھ مذہب کے مناقشات کو دونوں مذہبوں کے پنڈتوں نے فراموش کر کے کس طرح اپنی تمام تر توجہ اتفاق واتحاد اور دونوں مذہبوں کے درمیان ایک مشترکہ راہ اختیار کر کے تمام باشندگان ہند کو سلطنت غزنی کے خلاف آمادہ ہو جانے کی کوششیں کی ہونگی۔ چنانچہ راجہ جے پال کی خودکشی کے بعد ہندوستان میں فوراً ایک ایسے مذہب کی بنیاد رکھی گئی جس میں بودھ اور برہمنی مذہب کے ماننے والے دونوں شریک کیے جا سکتے تھے۔ افسوس ہے کہ بادشاہوں اور لڑائیوں کی تاریخ لکھنے والے جب واقعات پر رائے زنی کرتے ہیں تو وہ مذہبوں اور قوموں کی تاریخ کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور حقیقت

اصلیہ کا چہرہ بے نقاب کرنے میں کماحقہ تلاش و جستجو سے کام نہیں لیتے۔ جیپال کے بار بار سلطنت غزنی پرحملہ کرنے اور تین مرتبہ شکست پانے کے بعد خودکشی کرنے اور اس کے بعد انندپال کے بھی باپ کے نقش قدم پرچلنے کا جہاں ایک طرف یہ نتیجہ ہوا کہ پنجاب کا ملک سلطنت غزنی میں شامل ہوگیا وہاں دوسری طرف اس سے بھی زیادہ اہم ایک یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ہندوستان کے دو رقیب مذہبوں یعنی بودھ اور برہمنی مذہب کے عالموں اور پیشواؤں میں ایک زبردست صلح قائم ہوکر آیندہ کے لیے یہ مذہبی کشمکش بالکل نابود ہوگئی اور پنجاب کی بودھ حکومت کے برباد ہونے پر لیہ و دھ مذہب کے پیرو اکثر اس جدید مذہب میں جذب ہوگئے جو ہندوستان کے پنڈتوں نے پنجاب و غزنی کی حکومتوں میں مذکورہ سلسلہ جنگ قائم ہونے کے سبب تجویز کیا تھا اور جس کا نام وشنومت رکھا تھا۔ اس مذہب کے ایک الگ مستقل مذہب بننے کی صلاحیت شنکراچارج کی تعلیمات نے مہیا کردی تھی جو محمود غزنوی سے تھوڑے ہی دنوں پہلے برہمنی مذہب کو بہت کچھ مرتب و مدون کرچکا تھا۔ آنریبل ڈاکٹر ڈبلیو ہنٹر صاحب جنھوں نے ہندوستان کا گزیٹیئر مرتب کیا ہے اپنی کتاب "تاریخ اہل ہند" میں وشنوپران کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"وشنوپران کی تاریخ تصنیف ۱۰۴۵ء (مطابق ۴۳۶ھ) سے شمار کرنی چاہیے اس پوران میں جیسا کہ اس کے نام سے مترشح ہے قدیم روایتیں قلمبند ہیں جو شیوا اور بودھ کے متوں کے ساتھ ساتھ چلی آتی تھیں اس پوران کے مسائل براہ راست وید سے نہیں لیے گئے بلکہ دو مشہور نظم رزمیہ کی داستان سے حاصل ہوئے ہیں یہ اٹھارہ پورانوں یعنی علم الٰہی کی سنسکرت کتابوں میں سے ایک ہی جس میں برہمنوں نے وشنو اور شیو کے مخالف مذہبوں کو یکجا جمع کیا ہے۔"

وشنوپران کے متعلق ہنٹر صاحب جیسے ہندو نواز مورخ کا بیان ذہن میں رکھ کر غور کرو کہ جے پال ۳۹۲ھ کے آخر یا ۳۹۳ھ کے شروع میں ہلاک ہوا اور اسی زمانہ میں وشنومت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ۴۲۱ھ میں سلطان محمود کا انتقال ہوا اور ۴۳۶ھ میں وشنومت کی سب سے پہلی کتاب وشنوپوران لکھی گئی یعنی وہ مذہب جس کی بنیاد ۳۹۳ھ میں رکھی گئی تھی پینتالیس سال کے بعد اس قابل ہوگیا کہ اس کے عقائد و احکام کو کتابی شکل میں مدون کیا جائے۔ وشنوپوران کی تصنیف کا حال لنگ پوران کی ادھیائے چولنشٹھ میں بیان ہوا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لنگ پوران کے اس ادھیا کو اس جگہ درج کردیا جائے۔

"رشی لوگوں نے سوت جی سے دریافت کیا کہ بششٹھ جی کے بیٹوں کو رکھشش نے کیوں کھالیا سوت جی نے جواب دیا کہ وشوامتر کی بد دعا سے رُدھر نام رکھشش نے کلماکھ پاد نام راجا کے جسم میں حلول کرکے

بششٹھ جی کے سو بیٹوں کو کھالیا۔ .... بششٹھ جی یہ خبر سنتے ہی غش کھاکر گر پڑے جب ہوش آیا تو اپنے خاندان کے تخم سوختہ ہونے کا تصور کرکے خودکشی پر آمادہ ہوگئے مگر اُن کے ایک بیٹے شکت نامی کی بیوی آدرشینتی نے آکر کہا کہ مہاراج آپ خودکشی نہ کریں میرے رحم میں ایک لڑکا ہے جو آپ کا پوتا ہے وہ سب کام درست کر دیگا۔ بششٹھ جی نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی اثناء میں شکت کی بیوی کے پیٹ میں بچے نے وید کی ایک رچا پڑھی۔ بششٹھ جی سوچنے لگے کہ یہ وید کی رچا کس نے پڑھی۔ اسی حالت میں آسمان پر وشنو بھگوان نے نمودار ہوکر بششٹھ جی سے کہا کہ اے برخوردار بششٹھ یہ رچا تیرے پوتے نے پڑھی ہے جو ہماری برابر طاقت والا ہوگا۔ یہ کہکر وشنو بھگوان غائب ہوگئے۔ دسویں مہینے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام پراشر رکھا گیا۔ پراشر نے ایک روز اپنی ماں سے کہا کہ میرا باپ کہاں ہے اُس کی ماں نے کہا تیرے باپ کو راکھشس نے کھالیا ہے۔ پراشر نے کہا کہ میں راکھشسوں کو ہلاک کرونگا اور تینوں لوک کو جلادونگا۔ بششٹھ جی نے کہا کہ بیٹا تم راکھشسوں کا ستیاناس کرنے کے لیے توجہ کرو مگر تینوں لوک نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔ دادا کا یہ کلام سُن کر پراشر سب سے رخصت ہوا اور تنہائی میں جاکر مٹی کا شیو لنگ بناکر وید منتروں کے ذریعہ شیوجی کا پوجن کرنے لگا پاربتی جی نے مہادیوجی سے پراشر کی سفارش کی چنانچہ مہادیوجی اور پاربتی جی دونوں پراشر کے سامنے آگئے اور پراشر کو غیر معمولی روحانی طاقت عطا کرکے غائب ہوگئے۔ اس کے بعد پراشر راکھشسوں کو جلانے لگا بششٹھ جی نے پوتے سے کہا کہ بیٹا تم اب غصہ کو تھوک دو راکھشس لوگوں پر رحم کرو وہ بے قصور ہیں یہ سُن کر پراشر جی نے راکھشسوں کو مارنا چھوڑ دیا۔ اسی اثناء میں پلست منی آئے بششٹھ جی نے ان کو بڑی عزت سے بٹھایا پلست منی نے پراشر جی سے کہا کہ بیٹا تم نے بششٹھ جی کے کہنے سے بڑی بھاری عداوت کو فراموش کردیا اور ہمارے بیٹوں یعنی راکھشسوں کو مارنا چھوڑ دیا لہٰذا ہم تم سے بہت ہی خوش ہیں اور ہم تم کو یہ کرامت عطا کرتے ہیں کہ تم کو پوران تصنیف کرنے کی قوت حاصل ہوگی اور دیوتا تم سے بہت خوش ہوں گے اور تمھاری عقل بالکل صاف اور روشن ہوجائیگی۔ یہ سُن کر بششٹھ جی نے بھی کہا کہ اے پراشر جیسا پلست جی نے فرمایا ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ پراشر جی نے بششٹھ جی اور پلست جی کی مہربانی اور امداد پاکر وشنو پوران تصنیف کیا جو ہر قسم کی طاقت عطا کرنے والا ہے اور وید کے ارتھ سمیت چوتھا پوران شمار کیا گیا ہے۔ اُس میں چھ ہزار اشلوک ہیں۔ ہم نے شکت کے بیٹے پراشر کا حال سُنادیا۔ اب تم کیا سُننا چاہتے ہو بتاؤ۔ ختم شد ادھیائے چونسٹھ (لنگ پوران)

لنگ پوران کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس سے کوئی تاریخی سند لی جاسکے۔ لنگ پوران کے مذکورہ ترجمہ اور اقتباس سے صرف یہ مدعا ہے کہ وشنو پوران کی تصنیف کا سبب جو لنگ پوران نے

بیان کیا ہے اُس سے نہایت صاف اور نمایاں طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دو مخالف و معاند گروہوں میں صلح قائم ہونے کی تقریب ویشنو پران کی تصنیف کا سبب ہے بششٹھ جی اور پلست جی دو مذہبی پیشوا ہیں جن میں ایک رکھششوں کا بزرگ ہے اور دوسرا رشیوں کا۔ ممکن ہے کہ بششٹھ جی برہمنی مذہب کے پنڈت ہوں اور پلست جی بودھ مذہب کے یا اس کے برعکس ہوں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو راکھشش کے نام سے یاد کرتا ہوگا۔ لیکن اب حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے کہ دونوں مذہبوں کے پنڈتوں نے آپس کی عداوتوں کو فراموش کر دیا اور ایسا مذہب اختیار کیا جس میں دونوں متفق و متحد ہو گئے۔

ویشنومت کی خصوصیت اور سب سے زیادہ قابل تذکرہ بات یہ تھی کہ اُس میں انسان کو خودکشی کرنے اور اپنی جان کو قربان کر دینے کی ترغیب دی جاتی تھی اور جو لوگ مرنے سے ڈرتے تھے اُن کی تحقیر کی گئی تھی جو دلیل اس بات کی ہے کہ جے پال کی خودکشی کے بعد ہی یہ مذہب ایجاد ہوا تھا جو درحقیقت ایک سیاسی تحریک تھی اور بودھ و برہمنی مذہب کے سنگھٹن سے پیدا ہوئی تھی جس کا مقصد اصلی یہ تھا کہ تمام ملک کو لڑنے اور سلطنت غزنی کے برباد کرنے پر آمادہ کر دیا جائے۔ بعد میں جب حالات تبدیل ہو گئے اور اس تحریک کا منشائے اصلی حاصل ہونے سے مایوسی ہو گئی تو اس مذہب کی شکل بہت کچھ تبدیل ہو گئی مگر وہ ایک مستقل مذہبی فرقہ کی حیثیت سے ہندوستان میں باقی رہا۔ اس مذہب کے عقیدۂ خودکشی کے متعلق ہنٹر صاحب کہتے ہیں کہ

" وہ روایتیں جو جگن ناتھ کی رتھ جاترا سے عموماً منسوب کی جاتی ہیں کہ پرستار خود اپنے تئیں ہلاک کرتے ہیں محض بے بنیاد ہیں "

ہنٹر صاحب کے ان الفاظ سے کم از کم یہ تو ثابت ہے کہ اس مذہب کے متعلق اپنے آپ کو خود ہلاک کرنے کی روایتیں ضرور موجود ہیں گو آج کل وہ عملدرآمد میں نہ ہوں۔ لیکن جگناتھ جی کی رتھ جاترا کے چشم دید حالات جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے زمانہ میں انگریز سیاحوں نے قلمبند کیے ہیں وہ ہنٹر صاحب کے بیان کی تردید کرتے ہیں اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جگناتھ جی کی سواری کے رتھ کے نیچے اپنے آپ کو کچلوا کر ہلاک کرنا موکش حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور یہ رسم ماضی قریب تک جاری تھی اور انگریزوں کے صوبہ اڑیسہ پر قابض ہونے کے بعد تک بھی لوگ اپنے آپ کو خود ہلاک کرتے تھے۔ اور میں نے خود سیاحوں کی وہ تفصیلی رپورٹیں پڑھی ہیں جن میں پرستاروں کے اس طرح خود ہلاک ہونے کی نہایت مفصل کیفیت درج تھی۔ افسوس کہ اس وقت وہ رسالے

باوجود تلاش دستیاب نہ ہو سکے۔

ریاست ملتان اور ریاست بھاطیہ پر محمودی حملے

انندپال نے ایک طرف تو جے پال کا تسلیم کردہ خراج روانہ کرتے رہنے سے محمود کو مطمئن رکھا اور دوسری طرف باپ کی بے عزتی کا انتقام لینے کی آرزو میں ہندوستان کے دوسرے راجاؤں برہمنوں اور پنڈتوں سے خواہاں امداد و اعانت رہا۔ ملتان کی ریاست کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ شیخ حمید لودی ملتان نے امیر سبکتگین کو اپنی دوستی و ہمدردی کا یقین دلا کر اطمینان حاصل کیا تھا وہ سبکتگین کی وجہ سے اپنے قرمطی ہونے کو چھپاتا تھا تاہم ملتان میں قرامطہ کو پناہ ملتی رہتی تھی۔ محمود جو قرامطہ کا دشمن اور اُن کو بدمعاشوں اور نارستوں کی جماعت یقین کرتا تھا جب سیستان سے اُن کو خارج کر چکا تو اُس کے پاس اطلاع پہنچی کہ قرامطہ نے بحرین سے ایک مہم بذریعہ جہازات بندرگاہ دیبل اور ٹھٹھہ میں بھیجی ہے۔ ان قرامطہ نے سندھ میں وارد ہو کر سندھ کے راجاؤں سے محمود کے خلاف معاہدے اور ہر قسم کی امداد پہنچانے کے وعدے کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انندپال کی حمایت پر اس طرف کے تمام راجہ آمادہ ہو گئے اور حمید خان لودی کا پوتا یا نواسا داؤد بن نصر والی ملتان بھی قرامطہ اور انندپال کے معاہدوں میں شریک ہو کر قرامطہ کے لیے ملجا و ماوا بن گیا۔ ملتان کی ریاست امیر سبکتگین کے زمانہ سے سلطنت غزنی کی مطیع سمجھی جاتی تھی ملتان کی ریاست کے متصل کوئی ہندو ریاست تھی اس کا نام بھاطیہ۔ بھٹنیر۔ بھٹنڈا۔ دہند۔ بھیرہ وغیرہ بتایا جاتا ہے جس طرح اس ریاست کا نام ہر مورخ جدا جدا بیان کرتا ہے اسی طرح اس کے محل وقوع میں بھی اختلاف ہے۔ کوئی اس ریاست کو پٹ ورکے شمال میں بتاتا ہے کوئی اس کو ٹھٹھہ یا کراچی کا دوسرا نام سمجھتا ہے کسی نے اس کو موجودہ ریاست پٹیالہ کا مقام بھٹنڈا سمجھا ہے کوئی اس کو متھرا اور قنوج کے قریب بیان کرتا اور کوئی اس کو راجپوتانہ میں جگہ دیتا ہے۔ غالباً نام کے اختلاف نے محل وقوع میں بھی اختلاف پیدا کر دیا ہے مگر واقعات کی تفصیل سے کم از کم اس قدر ثابت ہے کہ اس ریاست کی حدود ریاست ملتان کی حدود سے ملتی تھیں اور غالباً اس کا محل وقوع ملتان سے جنوب و مغرب اور دریائے سندھ و بلوچستان و ریاست مکران کے درمیان تھا۔ ایک قرینہ یہ بھی موجود ہے کہ یہ ریاست ملتان کے جنوب اور دریائے سندھ کے مشرقی جانب تھی۔ یہ ریاست یقیناً ریاست منصورہ کی بربادی کے بعد قائم ہوئی تھی۔ اس ریاست کے فرمانروا کا نام بجے رائے تھا۔ ۳۹۵ھ میں محمود کو معلوم ہوا کہ بجے رائے کی ریاست میں قرامطہ کا اجتماع ہو رہا ہے۔ محمود کے بارہ یا سترہ حملوں کی شہرت نے ہندوستانیوں کو محمود کے دوسرے حالات اور واقعات سے بالکل غافل و بے خبر رکھا ہے اور اسی لیے وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ محمود اپنا سب سے بڑا دشمن قرامطہ ہی کو سمجھتا اور اپنی تمام ہمت اسی گروہ کے استیصال میں صرف

کرنا چاہتا تھا- قرامطہ اس سے پہلے سنہ ... اسود کو خانہ کعبہ سے اکھیڑ کر ... سے آئے تھے اُنھوں نے ہزارہا بلکہ لاکھوں حاجیوں کو قتل کیا تھا۔ اُنھوں نے خلافت بغداد کی بڑی بے عزتی کی تھی اور بڑی بڑی تباہیوں اور نالائقیوں کے مرتکب ہوئے تھے- قرامطہ کے استیصال میں کوشاں رہکر محمود اپنے آپ کو خلیفۂ بغداد کی نگاہ میں بھی محبوب بنا سکتا تھا جس کی اس کو بڑی آرزو تھی- نیز اُس کو اپنی سلطنت و حکومت کے محفوظ رکھنے کے لیے بھی قرامطہ کے استیصال کرنے کی سخت ضرورت تھی- قرامطہ کے لیے سندھ و بلوچستان اور سلسلہ کوہ سلیمان کے رہنے والے قبائل میں اثر و نفوذ کی سب سے زیادہ گنجایش تھی آج تک بھی اس کے اثرات و شواہد موجود ہیں سلسلہ کوہ سلیمان کے قبائل میں بکثرت ایسے قبائل اب بھی موجود ہیں جو قرامطہ کے اعمال و عقائد کا بہت سا حصّہ اپنے اندر موجود رکھتے ہیں- اسی مذکورہ علاقہ میں ایک ... لوگوں کی اب بھی آباد ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خدا سے بڑا یا خدا کی برابر ہی مانتے اور کسی رسول کی کوئی تکریم ضروری نہیں جانتے ہیں- نماز روزہ سے بالکل نابلد اور ارکان اسلام کی بجا آوری سے قطعاً بے تعلق ہیں یہ تمام لوگ اُسی زمانہ کی یادگار اور قرامطہ کی باقیات طالحات ہیں- غلطی سے لوگ اُن کو شیعہ سمجھتے ہیں حالانکہ شیعہ حضرات ان کے نام سے بیزار اور اُن کی صورت پر لعنت بھیجتے ہیں میں نے خود ایک شیعہ عالم کو ان بلوچی اور سرحدی لوگوں کی نسبت جن کو عام لوگ شیعہ خیال کرتے ہیں نہایت بُرائی اور بیزاری کے کلمات کہتے ہوئے سُنا ہے- محمود کو قرامطہ سے کس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ ۴۰۳ھ میں فرمانروائے مصر کی جانب سے جو قرامطہ کو مشرق میں خلیفۂ بغداد کے خلاف اپنا آلہ کار بنانے میں مصروف تھا ایک سفیر دوستی و محبت کا پیغام لیکر محمود کے پاس غزنی میں آیا- محمود کا فرض تھا کہ وہ اُس سفارت کا عزت کے ساتھ استقبال کرے اور مصر کی طاقتور عبیدی سلطنت کے اس سفیر کو اپنا مہمان عزیز سمجھے مگر چونکہ یہ سفیر قرمطی عقیدے کا آدمی تھا لہذا محمود نے حکم دیا کہ سفیر کو نہایت ذلت کے ساتھ شہر میں تشہیر کرکے نکال دیا جائے اور زیر حراست رکھکر حدود سلطنت سے باہر کیا جائے- غرض ۳۹۵ھ میں محمود نے بجے رائے کے پاس پیغام بھیجا کہ تم ہمارے دشمنوں یعنی قرامطہ کو اپنے یہاں جگہ نہ دو ورنہ ہمارے تمہارے درمیان حالتِ جنگ قائم ہوجائے گی- بجے رائے نے اس پیغام کا جواب سختی کے ساتھ انکار میں دیا- محمود فوراً بجے رائے کی ریاست پر حملہ آور ہوا بجے رائے نے جو پہلے سے آمادہ تھا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا تین دن تک برابر لڑائی ہوتی رہی آخر راجہ میدان چھوڑ کر محمود کے مقابلہ سے بھاگا اور بھاگتے ہوئے محمودی بہادروں کے ہاتھ میں گرفتار ہوجانے کے بعد خودکشی کرکے مرگیا- اُس کی فوج میں جس قدر قرامطہ تھے اُن میں سے کچھ تو مارے گئے جو باقی بچے وہ فرار ہوکر ملتان پہنچے- بجے رائے

کو شاید کوئی شخص قومی شہید اور سخی کریم سمجھے لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ایک ہندو ہی کے الفاظ نقل کر دیے جائیں جو اس نے بجے رائے کی نسبت استعمال کیے ہیں۔ سجان رائے اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ میں لکھتا ہے

"سلطان در ستانی قلعہ جہد راجہ بجے رائے بسیار و بجہد کثرت لشکر دلیران کوہ پیکر بدست آمد قلعہ و صعوبت جائے از روئے بے ہمتی و بے تدبیری آنکہ خود را بمقابلہ سلطان نگذاشتہ بجانب سندھ روان شد لشکریان سلطان باستماع ایں خبر تعاقب کردہ او را دستگیر نمودہ را جۂ بے حمیت از خوارے گلو گرفتہ خنجر آسا بر خاک ہلاک انداخت۔"

فرشتہ نے اس لڑائی کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور وہ بجے رائے کو بے حمیت کا خطاب نہیں دیتا بلکہ اس کی بہادری و شجاعت کا اقرار کرتا اور بعد گرفتاری اپنے ہاتھ سے اپنے سینے میں خنجر مار کر ہلاک ہونا بیان کرتا ہے۔ محمود غزنوی کو اس لڑائی کے بعد معلوم ہوا کہ تمام قرامطہ ملتان میں جا جا کر فراہم ہوئے ہیں ملتان کا حاکم داؤد بن نصر اب تک اپنے آپ کو محمود کا مطیع و منقاد ظاہر کرتا رہا تھا۔ لیکن اب محمود کو معلوم ہوا کہ داؤد ملحدی مذہب ہو گیا ہے اور اس نے اب تک ہم کو دھوکے ہی میں رکھا۔ بجے رائے کی شکست و ہلاکت کے بعد ملتان پر حملہ کرنا اور داؤد کو سزا دینا بہت آسان تھا مگر چونکہ محمود کو قرامطہ کا استیصال منظور تھا لہذا وہ ملتان پر اس طرح اچانک پہونچنا چاہتا تھا کہ قرامطہ بچ کر نہ نکل سکیں۔ پس وہ ملتان اور اس کے حاکم داؤد کی طرف متوجہ ہوئے بغیر سیدھا غزنی کو واپس چلا گیا اور اگلے سال ۳۹۶ھ میں ملتان پر اس طرح حملہ کرنا چاہا کہ داؤد بن نصر یا قرامطہ کو پہلے سے اس حملہ کی مطلق اطلاع نہ ہو سکے۔ اس جگہ یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ پشاور سے محمود جس وقت جیپال کو گرفتار کر کے غزنی لے گیا تھا تو جیپال کے ساتھ پندرہ سردار اور بھی گرفتار ہوئے تھے ان میں ایک جیپال کا نواسہ سکھپال بھی تھا جس وقت محمود نے جیپال کو غزنی سے رخصت کیا تو سکھپال نے محمود کے ایک سردار ابو علی سیمجوری کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے غزنی ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ اس نو مسلم سکھپال کو مورخین نے عام طور پر نواسہ شاہ کے نام سے یاد کیا ہے یہ نام اس کا غالباً اسلام قبول کرنے کے بعد مشہور ہوا ہوگا۔ بجے رائے کی مذکورہ مہم میں سکھپال یا نواسہ شاہ محمود کے ہمراہ تھا محمود نے سکھپال کو بجے رائے کی ریاست کا فرمانروا بنا کر غزنی کی طرف مراجعت کی۔ محمود درۂ گومل کی راہ سے آیا اور اسی راستہ سے واپس گیا تھا غزنی پہونچکر اس نے ملتان پر حملہ کرنے کے لئے درۂ خیبر کی راہ اختیار کی جس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ برسات کی وجہ سے دریائے سندھ کو جنوبی گھاٹوں سے عبور کرنا دشوار تھا۔ سجان رائے نے اس طویل اور پیچیدہ راہ اختیار کرنے کی وجہ وہی لکھی ہے جو اوپر ذکر ہو چکی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

سُلطان رعیت دین براں داشت تا کہ براہ ملتان متوجہ شدہ آں ملک را از داؤد بن نصر انتزاع نماید دریں صورت بعزیمت ملتان راہ راست از دست دادہ براہ مخالفت بنا بر آنکہ حاکم آنجا خبردار نشود و ناگہاں بر سر او برسد سواری کرد راجہ انند پال بن راجہ جیپال کہ بر سر راہ بود در مقام مخالفت شد"

فرشتہ نے بھی زین الاخبار کے حوالے سے یہی وجہ بیان کی ہے جو سجان رائے نے لکھی ہے۔ چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے کہ

"دراں زماں کہ لشکر اسلام بمحاصرۂ بلدۂ بھاطنہ اشتغال داشت از داؤد بن نصر ادا ہائے خارج از عقل سرزدہ مصدر اعمال ناشائستہ شد سلطان محمود دراں سال بنا بر صلاح وقت اغماض عین نمودہ ہیچ نگفت در سال دیگر عازم انتقام گردیدہ بروایت زین الاخبار از ملاحظہ آنکہ او واقف نشود براہ مخالف رواں شد و انند پال بن جیپال کہ بر سر راہ بود در مقام ممانعت شد و شکست خوردہ جانب کشمیر گریخت"

غرض کوئی بھی وجہ ہو محمود نے درۂ خیبر کی راہ سے پنجاب میں ہو کر یعنی انند پال کے علاقہ میں سے گذر کر ملتان پر حملہ کرنا چاہا۔ انند پال محمود غزنوی کا باجگذار تھا لہذا محمود پنجاب کے علاقے کو اپنے ایک ماتحت اور باجگذار دوست کا ملک سمجھ کر گذرنا چاہتا تھا اُس کی یہ خواہش ضرورۃً بالبداہۃً تھی۔ اُس کو اس امر کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ انند پال میرا مقابلہ کریگا مگر خلاف توقع انند پال نے اُس کو دریائے سندھ کے کنارے روکا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ محمود اور سلطنت غزنی کے خلاف ہندوستان میں ایک عام تحریک شروع ہو چکی تھی اور ملک کے ہر حصہ میں مذہبی پیشواؤں کے زیر اہتمام تبلیغی کام زور شور سے جاری تھا۔ قرامطہ ہندوؤں کی ہمدردی حاصل کر چکے تھے اُنھوں نے مصلحت وقت سمجھ کر حضرت علی کو وشنو کا دسواں اوتار بتا کر اپنے آپ کو اس سنگٹھن میں شامل کر لیا تھا۔ انہی قرامطہ کو جب مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کو شامل کرنے کی ضرورت شام و ایشیائے کوچک میں پیش آئی تو اُنھوں نے حضرت علیؓ کو فارقلیط کا مظہر بیان کیا۔ ٹی ڈبلیو ارنلڈ اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں اُن لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ لوگ جب ہندوستان میں اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے آئے تو اُنھوں نے اُس کی صورت ایسی بنا دی کہ ہندو اُس کو فوراً تسلیم کر لیں حضرت علی کو وشنو کا دسواں اوتار بتایا جو مشرق سے آئیگا اور ایک ہندی پوران لکھا اور دوا جاریوں کے انداز پر بھجن لکھے جن میں نماز اور روزوں کی باتیں اس انداز سے بیان کیں کہ ہندوؤں کو ان کا مسلک اختیار کرنے کی ترغیب ہوئی"

دوسری جگہ اسی مصنف نے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے وشنو کے باقی نو اوتاروں کی صداقت کو تسلیم کر لیا تھا

ہندوستان میں ان دونوں مذہبی عقائد کی جو نازک حالت تھی اُس کا اندازہ گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ نئے نئے فرقے بن رہے تھے۔ نئی نئی قومیں تیار ہو گئی تھیں نئی نئی تحریکیں جاری تھیں۔ اسی طوفان بے تمیزی میں قرامطہ بھی آکر شامل ہو گئے جو مذہبی رنگ میں بھی ہندوؤں کے دوست بن سکے اور سیاسی اعتبار سے بھی وہ ہندوؤں سے متحد ہو کر رہ سکتے تھے کیونکہ ہندوستان والوں کو محمود سے جو عداوت تھی اُس سے بڑھ کر قرامطہ اُس کے دشمن تھے۔ انند پال شاید ابھی محمود سے لڑنے کو تیار نہ تھا لیکن جب محمود نے اُس کو اطلاع دی کہ ہم تمہارے علاقے میں سفر کرتے ہوئے گزر جائیں گے ہمارا مقصود سفر ملتان پر حملہ آور ہونا ہے تو انند پال نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ داؤد بن نصر کو جو انند پال کا حلیف اور قرمطی مسلک اختیار کر کے دائرہ اسلام سے خارج ہو چکا تھا اس طرح ہلاک ہونے اور اپنے سنگھٹن کو نقصان پہنچنے سے بچائے۔ اس نے فوراً دریائے سندھ کے کنارے محمود کو روکنے کے لیے فوج روانہ کی اُدھر داؤد بن نصر کو آنے والے خطرے سے اطلاع دی اور خود بھی پشاور کی طرف روانہ ہوا۔ محمود کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جس طرح حاکم ملتان اُس کا باجگزار تھا اسی طرح انند پال بھی اُس کا خراج گزار تھا۔ اُس نے مجبوراً انند پال کی فوج کا مقابلہ کیا۔ یہ خلاف توقع لڑائی محمود کو سخت ناگوار و ناپسند تھی وہ انند پال سے ہرگز لڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ غزنی سے ملتان کا ارادہ کر کے روانہ ہوا تھا۔ انند پال کی فوجیں محمود کو دریائے سندھ پر نہ روک سکیں اور شکست کھا کر بھاگ گئیں۔ انند پال بھی جلد مقابلے پر پہنچ گیا اور فراریوں کو سمیٹ کر خود حملہ آور ہوا اُس کی قسمت میں بھی شکست ہی لکھی تھی چنانچہ بھاگا اور لاہور آکر دم لیا۔ محمود نے دوآبہ سندساگر کو طے کر کے دریائے جہلم کو عبور کیا اور دوآبہ چج کو بھی بلا روک ٹوک طے کر کے دریائے چناب پر آ پہنچا۔ یہ سن کر کہ محمود نے دریائے چناب کو عبور کر لیا ہے انند پال لاہور چھوڑ کر کشمیر کی طرف بھاگا۔ کیونکہ اس سراسیمگی اور عجلت میں وہ نہ دوسرے راجاؤں سے امداد طلب کر سکا نہ محمود کے مقابل ٹھہر سکا۔ محمود یہ سن کر کہ انند پال لاہور چھوڑ کر کشمیر کی طرف روانہ ہو گیا ہے اس کے دار السلطنت لاہور میں نہیں آیا بلکہ انند پال کے تعاقب میں خود بھی دریائے چناب کے کنارے کنارے کشمیر کی طرف روانہ ہوا یہ سن کر کہ انند پال پہاڑوں کے دروں میں داخل ہو گیا ہے محمود واپس ہو کر سیدھا ملتان کی جانب روانہ ہوا کیونکہ یہی اس کا مقصود سفر تھا۔ اگر محمود کو لوٹ مار کرنے، ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے اور مندروں کے ڈھانے کا شوق ہوتا تو وہ لاہور کو لوٹے بغیر ہرگز نہ چھوڑتا۔ پنجاب کا تمام ملک اس کے لیے بلا کسی مزاحمت کرنے والے حاکم کے بے خرخشہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اس سرسبز و شاداب ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے یہاں اپنی فوج اور اپنا نائب مقرر کر سکتا تھا۔ وہ ملتان کی مہم کو ملتوی کر کے پنجاب ہی کے بندوبست میں مصروف ہو جاتا

اور ایک ریگستانی ریاست پر حملہ کرنے کو زیادہ ضروری نہ سمجھتا مگر اس نے نہ پنجاب کو لوٹا۔ نہ یہاں کے لوگوں کو مسلمان بنایا نہ یہاں کے مندروں کو ڈھایا نہ اور کسی قسم کا نقصان پہونچایا بلکہ سیدھا ملتان کی طرف روانہ ہوگیا جو دلیل اس بات کی ہے کہ وہ قرامطہ کے امن سوز اور فساد انگیز گروہ کو سزا دینا اور انکی بیخ کنی کرنا سب سے زیادہ ضروری کام سمجھتا تھا۔ داؤد بن نصر کو انندپال کے ذریعہ پہلے ہی اطلاع ہو چکی تھی اور وہ بھی فوجیں انندپال کی مدد کے لیے روانہ کرنے والا تھا کہ انندپال کے شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگنے کی خبر پہونچی اس خبر سے داؤد کی ہمت پست ہوگئی اور وہ اپنا خزانہ اور قیمتی اسباب اونٹوں پر لاد کر دکن کی جانب فرار ہونے کی تیاری کرنے لگا وہ ابھی سامان سفر ہی میں مصروف تھا کہ آندھی اور بگولے کی طرح محمودی افواج ملتان کے سامنے نمودار ہوئی۔ داؤد نے محصور ہوکر مقابلہ کی تیاری کی تاریخ فرشتہ اور تاریخ نظامی دونوں نے لکھا ہے کہ محمود نے دریائے چناب کے کنارے پہونچ کر انندپال کے کشمیر کی جانب بھاگ جانے کا حال سن کر اس کا تعاقب نہیں کیا بلکہ ملتان ہی کی جانب روانہ ہوگیا۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"انندپال ہراساں شدہ بکوہ ہائے کشمیر گریخت و سلطان در پالسش نہ کردہ براہ تہندہ جانب ملتان کہ غرض اصلی او ازاں یورش تسخیر آں بود رواں شد"

اسی کے قریب نظام الدین احمد ہروی کے الفاظ ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمود نے انندپال کی اس گستاخی کی سزا دینی اس قدر ضروری نہیں سمجھی جس قدر کہ وہ داؤد بن نصر کو سزا دینا ضروری سمجھتا تھا اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ محمود ہندوؤں کا زیادہ دشمن تھا یا قرامطہ کا۔ محمود نے ملتان کا محاصرہ کر لیا سات روز تک محاصرہ جاری رہا آخر محمود کی خدمت میں داؤد نے عاجزانہ التجا کی کہ میں مذہب قرامطہ سے توبہ کرتا اور سچے دل سے مسلمان ہوتا ہوں۔ ساتھ ہی اس بات کا اقرار کیا کہ آئندہ قرامطہ سے کوئی تعلق نہ رکھونگا اور بیس ہزار درہم سالانہ خراج دار السلطنت غزنی کو روانہ کرتا رہونگا۔ محمود کے ملتان کی جانب آنے کا حال سن کر ۳۹۶ھ میں ایلک خاں حاکم ماوراء النہر نے اپنے سپہ سالار سیاوش تگین کو فوج دے کر خراسان پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دیا اور دوسرے سردار جعفر تگین (جعفر تگین) کو بلخ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا تھا جعفر تگین نے بلخ پر قبضہ کر لیا اور سیاوش تگین نے خراسان میں لوٹ مار مچادی یہ حال دیکھ کر اور تاب مقابلہ نہ لاکر محمود کے عامل ارسلان جاذب نے جو ہرات میں مقیم تھا ایک تیز رفتار قاصد ملتان کی جانب محمود کے پاس روانہ کیا اور ہرات میں تاب اقامت نہ لاکر غزنی کی جانب چلا آیا۔ ارسلان جاذب کا یہ قاصد محمود کے پاس اُس وقت پہونچا جبکہ وہ ملتان کے محاصرہ میں مصروف تھا۔ لہذا محمود نے داؤد کی توبہ کو غنیمت سمجھ کر اُس کی التجا قبول کر لی اور سکھ پال (نواسہ شاہ) کو جو ریاست ملتان کی متصلہ ریاست کی

حکومت پر مامور تھا داؤد بن نصر کے [illegible] تھا ملتان پر قبضہ کرکے اور داؤد سے سکھ پال کے احکام کی تعمیل کا اقرار لے کر بیٹے سکھ پال کو اپنا قائم مقام بنا کر غزنی کی جانب روانہ ہوگیا - واپسی میں کوہ سلیمان کے کسی جنوبی درے سے گذرا اور انند پال کے ملک کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوا - غزنی پہونچکر اور ارسلان جاذب سے تمام حالات سنکر ایک زبردست لشکر مرتب کیا اور اُن ہاتھیوں کو بھی ہمراہ لیا جو اُس نے ہے پال کی جنگ میں بطور مال غنیمت حاصل کیے تھے - ایلک خاں نے چین کے حاکم قدر خاں کو بھی اپنا شریک کار بنا لیا تھا اور خود مع قدر خاں کے ایک جرار اور بے شمار فوج لے کر بلخ کے قریب پہونچ گیا تھا - محمود نے ارسلان جاذب کو ایک حصہ فوج دے کر سیاوش تگین کے مقابل خراسان کی جانب بھیجا اور خود بلخ کی طرف متوجہ ہوا - ایلک خاں اور قدر خاں نے سخت مقابلہ کے بعد شکست کھائی اور محمود نے دریائے جیحون کے کنارے تک اُن کا تعاقب کیا - اس لڑائی میں ہاتھی بہت کار آمد ثابت ہوئے اور اُسی روز سے محمود ہاتھیوں کو جنگ کے لیے نہایت ضروری چیز سمجھنے لگا - سیاوش تگین کو بھی ارسلان جاذب نے خراسان سے بھگا دیا محمود اس مہم میں ایک سال سے زیادہ مصروف رہا اور ماہ ربیع الاول ۳۹۸ھ میں غزنی واپس آیا یہاں پہونچکر سُنا کہ سکھ پال جس کو وہ ہندوستان میں اپنا قائم مقام اور ریاست ملتان کا نگران مقرر کر آیا تھا اپنے ماموں انند پال کی ترغیب و سازش سے مرتد ہوکر باغی ہوگیا ہے اور بجائے اُس کے کہ داؤد بن نصر کے پاس قرامطہ کو جمع نہ ہونے دے اور اُس کے اوضاع و اطوار کا نگراں رہے خود قرامطہ کو اپنے گرد فراہم کر رہا ہے یہ سُنتے ہی وہ غزنی سے روانہ ہوکر سکھ پال کے سر پر اس طرح یکایک پہونچا کہ وہ کچھ بھی ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکا چنانچہ اُس کو گرفتار کرکے غزنی لے گیا اور وہاں نظر بند کر دیا -

ہندوؤں کا سلطنت غزنی پر چوتھا حملہ

انند پال جو پہلے سلطان محمود کا خراجگذار اور حملۂ ملتان کے وقت سے باغی ہوکر علانیہ برسرِ مخالفت تھا مستحقِ سزا ٹھہر چکا تھا لیکن چونکہ محمود کو ترکستان، خراسان اور آذربائیجان کی طرف سے خطرات درپیش تھے اور وہ انند پال کے مقابلہ میں شمالی و مغربی حریفوں کو زیادہ سخت اور اہم سمجھتا تھا لہذا اُس نے انند پال کے متعلق جو اس سے پہلے قرار کی عادہ گوارا کر چکا تھا چشم پوشی و درگذر ہی مناسب سمجھی مگر ہندوستان میں مذہبی پیشواؤں اور پنڈتوں نے جو تحریک شروع کی تھی وہ محمود کی مذکورہ لڑائیوں کے سبب اس طرح مشتعل اور ترقی پذیر رہی جیسے آگ ہوا کے جھونکوں سے مشتعل ہوا کرتی ہے - انند پال اپنی گذشتہ گستاخیوں اور سرکشیوں کی وجہ سے بخوبی جانتا تھا کہ محمود غزنوی ضرور مجھ سے انتقام لینے کے لیے پنجاب پر حملہ آور ہوگا - اُسکے پاس متھرا قنوج اور سندھ و گجرات کی طرف سے برابر ہمت افزا خبریں پہونچ رہی تھیں چنانچہ اُس نے اب زیادہ تامل مناسب

نہ سمجھ کر ہندوستان بھر کے تمام راجاؤں کے پاس قاصد اور سفیر بھیجے اور کہلوایا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب اپنے ملک کی حفاظت اور محمود غزنوی کی ہلاکت کے لیے متفقہ طور پر میدان میں نکل آئیں اور اس امر اہم کو اختتام تک پہنچائیں چنانچہ ان خطوط اور سفیروں کو ہر جگہ بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ کوہ پایہ [illegible] تھانیسر یا تھانیسر نام ایک شہر تھا۔ وہاں کا راجہ ندر بھیم اور بروایت [illegible] نروجیپال نامی تھا جو انندپال کا باجگزار اور ہوا خواہ تھا اُس نے سب سے پہلے اپنی فوج انندپال کے پاس بھیجی۔ ملک گجرات کا دار السلطنت انہلواڑہ تھا وہاں کے راجہ کا نام پرم دیو تھا اُس نے بھی ایک زبردست فوج لاہور کی جانب روانہ کر دی۔ [illegible] کے راجہ کا نام بھی پرم دیو تھا اُس نے بھی فوج بھیج دی۔ دہرہ دون کے راجہ رام دیو۔ سونی پت کے راجہ دیپال ہری۔ برن کے راجہ ہردت اور مہابن و متھرا کے راجہ کلچند رے نے بھی اپنی اپنی فوجیں اور خزانہ انندپال کے پاس روانہ کیا۔ استونی (ضلع فتحپور) کا راجہ چندیل بھور مقام شرواہ (بندیلکھنڈ) کا راجہ چندر رائے۔ سرسوا گڑھ کا راجہ بھیم پال بھی اپنی اپنی فوجوں اور خزانوں کے ساتھ انندپال کی امداد کے لیے مستعد ہو گئے۔ قنوج کے راجہ کنور رائے اور کالنجر کے راجہ نندا نے بھی زبردست اور باساز و سامان فوجیں روانہ کیں۔ سجان رائے نے قنوج کے راجہ کنور رائے کا نام اپنی تاریخ میں کورہ لکھا ہے جو غالباً کنور رائے کی تصغیر ہے۔ اسی طرح اجین۔ گوالیار۔ اجمیر۔ دہلی۔ تھانیسر۔ نگرکوٹ۔ اور کشمیر کے راجاؤں نے بھی اپنی اپنی فوجیں لاہور کی طرف روانہ کر دیں۔ مالوہ کے راجہ منج اور میرٹھ کے راجا دھرم دت نے بھی امدادی روپیہ اور فوجیں روانہ کیں۔ ان بیس پچیس راجاؤں کے نام جو اوپر درج ہوئے مختلف تاریخوں سے نقل کیے گئے ہیں کسی تاریخ میں چند راجاؤں کے نام ہیں اور چند کے نہیں دوسری تاریخ میں دوسرے چند راجاؤں کے نام ہیں اور ان میں سے بعض کے نہیں۔ ہر ایک مورخ تھوڑے سے نام لکھتا اور آخر میں یہ ضرور کہتا ہے کہ ہندوستان کے تمام راجا شریک تھے۔ جو جو نام تاریخوں میں بیان ہو گئے ہیں میں نے وہ سب اوپر درج کر دیے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور راجہ ضرور شریک ہونگے اور یہ تعداد صرف بیس پچیس ہی تک محدود نہ ہو گی۔ تاہم اگر انھیں پر حصر کر لیا جائے تو گجرات سے بہار تک اور کشمیر سے قنوج تک کے تمام راجہ ضرور شامل ہیں اس قدر راجاؤں کا ایک آواز پر متفقہ لبیک کہنا۔ فوج اور روپیہ روانہ کرنا اور بعض بعض کا خود بھی فوج کے ساتھ روانہ ہو کر لاہور پہنچنا اور انندپال کی سپہ سالاری میں داد شجاعت دینا کوئی اتفاقی اور فوری واقعہ نہیں ہو سکتا۔ اُس زمانے میں نہ ریل و تار برقی تھی نہ ڈاک کا انتظام تھا نہ اخبارات تھے۔ اس کام کو سرانجام دینے اور تمام براعظم ہند کو جنگ پر آمادہ کر دینے کے لیے ضرور کافی وقت اور زبردست کوشش صرف کرنی پڑی ہوگی سلطنتوں اور بادشاہوں کی رقابتیں ہر زمانے اور ہر ملک و قوم میں یقیناً رہی ہیں۔ غزنی کی سلطنت پر حملہ کرنے اور محمود غزنوی کو نیچا دکھانے کے لیے ان تمام رقابتوں کا فراموش ہو جانا اور کالنجر و بندیلکھنڈ اور گجرات تک کی

نوجوان کا متحد ہو کر پشاور کے میدان میں پہنچنا ہرگز ہرگز معمولی واقعہ اور ایک اتفاقی حادثہ قرار نہیں دیا جا سکتا اس سے پیشتر جیپال اس سنگٹھن کی بنیاد رکھ چکا تھا اس کے بعد وہ خودکشی کر کے قومی شہید کا مرتبہ بھی حاصل کر چکا تھا جس سے ہندوستان بھر میں ایک انقلاب پیدا ہوا اور مذہبی واعظوں نے سیاسی خدمات انجام دینے کے لیے اپنے مذہبی جھگڑوں کو اتحاد و اتفاق کے سانچے میں ڈھال کر تمام ہندوستان کو اپنے دیا لکھیا و اور دھواں دھار تقریروں سے مشتعل بنا دیا تھا یہ کام کسی ایک یا چند راجاؤں کے بس کا نہ تھا۔ ہندوستان اور تمام ایشیائی ملکوں میں اس قسم کے کام ہمیشہ مذہبی پیشواؤں ہی نے انجام دیے ہیں۔ گوتم بدھ نے منو کے قوانین اور قدیم برہمنی مذہب کی حکومت کو پارہ پارہ کر کے اس کی دھجیاں ہوا میں اڑا دیں اور چند روز کے بعد بودھ مذہب کی شہنشاہی ہندوستان میں قائم ہو گئی۔ راجپوتوں کی قوم کے بنانے اور بودھوں کی حکومت کے مٹانے کی کوشش بھی مذہبی پیشواؤں یعنے پنڈتوں ہی نے شروع کی تھی اور اس کام میں اُن کو کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ جیپال کی پہیم شکستوں اور پھر خودکشی نے اس برہمنی مذہب کے پنڈتوں اور بودھ مذہب کے پیشواؤں کو بڑی آسانی سے اس سلسلۂ کشش تحریک کے لیے متحد و متفق کر دیا اور ان مذہبی پیشواؤں کے اتفاق نے تمام راجاؤں ہی کو متفق نہیں بنایا بلکہ عام رعایا میں بھی مذہبی رنگ کا جوش اور قتل و خونریزی کے شوق کا خروش پیدا کر دیا۔ یہ بات محض تخیل اور مضمون آفرینی پر مبنی نہ سمجھنی چاہیئے بلکہ اس کے لیے ناقابل تردید ثبوت اور زبردست شہادتیں موجود ہیں۔ شاید کسی تاریخی مسئلہ میں مورخین کا اس قدر عظیم الشان اتفاق موجود نہیں جس قدر اس مسئلہ میں ہے کہ اس لڑائی میں امداد پہنچانے کے لئے ماؤں نے اپنے بیٹوں کو اور بیبیوں نے اپنے شوہروں کو لڑائی میں جانے اور مارنے مرنے کی ترغیب دی۔ خوشحال اور امیر گھروں کی عورتوں نے اپنے سونے چاندی کے زیور اتار کر مصارف جنگ کے لیے پیش کر دیے۔ غریب عورتوں اور بیواؤں نے سوت کات کات کر پیسے جمع کیے اور جنگ کو کامیاب بنانے کے لئے اس قومی جنگی خزانے میں شامل کئے۔ اب سوچنے اور غور کرنے کا مقام ہے کہ براعظم ہندوستان کے طول و عرض میں عورتوں تک کا یہ جوش و ایثار سوائے مذہبی پیشواؤں کی کوششوں کے کیا اور کسی طرح بھی ممکن تھا۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں کئی سال صرف ہوئے کیونکہ ایک دن یا ایک دو مہینے میں عام لوگوں کو اس قدر مشتعل اور آمادۂ قتال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی ہندو اگر چاہے تو فرشتہ۔ نظام الدین ہروی۔ یمینی۔ بیہقی۔ روضۃ الصفا۔ تاج المآثر وغیرہ کو اُن کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات قرار دے سکتا ہے مگر وہ راجہ شیو پرشاد کی گواہی کو کس طرح رد کریگا جو اپنی تاریخ آئینہ تاریخ نما میں ہندو عورتوں کے سوت کات کات کر جنگ میں مدد کرنے اور اپنے شوہروں اور بیٹوں کو لڑائی میں بھیجنے کی تصدیق فرماتے ہیں۔ مسٹر جے۔

سی۔ ایلین صاحب سے بڑھ کر مسلمانوں سے ناراض مورخ اور کون ہو سکتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

"راجہ انند پال نے جو ایک بہادر سپاہی تھا راجپوتوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا تمام راجپوت راجے اپنی اپنی فوج لے کر جمع ہو گئے۔ ہندو عورتوں نے اپنے زیور طلائی اُتار اُتار کر اس لیے گلوا ڈالے کہ وہ اپنے اُن بھائیوں اور خاوندوں کی روپیہ سے مدد کریں جو لڑائی میں شریک ہوں۔ راجپوتوں کی فوج اس قدر جرار تھی کہ بہت دنوں تک سلطان محمود کو اُس سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی"

آنریبل ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صاحب سے بڑھ کر اور کون ہندو نواز مورخ ہو سکتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ۔

"ہندوؤں نے ایسی حب الوطنی ظاہر کی کہ شریف عورتوں نے اپنا گہنا پاتا گلوا ڈالا اور غریبوں نے سوت کات کات کر لڑائی میں اپنے خاوندوں کی مدد کی"

یہی مورخ آگے چل کر اسی لڑائی کے ذکر میں لکھتا ہے کہ

"محمود نے اس خوف سے کہ چار راجاؤں نے صوبہ مالوہ سے لے کر ملک اودھ تک ایکا کر لیا تھا پشاور میں مورچے ڈالے اور ایک مرتبہ جو ان مورچوں میں سے برآمد ہو کر حملہ کیا تو سخت زک اٹھائی یہاں تک کہ گکھڑ قوم کے وحشی لوگ محمود کے لشکر میں گھس پڑے اور چار ہزار مسلمانوں کو تہ تیغ کیا"

ان شہادتوں کے موجود ہوتے ہوئے ہم فرشتہ کے بیان کو کیسے رد کر سکتے ہیں جس نے اب سے قریباً تین سو سال پہلے جبکہ ہندو مسلمانوں کی اس موجودہ کشمکش کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا اپنی تاریخ میں درج کیا کہ

"بقصد ثواب جمیع راجہائے ہند و اطراف مثلے کہ راجۂ اُجین و گوالیار و کالنجر و قنوج و دہلی و اجمیر در مقام مدد شدند و فوج فوج لشکر روئے بجانب پنجاب نہادند و زیادہ ازانچہ در زمان امیر ناصر الدین سبکتگین بقلم در آمدہ بود ایں دفعہ عرض لشکر گرفتہ بسر کردگی انند پال متوجہ حرب سلطان شدند و در صحرائے پشاور بسلطان محمود نزدیک گشتہ قریب چہل روز در مقابل ہم خیمہ زدند ہیچ کدام بر جنگ اقدام نمی نمودند اما روز بروز لشکر کفار زیادہ ترمی گشت واز اطراف مدد بایشاں می رسید تا آنکہ کفار گکھڑ نیز دریں سفر بایشاں ملحق گشتہ و حشرے عظیم برانگیختہ در حرب مسلماناں بنوعے ساعی گردیدند کہ زنان زیور خود فروختہ خرج از جاہائے دور دست نزد شوہران خود می فرستادند تا صرف مصالح سفر کردہ در حرب مسلمانان بکوشند و زنانیکہ دسترس نداشتند چرخہ رنی و مزدوری نمودہ چیزے برائے مردم لشکر ارسال می داشتند"

اب سوچنے اور غور کرنے کے قابل یہ بات ہے کہ راجاؤں کی باقاعدہ فوج کے علاوہ عام رعایا بھی بطور رضاکار بھرتی ہو کر میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئی تھی اور ان لوگوں کو جو جنگ کے جوش اور شوق میں گھروں سے نکل پڑے تھے انند پال یا دوسرے راجاؤں کی طرف سے سامان رسد اور ضروری اخراجات نہیں دیے جا سکتے تھے اس لئے اُن کی بیویوں اور بہنوں کو سوت کات کات کر روپیہ اُن کے لئے بھیجنا پڑتا تھا۔ یا یہ کہ تمام لوگوں کو مرکزی خزانہ سے خرچ ملتا تھا اور مرکزی خزانہ کو قابل اطمینان حالت میں رکھنے کے لئے تمام ملک کو چندوں سے امداد کرنی پڑتی تھی جس میں غریب اور بیوہ عورتوں تک کو بھی حصہ لینا پڑا تھا۔ کیا یہ صورت پنڈتوں اور مذہبی پیشواؤں کی کوششوں کے بغیر ہی پیدا ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ان افواج کے پنجاب میں فراہم ہونے کے لئے مہینے اور برس صرف ہوئے ہونگے۔ اور یہ سلسلہ دیر تک جاری رہنے کے بعد پشاور کے میدان میں لڑائی ہوئی ہوگی کیونکہ عورتوں کو بار بار خرچ بھیجتے رہنے کی ضرورت پیش آتی رہی تھی۔ بہر حال یہ حملہ ہندوؤں کی طرف سے خاص اہتمام کے ساتھ کیا گیا۔ اس حملہ کی تیاریوں اور ترغیبوں کا کام مذہبی پیشواؤں نے بڑی سرگرمی اور مستعدی سے انجام دیا گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں مناد پہنچے اور انھوں نے رضاکاروں کو میدان جنگ کی طرف روانہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ دور دور از مقامات کی فوجوں نے جب لاہور کی طرف سفر کیا تو راستے کے شہروں قصبوں اور گاؤں میں قدرتاً جوش پیدا ہوا ہوگا اور فوجوں کے اس مظاہرے نے پنڈتوں کے کاموں میں یقیناً بڑی کامیابی اور عوام میں شرکت جنگ کی آمادگی پیدا کی ہوگی۔ انند پال نے لاہور میں متحدہ فوج کی عظیم الشان تعداد کے فراہم ہونے پر پشاور کی طرف کوچ کیا۔ یہ فوج جو پشاور کے میدان میں پہنچی اگرچہ ہندوستان کی پوری قوت کہی جا سکتی تھی مگر لڑائی میں شریک ہو کر ثواب حاصل کرنیوالے گروہوں کی آمد کا سلسلہ برابر جاری تھا جن کو پنڈت لوگ شہروں اور قصبوں سے مسلسل روانہ کر رہے تھے۔ پشاور کے میدان میں پہنچ کر انند پال نے قیام کیا تاکہ آنیوالے جنگجو گروہوں کی آمد کے سلسلے سے فوج کی تعداد جس قدر زیادہ ہو سکتی ہے ہو جائے۔ محمود کے پاس جب خبر پہنچی کہ انند پال کی سپہ سالاری میں ایک فوجی سمندر موجیں مارتا ہوا پشاور کی جانب روانہ ہوا ہے تو وہ اس حملہ کو جیپال کے حملہ کا مثنیٰ سمجھ کر بلا تامل دار السلطنت کی موجودہ فوج لے کر روانہ ہوا۔ پشاور کے قریب پہنچ کر اُس نے ہندوؤں کے لشکر عظیم اور ہندوستان بھر کے تمام سورماؤں کو پہلے سے خیمہ زن اور مقابلہ پر مستعد پایا۔ محمود سے یہی توقع ہو سکتی تھی کہ وہ آتے ہی ہندوؤں کے لشکر پر حملہ آور ہو کر میدان کارزار گرم کر دیگا مگر اُس نے جب ہندوؤں کے لشکر کو توقع کے خلاف لاتعداد اور بے اندازہ پایا اور اپنی قلیل فوج کو بے حقیقت دیکھا تو بقول ملکم صاحب اُس کے حواس باختہ ہو گئے اور بجائے حملہ آور ہونے کے وہ اپنی حفاظت کی تدبیریں سوچنے لگا اُس کی عجیب

حالت بھی نہ وہ ہندو لشکر کے سامنے آ کر بھاگ سکتا تھا نہ حملہ آور ہونے کی جرأت کر سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے
حواس بجا کر کے فوراً اپنے لشکر گاہ کے گرد خندق کھدوانی شروع کر دی تاکہ ہندو یکایک حملہ آور ہو کر
اُس کے لشکر کو بآسانی ہیں نہ ڈالیں۔ ادھر انند پال کو اطمینان تھا اور اُس کا شکار جس کی تلاش میں وہ
نکلا تھا اُس کے سامنے پہنچ کر مقیم ہو چکا تھا۔ محمود نے اپنی طرف سے کوئی حملہ نہیں کیا اور حفاظتی سامانوں کے
بڑھانے میں مصروف رہا۔ اس طرح دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل چالیس روز تک خیمہ زن رہے
اور کسی نے کسی پر پیش قدمی اور پیش دستی نہیں کی۔ محمود کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہندوؤں کی تعداد ہر روز
ترقی کر رہی ہے اور نئے نئے فوجی دستے روزانہ آ آ کر شریک ہو رہے ہیں تو وہ اپنے اس تامل اور وقت کے
گذارنے پر متاسف ہوا آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ اسی میدان میں لڑ کر جام شہادت نوش کرنا چاہیئے چنانچہ اُس نے
ایک ہزار تیر اندازوں کے ایک دستے کو اول آگے بھیجا کہ ہندوؤں کے قریب پہنچ کر تیر اندازی کریں اور
پیچھے ہٹتے ہوئے ہندو حملہ آوروں کو اپنی خندقوں کے قریب لے آئیں اُس کا مدعا اس سے یہ تھا کہ اپنی
لشکر گاہ کے قریب ایک اچھے موقع پر افغانی لشکر ہندوستانی لشکر کا مقابلہ کرے تاکہ چاروں طرف سے
دشمنوں کے نرغہ میں نہ آ جائے کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے سے مسلمان جن کی تعداد بہت ہی تھوڑی
تھی چاروں طرف سے گھیر لیے جا سکتے تھے انند پال بھی اس جنگی داؤں پیچ سے واقف تھا اُس نے
تیس ہزار گھکڑوں یا کھوکھروں کی جمعیت کو جو پنجاب ہی کے شمالی اضلاع کی ایک قوم تھی محمود کے لشکر کی
دوسری جانب پہنچ کر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ادھر ان ایک ہزار تیر اندازوں نے نکل کر لڑائی شروع کی اُدھر
ان تیس ہزار گھکڑوں نے دوسری طرف سے محمودی کیمپ میں داخل ہو کر قیامت برپا کر دی اور چشم زدن
میں چار پانچ ہزار مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ محمود کو مجبوراً خود سوار ہو کر اور اپنی رکابی فوج لے کر ان گھکڑوں
کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور بمشکل اُن کو مار کر اپنے لشکر گاہ سے بھگایا۔ ادھر ہندوؤں کا لشکر ایک بحر مواج کی
مانند حرکت میں آ چکا تھا اور محمودی فوج کا بڑا حصہ اپنی خندق کے سامنے مصروفِ جنگ ہو چکا تھا۔ بظاہر
محمود کی فتح کسی طرح ممکن نظر نہ آتی تھی مگر مسلمانوں کے جوشِ شجاعت اور شوقِ شہادت نے اُن کو پہاڑ کی
طرح استوار اور فولاد کی طرح سخت و صعوبت کش بنا دیا۔ محمودی سرداروں میں عبداللہ طائی اور
ارسلان جاذب نے حیرت انگیز شمشیر زنی اور محیر العقول کارنامے دکھائے۔ محمود گھکڑوں کو بھگا کر خود بھی اس
ہنگامۂ زد و خورد میں آ کر شامل اور صفِ قتال میں شریک ہو کر اپنے بہادروں کی حوصلہ افزائی کا موجب
ہوا صبح سے قریب شام تک شمشیر زنی جاری رہی۔ لڑائی کے شروع ہونے پر ہر ہندو کو اپنی فتح کا یقین اور
ہر مسلمان کو سعادت شہادت کے حصول کی آرزو تھی مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا ہندوستانی لشکر میں

نتیجہ جنگ کے متعلق شک وشبہ کو دخل ملتا گیا۔ انند پال جو باپ کے انتقام اور فتحمندی کے پرعزم در یقین کے جوش میں اپنے ہاتھی کو سپاہیوں کا دل بڑھانے کے لیے صف قتال میں بڑھا لایا تھا غروب آفتاب کے قریب اسلامی لشکر کو پیچھے ڈھکیلنے اور پامال کرنے سے مایوس ہو کر خود پیچھے ہٹا اور اپنے ہاتھی کا منھ موڑا سپہ سالار کو پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھ کر ہندو سپاہی جو مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی تمام طاقتوں اور کوششوں کو بیکار و بلا نتیجہ پا چکے تھے صفوں کو توڑ توڑ اور لڑائی سے منھ موڑ موڑ کر ایسے بتا توڑ بھاگنا شروع ہوئے کہ پچھلوں کو ان اگلوں سے کچھ بھی دریافت کرنے کا موقع نہ ملا اور یہ فوجی سمندر اس تیز رفتاری سے ہزارہا شاخوں میں منشعب ہو کر مشرق کی سمت پھیل کر بہنے لگا کہ تاریکی کے پھیلنے سے پہلے پہلے ہندوستانی افواج کا کیمپ (لشکر گاہ) بالکل خالی اور سنسان ہو گیا۔ اس جگہ یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض مورخین نے انند پال کے فرار کو اس کے ہاتھی کے بے قابو ہو جانے پر محمول کیا ہے یعنے ہاتھی کسی وجہ سے مہاوت کے قابو میں نہ رہا اور خود ہی اپنی فوج کو کچلتا ہوا پیچھے کو بھاگا ہندو لشکر نے یہ سمجھا کہ ہمارا سپہ سالار بھاگا جاتا ہے لہذا وہ سب کے سب بھاگ پڑے۔ ملکم صاحب نے تو ایک انگریز مورخ کے حوالے سے کسی کا یہ بیان بھی لکھ دیا ہے کہ انند پال کا ہاتھی توپ کی آواز یا توپ کے گولے کے لگنے سے بھاگا تھا۔ مگر خود ہی اس کی تردید بھی کر دی ہے اور لکھا ہے کہ اس زمانہ میں توپ لڑائیوں میں کہاں استعمال ہوتی تھی۔ بعض نے جلتی ہوئی رال کے گولے اور چھوٹے بارود کی وجہ سے ہاتھی کا بھاگنا بیان کیا ہے۔ مگر چونکہ صبح سے شام تک دونوں لشکروں کا مصروف جنگ رہنا ثابت اور سب کو تسلیم ہے لہذا ہندوؤں کی اس شکست کو محض اتفاقی شکست نہیں کہا جا سکتا کیونکہ طرفین کو اپنے حوصلے پورے کرنے اور لڑنے کا کافی موقع مل چکا تھا۔ فرشتہ کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لڑائی دو روز تک جاری رہی۔ بہر حال یہ لڑائی ہندوستان کی مجموعی طاقت کا ایک زبردست مظاہرہ تھا۔ ہندوستان کی اتنی بڑی جنگی طاقت اب تک کسی ایک میدان میں جمع نہیں ہوئی تھی۔ اس فتح کے بعد سلطان محمود نے وقت کو ضائع کیے بغیر صرف دو دن فوج کو آرام لینے کا موقع دے کر انند پال کا تعاقب شروع کیا کیونکہ اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں پھر ان فراریوں کو فراہم کر کے دوبارہ انند پال حملہ آور نہ ہو۔ انند پال سلطان محمود کو اپنے متعاقب آتے ہوئے سن کر لاہور میں نہیں آیا بلکہ نگر کوٹ یا قلعہ بھیم کے راجہ کی معیت میں نگر کوٹ پہنچا کیونکہ وہ پہاڑی مقام ہونے کی وجہ سے بہت مضبوط اور ناقابل تسخیر مقام تھا۔ محمود بھی انند پال کا سراغ لگاتا ہوا نگر کوٹ پہنچا۔ اول انند پال نے اس قلعہ میں ٹھہرنا اور مقابلہ کرنا چاہا مگر یہ دیکھ کر کہ محمود کی فوج کے افغان سپاہی پہاڑی راستوں اور پہاڑی گذرگاہوں کو خاطر میں نہ لا کر ہر طرف پہاڑیوں پر چھانے

جاتے ہیں وہ وہاں سے کھسک کر اندرون کوہ کے دور دراز مقامات میں پہنچ گیا۔ سلطان محمود نے آتے ہی نگر کوٹ کا محاصرہ کیا اور قلعہ کی فوج نے معمولی مقابلہ کے بعد ہتھیار ڈالدیئے اور جان بخشی کی درخواست کی سلطان محمود قلعہ میں داخل ہوا اور یہاں کے مندر کو جو مجمع الاصنام تھا دیکھا۔ پجاریوں نے جان کی امان طلب کر کے مندر کے متعلقہ خزانہ کا پتہ بتایا۔ یہاں سے اس قدر سونا چاندی محمود کے ہاتھ آیا کہ اس سے پیشتر نہ سلطان محمود نے اسقدر خزانہ دیکھا تھا نہ ایران و خراسان کے کسی دوسرے بادشاہ کی نظر سے ایسے ایسے زیورات سونے چاندی کے گذرے ہونگے۔ اس جگہ ذرا مذہبی پیشواؤں اور اُس زمانے کے پجاریوں کی اس اخلاقی حالت کا بھی تصور کیجئے کہ انہی لوگوں نے محمود غزنوی کے خلاف تمام ہندوستان کو لڑائی پر آمادہ کیا۔ انہی لوگوں کے وعظ و پند کا اثر تھا کہ عورتوں نے اپنے مردوں کے لیے سوت کات کات کر روپیہ جمع کیا مگر ان لوگوں کے دل مال و دولت کی محبت سے خالی نہ ہوئے اور اُنھوں نے اتنے بڑے بڑے خزانوں کو اپنی ملکیت اور قبضہ میں رکھتے ہوئے خرچ کرنا نہ چاہا۔ محمود غزنوی کو نگر کوٹ سے جو خزانہ ملا وہ اُس کی زحمت سفر اور ضیاع نفوس کا کافی معاوضہ تھا۔ سلطان محمود نے ۳۹۹ھ کے آخر ایام میں پشاور کے قریب انندپال اور ہندوستان کی متحدہ طاقت کو شکست دی اور ۴۰۰ھ کے شروع میں نگر کوٹ سے فارغ ہو کر غزنی کی جانب روانہ ہوا۔ سلطان محمود ابھی نگر کوٹ ہی میں مقیم تھا کہ انندپال نے جو پہاڑوں کے اندر جا چھپا تھا پیغام بھیجا کہ جس طرح آپ نے اس سے پہلے بھی بار بار میری اور میرے باپ کی خطائیں معاف کی ہیں ایک مرتبہ اور میری گستاخی سے درگذر فرمائی جائے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب شرائط فرمانبرداری کے بجالانے اور سالانہ زر خراج ادا کرنے میں کوئی کوتاہی عمل میں نہ آئیگی۔ نگر کوٹ کے راجا نے بھی اسی طرح عفو تقصیرات کی درخواست بھیجی اور برہمنوں کی سازش و کوشش سے آمادۂ جنگ ہو جانے پر اظہار ملال کیا۔ سلطان نے اس درخواست کو بلا تامل منظور کر لیا۔ چونکہ سلطان کو معلوم ہو چکا تھا کہ برہمنوں اور پنڈتوں کی کوششوں نے یہ ہنگامہ برپا کرنے اور ہندوستان والوں کے دلوں میں نفرت و عداوت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لہذا اُس نے از راہ مآل اندیشی عام اعلان کر دیا کہ جو ہندو ہماری فوج میں نوکر ہونا چاہے وہ خوشی سے بھرتی ہو سکتا ہے ہم اُس کو مثل مسلمانوں کے تمام حقوق عطا کریں گے پشاور کی مذکورہ شکست نے چونکہ عام لوگوں کے دلوں میں ایک زبردست مایوسی پیدا کر دی تھی لہذا دریائے سندھ کو عبور کرنے سے پہلے پہلے مختلف مقامات سے آ آ کر دس ہزار ہندو سلطانی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اور سلطان نے انھیں میں سے ایک ہندو کو سپہ سالاری کا عہدہ دے کر ان دس ہزار ہندوؤں کی ایک ایک الگ مستقل فوج قائم کر دی۔ ہندوؤں کی اس فوج کے قائم کرنے سے سلطان کا مدعا یہ تھا کہ اس نفرت کو

جو ہندوؤں کے دلوں میں سلطنت غزنی کی طرف سے قائم ہوئی تھی دور کر دیا جائے اور اس بات کا یقین دلایا جائے کہ ہم ہندوؤں پر بخوبی اعتماد کر سکتے ہیں۔ جامع التواریخ میں پشاور اور نگر کوٹ کی لڑائی کا حال لکھ کر لکھا ہے۔

"ملوک ہند اطاعت وخراج قبول ساختہ دہ ہزار سوار ملازم سلطان گردانیدند"

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سلطان نے انند پال وغیرہ سے یہ فرمایش کی ہوگی کہ تم ہماری فوج میں ہندوؤں کو بھرتی کرادو۔ انند پال اور نگر کوٹ کے راجہ نے دس ہزار سواروں کو سلطان کے لشکر میں بھرتی کرادیا ہوگا۔ بہر حال سنہ ھ سے سلطنت غزنی کے لشکر میں ہندو شامل ہوئے اور اُن کی تعداد برابر سلطانی فوج میں ترقی کرتی رہی اور خسرو ملک یعنے خاندان سبکتگین کے سب سے آخری بادشاہ کے زمانہ تک مسلسل یہ ہندو فوج قائم رہی جیسا کہ آگے اس کی تفصیل آتی ہے۔ سلطان نے غزنی کو جاتے ہوئے نہ کسی شہر کو لوٹا نہ کسی کو زبردستی پکڑ کر مسلمان بنایا نہ کسی کو گرفتار کر کے غلام بنایا بلکہ نہایت امن و امان اور خاموشی کے ساتھ پشاور و جمرود و خیبر کے راستے غزنی چلا گیا۔ اگر محمود واقعی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ گمراہ کن تاریخوں میں ہمارے بچوں کو پڑھایا جاتا ہے تو نگر کوٹ (کانگڑہ) سے پشاور تک وہ نہایت آباد و سرسبز علاقے میں سفر کرتا ہوا گذرا اس آباد علاقے کے شہروں اور قصبوں کو لوٹتا اور خاک سیاہ بناتا ہوا گذرتا اور خون کی ندیاں بہا کر پنجاب کے دریاؤں کا پانی سُرخ کر دیتا۔ انند پال محمود کے چلے جانے کے بعد اپنے دارالحکومت لاہور میں آیا تھا اُس وقت یہ ملک بالکل بے والی وارث پڑا تھا محمود کو کسی مزاحمت اور کسی کے مقابلے کا بھی اندیشہ نہ تھا مگر اُس نے نگر کوٹ سے پشاور تک کسی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس نے لاہور کو بھی دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔

ملتان اور غور میں قرامطہ کا استیصال

غزنی پہنچ کر اُس کو معلوم ہوا کہ غور و ہرات کے علاقے میں قرامطہ نے شورش برپا کر دی ہے اور وہاں کا حاکم محمد بن سوری قرمطی ہو کر علم بغاوت بلند کر چکا ہے۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس زمانے میں مصر کے اندر عبیدیوں کی حکومت بڑے زور و شور سے قائم تھی انہی عبیدیوں کو فاطمیین بھی کہتے ہیں یہ لوگ خود خلافت کے مدعی اور بغداد کی عباسیہ خلافت کے رقیب اور جانی دشمن تھے محمود غزنوی عباسیوں کا طرفدار اور اپنے آپ کو عباسی خلیفہ کا خادم جانتا تھا۔ مصر کا فرمانروا حاکم بن عزیز عبیدی تھا۔ حاکم بن عزیز عبیدی کو محمود کی روز افزوں طاقت و شہرت کے مٹانے اور نقصان پہنچانے کا بہت خیال تھا۔ قرامطہ کی بیخ کنی اور بربادی کے لئے محمود نے سندھ و سیستان و خراسان وغیرہ میں جو جو کوششیں کی تھیں ان سب کا حال سُنکر حاکم عبیدی محمود غزنوی کا جانی دشمن بن گیا تھا

اوپر ذکر آچکا ہے کہ محمود نے مصر کے ایلچی کو قرمطی ہونے کی وجہ سے ذلیل کر کے نکلوا دیا تھا۔ حاکم بن عزیز عبیدی اگرچہ قرمطی نہ تھا لیکن اُس کو قرامطہ سے اس لئے ہمدردی تھی کہ قرامطہ کے مذہب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تکریم موجود تھی نیز یہ کہ اب تک قرامطہ کی تمام تر کوششیں خلافت عباسیہ اور اُس کے متوسلین کو نقصان پہنچانے میں صرف ہوئی تھیں۔ اس زمانے کے قرامطہ بھی حاکم بن عزیز عبیدی کو اپنا سردار و مربی ماننے لگے تھے کیونکہ حاکم عبیدی نے ان کی ہمت افزائی کی تھی۔ ہندوستان میں جو تحریک برہمنوں کی کوشش سے نشوونما پا رہی تھی اُس میں شروع سے قرامطہ شریک تھے اور انھوں نے حاکم بن عزیز عبیدی سے امداد طلب کی تھی۔ حاکم عبیدی کو انند پال کی تیاری اور حملہ آوری کا بخوبی علم تھا یہی وجہ تھی کہ ملک گجرات کی فوجیں تو پشاور کے معرکہ میں شریک تھیں مگر کسی قرمطی کا معرکہ پشاور میں انند پال کے زیر علم موجود ہونا ثابت نہیں۔ قرامطہ نے اپنے لئے دوسرا میدان تجویز کر لیا تھا اور ہندوؤں کو اس کا علم تھا اس لئے انھوں نے قرامطہ کو پشاور کی طرف آنے کی تکلیف نہیں دی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مصر سے کچھ جہاز امدادی فوج اور منادے کر دیبل کے بندرگاہ پر آئے۔ داؤد بن نصر حاکم ملتان کے پاس حاکم بن عزیز عبیدی کے سفیر پہنچے اور اُس کو خلیفہ مصر یعنے حاکم عبیدی کی بیعت پر آمادہ کر کے محمود غزنوی کے خلاف جنگ پر مستعد کیا۔ مصری فوج ملتان میں پہنچی اور قرامطہ کا بھی ملتان میں خوب اجتماع ہوا۔ ایک حصہ سفارت مصر اور قرامطہ کا غور کے جاہل اور پہاڑی علاقے میں خفیہ طور پر پہنچ چکا تھا۔ ادھر انند پال نے لاہور سے پشاور کی جانب کوچ کیا اُدھر مصری سفیروں اور قرمطی منادوں نے محمد بن سوری اور اُس نواح کی جاہل رعایا کو محمود کی مخالفت اور بغاوت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ٹھیک اُس زمانے میں جبکہ پشاور کے میدان میں محمود و انند پال آمادۂ پیکار تھے ملتان اور غور میں بیک وقت علم بغاوت بلند کیے گئے سلطان محمود نے غزنی پہنچتے ہی غور پر حملہ کیا اور محمد بن سوری دس ہزار جنگجو لے کر مقابلہ پر آیا۔ آخر گرفتار ہوا اور گرفتار ہوتے ہی خودکشی کر کے مر گیا۔ جس وقت سلطان محمود محمد بن سوری سے مصروف جنگ تھا اُس وقت داؤد بن نصر اپنی فوج لے کر محمودی علاقہ میں دست درازی کر رہا تھا۔ سلطان نے محمد بن سوری سے فارغ ہوتے ہی ملتان پر فوج کشی کی داؤد بن نصر نے سلطان محمود کا نہایت سختی سے مقابلہ کیا مگر انجام کار شکست پا کر گرفتار ہوا۔ بہت سے قرامطہ تہ تیغ ہوئے بعض ہاتھیوں کے پاؤں میں کچلوائے گئے۔ قرامطہ کو سلطان محمود نے نہایت تلاش و تجسس کے ساتھ گرفتار کرا کر قتل کیا۔ غور و ملتان کی شورشوں کا بیک وقت برپا ہونا اور انند پال کی چڑھائی کے ساتھ ہی ان مقامات میں بھی علم بغاوت بلند ہونا صاف بتا رہا ہے کہ یہ کیسی عظیم الشان سازش تھی۔ اس قسم کی خطرناک سازشوں کا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برپا ہونا کوئی عجیب اور غیر معمولی بات نہیں۔ خلافت راشدہ کے آخری زمانے سے ایسی ہی خطرناک اور بڑی بڑی سازشوں کا سلسلہ جو سلطنت اسلامیہ کے خلاف شروع ہوا ہے وہ آج تک

بھی ختم ہونے میں نہیں آیا۔ جن لوگوں کو ان مخالف اسلام سازشوں کی مفصل تاریخ سے واقفیت حاصل کرنی منظور ہو وہ میری کتاب تاریخ اسلام کی پہلی، دوسری، تیسری جلد ملاحظہ فرمائیں جن کا مسودہ تیار کر کے میں صوفی کمپنی کو اشاعت کے لئے دے چکا ہوں۔ اگر محمود غزنوی کو پشاور کے میدان میں شکست حاصل ہوتی تو سندھ سے لے کر آذربائیجان و بخارا تک تمام ملکوں میں قرامطہ یا عبیدیین مصر کی حکومت کا قائم ہو جانا یقینی تھا اور اس کے ساتھ ہی خلافت عباسیہ کا بھی خاتمہ تھا۔ غور و ملتان کی لڑائیوں میں محمود کو آسانی کے ساتھ فتوحات حاصل نہیں ہوئی تھیں یہ لڑائیاں پشاور کی لڑائی سے ہرگز کم خطرناک نہ تھیں بخوف طوالت ان کی تفصیل سے اعراض کیا گیا ہے۔ جنگ پشاور کے بعد پورا ایک سال سلطان محمود کو نگرکوٹ غور اور ملتان کی لڑائیوں میں صرف کرنا پڑا سنہ ۴۰۱ھ کی ابتدا میں سلطان ان لڑائیوں سے فارغ ہوا۔

تھانیسر پر حملہ۔ اب بظاہر سلطان محمود کے لئے کوئی خطرہ موجود نہ تھا لیکن اس کے اصلی دشمنوں کا ایک حصہ ابھی تک پس پردہ اور محفوظ تھا جس سے سلطان بخوبی واقف و آگاہ ہو چکا تھا قرامطہ کو وہ شروع ہی سے جانتا اور ان کے استیصال کے درپے رہا تھا لیکن اب اس کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے برہمن جو مذہبی پیشوا ہونے کے سبب عوام پر بڑا اثر رکھتے ہیں وہ بھی قرامطہ کے ہم نوا اور قرامطہ سے کچھ کم خطرناک نہیں ہیں۔ انندپال اب سلطان کا پھر فرمانبردار و باجگذار بن چکا تھا۔ ملتان کی ریاست جو عرصہ سے قرامطہ کے زیر اثر چلی آتی تھی اب باقاعدہ طور پر سلطان کی مملکت میں شامل ہو گئی تھی اور سلطان نے وہاں اپنی طرف سے ایک عامل مقرر کر دیا تھا۔ مگر سلطان کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ جس طرح پنجاب و ملتان کے صوبے پہلے کئی مرتبہ مطیع ہونے کے بعد باغی ہو چکے ہیں اب پھر باغی نہ ہو جائیں لہٰذا اس نے اس بات کا سراغ لگایا کہ انندپال کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے کون کون سی طاقتیں محرک ہو سکتی ہیں تاکہ پہلے سے ان کا علاج کر دیا جائے اور انندپال کو دوبارہ باغی ہونے کا موقع نہ دیا جائے چنانچہ اس کو معلوم ہوا کہ تھانیسر، قنوج اور متھرا بن سکتا ہے اس لئے زیادہ موجب فساد ہو سکتے ہیں کہ یہی مقامات برہمنوں اور سازشی لوگوں کے بھی مرکز ہیں۔ یہاں کے بت خانے سازش خانے بنے ہوئے ہیں اور نہ صرف اپنے اپنے مقامی راجاؤں پر بلکہ تمام ہندوستان پر اثر ڈال سکتے ہیں اور یہی وہ زبردست راجا ہیں جو انندپال کی مدد کو سب سے پہلے پہنچ سکتے ہیں۔ دوسری طرف انہلواڑہ (گجرات) اور اجین کی ریاستیں ملتان کے صوبہ کو نقصان پہنچا سکتی ہیں مگر چونکہ ملتان پر سلطان ایک مسلمان حاکم مقرر کر چکا تھا لہٰذا اس کو پنجاب ہی کا سب سے زیادہ خیال تھا اور اسی لئے اس نے سنہ ۴۰۵ھ میں تھانیسر پر حملہ کرنا مناسب سمجھا تاکہ تھانیسر کے راجہ کا وہ قرضہ بھی ادا کر دے جو اس نے اس سے پیشتر ایک سے زیادہ مرتبہ انندپال و جیپال کا معاون

بن کر اور سلطنت غزنی پر حملہ آور ہو کر محمود کے ذمہ چڑھا دیا تھا۔ نیز وہاں کے سازشی لوگوں کو بھی جو قرامطہ سے ہرگز کم نہ تھے سزا دے۔ تھانیسر اور دہلی کی ریاست انندپال کے ملک یعنے پنجاب کی مشرقی سرحد سے ملحق تھی اس ریاست پر حملہ کرنا بغیر اس کے ممکن نہ تھا کہ انندپال کے ملک میں ہو کر سلطانی لشکر گذرے۔ سلطان کو اس امتحان کا بھی موقع مل گیا کہ انندپال سلطانی لشکر کو اپنے علاقے میں ہو کر گذرنے دیتا ہے یا پہلے کی طرح پھر بغاوت پر آمادہ ہو کر سدراہ بنتا ہے۔ چنانچہ سلطان نے اپنی روانگی سے پیشتر انندپال کو لکھا کہ ہمارا ارادہ تھانیسر و دہلی پر حملہ کرنے کا ہے لشکر سلطانی تمہارے علاقے میں ہو کر گذرے گا مناسب یہ ہے کہ تم اپنے آدمی ہمارے ساتھ متعین کر دو کہ وہ تمہارے ملک کی حدود سے ہم کو آگاہ کریں اور تمہارے علاقہ میں سلطانی لشکر سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ انندپال نے فوراً اپنے بھائی کی سرداری میں دو ہزار سواروں کا ایک لشکر پشاور کے مقام پر بھیج دیا کہ سلطان محمود کے ہمراہ اس سفر میں رہے اور لشکر سلطانی کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب انندپال کے سر سے سلطان محمود کے مقابلہ اور مخالفت کا سودا دور ہو چکا تھا اور اُس نے مطیع و فرمانبردار رہنے ہی میں اپنی فلاح و بہبود دیکھی تھی۔ فرشتہ کہتا ہے کہ

"سلطان غازی چوں داخل ممالک پنجاب شد خواست کہ بنا بر عہد و شرطیکہ میانہ او و انندپال شدہ تخلف نہ شود و آسیبے در اثناء راہ عبور بمملکت وے نہ رسد از اں سبب کس پیش انندپال فرستادہ اعلام نمودہ کہ عزیمت تھانیسر داریم باید کہ جمعے از معتمدان خود را ملازم کوکب ہمایون ما گردانی تا ہر پرگنہ کہ تعلق بتو داشتہ باشد از صدمۂ سپاہ گردوں اشتباہ مصئون و محفوظ ماند انندپال امتثال امر را موجب بقائے دولت خود دانستہ بسرعت اسباب ضیافت مہیا کرد و تجار و بقالان مملکت خویش را فرمودہ تا امتعہ و روغن و غلہ و جمیع مایحتاج بار دوئے لشکر سلطان بردہ نوعے نمایند کہ رفاہیت در لشکر پدید آید و دو ہزار سوار بسرکردگی برادر خود بخدمت سلطان فرستادہ عریضہ نوشت کہ بندہ مطیع و منقاد است"

ملکم صاحب انندپال کی اس اطاعت و فرمانبرداری اور سلطانی لشکر کی ضیافت و مہمان نوازی کے حال کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

محمود نے دوسری یورش تھانیسر پر کی جو بڑی مشہور پرستش گاہ ہے اور دلی سے شمال کی جانب کوئی ستر میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انندپال نے اس یورش میں اس کا مقابلہ نہ کیا مگر چونکہ وہ اب ایک سردار خدمتگذار کی برابر رہ گیا تھا اس لئے اپنی دارالحکومت لاہور ہی میں رہا

اور بڑے صبر و تحمل سے اس حملہ کو دیکھتا رہا جس کی روک تھام کی تاب اُس میں نہ رہی تھی۔"

اور جن لڑائیوں اور یورشوں کا ذکر ہوا ان میں ایک بھی ایسی نہیں ہے جس کو محمود کی ملک گیری کے شوق یا ہندوستان والوں کو لونڈی غلام بنانے اور مندروں کو نقصان پہنچانے کی خواہش کا نتیجہ کہا جا سکے بلکہ ہر مرتبہ قرامطہ یا ہندوستان کے راجاؤں کی پیش قدمی نے لڑائی کی دعوت دی۔ وہ اگر دشمن تھا تو قرامطہ کا دشمن تھا۔ ہندو یا بودھوں سے من حیث القوم اُس کو کوئی عداوت و پرخاش نہ تھی۔ تھانیسر چونکہ برہمنوں کی سازش کا مرکز تھا اور یہیں یہ مندر تھا جس کا نام سوم جگ یا جگ سوم رکھا گیا تھا اور جہاں سلطنت غزنی کی بربادی کے لئے برہمنوں نے سازشی مرکز قائم کیا تھا لہٰذا اس سیاسی مرکز کو جو قرامطہ کے مرکزی مقام سے کم خطرناک نہ تھا تہ و بالا کرنا محمود کا فرض تھا۔ محمود کے پنجاب میں پہنچنے اور تھانیسر کی جانب جلد جلد بڑھنے کا حال سُنکر یہاں کے راجہ نے اپنی مدد کے لئے میرٹھ۔ مہابن۔ برن اور قنوج کے راجاؤں کو بُلایا لیکن ان راجاؤں کے تھانیسر پہنچنے سے پہلے محمود تھانیسر پہنچ گیا۔ تھانیسر کا راجا شہر چھوڑ کر بھاگ گیا محمود نے مندر کو توڑا اور سازشی گروہ کے جس شخص کا پتہ چلا اُس کو گرفتار کیا۔ اُس کو معلوم ہوا کہ مندر میں جو بت رکھا ہے اُس کی نسبت عوام کو برہمنوں نے یقین دلا رکھا ہے کہ جو شخص اس بت کے سامنے خودکشی کر کے اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے وہ عقبےٰ کی نجات حاصل کر لیتا ہے۔ یہ سُنکر محمود نے اُس بت کے توڑنے کا حکم دیا تاکہ اس خیال فاسد اور ہلاکت آفریں عقیدے سے عوام کو نجات سے ملے فرشتہ کی روایت کے موافق سوم جگ کا بت توڑا نہیں گیا بلکہ اُس کو محمود بجنسہٖ اُٹھا کر اپنے ہمراہ غزنی لے گیا مگر ملا صاحب لکھتے ہیں کہ بت کو توڑ کر اس کے ٹکڑے غزنی لے گیا۔ طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ

"سوم جگ را کہ در تھانیسر بود بغزنی بردند۔ سلطان فرمود کہ آں بت را بر درگاہ نہادہ سپے سپر خلائق سازند"

خلاصۃ التواریخ میں سجان رائے لکھتا ہے کہ

"بت جگر سوم را بغزنی بردہ بفرمودۂ سلطان بر درگاہ نہادند تا پے سپر خلائق گردد ے

سیتے چوں برآرد مہمات کس	کہ نتواند از خویش راندن مگس
زنیروئے دستش نہ رفتار پائے	وگر بفگنی بر نہ خیزد ز جائے"

ذرا غور کرنا کہ ایک ہندو اس بت کا ذکر کرتے ہوئے کیسے لطیف دو شعر لکھتا ہے اور کوئی ماتمی فقرہ اُس کی زبان سے نہیں نکلتا۔ محمود کا یہی حملہ ہے جس میں بت کے توڑنے یا یہاں سے اُٹھا کر غزنی لے جانے اور ہندوؤں کو بھی گرفتار کر کے لے جانے کا ذکر پہلی مرتبہ آتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اسی حملہ میں محمود کے ساتھ بارہ ہزار ہندو فوج بھی موجود ہے۔ جس میں سے دس ہزار ہندو تو باقاعدہ اُس کی فوج میں نوکر ہیں

اور دو ہزار کا ہندو لشکر انندپال کے بھائی کی سپہ سالاری میں بطور معاون اور بطریق میزبان موجود ہے محمود نے جب خالص اسلامی لشکر لے کر اس ملک میں راجاؤں کا مقابلہ کیا تو کسی مندر کو ڈھایا نہ کسی مورت کو توڑا لیکن جب ہندو اُس کی فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں تو مندر اور مورت کے توڑنے اور ہندوؤں کو قید کر کے غزنی لے جانے کا واقعہ ظہور میں آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان ہندو سپاہیوں اور ہندو سرداروں ہی نے جو محمود کی فوج میں نوکر تھے محمود کو ان سازشی مرکزوں، سازشی لوگوں اور سازشی کارروائیوں کا پورا پورا حال بتایا اور سُنایا ہوگا۔ اور اسی لئے محمود نے تھانیسر میں وہ کارروائیاں جن کا ذکر اوپر ہوا آزادی کے ساتھ کیں اس نے جس طرح قرامطہ کو قتل و گرفتار کیا تھا اُسی طرح تھانیسر کے سازشی مرکز سے سازشی ہندوؤں کو گرفتار کیا۔ اس کی فوج کے ہندوؤں اور انندپال کی دو ہزار ہندو فوج نے بھی جو اُس کے ہمراہ موجود تھی کوئی اظہار ناراضی نہیں کیا۔ نہ ہندوؤں نے محمود کی ملازمت کو ترک کیا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہندوؤں ہی کی رہبری میں ہوا پس اس کارروائی کو مذہبی تعصب کا نتیجہ قرار دینا۔ سیاسی ضرورت اور سیاسی تقاضے کو فراموش کر دینا عقل و عدل کے سراسر خلاف ہے۔ محمود کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اُس کے لیے بھی یہ تمام کارروائیاں جائز اور ناگزیر تھیں۔ ایک بادشاہ اور ایک سلطان کے اخلاق اور اُس کی ضرورتوں کو ایک سادھو کے اخلاق اور ایک سادھو کی ضرورتوں پر قیاس کرنا بڑے درجہ کی حماقت اور نابینائی ہے۔

کشمیر پر حملہ

محمود جبکہ ہندوستان آیا ہوا تھا اُس کی غیر موجودگی میں خراسان کی جانب کچھ بدامنی اور بغاوت پیدا ہوئی لیکن محمود کے غزنی پہنچتے پہنچتے اُس کے سپہ سالار ارسلان جاذب نے اس بغاوت و بدامنی کو فرو کر دیا تھا۔ اسی سال یعنی سنہ ۴۰۳ھ میں ابوالفوارس بن بہاء الدولہ دیلمی اپنے بھائیوں کے غلبہ سے مجبور ہو کر سلطان محمود کے پاس آیا اور اعانت طلب کی۔ سلطان نے اُس کے بھائیوں کے پاس خطوط بھیجے اور صلح کرا دی۔ سنہ ۴۰۴ھ میں پنجاب کے حاکم انندپال کا انتقال ہوا۔ انندپال مرتے دم تک سلطان محمود کا فرمانبردار رہا۔ اب اُس کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا جیپال ثانی تخت نشین ہوا جیپال ثانی نے تخت نشین ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان اور محمود کی فرمانبرداری و خراجگذاری سے انکار کیا محمود نے اُس کی تادیب کے لئے لشکر کشی کی۔ جیپال ثانی نے مقام نندونہ (ضلع جہلم) میں اس لئے مقابلہ کی تیاری کی کہ وہ نہایت مضبوط اور مستحکم مقام تھا محمود نے قلعہ نندونہ کا محاصرہ کیا۔ جیپال ثانی عاجز ہو کر نندونہ سے نکل بھاگا اور کشمیر کے دروں میں جا چھپا محمود اُس کے تعاقب میں کشمیر تک گیا مگر وہ کشمیر کے راجہ کی پناہ اور کشمیر کے اندرونی علاقے میں پہنچ گیا۔ سلطان نے کشمیر کے دروں میں پہنچ کر کئی قلعے فتح کیے اور نندونہ میں اپنا ایک عامل مقرر کر کے غزنین کو واپس چلا گیا۔ جیپال ثانی نے کشمیر سے لاہور واپس آ کر پھر پنجاب میں

حکومت شروع کی اور سلطان کی خدمت میں خراج سالانہ کے ساتھ درخواست بھیجی کہ میری ناتجربہ کاری و نوعمری پر نظر فرماکر میری گستاخی معاف فرمائی جائے آئندہ اپنے باپ کے زمانہ کا مقررہ خراج بلاعذر و حیلہ روانہ کرتا رہونگا اور اطاعت و فرمانبرداری کے شرائط بجالانے میں کوتاہی ہرگز عمل میں نہ لاؤنگا۔ سلطان نے جس طرح اُس کے باپ اور دادا کو بار بار معاف کیا تھا اُسی طرح جیپال ثانی کی خطاؤں کو معاف کر کے پنجاب کی سند حکومت اُس کے پاس بھیج دی۔ سلطان محمود سنہ ۴۰۵ھ تک غزنی اور خراسان کے اندرونی معاملات کی اصلاح میں مصروف رہا۔ وہاں سے فارغ و مطمئن ہو کر اُس نے ضروری سمجھا کہ کشمیر کے راجہ کی تادیب کیجائے تاکہ وہ جیپال ثانی کے گمراہ کرنے اور سلطان کی مخالفت میں اُس کو امداد پہنچانے کی جرأت نہ کرسکے سنہ ۴۰۶ھ کے آخر ایام میں وہ فوج لے کر کشمیر پر حملہ آور ہوا اور جیپال ثانی سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ لوہ کوٹ کے قلعہ پر کشمیری لشکر نے سلطانی لشکر کا مقابلہ کیا سلطان نے اس قلعہ کا محاصرہ کرلیا یہ محاصرہ چند روز جاری رہا قریب تھا کہ یہ قلعہ فتح ہو جائے کہ اسی اثنا میں خبر پہنچی کہ حاکم خوارزم کو جو سلطان کا رشتہ دار تھا وہاں کے لوگوں نے بغاوت کر کے مار ڈالا ہے سلطان قلعہ لوہ کوٹ سے سنہ ۴۰۷ھ میں محاصرہ اُٹھا کر غزنی اور غزنی سے خوارزم پہنچا وہاں کے باغیوں کو سزا دی اور اس ملک میں امن وامان قائم کر کے غزنی واپس آیا ۴۰۹ھ میں سلطان محمود غزنی سے ایک زبردست لشکر لے کر اس ارادہ سے روانہ ہوا کہ تمام سرکشوں کو قرار واقعی سزا دے کر ملک پنجاب کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ کر دے چنانچہ وہ غزنی سے چل کر اول کشمیر پہنچا کیونکہ اُس کے پہلی مرتبہ لوہ کوٹ سے چلے جانے پر کشمیر کے راجہ کی نخوت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس مرتبہ محمود جب حدود کشمیر میں داخل ہوا تو کشمیر کے راجہ نے اطاعت و فرمانبرداری کی درخواست بھیج کر امان طلب کی اور اپنی خدمت گذاری و خراج گذاری کا وعدہ کر کے محمود کے غصہ کو فرو کیا۔ سلطان نے کشمیر کے راجہ کی درخواست منظور کر کے اُس کے ملک کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا اور اُس کو حکم دیا کہ تم اپنی مناسب فوج لے کر بطور مقدمۃ الجیش ہمارے لشکر کے آگے آگے چلو۔

قنوج و متھرا وغیرہ پر حملہ

کشمیر کا راجہ سلطانی حکم کی تعمیل میں حاضر ہو کر خلعت و خطاب سے سرفراز اور محمودی لشکر کے ساتھ بطور مقدمۃ الجیش روانہ ہوا۔ سلطان نے اُس کو سمجھا دیا تھا کہ ہم قنوج و مہابن و برن وغیرہ پر حملہ آور ہو کر وہاں کے سازش خانوں کو برباد اور سازشی لوگوں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں تم ہم کو اس طرح پہاڑوں ہی پہاڑوں سفر کرا کر لے چلو کہ ان مذکورہ مقامات میں پہلے سے خبر نہ پہنچ سکے۔ کشمیر کے راجہ نے رہبری کر کے سلطان اور اُس کے لشکر کو پنجاب کے دریاؤں اور گنگا جمنا کے دہانوں سے کوہ ہمالہ کے اندر عبور کراتے اور گھاٹیوں ہی گھاٹیوں

گذارتے ہوئے رام گنگا کے دہانے تک پہنچا دیا اس سفر میں صرف ہندو سپاہیوں کو جو سلطان کی فوج میں نوکر تھے کسی قدر تکلیف ہوئی باقی سرحدی افغانوں۔ خراسانیوں۔ غوریوں اور ترکوں کو کوئی اذیت نہیں پہنچی کیونکہ یہ لوگ پہاڑوں کے رہنے والے اور پہاڑی سفر کے عادی تھے۔ ملا محمد قاسم ہندو شاہ نے بھی کشمیری لشکر کے مقدمۃ الجیش ہونے کا ذکر کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ

"چوں بحدود کشمیر رسید والی آنجا تحف و ہدایائے لائق پیشکش نمودہ بعنایات پادشاہانہ مفتخر گردید وحسب الحکم در مقدمہ لشکر ظفر اثر رواں شد"

سلطانی لشکر کوہ ہمالہ سے میدان میں اتر کر اس طرح یکایک قنوج کے سامنے پہنچ گیا کہ قنوج کا راجہ کنور رائے لشکر سلطانی کی کثرت و شوکت دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ سلطان محمود کے اس حملے اور پہاڑی سفر کا حال روسی میجر جنرل اے۔ ایل۔ این سبولوف نے اپنی کتاب "ہندوستان پر حملے" میں اس طرح لکھا ہے کہ

"محمود دیگر کشمیر پر حملہ آور ہوا پھر قنوج پر چڑھائی کا ارادہ کیا جو اس زمانے میں ہندوستان کا دارالسلطنت تھا ۱۰۱۸ء کے موسم بہار میں محمود ایک لاکھ سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہ سے کشمیر و پشاور کے رستہ سے ہندوستان آیا۔ اس پیچ کی راہ اختیار کرنے سے اس کی یہ غرض تھی کہ دشمن کو اس کی آمد کا علم نہ ہو اور وہ دفعتاً اس کے سر پر جا پڑے۔ محمود اس پر صعوبت سفر میں کامیاب ہوا۔ یہ اُس کے استقلال اور بے نظیر قوت ارادہ ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ ایسے دشوار گذار رستہ سے اپنی فوج سلامت لے گیا۔ چونکہ وہ غیر معمولی قوت ارادی رکھتا تھا اُس کی سپاہ اور افسروں کو اُس کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا اور اس وجہ سے اُس نے وہ اہم کام انجام دیئے جن کی اوروں کو بمشکل جرأت ہو سکتی تھی بہت سے بلند و مرتفع کوہی سلسلے محمود کی فوج کو عبور کرنے پڑے۔ فوج مذکور کو انتہا درجہ کی کٹھن گھاٹیوں برف پوش ہیبت ناک دروں اور خطرناک کوہی آبشاروں اور ندی نالوں کو عبور کرنا پڑا اور وہ ان تمام رکاوٹوں اور مشکلات پر غالب آئی۔ یہ ساری مصیبتیں اس لئے جھیلی گئی تھیں کہ اس کی یورش کا راز مخفی رہے۔ محمود اپنی فوج کو کشمیر سے لیتے گیا جو سطح سمندر سے ۱۷۰۴۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ پھر لداخ اور وہاں سے بتدریج شوشول و ہر دوہ کے دروں میں پہنچا جو ۱۳۷۰۶ فٹ سطح سمندر سے بلند ہیں بعدہ سلسلہ ہمالہ کو ڈینگو رجو ۱۸۱۳۰ فٹ بلند ہے یا ٹنکور (جو ۱۶۰۰۰ فٹ بلند ہے) کے قریب سے طے کیا۔ اس قسم کا سفر جاری رکھنے کے لئے آہنی ارادے کی ضرورت تھی۔ نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندوؤں کو ان راستوں سے مسلمانوں کے قہر الٰہی کی طرح نازل ہونے کا وہم وگمان بھی نہ تھا لیکن جب غزنی کا لشکر

نیپال کی مغربی سرحد پر پہنچ گیا تو اُنھیں معلوم ہوا کہ خوفناک سپہ سالار طاقتور لشکر کے ساتھ ہندوستان کے قلب میں معرکہ آرا ہونے کے لئے بگولے اور آندھی کی طرح تیزی سے چلا آتا ہے۔ اس کے مقابلہ کی تیاریوں کے لئے اب وقت کہاں تھا۔ محمود اپنے شاندار رسالے کے ساتھ قنوج پر جو وادی گنگا میں واقع ہے صاعقہ کی طرح جا پڑا۔"

قنوج کا راجہ کنور رائے محمود کی صفت خطا بخشی سے واقف تھا اور اس کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا یہ امتیازی نشان ہے کہ وہ ہر معافی مانگنے والے کو ضرور معاف کر دیتے ہیں لہذا اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے گلے میں دوپٹہ ڈال کر اور اپنے ہاتھ رومال سے بندھوا کر معہ اپنے بیٹوں اور قریبی رشتہ داروں کے محمود کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ محمود نے یہ دیکھ کر فوراً اُس کے ہاتھ کھولے گلے سے لگایا۔ اور اپنے برابر تخت پر بٹھایا اور ہر طرح تسلی و تشفی دے کر رخصت کیا۔ جو حملہ اس محنت اور اس جانفروشی و مصیبت کے ساتھ کیا گیا تھا وہ راجہ کے معافی مانگ لینے سے ایک منٹ کے اندر ختم ہوگیا۔ اب اس کو محمود کی ہندوکشی کہہ لو یا ہندو نوازی سمجھ لو۔ راجہ کنور رائے والی قنوج نے سلطان محمود اور اُس کے لشکر کی ضیافت کی۔ جو سلطان غزنی سے اُس کی سزادہی کا ارادہ کر کے چلا تھا وہ اب اُس کا مہمان عزیز بن کر قنوج میں داخل ہوا۔ اور تین روز یا آٹھ روز تک راجہ کا مہمان رہا محمود اور اُس کی فوج کے سردار قنوج میں اس طرح سیر کرتے ہوئے پھرتے تھے جیسے اپنے وطن اور بھائیوں میں ہوتے۔ راجہ کی بے بسی کوئی پوشیدہ بات نہ تھی اُس نے نہایت مجبوری کے عالم میں محمود سے امان طلب کی محمود اگر ویسا ہی ہوتا جیسا کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم اپنی کتابوں میں پڑھتے ہیں تو وہ ہرگز راجہ کو معاف نہیں کر سکتا تھا بلکہ اُس کو نہایت آسان موقع ملا تھا کہ وہ راجہ کو قید یا قتل کر کے قنوج میں قتل عام کا حکم دیتا۔ قنوج کے مندروں کو ڈھاتا اور وہاں کا تمام مال و اسباب گاڑیوں، چھکڑوں اور اونٹوں پر لاد کر غزنی کو لیجاتا۔ قنوج اُس زمانہ میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا جس قدر مال و دولت قنوج سے ہاتھ آسکتا تھا ہندوستان کے دوسرے شہروں سے ہرگز اس قدر مال و دولت کے حصول کی توقع نہیں تھی مگر محمود کی وجہ سے قنوج میں کسی کی نکسیر تک نہیں پھوٹی۔ محمود نے راجہ کنور رائے کی دوستی کو بہت قیمتی چیز سمجھا اور اُس سے دوستی و محبت کے پیمان مستحکم کر کے اور مخالفانہ سازشی تحریکوں سے بچے رہنے کا اقرار لے کر اور اردگرد کے سازشی مرکزوں کا پتہ لگا کر قنوج سے روانہ ہوا۔ اس جگہ ایک ہندو مورخ لالہ بابو رام صاحب خلف لالہ اجودھیا پرشاد صاحب کے الفاظ بھی ملاحظہ ہوں جو انھوں نے اپنی تاریخ موسومہ "مختصر سیر گلشن ہند" میں لکھے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ:-

"محمود اس مرتبہ اپنا لشکر اچانک قنوج کے سامنے لے آیا مہاراجہ قنوج سے کچھ نہ ہوسکا فوراً مع عیال واطفال کے دربار سلطانی میں حاضر ہوا اور اطاعت بادشاہ کی قبول کرلی۔ محمود نے راجہ قنوج کی بڑی عزت اور توقیر کی اور تین روز تک قنوج میں مقیم رہ کر راجہ قنوج کا مہمان رہا وقت رخصت کے بادشاہ نے راجہ سے اقرار کیا کہ اگر تم اور تمہارے وارث ہم سے سرکش نہ ہونگے تو جب تم یا تمہارے وارث مدد سلطانی چاہیں گے فوراً غزنی سے ملیگی چنانچہ راجہ قنوج کو ہر طرح سے تسلی دے کر متھرا میں داخل ہوا"

یہ وہی قنوج ہے جس کے راجہ نے خلیفہ ہارون الرشید کے پاس اپنا طبیب بھیجا تھا اور جہاں مسلمانوں کی آمد و رفت سیکڑوں برس پہلے پائی جاتی تھی مگر اس زمانہ میں کوئی عام مسلم کش تحریک ہندوستان میں موجود نہ تھی قنوج کا راجہ محمود کے خلاف انندپال اور اس کے باپ کی امداد کر کے نتیجہ دیکھ چکا تھا اس نے اب محمود کے آگے سپر ڈال کر اور تعلقات دوستی پیدا کر کے اپنی دانائی اور عقلمندی کا ثبوت دیا۔ تاریخ فرشتہ کی روایت کے موافق محمود قنوج سے رخصت ہو کر اول میرٹھ پھر مہاین اور اس کے بعد متھرا گیا لیکن طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ قنوج سے بلند شہر (برن) اور بلند شہر سے مہاین و متھرا گیا۔ بہرحال قنوج کی طرف سے مطمئن ہو کر محمود نے قریب قریب کے تمام سرکشوں کو ٹھیک بنانا اور مرعوب کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ وہ راجہ ہردت پر حملہ آور ہوا۔ ہردت اپنے سرداروں کو مع فوج قلعہ میں چھوڑ کر اور خود فرار ہو کر جنگل میں جا چھپا ہردت کے سرداروں نے تیس ہاتھی اور بہت سا روپیہ بطور نذرانہ سلطان کی خدمت میں پیش کر کے امان طلب کی سلطان نے یہ نذرانہ قبول کر کے وہاں سے مہاین کے راجہ کلچند پر حملہ کیا اس نے اول مقابلہ کیا پھر شکست کھا کر بھاگا اور اپنے ہاتھی کو جمنا کے پار لیجانا چاہا کہ اتنے میں سلطانی لشکر نے اس کو گرفتار کرلیا کلچند نے اسی حالت میں خودکشی کر کے اپنی جان گنوائی۔ محمود نے مہاین سے ان لوگوں کو جو مایۂ شرارت تھے گرفتار کر کے متھرا پر حملہ کیا یہاں اس نے ایک مندر کو توڑا باقی سیکڑوں مندر جو یہاں موجود تھے ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہاں سے بھی اس نے خاص خاص آدمیوں کو اپنے ہندو ہمراہیوں کی ہدایات واطلاعات کے بموجب گرفتار کیا۔ یہاں اس نے بعض بتوں کو بھی توڑا اس جگہ چند روز قیام کرنے کے بعد وہ مشرق کی جانب مقام اسوفی (ضلع فتحپور) کے راجہ چندپال بھور یا چندر پال کی طرف متوجہ ہوا اس راجہ نے اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ دیکھ کر راہ فرار اختیار کی و جنگلوں میں جا چھپا لیکن سلطان کے پاس تحف و ہدایا اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار نامہ بھیج دیا جس سے سلطان کا غیظ و غضب فرو ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان راجہ چندر رائے کی طرف متوجہ ہوا اس نے بھی چندر پال کی روش اختیار کی۔ سلطان نے اس کا قصور معاف کیا اور ایک مشہور ہاتھی جو اس کے پاس تھا لیکر

واپس ہوا۔ یہ تمام راجا جن پر اس مرتبہ سلطان نے حملہ کیا وہی تھے جو سلطان محمود کا مقابلہ انندپال کے حامی بن کر پشاور کے میدان میں کر چکے تھے۔ انندپال نے تو اطاعت قبول کر لی تھی اور اب اُس کا بیٹا جیپال ثانی بھی مطیع و فرمانبردار تھا۔ پس ان راجاؤں کو مطیع و منقاد بنانا اور ان سب سے بھی اقرار طاعت لینا یا کم از کم اُس حملۂ پشاور کا عوض لینا سلطان محمود کا حق تھا۔ لیکن اگر بنظر غور دیکھا جائے تو سلطان کو درحقیقت اُس سازش کا مٹانا مقصود تھا جس نے ہندو مسلم منافرت پیدا کر کے بد امنی اور ہنگامہ آرائی کے ذریعہ قرامطہ کو تقویت پہنچائی تھی۔ سلطان محمود بجائے اس کے کہ ہندو راجاؤں کو قتل و ذلیل کرے اُن سے صلح کرنے کا زیادہ شائق تھا۔

اس حملہ میں کشمیر کا راجہ معہ اپنی فوج کے سلطان کی ہمراہی میں موجود تھا۔ سلطان کی فوج میں بھی کافی ہندو ملازم تھے۔ ان ہندو دوستوں کی موجودگی میں محمود کیا کوئی بھی تھوڑی سی عقل رکھنے والا بادشاہ کوئی ایسی کارروائی نہیں کر سکتا تھا جو اُس کے دوستوں کی دلشکنی کا موجب ہوتی۔ حالانکہ محمود تو ہر ایک ہندو راجا کی طرف مصالحت اور دوستی کا ہاتھ بڑھانے کو ہمیشہ مستعد رہتا اور کسی پیغام صلح کو کبھی رد کرنا نہ چاہتا تھا متھرا د مہابن وغیرہ میں اُس نے جو کچھ کیا وہ یقیناً مصالح ملکی اور عدل و استحقاق کے عین موافق تھا اور ان تمام کارروائیوں کا سبب ہرگز کوئی مذہبی منافرت اور بیجا تعصب نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو محمود اپنی ہندو فوج اور ہندو سرداروں پہ ہرگز وہ اعتماد نہ کرتا جو اُس نے ہمیشہ کیا اور نہ ہندو اُس کے لئے وہ ہمدردی اور جانفشانی دکھاتے جو انھوں نے دکھائی اور جس کا بیان آگے آئیگا۔ سجان رائے اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ میں تمام نذرانوں اور اُس تمام مال و اسباب کی میزان لکھتا ہے جو سلطان محمود اور اُس کی فوج کو اس سفر میں حاصل ہوا اور جس کا غزنی پہنچ کر جائزہ لیا گیا سجان رائے کے الفاظ اس مال و دولت کی نسبت یہ ہیں کہ۔

"چوں بغزنی رسید و غنائم سفر قنوج بشمار در آمد پنج لک و بست ہزار درم و سی صد و پنجاہ فیل بقلم در آمد"

پانچ لاکھ بیس ہزار درم آج کل کے ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے برابر ہوتے ہیں اس کے علاوہ ساڑھے تین سو ہاتھی ہیں۔ اس مال غنیمت اور خراج کے مجموعہ کو دیکھو اور اس بات کو سوچو کہ سلطان محمود کس قدر فوج سے کر آیا ہے سات آٹھ راجاؤں کو اُس نے شکست دی ہے کئی شہروں کو لوٹا اور کئی راجاؤں سے خراج و نذرانہ وصول کیا ہے اور سب کی میزان وہ ہے جو سجان رائے کے الفاظ میں اوپر نقل کی گئی ہے کیا یہ کسی بہت بڑی لوٹ مار کی میزان ہو سکتی ہے؟ اس میزان میں متھرا و مہابن کے سونے چاندی کے بُت اور اُن شہروں کی لوٹ مار کا مال بھی کچھ شامل ہے اور یہی محمود کا وہ حملہ ہے جس کی سب سے زیادہ ہندوؤں اور یورپی مورخوں کو شکایت ہے اور اسی حملہ کو اُس کی غارتگری کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اوپر جو تعداد مال غنیمت کی لکھی گئی ہے وہ ایک ہندو مورخ کی روایت ہے مگر فرشتہ نے اس تعداد کو ان الفاظ میں لکھا ہے۔

"چوں بغزنی رسید غنائم سفر قنوج را شمار کردند بست ہزار دینار و ہزاران ہزار درم بشمار در آمد"

اس طرح پندرہ لاکھ روپیہ کے دینار اور ہزارہا درم ہوتے ہیں۔ اس تعداد کو کتنا ہی بڑھا لیجیے پھر بھی بیس پچیس لاکھ روپیہ سے زیادہ فرض نہیں کر سکتے۔ میرے وطن نجیب آباد کی نسبت تاریخ امیر نامہ میں لکھا ہے کہ جب نواب امیر خاں بانی ریاست ٹونک نے انگریزوں کو پریشان کرنے کے لئے روہیلکھنڈ میں آکر لوٹ مار مچائی اور جنرل اسکاٹ کو پریشان و مبہوت رکھا تو اُسی زمانہ میں نواب امیر خاں اپنی تمام فوج کو نگینہ میں چھوڑ کر صرف چار پانچ ہزار سواروں کے ساتھ نجیب آباد آئے اور دو کروڑ روپیہ یہاں سے لوٹ کر لے گئے یہ وہ زمانہ تھا کہ نجیب آباد کا بڑا حصہ ویران ہو چکا تھا کوئی نواب یا حاکم موجود نہ تھا اس واقعہ کو اس قدر معمولی اور نا قابل تذکرہ واقعہ سمجھا جاتا ہے کہ نجیب آباد والوں کی زبان پر بھی اس کا چرچا نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ نواب امیر خاں کے دو کروڑ روپیہ کے مقابلے میں سلطان محمود غزنوی کے ڈیڑھ لاکھ یا زیادہ سے زیادہ بیس پچیس لاکھ روپیہ کی کیا حقیقت ہے جس کے لئے ربع مسکوں میں ایک شور برپا ہے۔ سجان رائے نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس حملہ میں محمود غزنوی ترپّن ہزار آدمیوں کو گرفتار کر کے لے گیا اگر یہ تعداد صحیح تسلیم کر لی جائے تو محمود غزنوی سے بڑی غلطی ہوئی کہ وہ ان ترپن ہزار آدمیوں کے سال بھر کے کھانے کا خرچ بھی ہندوستان سے لے کر نہ گیا۔ بات صرف یہ ہے کہ وہ فسادی اور شرارت پیشہ لوگوں کو یہاں سے گرفتار کر کے لے گیا تھا اور وہاں لے جا کر اس نے اُن کو نواح غزنی اور شہر غزنی میں آباد کر دیا تھا یہ ایک بہت بڑی سیاسی تدبیر اور ملکداری کا تقاضا تھا۔ آج کل بھی حکومتوں کو جب ضرورت پیش آتی ہے تو وہ جرائم پیشہ لوگوں کو ایک جگہ سے ترک سکونت کرا کر دوسری جگہ آباد کرا دیتے ہیں اور اس طرح یہ جرائم پیشہ لوگ بہت ہی مفید گروہ ثابت ہو جاتے ہیں اگر محمود کو محض ہندو ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کے پکڑنے اور لے جانے کا شوق ہوتا تو وہ تھانیسر، متھرا اور مہابن ہی کو اس کام کے لیے انتخاب نہ کرتا بلکہ پنجاب کے شہروں سے جو نسبتاً بہت قریب تھے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لیجاتا۔ بات یہ ہے کہ اس نے چُن چُن کر جرائم پیشہ اور فسادی لوگوں کو معہ اہل و عیال اپنے ساتھ غزنی چلنے پر مجبور کیا تھا اور آئندہ چل کر ثابت ہوگا کہ ان لوگوں کو وہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ سلطان محمود کی غرض قنوج و متھرا وغیرہ کے حملے سے صرف یہ تھی کہ ان راجاؤں کو جنھوں نے اُس کے خلاف فوج کشی کی تھی سزا دے کر اپنا رعب قائم کرے اور سازشی لوگوں کو جو اصلی خطاوار تھے گرفتار و قتل کرے ملک گیری اُس کا مقصد نہ تھا وہ صرف ملک پنجاب کو ایک ایسی ریاست بنا کر رکھنا چاہتا تھا جس کا راجہ محمود کا ہوا خواہ رہے۔ اور سلطنت غزنی پر ہندوستان کی طرف سے کوئی حملہ نہ ہو سکے۔ حملۂ قنوج کے بعد اُس کی یہ غرض حسب دلخواہ پوری ہو چکی تھی اور اب اُس کو پنجاب کی

طرف سے حملہ کا کوئی خطرہ نہ رہا تھا اس کے بعد وہ ملتان و سندھ کی جانب اُس طرف کے خطرہ کو مٹانے کے لئے متوجہ ہوتا لیکن کالنجر کے راجہ نے اُس کو پھر مشرقی ہندوستان کی طرف حملہ آور ہونے کے لئے مجبور کیا۔

کالنجر پر حملہ پنجاب کا الحاق کالنجر کی اطاعت

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہندوستان سے محمود کے چلے جانے کے بعد کالنجر کے راجہ نندا نے قنوج۔ متھرا۔ مہابن۔ میرٹھ۔ برن وغیرہ کے راجاؤں کو ملامت آمیز خطوط لکھے اور محمود کے اس طرح آنے اور کامیاب واپس چلے جانے کو ان راجاؤں کی بزدلی و نامردی پر محمول کر کے غیرتیں دلائیں۔ قنوج کا راجہ کنور رائے اُس قول و اقرار پر جو اُس نے محمود سے کیا تھا قائم رہا لیکن باقی راجاؤں نے نندا کی بلند ہمتی و عالی حوصلگی کا اقرار کر کے آئندہ کے لئے مستعد رہنے اور نندا کی رہبری میں کام کرنے کا وعدہ کیا نندا نے ان راجاؤں کو اپنے موافق اور مستعد دیکھ کر قنوج پر چڑھائی کی اور ساتھ ہی پنجاب کے راجہ جیپال ثانی کو لعنت ملامت کا خط لکھ کر محمود کے مقابلے پر مستعد ہونے کی ترغیب دی۔ قنوج کے راجہ نے اپنے آپ کو خطرہ میں مبتلا دیکھ کر غزنی کی جانب قاصد روانہ کیا اور سلطان سے امداد طلب کی۔ سلطان محمود اس حادثہ سے مطلع ہو کر سنہ ۴۱۰ھ میں فوراً قنوج کی جانب روانہ ہوا۔ جیپال ثانی چونکہ نندا کی ترغیب اور تمام راجاؤں کے متحد ہو کر مستعد مقابلہ ہونے کا حال سُننے سے بغاوت پر آمادہ ہو چکا تھا اُس نے سلطان کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ پنجاب میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر روکنا اور مقابلہ کرنا چاہا کہ اس طرح باپ دادا کی کھوئی ہوئی عزت و شہرت کو بآسانی حاصل کر سکے۔ مگر سلطانی لشکر نے ایک ہی حملے میں پنجابی لشکر کو بھگا دیا اور بھگوڑوں کا تعاقب کیے بغیر قنوج کی طرف تیز رفتاری سے سفر کو جاری رکھا تاکہ قنوج کے راجا کنور رائے کو جلد از جلد امداد پہنچائی جا سکے مگر سلطان محمود کے پہنچنے سے پہلے ہی قنوج کا راجا نندا کے مقابلے میں مارا جا چکا تھا۔ سلطان جب قنوج پہنچا ہے تو نندا قنوج سے کالنجر کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ سلطان نے اُس کو حدود کالنجر میں جا لیا۔ نندا اپنے چھتیس ہزار سوار اور پینتالیس ہزار پیادے اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھی لے کر مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ سلطان کے ہمراہ بہت ہی تھوڑی سی فوج تھی جو اس دو منزلہ اور سہ منزلہ یلغار میں بمشکل ساتھ دے سکتی تھی۔ نندا کے مقابل سلطانی لشکر خیمہ زن ہوا اور سلطان نے ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر نندا کے لشکر کو دیکھا تو اُس کی کثرت و شوکت دیکھ کر اس قدر دور و دراز مقام پر اتنی تھوڑی فوج کے ساتھ آنے سے پشیمان ہوا اور خدائے تعالےٰ سے دعا مانگی۔ اس روز دن آخر ہونے کی وجہ سے لڑائی نہیں چھیڑی۔ رات کو لشکر نے خیمہ زن ہو کر آرام کیا صبح ہونے پر دیکھا تو معلوم ہوا کہ نندا کے

دل پر اس قدر خوف طاری ہوا کہ وہ اپنا تمام سامان وہیں چھوڑ کر اور اپنی جان بچا کر صبح ہونے سے پہلے ہی فرار ہو گیا ہے سلطان نے جب نندا اور اس کے لشکر کو بھاگتے ہوئے دیکھا تو اول کمین گاہوں کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کا حکم دیا کہ کہیں ہندوؤں نے کوئی جنگی چال تو نہیں چلی۔ جب راجہ کے بھاگ جانے کا یقین ہو گیا تو سلطان نے اپنی فوج کو تعاقب کرنے اور مال غنیمت حاصل کرنے کی اجازت دی۔ تھوڑی دور تک نندا کا تعاقب ہوا اور اس تعاقب میں پانسو اسی جنگی ہاتھی سلطانی فوج نے نندا کے آدمیوں سے چھینے۔ بہت سا سامان اور خزانہ جو نندا قنوج سے لایا تھا سب سلطان کے قبضہ میں آیا مگر نندا تیز رفتاری سے جان بچا کر نکل گیا اور سلطان نے اس کا زیادہ تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا اسی فتح کو کافی سمجھ کر وہاں سے غزنی کی جانب واپس ہوا کیونکہ اس کو اب جیپال ثانی کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ غزنی پہنچ کر سلطان نے ارادہ کیا کہ پنجاب کو حکومت اسلامیہ میں شامل کر لیا جائے جیپال ثانی کی حرکات ناشائستہ نے اس کو اس قابل ہی نہ رکھا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت مرعی رکھی جائے۔ مگر سلطان کو قریباً دو سال تک سوات اور بونیر کی طرف مصروف و متوجہ رہنا پڑا۔ وہاں سے مطمئن ہو کر ۴۱۳ھ میں سلطان نے پنجاب و لاہور کا قصد کیا۔ جیپال ثانی تاب مقاومت نہ لا کر لاہور سے اجمیر کی جانب فرار ہوا کیونکہ اب وہ کشمیر کی جانب پناہ گزیں نہیں ہو سکتا تھا جہاں کا راجہ پہلے ہی سلطان کا حلقہ بگوش بن چکا تھا۔ سلطان نے لاہور میں داخل ہو کر قیام کیا پنجاب کے اضلاع میں عامل مقرر کر کے اپنے نام کا سکہ خطبہ جاری کیا اور اس وقت سے پنجاب سلطنت غزنی میں شامل ہوا۔ یہ کام سلطان اب سے بہت پہلے بھی کر سکتا تھا مگر اس نے نہ چاہا کہ یہاں کے قدیمی حکمران خاندان کو محروم و مستاصل کرے اس نے بار بار خطائیں دیکھ کر بار بار معافی دی اور عفو و درگذر سے کام لیا۔ اس عفو و درگذر کی مثالیں دوسری قوموں کی تاریخ میں ہرگز دستیاب نہیں ہو سکتیں مگر حیرت ہے کہ محمود کو ظالم اور ڈاکو کا خطاب دیا جاتا ہے۔ محمود لاہور میں اپنے عزیز غلام ایاز کو پنجاب کا صوبہ دار بنا کر غزنی کی جانب چلا گیا۔ پنجاب کے اس پہلے مسلمان گورنر کی (جو کشمیری النسل تھا) قبر لاہور کی ٹکسالی منڈی کے متصل آج تک موجود ہے۔ ۴۱۳ھ میں سلطان نے ایک زبردست لشکر ہمراہ لیکر نندا کی سرکوبی کے لئے غزنی سے کوچ کیا۔ راستے میں گوالیار کے راجہ نے محمود کے لشکر کو روکا اور مقابلہ پر مستعد ہوا لیکن اس کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ محمود کی اطاعت ہی موجب فلاح و بہبود ہے چنانچہ اس نے پینتیس ہاتھی سلطان کی خدمت میں بطور نذرانہ بھیج کر امان طلب کی اور آئندہ مطیع و منقاد رہنے کا وعدہ کیا۔ گوالیار سے سلطان کالنجر کی طرف روانہ ہوا۔ کالنجر کا راجہ نندا قلعہ بند ہو بیٹھا۔ سلطان نے قلعہ کا محاصرہ کیا چند روز کے

بعد راجہ نے عاجز ہو کر درخواست بھیجی کہ تین سو ہاتھی مجھ سے بطور نذرانہ قبول فرما کر میری جان بخشی اور تاج بخشی فرمائی جائے۔ سلطان محمود کبھی کسی کی درخواست صلح یا اقرار اطاعت کو رد نہیں فرماتا تھا چنانچہ اُس نے راجہ کی یہ درخواست منظور کر لی۔ راجہ نے تین سو ہاتھی خالی بلا مہاوتوں کے قلعہ کے دروازے سے باہر نکال دیئے سلطان نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُن کو پکڑ لو چنانچہ سلطانی بہادروں نے بلا خوف و خطر ان ہاتھیوں کو قابو میں کر لیا اور قلعہ والے جو اوپر سے تماشا دیکھ رہے تھے محمودی سپاہیوں کی چابکدستی و مستعدی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اگلے دن راجہ نے سلطان محمود کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا سلطان نے یہ قصیدہ اپنے اُن ہمراہیوں کو جو ہندی زبان جانتے تھے دکھایا اور ہندی زبان کے مُسلّم انشا پردازوں سے نندا کی شاعری کا مرتبہ دریافت کیا۔ ان لوگوں نے سلطان کو قصیدہ کا ترجمہ سُنایا اور نندا کی شاعری کی تعریف کی۔ سلطان نے خوش ہو کر اس مدحیہ قصیدے کے صلے میں پندرہ قلعے ریاست کالنجر میں اپنی طرف سے شامل کیے راجہ نندا نے اس گراں سنگ انعام سے مفتخر ہو کر بہت سے قیمتی تحائف اور نذرانے سلطان کی خدمت میں بھیجے۔ سبحان رائے لکھتا ہے کہ۔

"راجہ نندا شعر ہندی بعبارت متین و استعارات رنگین کہ پسندیدۂ شعر فہمان خرد گزیں و گزیدۂ سخنداں دانش آئیں بودہ باشد در مدح سلطان نوشتہ ارسال داشت زباندانان ہند مضمون آن را بعرض رسانیدند سلطان مسرت اندوز گشتہ تحسین نمود و بجلدوئے آں منشور حکومت پانزدہ قلعہ ضمیمہ کالنجر نمودہ باتحف دیگر مرحمت فرمود راجہ نندا نیز مال بسیار و جواہر بے شمار درعوض آں بخدمت سلطان مرسل نمود و سلطان بعد صلح بغزنی معاودت کرد"

اس کے بعد سلطان محمود کو پنجاب کے مشرقی ملکوں میں آنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور راجہ نندا ہمیشہ سلطان محمود کا مطیع و فرمانبردار اور ہمدرد و مداح رہا۔ محمود کو بھی اُس پر اس قدر اعتماد تھا کہ دو برس کے بعد ۴۱۵ھ میں جب سلجوقیوں نے شمالی خراسان اور ماوراء النہر میں خروج کیا تو محمود نے سلجوق اعظم کے بیٹے اسرائیل کو گرفتار کر کے نندا کے پاس کالنجر میں بھیج دیا کہ اس کو اپنے قلعہ میں نظر بند رکھو۔ الغرض اسرائیل بن سلجوق سات برس تک کالنجر کے قلعہ میں نظر بند رہا اور ۴۲۱ھ میں سلطان محمود کی وفات کے بعد سلطان مسعود بن محمود کے حکم سے رہا ہو کر غزنی اور وہاں سے اپنے قبیلہ میں گیا یہ وہی اسرائیل بن سلجوق ہے جس کی اولاد میں ساتویں صدی ہجری کے آخر تک ایشیائے کوچک کی حکومت و سلطنت رہی اور اُن کے جانشین سلاطین عثمانیہ ہوئے۔ ایک مسلمان اور زبردست سلجوقی سردار کا کالنجر کے قلعہ میں قید رکھنا دلیل اس بات کی ہے کہ محمود کو کالنجر کے راجہ کی فرمانبرداری پر پورا پورا اعتماد تھا اور

کالنجر کا راجہ نہ صرف محمود بلکہ اُس کے بیٹے کا بھی فرمانپذیر رہا جس سال اسرائیل بن سلجوق کو گرفتار کر کے کالنجر میں قید رہنے کے لئے بھیجا ہے اُسی سال ماوراء النہر کے حاکم علی تگین کو بھی گرفتار کر کے اسی قلعہ میں بھیجا گیا تھا چنانچہ علی تگین بحالت قید کالنجر ہی میں فوت ہوا۔ احمد بن حسن میمندی وزیر اعظم بھی اسی قلعہ میں قید کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود نے کالنجر کو کالا پانی بنا رکھا تھا۔

سومنات پر حملہ

علی تگین کے فتنہ سے فارغ ہو کر سلطان غزنی میں آیا تو اُس کے پاس خبر پہنچی کہ متھرا و مہابن اور تھانیسر کے برہمنوں نے اپنے دوسرے مرکز سومنات (ملک گجرات) میں جا کر پناہ لی ہے اور گجرات کے راجہ کی سرپرستی میں انواع و اقسام کی فریب دینے والی باتیں شائع کر رہے ہیں نیز سندھ و فارس و گجرات کے بقیۃ السیف قرامطہ بھی اسی جگہ فراہم ہو گئے ہیں اور انھوں نے فرمانروائے مصر سے خط و کتابت شروع کر دی ہے۔ سومنات کا ذکر حملہ محمودی سے پہلے ہندوستان کی ملکی و مذہبی تاریخ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ اس جگہ پہلے سے کوئی معمولی اور غیر مشہور مندر ہو لیکن وہ کوئی مرکزی بت خانہ نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو چینی سیاح بھی اس کا ذکر کرتا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تھانیسر کے بت سوم جگ کی بجائے سومنات کو قائم کیا گیا تھا۔ یا یہ کہ سوم جگ اور سومنات دونوں کی بنیاد ساتھ ہی ساتھ دو مختلف مقامات میں رکھی گئی تھی۔ ان دونوں بتوں یا بت خانوں کے نام میں لفظ سوم موجود ہے جو دلیل اس بات کی ہے کہ یہ مندر یا یہ بت چاند سے منسوب تھے۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کے موقع پر سوم جگ اور سومنات دونوں مندروں میں یکساں پرستش ہوتی تھی۔ اُدھر ملک عرب کے تمام مشرکوں میں چاند کے بت کو عام طور پر فضیلت حاصل تھی۔ قرامطۂ بحرین کی رعایت بھی سوم (چاند) کے بت میں مدنظر رکھی گئی ہو تو تعجب نہیں سومنات کی نسبت سجان رائے لکھتا ہے کہ

"گویند در زمان پیغمبر آں بت را از خانۂ کعبہ برآوردہ دراں جا گذاشتہ اند"

برہمنوں نے تمام ملک میں اس بات کو شہرت دی تھی کہ سومنات کا بت تھانیسر اور متھرا کے بتوں سے ناراض تھا لہٰذا اُس نے موقع دیا کہ محمود اُن بتوں کو توڑ دے اور اسی لئے سومنات نے محمود کی مخالفت میں کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن اب سومنات ایک چشم زدن میں محمود کا کام تمام کر دیگا کیونکہ وہ تمام بتوں کا بادشاہ ہے اور سمندر اُس کی عبادت کے لئے مقررہ اوقات میں حاضر ہوتا ہے چونکہ سومنات بالکل سمندر کے کنارے گجرات کے جنوبی ساحل پر واقع ہوا تھا لہٰذا جوار بھاٹے کے وقت سمندر کا پانی کبھی مندر کی دیواروں سے آکر ٹکراتا اور کبھی میلوں فاصلے پر چلا جاتا تھا۔ جوار بھاٹا سمندر

میں چاند کی گردش سے قمری مہینے کی مقررہ تاریخوں میں چونکہ آتا ہے اس لئے مقررہ اوقات میں سمندر کے پانی کا مندر تک آنا سمندر کا بت کی عبادت کے لئے آنا بیان کیا گیا اور شمالی ہند اور دور دراز کے رہنے والوں کو یہاں لالا کر اور سمندر کے اس طرح برائے عبادت آنے کا تماشا دکھا کر معتقد بنایا گیا یہ لوگ چونکہ ساحل سمندر کے رہنے والے نہ تھے اُنھوں نے اس نظارہ کو دیکھ کر بت کی عظمت بلا تامل تسلیم کرلی اور اپنے اپنے شہروں میں جاکر دوسروں کو یہ حال سُنایا اور سومنات پہنچنے کی ترغیب دی شمالی ہند کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا اور لوگ ہردوار سے گنگا کا پانی لے کر سومنات کے بت پر چڑھانے کے لئے پہنچنے لگے چنانچہ راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند نے اپنی کتاب میں صاف طور پر اس بات کا اقرار کیا ہے کہ ہر روز گنگا کا پانی سومنات پر چڑھانے کے لئے پہنچتا تھا۔ اب قیاس کیجئے کہ ہردوار سے سومنات تک کتنے میدان و ریگستان و کوہستان ہیں اور کتنے راجاؤں کی حکومتیں راستے میں پڑتی ہونگی۔ یہی وجہ تھی کہ یک لخت تمام ہندوستان میں سومنات کی شہرت ہوگئی اور سومنات کو محمود سے انتقام لینے والا ظاہر کرکے اُس سازش مردہ میں جس کو محمود فنا کرچکا تھا از سرِ نو جان ڈالنے کی کوشش کی گئی اور سومنات کی نسبت عجیب عجیب قسم کے عقیدے تراشے گئے۔ ابوالقاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ۔

"دریہاں سال کہ خمس و عشر و اربعمائۃ باشد بعرض محمود رسانیدند کہ اہل ہنود میگویند کہ ارواح بعد از مفارقت ابدان بخدمت سومنات می آیند و او ہر یکے را از ارواح ببدنے کہ لائق میداند حوالہ نماید امابطریق تناسخ و ہمچنیں معتقد ایشاں درحق سومنات آنست کہ مد و جزر دریا از برائے عبادت اوست و براہمہ میگویند کہ چوں سومنات ازاں بتہا کہ سلطان محمود شکستہ است رنجیدہ بود حمایت ایشاں نہ کرد والا در یک چشم زدن ہر کرا بخواہد ہلاک می تواند ساخت۔"

غزانامۂ مسعود مصنفہ عنایت حسین بلگرامی میں حملہ سومنات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ایک روز سلطان نے جہاد سومنات میں پہلوان لشکر (سالار ساہو) سے یہ مشورہ لیا کہ ملک ھ میں ہمارے جہاد کرنے سے ہنود نے یہ بات بنائی کہ سومنات کی خفگی سے بتان ہند پر آفت آئی ورنہ سومنات لشکر شاہ کو تباہ کرتا فوج کو خاک سیاہ کرتا اس وجہ سے ہم کو زعم ہنود باطل کرنا منظور ہے بت سومنات کو توڑنا ضرور ہے۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سومنات کا مندر کرشن کے زمانہ سے قائم تھا اور اسی لئے متھرا و تھانیسر وغیرہ کے لوگوں کو اس مندر سے قدیمی تعلق تھا کیونکہ یہ لوگ دوارکا (گجرات) کی عظمت ہردوار و متھرا سے کم نہ سمجھتے تھے۔ اس مندر میں پانسو نوجوان لڑکیاں سومنات کی خدمت کے لئے ایسی موجود رہتی تھیں

جو راجاؤں اور بڑے بڑے ہندو سرداروں کی بیٹیاں تھیں۔ دو ہزار برہمن اس مندر کے پوجاری تھے جو رات دن وہیں مصروف جرس نوازی رہتے تھے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سومنات میں کس قدر لوگوں کا ہجوم رہتا ہوگا۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جب محمود غزنوی سومنات کے قریب پہنچا ہے تو مندر اور شہر میں ایک نہایت زبردست فوج کو مقابلہ پر مستعد پایا۔ یہ فوج اور جنگی سامان کسی مندر یا عبادت گاہ کے لئے جز و لازم نہیں ہو سکتے تھے۔ سومنات میں ایک نہایت زبردست جنگی طاقت کا موجود ہونا کافی دلیل اس بات کی ہے کہ یہ کوئی نہایت اہم سازشی مرکز تھا اور اسی سے سلطان محمود غزنوی کے حملہ آور ہونے کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ملکم صاحب نے سومنات کے مندر کی نسبت ایک اور بھی نئی بات لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ۔

"یہ مندر وہ تھا جس کے پوجاری سومنات کے زور و قوت پر فخر کرتے تھے اور شمالی ہندوستان کے باشندوں کی ستم شعاری بدکرداری اور وہاں کے دیوتوں کے ضعف و ناتوانی کو وہاں کی آفتوں اور مصیبتوں کا باعث بتاتے تھے"

اگر ملکم صاحب کے اس بیان کو صحیح سمجھ لیا جائے تو سلطان محمود کے اس حملہ کی ایک نئی وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ خود شمالی ہندوستان کے ہندوؤں ہی نے سلطان محمود کو سومنات پر حملہ کرنے کی ترغیب دی ہوگی اور انھوں ہی نے سومنات کی نسبت ایسی ایسی خبریں سلطان تک پہنچائی ہونگی کہ وہ حملہ آور ہونے پر مجبور ہو جائے اور شمالی ہند کے بتوں کی تحقیر کر کے سومنات والے جو فخر و غرور کرتے اور ڈینگیں مارتے تھے وہ بھی اپنے بت کی بے بسی و بیچارگی دیکھ کر سیدھے ہو جائیں۔ روضۃ الصفا کی روایت کے موافق سلطان محمود نے دہم ماہ شعبان ۴۱۵ھ کو معہ لشکر غزنی سے کوچ کیا اور ۱۵ رمضان ۴۱۵ھ کو ملتان پہنچا۔ ملتان سے سلطان گجرات کی طرف روانہ ہوا یہ حملہ درحقیقت سلطان محمود کو گجرات کے راجہ پر کرنا ضروری تھا۔ سومنات کی جدید شہرت اور سازشی مرکز ہونے کا حال سن کر اس نے یہاں کے جنگی اجتماع کو منتشر اور سازشی گروہ کو ہلاک کرنا ضروری سمجھا جو گجرات کے راجہ کی سرپرستی میں مصروف کار تھا۔ محمود نے بیس ہزار اونٹوں پر پانی کی مشکیں لاد کر ملتان سے کوچ کیا وہ اول انھلواڑہ (نہروالہ) دارالسلطنت گجرات پہنچا۔ گجرات کا راجہ اس اچانک حملہ سے سراسیمہ ہو کر اور شہر چھوڑ کر کسی طرف کو بھاگ گیا محمود نے اس شہر میں قیام کرنے یا اس کے لوٹنے کا مطلق خیال نہیں کیا بلکہ نہروالہ سے سومنات کی طرف روانہ ہوا سومنات والوں کو بھی اس اچانک حملے کی پہلے سے اطلاع نہ تھی۔ محمود کو فصیل شہر کے نیچے دیکھ کر شہر والوں نے فصیل کے اوپر سے کہا کہ تمہاری موت تم کو یہاں کھینچ کر لائی ہے یاد رکھو کہ اب تم یہاں سے بچ کر

ہرگز نہیں جا سکتے اور سومنات اب تم سب کو ضرور ہلاک کر ڈالیگا۔ محمود نے اس کے جواب میں اپنے سواروں
کو تیر اندازی کا حکم دیا۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ سومنات میں دس ہزار سے زیادہ بہادر راجپوتوں کی فوج تھی
اور اب تو شہر کے باشندے بھی مسلح ہو کر مقابلے پر مستعد ہو گئے تھے۔ محمود کے ہمراہ تیس ہزار سپاہی تھے
شہر سومنات کے تین طرف سمندر اور ایک سمت خشکی تھی۔ اسی خشکی کی جانب سے محمودی لشکر حملہ آور
ہوا تھا۔ سلطان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ساحل سمندر پر جس قدر کشتیاں دستیاب ہو سکیں ان
سب پر قبضہ کر کے اُن میں ایک حصۂ فوج بٹھا کر جو عموماً ہندو سپاہیوں پر مشتمل تھا حکم دیا کہ تم سمندر کی
جانب سے شہر کا محاصرہ جاری رکھو اور کوئی بحری امداد شہر والوں کو نہ پہنچنے دو۔ سلطان کی اس احتیاط اور
اس اولیں کارروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو ضرور یہ اندیشہ تھا کہ سومنات والوں کے لئے خلیج فارس
اور بحر عمان سے قرامطہ کی امداد پہنچ سکتی ہے ورنہ کسی ہندو ریاست سے تو جہازوں کے ذریعہ فوجی امداد
کے آنے کا احتمال ہی نہ تھا۔ سومنات والوں نے دو دن تک بڑی بہادری اور جانفروشی کے ساتھ مقابلہ کیا
تیسرے دن نہروالہ کے راجہ پرم دیو اور اُسی نواح کے دوسرے راجہ دابشلیم نامی نے اپنی فوجوں کو فراہم
و آراستہ کر کے سومنات کے بچانے اور سومنات کی فوج کو امداد پہنچانے کے لئے تیس چالیس ہزار فوج
سے حملہ کیا ادھر محمود سومنات کی فوج سے مصروف پیکار تھا اُدھر پیچھے سے یہ زبردست فوج آگئی اور
محمودی لشکر دونوں فوجوں کے بیچ میں گھر گیا۔ یہ وقت بڑا نازک تھا لیکن محمود نے اپنے خدا سے مدد
طلب کی دعا مانگی اور فوج کے دو حصے کر کے ایک حصہ کو سومنات کی جانب مصروف جنگ رکھا اور دوسرے
کو لے کر ان راجاؤں کی حملہ آور فوج پر خود حملہ آور ہوا۔ شہر والے بھی اب بہت دلیری اور جرأت کے ساتھ
لڑنے لگے۔ لیکن محمود نے تھوڑی ہی دیر میں پرم دیو اور دابشلیم کی فوج کو شکست دے کر بھگا دیا اس
فتح کے ساتھ ہی سومنات کی فوج نے ہمت ہار دی۔ اور محمودی لشکر فصیل شہر پر قابض ہو کر شہر میں
داخل ہوا۔ پانچ ہزار کے قریب راجپوت لڑائی میں مارے گئے پانچ ہزار کے قریب سمندر کی جانب
کشتیوں میں سوار ہو ہو کر بھاگے اور محمودی سپاہیوں نے جو پہلے سے کشتیوں میں سوار تھے اُن کو غرق کیا
سومنات کی فتح اور بت شکنی کے بعد سلطان محمود نے پرم دیو راجہ نہروالہ کو سزا دینا ضروری سمجھا
لیکن وہ پہلے ہی نہروالہ سے تمام خزانہ او زر و جواہر لے کر ساحل گجرات کے قریب کسی جزیرہ میں چلا گیا
تھا۔ محمود نے اُس جزیرہ تک پہنچ کر اُس کو محصور کیا وہ وہاں سے بھیس بدل کر اور چھپ کر نکل بھاگا اور
اپنی جان بچا کر لے گیا۔ مگر اُس کا مال و اسباب سب محمود کے قبضہ میں آیا اُس کے بعد محمود نے نہروالہ میں
آکر قیام کیا اور ملک گجرات کو فسادیوں اور شر انگیز مادہ سے پاک کیا۔ پھر محمود نے سومنات کے لوگوں کو

بلا کر کہا کہ تم کس کو اپنا حاکم بنانا چاہتے ہو۔ انھوں نے اپنے مندر کے ایک پجاری کا نام لیا جو راجہ دابشلیم کا بھائی تھا۔ اس نے دابشلیم سے خوف ظاہر کیا۔ محمود نے حملہ کر کے دابشلیم کو گرفتار کر لیا اور دابشلیم کے بھائی کو گجرات و سومنات کا فرمانروا بنا کر دابشلیم کو اپنے ہمراہ غزنی لے گیا۔ جب دوسرے سال دابشلیم کے بھائی کا انتقال ہو گیا تو اس نے دابشلیم کو گجرات و سومنات کی حکومت پر مامور کر کے غزنی سے روانہ کیا۔ اس حملۂ سومنات میں محمود کے ڈھائی سال صرف ہوئے اور وہ ۴۱۷ھ میں غزنی واپس پہنچا۔ اسی حملے میں واپس جاتے ہوئے اس نے اجمیر کے راجہ کی بھی گوشمالی کی اور اس سے اقرار اطاعت لے کر اور قریباً تمام راجپوتانہ کو اپنی حکومت میں شامل کر کے غزنی پہنچا۔ پنجاب۔ ملتان۔ سندھ اور گجرات کے صوبے براہ راست غزنی کی سلطنت میں شامل ہو چکے تھے۔ کالنجر تک کے راجہ محمود کے پاس خراج بھیجتے اور اس کی فرمانبرداری کو موجب فخر جانتے تھے۔ محمود نے سومنات میں داخل ہو کر سومنات کی مورت کو ضرور توڑا لیکن شہر کے باشندوں کا قتل عام نہیں کرایا۔ بلکہ گجرات والوں کے ساتھ بحد رعایت و محبت کے ساتھ پیش آیا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ سلطان محمود گجرات ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے اور نہروالہ کو اپنا دارالسلطنت بنانے پر آمادہ تھا مگر اس کے وزیروں اور سرداروں نے اس رائے کی مخالفت کی اور اس کو غزنی لے گئے۔ غالباً محمود گجرات میں اسی لئے رہنا چاہتا ہو گا کہ یہاں رہنے سے قرامطہ بحرین کا بخوبی استیصال ہو سکتا تھا۔ سلطان محمود کی ساری عمر قرامطہ کی بیخ کنی میں صرف ہوئی چنانچہ گجرات سے غزنی پہنچ کر سلطان کو معلوم ہوا کہ رے میں قرامطہ نے زیادہ فساد فراہم کر دیا ہے ساتھ ہی صوبۂ طوس کے عامل کی عرضداشت پہنچی کہ اس طرف ترکمانوں کا فتنہ آپ کے آئے بغیر فرو نہ ہو گا چنانچہ اول سلطان طوس کی طرف گیا وہاں سے فارغ ہو کر رے پہنچا اور قرامطہ کی بیخ کنی کی۔ طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ۔

"امیر طوس بعد از جنگہائے عظیم بسلطان نوشت کہ تدارک فساد بجز آنکہ سلطان بذات خویش حرکت فرماید ممکن نیست۔ سلطان بذات خویش توجہ نمودہ استیصال ترکمانان نمود از انجا برے رفتہ خزائن و دفائن رے کہ حکام آنجا بسا لہائے دراز اندوختہ بودند بے محنت و مشقت بدست آورد و از باطل مذہبان و قرامطہ آنجا بسیار بودند ہر کہ ثابت شد بقتل رسید و ایں ولایت رے و اصفہان را با میر مسعود دادہ خود بغزنی مراجعت نمود"

روز پنجشنبہ ۲۳ ربیع الآخر ۴۲۱ھ کو سلطان محمود نے وفات پائی۔ اس کی تمام فوج کشیوں کا حال جو اس نے ہندوستان پر کیں اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اب ہر ایک شخص خود ہی غور کر سکے سلطان محمود کے

متعلق رائے قایم کرسکتا ہے کہ اُس کی لوٹ مار اور ظلم و ستم کے افسانے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ میں اس وقت سلطان محمود غزنوی کی علم دوستی۔ علم پروری۔ منصف مزاجی۔ رعیت نوازی کی شاندار روایتیں بھی نقل نہیں کرتا ہوں جو تاریخوں کے صفحات کی زینت اور مسلم فرمانرواؤں کے لئے موجب افتخار ہیں۔ میں اس وقت صرف الفنسٹن صاحب کا یہ قول اور سُنانا چاہتا ہوں کہ۔

"یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُس نے (سلطان محمود نے) ایک ہندو کو بھی مسلمان بنایا ہو"

پھر یہی مورخ آگے کہتا ہے کہ۔

"سوائے لڑائی کے اُس نے کسی ہندو کو قتل نہیں کیا"

اس باب کے ختم کرنے سے پہلے ہم کو سلطان محمود غزنوی کی اولاد اور اُس کے ہندو سپہ سالاروں اور ہندو لشکروں کا بھی مجمل طور پر کچھ بیان کر دینا چاہیے تاکہ ہمارے ہندو دوستوں میں مسلمانوں کی حملہ آوری کی کیفیت کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہو سکے۔

سلطنت غزنی کا ہندو لشکر اور سلطان محمود کی اولاد

جب سلطان محمود غزنوی کا انتقال ہوا ہے تو اُس کا بیٹا مسعود اصفہان میں اور دوسرا بیٹا محمد گرگان میں تھا۔ محمد بن محمود اول غزنی پہنچا اور باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ امرائے سلطنت مسعود بن محمود کی جانب زیادہ مائل تھے اُن کو محمد بن محمود کی تخت نشینی کچھ پسند نہ تھی۔ پچاس روز تک سب خاموش رہے۔ پچاسویں روز امیر ایاز نے جو لاہور سے غزنی آیا ہوا تھا دوسرے شاہی غلاموں کو اپنا ہمخیال بنا کر اور سب سے قسمیں لے کر ایک دوسرے امیر ابوالحسن علی بن عبداللہ معروف بہ علی دایہ کو بھی اپنا شریک کار بنایا اور دونوں امیر اپنی جمعیت لے کر اور شاہی طویلہ سے زبردستی گھوڑوں پر چڑھ کر امیر مسعود کی طرف روانہ ہوئے سلطان محمد بن محمود کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے سوندیرائے ہندو سردار کو ان دونوں امیروں کے تعاقب میں روانہ کیا۔ طبقات اکبری کے الفاظ یہ ہیں

"امیر محمد سوندیرائے ہندو را با لشکر بسیار بتعاقب ایشاں فرستاد چوں سوندیرائے و جمع کثیر از ہندواں کشتہ شدند و از غلامان نیز جمع کثیر بقتل آمدہ سرہائے ایشاں را نزد امیر محمد فرستادند و ایاز و علی دایہ ہمخیاں باتفاق غلاماں بتعجیل میرفتند تا بامیر مسعود در نیشاپور رسیدند"

سوندیرائے سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے ہندو لشکر کا سپہ سالار تھا۔ امیر مسعود نے غزنی پر حملہ کر کے امیر محمد بن محمود کو گرفتار کر کے اندھا کرایا اور ایک قلعہ میں محبوس و نظر بند کر دیا اور تخت سلطنت پر جلوس کر کے ہندوؤں کی سپہ سالاری سوندیرائے کی جگہ ناتھ نامی ہندو کو عطا کی ۴۲۲ھ میں

کیچ و مکران کا صوبہ براہ راست سلطنت غزنی میں شامل ہوا اور سلطان مسعود کے نام کا سکہ و خطبہ وہاں جاری ہوا سلطان محمود غزنوی نے اپنی وفات سے پہلے احمد بن حسن میمندی کو معزول کر کے کالنجر کے قلعہ میں قید کر دیا تھا اور اس کی جگہ احمد بن حسین بن میکائیل کو اپنا وزیر بنایا تھا جو سلطان محمود کی وفات تک وزارت کے عہدے پر مامور رہا۔ سلطان مسعود کی تخت نشینی کے بعد احمد بن حسین بن میکائیل حج کے لئے چلا گیا تھا وہاں ملک حجاز پر چونکہ عبیدیوں کا تسلط تھا لہذا حجاز سے اس وزیر کو عبیدی فرمانروا نے مصر بلوایا اور خوب خاطر مدارات بجا لا کر اپنی طرف مائل کیا۔ احمد بن حسن نے عبیدی فرمانروا کی بیعت کی اور سلطنت غزنی کے خلاف اشاعتی مقصد کو پورا کرنے کے ارادے سے واپس آیا۔ یہاں اس کے آنے پر قرامطہ اس کے پاس آنے جانے لگے۔ یہ حال سلطان مسعود کو معلوم ہوا اس نے بلا تامل ۴۲۲ھ میں احمد بن حسن بن میکائیل کو بلخ میں پھانسی دے کر مار ڈالا۔ اسی سال احمد بن حسن میمندی نے وفات پائی اور اسی سال سلطنت غزنی کا سپہ سالار اعظم التونتاش جو بڑا تجربہ کار شخص تھا فوت ہوا۔ ۴۲۳ھ میں سلطان مسعود نے قلعہ سرستی پر حملہ کیا۔ یہ قلعہ کشمیر کے کسی درہ میں واقع تھا یہاں حملہ کرنے کی یہ وجہ ہوئی تھی کہ کچھ مسلمان سوداگر اس طرف آئے تھے قلعہ والوں نے ان سوداگروں کو پکڑ کر ان کا تمام مال و اسباب چھین لیا اور ان کو قلعہ میں قید کر دیا۔ یہ خبر سن کر سلطان مسعود نے قلعہ سرستی پر حملہ کیا اور قلعہ والوں کو سزا دیکر سوداگروں کو آزاد کرایا اور ان کے اموال ان کو واپس دلائے یہ سلطان مسعود بن محمود کا ہندوستان پر پہلا حملہ تھا سلطان محمود کا غلام ایاز پنجاب کی حکومت عبداللہ قراتگین یا قاضی شیراز کے سپرد کر کے غزنی چلا گیا تھا اور ایاز ہی کی کوشش و پامردی سے سلطان مسعود کو تخت ملا تھا لہذا سلطان مسعود نے ایاز کو اپنی مصاحبت میں رکھ لیا تھا۔ اب ۴۲۵ھ میں سلطان مسعود کو ہندوستان آنا پڑا تو اس نے پنجاب کے صوبے کی حکومت کا یہ مستقل انتظام کیا کہ احمد نیالتگین کو ہندوستان کا سپہ سالار بنایا اور قاضی شیراز کو ہندوستان کے عہدۂ قضا پر مامور رکھا۔ اس زمانہ میں ملک کے انتظام کا یہ قاعدہ تھا کہ کسی ملک یا صوبہ کا ایک سپہ سالار ہوتا تھا جس کا کام فتوحات حاصل کرنا۔ فوج پر اقتدار قایم رکھنا اور ماتحت رئیسوں سے خراج وصول کرنا تھا۔ دوسرا بڑا افسر قاضی ہوتا تھا قاضی تمام مالی اور اندرونی انتظام کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ سلطان مسعود نے جب احمد نیالتگین کو ہندوستان کا سپہ سالار مقرر کیا تو قاضی شیراز نے جو لاہور میں قاضی ہندوستان کی حیثیت سے مقیم تھا احمد نیالتگین کی سپہ سالاری کو ناپسند کیا۔ احمد نیالتگین سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں سلطنت کے نہایت اہم اور ذمہ دارانہ عہدوں پر مامور رہ چکا تھا۔ سلطان محمود کا بڑا مزاجدان اور سلطان اس پر بیحد مہربان

تھا۔ احمد نیالتگین اپنی فوج لے کر لاہور سے مشرق کی جانب روانہ ہوا اور کالنجر تک کے تمام راجاؤں سے مقررہ خراج وصول کرتا ہوا چلا گیا۔ راستہ میں رہ بنارس بھی گیا اور وہاں کے راجہ کو مطیع بنا کر خراج وصول کیا۔ جو چھوٹے چھوٹے راجا اور ٹھاکر ایسے رہ گئے تھے کہ اُن پر نہ سلطان محمود غزنوی نے حملہ کیا تھا نہ کوئی اقرار فرمانبرداری اُن سے لیا گیا تھا اُن کو احمد نیالتگین نے اقرار اطاعت اور خراج گذاری پر مجبور کیا اور اس طرح شمالی ہند میں صوبۂ بہار تک سلطنت غزنی کی باقاعدہ شہنشاہی اور سیادت قائم ہوگئی۔ ہر ایک چھوٹے بڑے راجہ نے خراج گذاری اور سلطنت غزنی کی فرمانبرداری اپنا فرض سمجھا قاضی شیراز نے احمد نیالتگین کی غیر حاضری میں اُس کی شکایتیں لکھ لکھ کر سلطان مسعود کے پاس بھیجنی شروع کیں اُس نے سلطان کو لکھا کہ میرے خاص الخاص معتمد احمد نیالتگین کے ہمراہ ہیں اُنھوں نے مجھ کو لکھا ہے کہ احمد نیالتگین بغاوت اور اپنی خود مختاری کے اعلان کی تیاری کر رہا ہے اس قسم کے شکایتی خطوط قاضی شیراز نے سلطان کے پاس بیس کے قریب روانہ کئے۔ ہر خط میں سلطان کو احمد نیالتگین کی بغاوت اور عزم فاسد کا یقین دلایا جاتا تھا۔ اُدھر احمد نیالتگین کے خطوط ٹھاکروں سے خراج وصول ہونے اور شاہی خزانے کی حالت درست ہونے کی خوشخبری پر مشتمل براہ راست پہنچ رہے تھے۔ سلطان مسعود حیران تھا کہ ایک طرف احمد نیالتگین کے خطوط سے خلوص کی خوشبو آتی ہے دوسری طرف قاضی کے خطوط سے اُس کی بغاوت و سرکشی کی تیاریوں کا حال ظاہر ہوتا ہے۔ آخر احمد نیالتگین اضلاع مشرق سے فارغ ہو کر لاہور واپس آیا تو قاضی شیراز نے اُس کو لاہور میں داخل نہ ہونے دیا اور سلطان کو لکھا کہ وہ لاہور پر قابض ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کرنیوالا ہے۔ سلطان مسعود نے تفتیش احوال اور ضرورت ہو تو احمد نیالتگین کے گرفتار کر لینے کے لئے ناتھ نامی سپہ سالار کو مامور کیا کہ اپنی ہندو فوج لیکر جاؤ۔ ناتھ نے پنجاب آتے ہی قاضی شیراز کی باتوں میں آ کر احمد نیالتگین پر حملہ کر دیا احمد نیالتگین کو مجبوراً مقابلہ کرنا پڑا۔ اس لڑائی میں ناتھ مارا گیا۔ ناتھ کے مارے جانے کا حال سُن کر سلطان مسعود کو احمد نیالتگین کے باغی ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا مگر دوسرے تمام سردار احمد نیالتگین کو بیگناہ جانتے اور قاضی شیراز کی شرارتوں سے واقف تھے مگر سلطان کے خوف سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ سلطان مسعود باغ صد ہزارہ میں فروکش تھا تمام سرداروں، سپہ سالاروں، امیروں، وزیروں اور مصاحبوں کو بُلا کر مجلس مشورت منعقد کی اور کہا کہ بتاؤ احمد نیالتگین کے فتنے سے کس طرح نجات حاصل کیجائے۔ ان ایام میں وزیر اعظم خسلان وطخارستان کی طرف گیا ہوا تھا۔ سپہ سالار اعظم موجود تھا اُس نے کہا کہ مجھ کو حکم دیجئے میں لاہور جا کر سب بندوبست کر دونگا۔ سلطان نے کہا کہ تجھ کو خراسان کی طرف بھیجنے کی سخت ضرورت ہے

اگر میں خود اُس طرف گیا تب بھی تجھ کو میرے ہمراہ چلنا ضروری ہے۔ سپہ سالار نے کہا کہ اس مجلس میں
اور بھی بہت سے سردار موجود ہیں جس کو آپ حکم دیں گے وہ تعمیل کریگا۔ چونکہ تمام سردار احمد نیالتگین کی بیگناہی
اور قاضی کی شرارت سے واقف تھے اس لئے سب یہی چاہتے تھے کہ سپہ سالار اعظم یا وزیر اعظم جائے
اور وہاں پہنچ کر اصلیت یعنے قاضی کی شرارت سے سلطان کو آگاہ کرے۔ احمد نیالتگین پر چونکہ
بغاوت کا الزام لگ چکا تھا اس لئے اُس کی سفارش کرنا اب کوئی آسان کام نہ تھا۔ خود سپہ سالار اعظم
بھی باوجود واقف ہونے کے اُس وقت سلطان سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور اسی لئے وہ خود لاہور جانا
چاہتا تھا۔ غرض اس مسئلہ کی پیچیدگی سے تمام سردار ابھی خاموش اور سلطانی حکم کے منتظر تھے کہ یکایک
تلک نامی ہندو نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ میں لاہور جانے اور خدمت انجام دینے کے لئے تیار ہوں اور
چونکہ میں ہندوستانی ہوں اس لئے ہندوستان کے گرم موسم کی سختی بھی باآسانی برداشت کر سکونگا۔
یہ مہم مجھ کو سپرد فرمائی جائے۔ سلطان مسعود تلک کی اس پیش قدمی اور جرأت سے بہت خوش ہوا
اور اُس کو ہندوستان کی جانب روانہ کیا۔ تلک نے ہندوستان آکر احمد نیالتگین کو قتل کیا اور سلطان
کی خدمت میں واپس پہنچ کر مورد تحسین و آفرین ہوا۔ یہ واقعہ یعنی احمد نیالتگین کا قتل ۴۲۶ھ میں وقوع
پذیر ہوا۔ ذیحجہ ۴۲۶ھ کو تلک ہندوستان سے بمقام مرو سلطان کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ ہندوستان
میں ایک قلعہ ہانسی کا ایسا باقی رہ گیا ہے جہاں ابھی تک اسلامی لشکر کا قدم نہیں پہنچا اور ہندوستان میں
اس کی نسبت شہرت ہے کہ مسلمان اس قلعہ پر قابو نہیں پاسکیں گے۔ سلطان مسعود جانتا تھا کہ اس قسم
کی شہرتوں کا کیسا مضر اثر پیدا ہو سکتا ہے اور اسی مضر اثر سے محفوظ رہنے کے لئے سلطان محمود کو
سومنات پر حملہ کرنا پڑا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان مسعود سلجوقیوں کی معرکہ آرائیوں میں مصروف تھا اور
خراسان و ماوراء النہر و خوارزم کا علاقہ سلطنت غزنی کے قبضہ سے نکلنے والا تھا۔ آخر ذیحجہ ۴۲۸ھ
کو سلطان مسعود نے دربار منعقد کیا اور ارکان دربار سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں ہندوستان میں قلعہ ہانسی
کو ضرور فتح کرونگا اگرچہ آج کل ترکمانوں نے ہر طرف سے زور باندھ رکھا ہے اور بلخ و مرو وغیرہ
کی طرف میرے پہنچنے کی ضرورت ہے لیکن میں بلخ کی جانب اپنے بیٹے مودود کو اور مرو کی جانب سپہ سالار
کو بھیجتا ہوں اور خود ہندوستان کی طرف جاتا ہوں۔ وزیر اعظم میری جگہ اس ملک میں رہیگا۔ بادشاہ کی
زبان سے یہ الفاظ سن کر تمام اہل دربار نے اس رائے کی مخالفت کی اور مودبانہ عرض کیا کہ ہانسی کا
قلعہ تو کوئی معمولی سردار یہاں سے جا کر اور لاہور کی فوج کو ہمراہ لیکر فتح کر سکتا ہے لیکن سلطان کے مرو کی
جانب جانے کی اس وقت سخت ضرورت ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ ترکمانان سلجوقی تمام ملک پر چھا جائینگے

اور پھر تدارک محال ہوگا۔ سلطان نے کہا جا ہے کچھ ہو میں قلعہ ہانسی کی فتح میں اب دیر کرنا نہیں چاہتا سلطان کو بضد اور مُصر دیکھ کر سب خاموش ہوگئے لیکن دربار سے نکل کر سب نے سلطان کی رائے کو ہلاکت آفریں بتایا۔ ۲۲۔ ذیحجہ ۴۲۸ھ کو سلطان مسعود غزنی سے کابل کی جانب روانہ ہوا یکم محرم کو کابل سے چلا اور ۲۵۔ محرم ۴۲۹ھ کو دریائے جہلم کے کنارے دینار کوٹہ کے مقام پر پہنچ کر قیام کیا یہاں بیمار ہوکر چودہ روز مقیم رہا۔ شراب سے توبہ کی۔ تمام شراب دریائے جہلم میں پھکوا دی، شراب کے تمام برتن توڑوا دیے۔ ابھی اسی جگہ مقیم تھا کہ کشمیر کے راجہ کے مرنے کی خبر پہنچی۔ ۱۷ صفر ۴۲۹ھ بروز سہ شنبہ دریائے جہلم کو عبور کیا اور چہار شنبہ ۹۔ ربیع الاول کو قلعہ ہانسی کے سامنے پہنچ کر فصیل قلعہ کے نیچے قیام کیا۔ قلعہ کا محاصرہ کرکے لڑائی شروع کی ۲۰۔ ربیع الاول ۴۲۹ھ کو بزور شمشیر قلعہ پر قبضہ کیا۔ ۲۶۔ ربیع الاول ۴۲۹ھ کو ہانسی سے روانہ ہوکر قلعہ سونی پت فتح کیا پھر لاہور میں اپنے بیٹے مجدود کو چھوڑ کر ایاز کو اس کے ہمراہ بطور اتالیق مقرر کیا۔ اور شروع جمادی الاول ۴۲۹ھ میں غزنی پہنچ گیا۔ سلطان کی اس غیر حاضری میں ترکمانوں نے بہت زور پکڑ لیا اور پھر اس مصیبت کا کوئی تدارک سلطان مسعود سے نہ ہوسکا۔ ۴۳۱ھ میں بیابان سرخس کے اندر سلجوقیوں سے سلطان کی لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں پانسو ہندو بھی سلطان کے ہمراہ موجود تھے۔ سلجوقیوں کے مقابلہ میں سلطان مسعود کو یہ ایسی شکست ہوئی کہ پھر اُس نے ہمت ہار دی۔ غزنی پہنچ کر اُس نے تمام اموال و خزائن فراہم کئے اور سب کو اونٹوں پر بار کرکے ہندوستان کی جانب روانہ کیا۔ سرداروں اور امیروں نے ہر چند روکا لیکن سلطان مسعود نہ مانا غزنی سے تین ہزار اونٹ صرف سونے چاندی اور جواہرات کے خزانوں سے لدے ہوئے لے کر ہندوستان کی جانب اس ارادے سے چلا کہ لاہور کو دارالسلطنت قرار دے کر اور ہندوستان میں فوج مرتب کرکے سلجوقیوں کا مقابلہ کرونگا۔ اُس کا بیٹا مجدود ہندوستان میں پہلے ہی سے تھا تمام خزانہ ہندو لشکر کی نگرانی میں لئے ہوئے ہندوستان آیا۔ غزنی سے چلتے وقت اپنے بھائی محمد کو بھی جو اندھا ہونے کے بعد قید خانہ میں تھا اپنے ہمراہ لے لیا تھا۔ دریائے جہلم کے کنارے پہنچ کر ہندو لشکر نے بغاوت اختیار کرکے تمام خزانہ لوٹ لیا اُس وقت سلطان مسعود کو اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ اس ہندو لشکر نے یہ چالاکی کی کہ سلطان مسعود کو فوراً گرفتار کرکے اُس کے بھائی محمد کو جو قید میں تھا آزاد کردیا۔ اور اُس کو زبردستی تخت نشین کرکے مسعود کو اُس کے سامنے بطور مجرم پیش کیا۔ محمد نے مسعود کو قید کیا۔ اور محمد کے بیٹے احمد نے اپنے باپ کی اجازت کے بغیر اپنے چچا مسعود کو قید خانے میں قتل کردیا۔ اس جگہ یہ اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ سلطان محمود غزنوی سے اس لیے بہت

ناخوش ہیں کہ وہ ہندوستان سے سونا اور چاندی وغیرہ لوٹ کر غزنی لے گیا تھا اُن کو خوش ہونا چاہیے
کہ سلطان محمود کا بیٹا مسعود غزنوی سلطنت غزنی کا تمام خزانہ جس میں ہندوستان کی لوٹ کے علاوہ
خراسان و ماوراء النہر وغیرہ کے صوبوں کا خراج بھی شامل تھا سب کا سب ہندوستان واپس لے آیا
اور دریائے جہلم کے کنارے ہندو لشکریوں نے وہ سب کا سب دھڑی دھڑی کرکے لوٹ لیا۔ یعنے جو
سونا چاندی ہندوستان سے گیا تھا وہ معہ سود ہندوستان میں واپس آگیا غزنی میں کچھ نہیں رہا۔ سلطان
مسعود کے قتل کا حال سن کر مودود بلخ سے غزنی پہنچا اور خزانہ کو بالکل خالی پایا۔ سلطان مسعود نے یہاں
تک مبالغہ سے کام لیا تھا کہ سرکاری عمارتوں کے قیمتی پردے تک بھی اُتروا کر اپنے ہمراہ لے لیئے تھے اور
کوئی قیمتی چیز غزنی میں نہیں چھوڑی تھی۔ غزنی سے مودود باپ کا انتقام لینے کی غرض سے روانہ ہوا
اودھر سے سلطان محمد بھی مقابلے پر مستعد ہوگیا۔ محمد اور اُس کا بیٹا احمد لڑائی میں مارے گئے۔ لاہور
میں مجدود اور ایاز پہلے سے قابض و متصرف تھے جب مودود نے لاہور پر قبضہ کرنا چاہا تو ایاز اور مجدود
مقابلہ کی تیاری کی اور مودود واپس غزنی چلا گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۴۳۳ھ کے آخر یا ۴۳۴ھ کے شروع
ایام کا ہے۔ سنہ ۴۳۴ھ کے آخر ایام میں مودود لشکر لے کر لاہور پر حملہ آور ہوا۔ ابھی دونوں لشکروں
کا مقابلہ نہ ہونے پایا تھا کہ ۹۔ ماہ ذی الحجہ سنہ ۴۳۴ھ کو نہایت پُراسرار طریقے سے مجدود اپنے خیمہ کے اندر مردہ
پایا گیا اور اسی قریبی زمانے میں ایاز بھی فوت ہوگیا۔ اس طرح پنجاب کا تمام ملک بآسانی مودود کے
قبضے میں آگیا۔ سلطان محمود کے زمانے میں ایک ہندو سپہ سالار سنجے رسالے تھا جو بارگاہ محمودی میں
رتبہ عالی رکھتا تھا اور ندیم خاص سمجھا جاتا تھا وہ سلطان محمود سے اجازت لیکر کشمیر چلا آیا تھا۔ طبقات اکبری کی
روایت کے موافق ناراض ہوکر کشمیر آگیا تھا۔ سلطان مودود نے سنجے رسالے کو سنہ ۴۳۲ھ میں کشمیر سے اپنے دربار
میں بُلوایا اور بڑی تکریم و قدردانی کے ساتھ پیش آیا۔ یہ جو کچھ بیان ہوا ہے تاریخ بیہقی۔ تاریخ فرشتہ اور
طبقات اکبری سے بطور خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ تاریخ بیہقی کا مصنف ابوالفضل بیہقی ہے جو سلطان مسعود بن
محمود کا میر منشی اور مصاحب خاص تھا اُس نے سنہ ۴۵۱ھ میں اپنی تاریخ بیہقی لکھی ہے پس ظاہر ہے کہ تاریخ
بیہقی سے زیادہ معتبر دوسری کتاب سلطان محمود غزنوی اور مسعود غزنوی کی نسبت ہم کو دستیاب نہیں
ہوسکتی۔ میں اس جگہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تاریخ بیہقی سے تلک کا مفصل حال ترجمہ کرکے ذیل میں درج
کروں یہ وہی تلک ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس نے احمد نیالتگین پر قبضہ کیا تھا۔

راجہ تلک پسر جے سنگھ کا حال تلک ایک ہندو حجام کا لڑکا تھا۔ خوش گفتار و خوش سیرت تھا۔
ہندی اور فارسی بہت خوشخط لکھتا تھا۔ ایک مدت تک کشمیر میں

رہ چکا تھا۔ وہاں کسی کا شاگرد بن کر جادوگری اور بازیگری بھی سیکھ چکا تھا۔ کشمیر سے روانہ ہو کر قاضی شیراز ابوالحسن کی خدمت میں آیا اور اُسی کے پاس رہنے لگا۔ قاضی ابوالحسن (جو قاضی شیراز کے نام سے شہرت رکھتا تھا) اور وزیر اعظم احمد بن حسن میں اَن بن تھی قاضی شیراز نے تلک کو نامناسب طور پر نظر بند کر دیا اس کا حال وزیر اعظم کو معلوم ہوا تو اُس نے تین خیلتاشوں کے ہاتھ شاہی حکم بھجوا کر تلک کو اپنے پاس بلوایا اور سلطان محمود سے قاضی کی شکایت کی چنانچہ قاضی پر سلطانی عتاب نازل ہوا۔ تلک وزیر اعظم کے پاس رہنے لگا اور چند روز کے بعد وزیر اعظم نے اُس کو اپنا میر منشی اور مترجم مقرر کر لیا۔ تاریخ بیہقی کا مصنف ابوالفضل لکھتا ہے کہ میں نے بارہا بچشم خود تلک کو دیکھا ہے کہ وہ وزیر اعظم کے دربار میں دبیری و مترجمی کے علاوہ باہر کے پیغامات لاتا اور وزیر اعظم تک پہنچاتا تھا اور کام سلیقہ سے کرتا تھا۔ جس طرح وزیر اعظم کا میر منشی تلک تھا اسی طرح شہزادہ ولیعہد یعنی مسعود ابن محمود کا میر منشی بھی ایک ہندو تھا جس کا نام بیرپال تھا۔ ایک روز سلطان محمود غزنوی نے وزیر اعظم خواجہ احمد بن حسن کے تمام نوکروں اور منشیوں کو بلا کر سب کی قابلیتوں کا اندازہ کرنے کے لئے امتحان لیا تاکہ جو لوگ سلطانی دربار کے قابل ہوں اُن کو انتخاب کیا جائے۔ اس امتحان میں تلک سب سے زیادہ قابل ثابت ہوا۔ چنانچہ سلطان محمود نے تلک کو وزیر اعظم سے مانگ لیا اور تلک سلطانی ترجمان بہرام کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا۔ جب سلطان محمود نے اپنے بیٹے مسعود کو ولیعہدی سے معزول کر کے اپنے دوسرے بیٹے محمد کو ولیعہد بنایا تو امراء کے دو فریق ہو گئے ایک فریق محمد کا طرفدار تھا اور دوسرا مسعود کا۔ تلک اُس فریق میں شامل تھا جو مسعود کا طرفدار تھا اور سپہ سالار ہندوان یعنی سوندیرائے اُس فریق میں شامل تھا جو محمد کا خیر خواہ تھا جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے سوندیرائے سلطان محمد بن محمود کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد ہی امیر محمد اندھا ہو کر قید ہوا اور سلطان مسعود نے تخت نشین ہو کر سوندیرائے کی جگہ ناتھ کو ہندو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ جب ناتھ احمد نیالتگین کے مقابلے میں مارا گیا تو اس کی جگہ تلک کو ہندو فوج کا سپہ سالار بنایا گیا۔ سلطان مسعود نے اُس کو خلعت زر عطا کیا۔ زرین طوق جس پر بیچے موتی اور ہیرے جڑے ہوئے تھے اپنے ہاتھ سے تلک کی گردن میں پہنایا۔ گھوڑے عطا کئے۔ سراپردہ اور چتر سے سرفراز کیا۔ اس عزت افزائی کے موقع پر طبل جس کا ہندو کے راجاؤں میں دستور ہے بجتا تھا۔ ایک جھنڈا جس کے اوپر طاس زریں آویزاں تھا عطا کیا سرداران اعظم کے برابر بیٹھنے کی اجازت دی۔ خلوت اور خاص الخاص مشوروں میں شامل کیا جانے لگا۔ اس موقع پر ابوالفضل بیہقی کے الفاظ یہ ہیں۔

"خردمندان چنیں اتفاق ہا را غریب ندارند کہ کس از مادر وجیہ نزاید و مردمان بہ رسند اما شرط

آنست کہ نام نیکو یادگار ماند وایں تلک مرغے جلد آمد و اخلاق ستودہ نمود و آں مدت کہ عمر یافت
زیانیش نداشت کہ پسر حجامے بود واگر باآں نفس وخرد وہمت اصیل بودے نیکو ترشدے
کہ عظامی عصامی بس نیکو باشد ولیکن عظامی بیک پشیز نیرزد چوں فضل وادب ونفس ولیاقت
درس ندارد وہمہ سخنش آں باشد کہ پدرم چنیں بود وشاعرے سرہ گفت است۔

ما بالھم نسبا لو قلت فی الحسب   لقد صدقت ولکن بئس ما ولدوا

یہ ذکر بھی اوپر آچکا ہے کہ کس طرح احمد نیالتگین کی سزا دہی کے لئے سلطان مسعود نے تلک کو سپہ سالار ہند بنا کر بھیجا تھا۔ تفصیل اُس کی اس طرح ہے کہ سلطان مسعود کو تلک کی پیشقدمی بہت پسند آئی۔ دربار برخاست ہوا۔ سلطان نے محل میں جاکر اپنے دبیر ابوالحسن عراقی کو تلک کے پاس بھیجا اور پیغام دیا کہ ہم تم کو تمام سرداروں پر فوقیت و برتری دینا چاہتے ہیں تم کسی کی رقابت سے ہرگز نہ گھبرانا جس قسم کے سامان کی ضرورت ہوگی تم کو دیا جائیگا اور کل اس مہم پر تم نامزد کردیے جاؤگے تلک نے ابوالحسن عراقی کے ذریعہ چند خواہشات سلطان کی خدمت میں پیش کیں چنانچہ دربار سلطانی سے یہ فرمان جاری ہوا کہ۔

"جب تلک مقام برغوزک سے گذر جائے تو اُس کے بعد وہ خود مختار ہے اپنے اختیار سے جو چاہے کرے اور ہندوؤں کی تمام فوجیں تلک کے ہمراہ جائیں شاہی دبیر تلک کے ہمراہ رہیگا اور وہ تلک کے احکام اسی طرح لکھا کریگا جیسے کہ شاہی فرامین لکھے جاتے ہیں تلک کے تمام ہمراہی تلک کی فرمانبرداری اسی طرح کرینگے جیسے صاحب تخت بادشاہ کی کیجاتی ہے"

اہل دربار کو یہ تمام کارروائیاں بہت ہی شاق گذریں مگر چونکہ احمد نیالتگین کی موت آچکی تھی اُس کے قدرتی سامان ہونے ضروری تھے۔ سلطان نے تلک کو بیقیاس اموال وخزائن اور ذخائر زروجواہر عطا کیے۔ جب تلک کا تمام ساز وسامان درست ہوگیا اور وہ روانگی پر آمادہ ہوا تو سلطان نے اُس کو نہایت اعلےٰ درجہ کا خلعت پہنایا نقارہ وعلم عطا کیا۔ بڑی محبت کی باتیں کیں۔ دوسرے روز سلطان قصر فیروزہ میں آکر بیٹھا۔ ہندوؤں کا لشکر سوار و پیادہ اُس کے سامنے سے گذرنا شروع ہوا۔ تلک جب سلطان کے سامنے پہنچا تو قریب آکر گھوڑے سے اُتر پڑا۔ زمین خدمت چومی اور پھر سوار ہوگیا۔ یہ منگل کا روز جمادی الآخر کی پندرھویں تاریخ تھی۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد تلک لاہور کے قریب پہنچ گیا اُس نے دیکھا کہ شہر پر قاضی شیراز قابض ہے اور شہر کے قریب تھوڑے فاصلے پر احمد نیالتگین اپنے ہمراہیوں کو لئے پڑا ہے۔ قاضی شیراز نے تلک کے پہنچنے پر بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ باشندگان لاہور کا اکثر حصہ احمد نیالتگین کا ہوا خواہ تھا اور اُس کے لشکر کو شہر لاہور سے

سامان رسد پہنچا رہا تھا۔ قاضی شیراز نے سب سے پہلے لاہور کے اُن لوگوں کے نام تلک کو بتائے جو احمد نیالتگین کی ہمدردی کا دم بھرتے تھے تلک نے ان تمام لوگوں کو گرفتار کرا کر اپنے سامنے بلوایا اور سب کے داہنے ہاتھ کٹوا ڈالے۔ اس سخت سزا کو دیکھ کر تمام شہر کانپ گیا اور کسی کو اتنی جرأت نہ رہی کہ احمد نیالتگین کی ہمدردی کا دعوےٰ کرے یا اُس کے لشکر کو رسد پہنچائے۔ اس کے بعد تلک اور احمد نیالتگین میں لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ تلک نے انواع و اقسام کے لالچ دے کر احمد نیالتگین کے ہمراہیوں کو توڑنا اور اپنی طرف مائل کرنا شروع کیا۔ احمد نیالتگین کی جمعیت دن بدن کم ہونے لگی اور تلک نے اُس کو کوئی ایسا موقع نہیں دیا کہ وہ اپنی بگڑی ہی کا یقین سلطان مسعود کو دلا سکتا۔ آخر چند روزہ معرکہ آرائی کے بعد احمد نیالتگین صرف دو سو ہمراہیوں کے ساتھ لاہور سے ملتان و سندھ کی جانب چل دیا تلک نے منادی کرا دی کہ جو شخص احمد نیالتگین کا سر کاٹ کر لائیگا اُس کو پانچ لاکھ درم انعام دیا جائیگا۔ جٹوں کی قوم اس گراں سنگ انعام کے لالچ میں اُٹھ کھڑی ہوئی آخر مقام منصورہ کے قریب دریائے سندھ کو عبور کرتے ہوئے جٹوں نے جا لیا اُس وقت احمد نیالتگین کے ہمراہ صرف چند آدمی باقی رہ گئے تھے اُس نے اپنا ہاتھی دریا میں ڈالا۔ دوسرے ہاتھی پر اُس کا خردسال بیٹا سوار تھا عین دریا کے اندر ایک ہزار جٹوں نے اُس کو گھیر لیا۔ سخت معرکہ آرائی اور بڑے کشت و خون کے بعد احمد نیالتگین مارا گیا جٹوں نے اُس کا سر کاٹ لیا اور اُس کے چھوٹے بچے کو گرفتار کر لیا ماہ ذیحجہ ۴۲۶ھ کو تلک احمد نیالتگین کا سر لے کر سلطان مسعود کی خدمت میں جبکہ وہ مرو میں مقیم تھا پہنچا تلک ہندوستان سے ہندوؤں کا ایک نہایت شاندار لشکر لے کر پہنچا اور یہاں کے ٹھاکروں اور جٹ سرداروں کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ ان ٹھاکروں میں ایک دوسرا تلک بھی تھا سلطان اس دوسرے تلک کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ تلک ہندوستان سے پچپن ہاتھی بطور خراج وصول کر کے لے گیا تھا وہ بھی سلطان کی خدمت میں پیش کیے۔ محرم ۴۲۷ھ میں سلطان بلخ کی طرف آیا یہاں ایک بڑا دربار منعقد کیا ابو الفضل بیہقی کے الفاظ یہ ہیں۔

"روز دوشنبہ یازدہم صفر دیگر دربار عظیم منعقد فرمودہ تلک را خلعت دادند بسالاری ہندوان خلعت سخت نیکو۔ چوں پیش سلطان آمد و خدمت کرد سلطان خزینہ دار را گفت طوقے بیارد مرصع بجواہر کہ ساختہ بودند بیاوردند سلطان بپسند و تلک را پیش خواندو آں طوق را بدست عالی خویش در گردن تلک افگند و نیکوئیہا گفت بزبان بخدمتے کہ نمودہ بود در کار احمد نیالتگین و باز گشت"۔

اس کے بعد سلطان مسعود نے ایک بہت بڑی ضیافت تلک کی تکریم میں ترتیب دی تمام ارکان

سلطنت اور شرفائے ملک کو بلایا اور کھانا کھلایا۔ احمد نیا لتگین کے قتل کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ارکانِ سلطنت سلطان سے بددل ہوگئے اور رفتہ رفتہ سلطنت کے کاموں میں اختلال پیدا ہوتا گیا۔ چونکہ تلک کو اول ٹھاکر اور پھر راجہ کا خطاب سلطان مسعود نے دیا تھا اسی لیے پنجاب میں آج تک حجاموں کو ٹھاکر اور راجہ کے خطاب سے مخاطب کیا جاتا ہے۔

ہندو فوج کا کرمانی کارنامہ

ایک مرتبہ سلطان مسعود نے احمد علی نوشتگین کو سپہ سالار بنا کر کرمان کی جانب روانہ کیا کہ وہاں کی بغاوت کو فرو کرو۔ چار ہزار ہندو سپاہی اس کے ہمراہ کیے اور دو ہزار سگزی پیادے سیستان سے احمد علی نوشتگین کے ہمراہ ہوئے اس طرح یہ چھ ہزار کا لشکر کرمان پہونچا تو ماشیر کے مقام پر دشمنوں سے مقابلہ ہوا تو ہندوؤں نے بڑی بزدلی دکھائی اور سلطانی لشکر نے شکست پائی۔ اس غم و شرمندگی میں احمد علی نوشتگین کی جان گئی۔ ہندو لشکر کی بزدلی جب ثابت ہو گئی تو سلطان نے فوج سے اُن کا نام کاٹ دینے کا حکم دیا۔ اپنی موقوفی و برطرفی کا حکم سن کر چھ ہندو سردار خودکشی پر آمادہ ہوگئے اور اپنے پیٹ میں کٹار مارنے لگے سلطان نے سن کر کہا کہ یہ کٹاریں کرمان میں چلانی چاہیے تھی۔ بہرحال یہ واقعہ زبردست دلیل اس بات کی ہے کہ ہندو لوگ غزنوی سلطنت کے لشکر میں بڑی آرزو اور خواہش کے ساتھ بھرتی ہوتے تھے اور جب اُن کو موقوف کیا جاتا تھا تو وہ غم کے مارے خودکشی پر آمادہ ہو جاتے تھے مندرجہ بالا واقعہ کو ابوالفضل بیہقی نے اپنا چشم دید ان الفاظ میں لکھا ہے کہ:

"اما ہندوان سستی کردند و پشت بہزیمت بدادند دیگراں را دل بشکست و احمد علی نوشتگین را بضرورت ببایست رفت وے با فوجے از خواص خویش و لشکر سلطان از راہ قائن بہ نیشاپور باز آمدند و فوجے بکرمان افتادند و ہندوان بسیستان آمدند و از انجا بغزنی من کہ بوالفضلم با سلطان بخدمت رفتہ بودم بباغ صد ہزارہ مقدمان ایں ہندواں را دیدم کہ آنجا آمدہ بودند و امیر فرمودہ بود تا ایشاں را در خانۂ بزرگ آنجا کہ دیوانِ رسالت داشتند بنشاندند و بوسعید مشرف پیغامہا درشت می آورد سوئے ایشاں از سلطان و کار بدانجا رسید کہ پیغامے آمد کہ شمارا جواب فرمودہ آید شش تن مقدم تر ایشاں خویشتن را بکٹارہ زد چنانکہ خون در آں خانہ رواں شد من و بوسعید و دیگراں از آں خانہ برفتیم و ایں خبر بسلطان رسانیدند گفت ایں کٹارہ بکرمان بایست زد بسیار بمالیدشان و آخر عفو کرد۔ احمد علی نوشتگین نیز بیامرد چوں خجلے و متند رستے بود بس روزگار برنیامد کہ گذشتہ شد۔"

خاندانِ محمود کا زوال

اوپر ذکر آچکا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی نے ہندو نوازی کی بدولت کس طرح اپنی جان دی۔ سلطان مسعود کے بیٹے مودود نے ۲۴۔ رجب ۴۴۱ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد تین مہینے علی بن مسعود نے حکومت کی اس کے بعد عبدالرشید بن مسعود نے چار سال حکومت کی اس کے بعد فرخ زاد بن مسعود چھ سال فرمانروا رہا اس کے بعد ابراہیم بن مسعود تخت نشین ہوا۔ ابراہیم بن مسعود نے تخت نشین ہو کر سلجوقیوں سے صلح کی اور ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ کئی بار حملے کئے یہاں کے سرکشوں کو درست کیا بعض کو گرفتار کرکے غزنی لے گیا سیاوش گرد عرف جانڈی کا قلعہ فتح کیا اجودھن یا پاک پٹن کو فتح کرکے وہاں کے باغیوں کو راہ راست پر لایا اور اس مقام سے تخم بغاوت مٹایا ۴۹۲ھ میں سلطان ابراہیم بن مسعود نے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مسعود بن ابراہیم تخت نشین ہوا اور سولہ سال حکومت کی اس کے بعد اس کا بیٹا ارسلان شاہ بن مسعود تخت نشین ہوا اس کا بھائی بہرام شاہ بھاگ کر سلطان سنجر سلجوقی کے پاس گیا اور اس سے اعانت کا خواہ ہوا۔ سلطان سنجر نے غزنی پر فوج کشی کی ارسلان شاہ شکست کھا کر ہندوستان کی طرف بھاگ آیا۔ سنجر نے بہرام شاہ کو تخت نشین کرکے خود غزنی سے خراسان کی جانب مراجعت کی۔ ارسلان شاہ نے ہندوستان سے بہت بڑا لشکر لے کر غزنی پر چڑھائی کی مگر بہرام شاہ کے ہاتھ سے مارا گیا کیونکہ ہندی فوج نے کوئی بہادری نہیں دکھائی بلکہ میدان کارزار گرم ہوتے ہی پیٹھ دکھائی اور ارسلان شاہ نے غیرت کی وجہ سے اپنی جان گنوائی۔ اس کے بعد بہرام شاہ نے ہندوستان پر کئی مرتبہ حملے کئے اور یہاں کے تمام سرکشوں کو مطیع و منقاد بنایا اور ہر قسم کے مادہ فساد کو مٹایا ۵۴۷ھ میں بہرام شاہ نے وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو شاہ بن بہرام شاہ تخت نشین ہوا چونکہ وہ علاء الدین حسین غوری کا مقابلہ نہ کر سکا لہٰذا لاہور چلا آیا اور یہاں ۵۵۵ھ میں فوت ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک لاہور میں تخت نشین ہوا اور ۵۸۳ھ میں خاندان محمود کا خاتمہ ہو گیا۔ خاندان محمود کے زوال کا سبب سلجوقیوں کے حملے اور سلاطین غزنی کا ہندوؤں پر سب سے زیادہ اعتماد کرنا بتایا جاتا ہے خاندان محمود کا آخری بادشاہ خسرو ملک تھا جس کو سلطان شہاب الدین غوری پنجاب سے گرفتار کرکے لے گیا تھا۔

خاندانِ غزنی کے عہدِ حکومت میں ہندوؤں کی حالت

محمود غزنوی ہندوؤں پر کس قدر مہربان تھا اس سے اس قدر عفو و درگزر سے کام لیا اس کی امداد سے ہندوؤں کی کیسی قدر دانی کی ...

عہد ہندوؤں کو سلطنت غزنی میں حاصل ہوئے اس کا ذکر بطور نمونہ اوپر ہو چکا ہے۔ اس باب کو
ختم کرنے سے پہلے ہم کو ہندوستان پر پھر ایک نظر ڈالنی چاہیے کہ محمود کی وفات سے خسرو ملک تک
ہندوستان میں ہندوؤں کی حالت کیا رہی اور ان میں کون کون سے تغیرات پیدا ہوئے۔ پنجاب
کے راجہ جیپال کی خودکشی کے بعد ملک ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو جوش پیدا ہوا تھا
اس کو سلطان محمود غزنوی نے اپنی زندگی ہی میں فرو کر دیا اور جنگ سومنات کے بعد ہندوؤں نے
مسلمانوں کے مقابلے کا خیال ترک کر دیا یا یوں کہئے کہ تمام ملک پھر مسلمانوں کے مقابلہ پر متحد نہیں
کیا جا سکا اس یاس اور بار بار کی ہزیمتوں نے جدید برہمنی اور مسخ شدہ بودھ مذہب کے اس اتفاق
و اتحاد کو جو مسلمانوں کی مخالفت میں عارضی طور پر قائم ہوا تھا پائدار و استوار اتفاق میں تبدیل کر دیا
اور دونوں مذہبوں کے پنڈتوں نے اپنے راجاؤں اور اپنی قوموں کو مسلمانوں کے مقابلے میں
ضعیف و بیکار دیکھ کر اور مایوس ہو کر آپس کی پرانی رقابتوں کے بیدار کرنے اور ایک دوسرے کے
مقابلے میں مستعد ہونے کے خیال کو ترک کر کے آپس میں ایک ہی ہو جانے کو مناسب سمجھا۔
اس اتفاق کی ابتدا اگرچہ جنگی تیاریوں کے لئے کی گئی تھی مگر اب جنگی تیاریوں میں ناکامی دیکھ کر مذہبی
تعمیر اور مذہبی امتزاج ایک دوسرے نقطۂ نظر کی بنا پر عمل میں آنا شروع ہوا۔ ویدانت اور جدید تصوف کی
بنیاد پڑی۔ شیوی مذہب کی ترقی ہوئی اور اس موضوع پر خیالات کی نشو و نما شروع ہوئی۔ دوسری
طرف نوزائیدہ ویشنو مذہب کے بہت سے اعمال و عبادات میں مناسب تاویلیں ہونے لگیں یہ
یہ تمام حالات اب کسی نظام کسی سازش اور باقاعدہ مرکز کے ماتحت اور محتاج نہ تھے بلکہ ایک فطری تقاضا
تھا اور اسباب و علل کی لہر نے ہندو نسلوں کو بلا ارادہ اس جانب بہا دیا تھا۔ پنجاب۔ ملتان اور سندھ کے
صوبے براہ راست سلطنت غزنی کا جزو بن چکے تھے۔ گجرات، مالوہ، اجمیر، دہلی، مہابن، برن، قنوج
میرٹھ، گوالیار، کالنجر وغیرہ ریاستیں سلطنت غزنی کو باقاعدہ خراج ادا کرتی تھیں۔ سلطان مسعود کے زمانہ
میں سونی پت اور بنارس کے رہے ہوئے علاقے بھی مفتوح اور خراج گذار بنا لیے گئے تھے۔ ہندوستان
میں خواجہ ایاز کی وفات تک کسی قسم کا کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا۔ ایاز کی وفات اور سلجوقیوں کے مقابلے
میں مودود کے شکست یاب اور مبتلائے آلام ہونے کے بعد جبکہ خراسان و ماوراء النہر و خوارزم وغیرہ
بڑے بڑے صوبے سلطنت غزنی سے سلجوقیوں نے چھین لئے تھے دہلی کے راجہ انگ پال اول نے
مذہبی جذبے سے کام لینے اور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھانے
اور عجیب و غریب چالاکی کو کام میں لانے کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ تفصیل اس کی اس طرح ہے

کہ دہلی کے راجا اننگ پال اول نے ایک پنڈت کے مشورے سے یہ مشہور کیا کہ میں نے اس بت کو جسے محمود غزنوی اپنے ہمراہ غزنی لے گیا ہے خواب میں دیکھا ہے۔ بت نے مجھ سے فرمایا ہے کہ میں اتنے دنوں غزنی میں اسی لیے رہا کہ سلطنت غزنی کو برباد کر سکوں چنانچہ میں اس سلطنت کو اب بہت کچھ کمزور کر چکا ہوں یقین ہے کہ چند روز میں یہ سلطنت خود بخود مٹ جائیگی اب میرے غزنی میں رہنے کی ضرورت نہیں رہی لہذا میں ہندوستان واپس آنیوالا ہوں تم کو چاہیے کہ اپنا تمام وہ ملک جو مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا ہے اُن سے چھین لو اور میرے منتظر رہو۔ اس اعلان کے بعد راجا نے اپنے معتمد سنگ تراش کو بلایا اور کہا کہ جس قسم کا وہ بت تھا اُسی قسم کے پتھر کا بالکل ویسا ہی ایک بت پوشیدہ طور پر تیار کرو۔ سنگ تراش نے حسب فرمائش بت تیار کر لیا۔ راجا نے ہانسی اور تھانیسر کا علاقہ جو صوبۂ پنجاب کا مشرقی حصہ تھا سلطنت غزنی کے عاملوں سے چھین لیا اور عوام میں اپنے خواب کو خوب شہرت دی ہندوؤں کو دوبارہ مستعد بنانے اور مسلمانوں کے مقابلہ پر آمادہ کرنے کی اس سے بہتر کوئی دوسری تدبیر نہیں ہو سکتی تھی جو راجہ نے ایک پنڈت کی رہبری میں انجام دی۔ ہانسی اور تھانیسر کی فتح کے بعد نگرکوٹ پر چڑھائی کی غزنوی سلطنت کے عامل کو نکال کر قبضہ کیا اور اُس علاقہ میں ایک باغ کے اندر اُس بت کو رات کے وقت رکھوا دیا۔ باغ کا مالی صبح کو بیدار ہوا تو اُس نے بت کو باغ میں موجود پایا۔ راجہ کے خواب کی پہلے سے شہرت تھی ادھر بت بھی ویسا ہی تھا یکدم شور مچ گیا کہ غزنی سے بت واپس تشریف لے آیا جیسا کہ اُس نے خواب میں راجا سے کہا تھا۔ اس کے بعد وہ پنڈت جو اس تجویز کا بانی تھا راجہ کو ہمراہ لے کر بت کے سامنے پہنچا خوب خوشیاں منائی گئیں۔ آخر وہی پنڈت جی مہاراج بت کے پجاری اور خادم قرار دیے گئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ بت کہتا ہے کہ میں ایک شب میں غزنی سے چل کر یہاں تک پہنچا ہوں اس لیے کسی قدر تھک گیا ہوں مجھے کو ذرا آرام کرنے دو اور بہت جلد نگرکوٹ کو مسلمانوں سے خالی کر دو۔ چنانچہ نگرکوٹ پر ہندوؤں کا قبضہ مکمل ہو گیا۔ اس واقعہ کی شہرت تمام ہندوستان میں ہوئی اور بہت سے راجہ دہلی کے راجا کی امداد و اعانت کو پہنچ گئے اور بت کی زیارت سے مشرف ہوئے یہ تمام واقعات اور بت کے خواب میں دیکھنے اور غزنی سے واپس آنے کا قصہ بالتفصیل تاریخ فرشتہ میں درج ہے۔ سلطان عبدالرشید کے زمانہ میں ایک مسلمان سردار نے حملہ کر کے اس علاقہ کو دہلی کے راجہ سے چھین لیا لیکن ۱۰۴۳ء میں ہندوؤں نے پھر زور پکڑ کر تھانیسر و ہانسی پر قبضہ کر لیا۔ یہ حال سن کر ۱۰۷۹ء میں سلطان ابراہیم بن مسعود نے حملہ کیا اور ہندوؤں سے اس علاقے کو فتح کر کے اپنے عامل مقرر کئے ہر دوار کا علاقہ بھی فتح کیا۔ ہندو راجاؤں نے خراج بھیجنا بند کر دیا تھا اُن سے خراج وصول کر لیا اور سلطان محمود کے

زمانہ کی عظمت و شوکت پھر ہندوستان میں قائم کر دی۔ ۵۱۱ھ میں جبکہ ارسلان شاہ اور بہرام شاہ کی مخالفت کے سبب سلطنت غزنی کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی تھی خود سلطنت غزنی کے ایک سپہ سالار نے جو ہندوستان میں مامور تھا اپنی بغاوت کو کامیاب بنانے کے لئے تھانیسر و سونی پت کے علاقہ کو دہلی کے راجہ کی سپرد کر دیا مگر چند ہی روز کے بعد بہرام شاہ نے ہندوستان آکر اس علاقہ کو سلطنت غزنی میں شامل کیا اور پھر سلطنت غزنی کا تسلط اور رعب اس ملک کے راجاؤں پر قائم کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت غزنی اگرچہ بحید کمزور ہو کر موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی لیکن پھر بھی اس کا اس قدر رعب ضرور قائم تھا کہ پنجاب و سندھ وغیرہ کی طرف ہندو نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ ہانسی و تھانیسر کے علاقے کو جب کبھی موقع ملتا تھا ہندو دبا لینا چاہتے تھے مگر جب کبھی سلطنت غزنی کا کوئی سلطان یا سردار اس طرف فوج کشی کرتا تھا فوراً چھوڑ کر الگ ہو جاتے تھے۔ بہرام شاہ کے بعد جبکہ خسرو شاہ غوریوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا تو دہلی کے راجہ نے پھر اس علاقے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور خسرو ملک کے عہد میں وہ اس پر قابض ہو گیا۔ اس علاقے کو سلطنت غزنی نے پنجاب کا جزو بنا دیا تھا لیکن دہلی کا راجہ اس کو اپنی ریاست کا جزو اور پنجاب سے جدا سمجھ کر اس پر قابض ہونا اور اس علاقے کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتا تھا۔ اس جگہ یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ ۳۸۳ھ میں توار قوم کے ایک راجپوت راجا نے دلی کو آباد کیا تھا جو تھانیسر کا راجا تھا۔ اس کے بعد سلطان محمود غزنوی کے خلاف تمام ملک میں ایک عام تحریک پھیل گئی اور سلطان محمود کو تھانیسر وغیرہ پر حملے کرنا پڑے اور تھانیسر کے راجہ نے دہلی میں قیام کیا۔ سلطان مسعود کی فوج کشی اور ہانسی و سونی پت کی فتح کے بعد تھانیسر کا راجہ جو تھانیسر سے بیدخل ہو کر دہلی میں رہنے لگا تھا بہت ہی زیادہ ذلیل و بے اعتبار ہو گیا تھا مگر سلطان مودود کے زمانے میں جبکہ سلطنت غزنی کے وقار کو سلجوقیوں نے سخت نقصان پہنچا دیا تھا تو اسی توار خاندان کے ایک نوعمر راجہ اننگ پال اول نے جو اپنے باپ کی سقیم و ذلیل حالت دیکھ چکا تھا اپنی حالت میں تبدیلی پیدا کرنی چاہی اور ۴۳۵ھ میں تھانیسر اور نگرکوٹ کا علاقہ مصنوعی خواب کے ذریعہ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے فتح کر لیا۔ اس کے بعد اننگ پال نے ۴۴۳ھ میں دلی کے اندر سنگین عمارتیں اور قلعہ تعمیر کیا۔ ۴۶۵ھ میں سلطان ابراہیم غزنوی نے اننگ پال اول کی اچھی طرح گوشمالی کی اور دوسرے راجاؤں کو بھی درست بنایا۔ ۴۸۱ھ میں سلطان ابراہیم غزنوی کا انتقال ہوا اور ہندوستان کے راجاؤں کو پھر اپنی حالت مضبوط کرنے کا خیال آیا۔ مسلمانوں کی حملہ آوریوں کا یہ نتیجہ ضرور ہوا تھا کہ بعض راجپوت جو پہلے طاقتور تھے کمزور اور بعض جو پہلے کمزور تھے وہ طاقتور ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۴۸۳ھ میں بنارس کے راجہ چندر دیو نے

قنوج پر حملہ کرکے راجہ کنور رائے کی اولاد کو چن چن کر قتل کیا اور اُس خاندان کا جو سلطان محمود غزنوی کے
زمانے میں قنوج کا حکمران تھا خاتمہ ہو کر چندر دیو اور اُسکے خاندان کی حکومت قنوج میں شروع ہوئی
چندر دیو راٹھور خاندان کا راجپوت تھا اسی کی اولاد میں قنوج کا راجہ جے چند تھا جو سلطان شہاب الدین غوری
کے مقابلے میں قطب الدین ایبک کے تیر سے مارا گیا تھا۔ عجب اتفاق کی بات ہے کہ جس سال قنوج میں
راٹھور خاندان کی حکومت شروع ہوئی اسی سال سیستان کے قلعہ الموت میں حسن بن صباح نے باطنی سلطنت کی
بنیاد رکھی۔ حسن بن صباح بھی ایک خاص مذہب کا بانی تھا اُسکی جماعت کے لوگوں کو باطنی فدائی اور
حشاشین وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لوگوں نے غلطی سے قرامطہ اور باطنی فرقہ میں کوئی امتیاز نہیں کیا
حالانکہ یہ دو جدا جدا فرقے ہیں لیکن دشمن اسلام اور قاتل المسلمین ہونے میں دونوں ایک دوسرے کے مثیل
و مماثل ہیں جس طرح قرامطہ نے سلطان محمود غزنوی کے خلاف ہندوؤں کی طرح طرح سے امداد کی اسی طرح ان
باطنیوں نے سلطان شہاب الدین غوری کے خلاف ہندوؤں کو امداد پہنچائی۔ ان باطنیوں نے قرامطہ سے
بھی زیادہ عالم اسلام کو نقصان پہنچایا۔ قرامطہ کی سرگرمیوں کے کم ہوتے ہی باطنی گروہ میدان میں نکل آیا
حسن بن صباح نے اس گروہ کو پیدا کرکے الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی کو
اپنے ایک شاگرد ابوطاہر فدائی کے ہاتھ سے بمقام نہاوند ۴۸۵ھ میں قتل کرادیا۔ یہ باطنیوں یا ملحدوں کا
سب سے پہلا شکار تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مسعود بن ابراہیم غزنی کا فرمانروا تھا سلجوقیوں کی سلطنت میں بھی
زوال پیدا ہو چکا تھا۔ اُدھر یورپی عیسائیوں نے کروسیڈ یعنی صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ ادھر
باطنیوں نے چن چن کر مسلمان سرداروں اور بادشاہوں کو قتل کرنا شروع کر رکھا تھا ۴۹۴ھ میں
باطنیوں نے عراق میں ہزاروں مسلمانوں کو قتل کر ڈالا لوگ خوف کے مارے کپڑوں کے نیچے ہمہ اوقات زرہ
پہنے رہتے تھے۔ عیسائیوں نے سروج، حیفا، ارسوف، قیساریہ وغیرہ مقامات پر قبضہ کیا اور باطنیوں نے
اصفہان مسلمانوں سے چھین لیا ۵۰۰ھ میں باطنیوں نے شیراز پر قبضہ کیا اور ۵۰۳ھ میں طرابلس پر عیسائیوں کا
قبضہ ہوا، موصل کے بادشاہ مودود کو جو عیسائیوں سے لڑنے کے لیے نکلا تھا ۵۰۷ھ میں ایک باطنی نے
جامع مسجد دمشق میں قتل کر دیا۔ غرض یہ زمانہ عالم اسلام کے لیے بڑی پریشانی اور مصیبت کا زمانہ تھا۔
سلاطین غزنی کوئی طاقت نہ رکھتے تھے۔ ہندوستان میں اگرچہ اُن کا رعب ہندوؤں پر چھایا ہوا تھا مگر
حقیقتہً وہ برائے نام فرمانروا تھے۔ ترکان غز (غارت گر قبائل ترک) نے تمام خراسان و ایران کو پامال کر ڈالا
تھا اور سلجوقیوں کا رعب مٹ چکا تھا۔ غور کے حاکم جو سلطان غزنی کے محکوم تھے سلطان غزنی کے مقابلہ
کی تیاری کر رہے تھے۔ ادھر ۴۹۵ھ میں چندر دیو کے پوتے گوبند چندر نے قنوج میں تخت نشین ہو کر

اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور ۵۵۵ھ تک قنوج میں خوب زور شور سے حکومت کرتا رہا۔ اسی گوبند چندر کے زمانہ میں غزنی کے ایک سپہ سالار نے جو ہندوستان میں مامور تھا بغاوت اختیار کی اور تھانیسر و سونی پت کا علاقہ دہلی کے راجہ انگ پال ثانی کے سپرد کر دیا تھا۔ اجمیر کے راجہ کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ سومنات کی فتح کے بعد ۴۱۷ھ میں سلطان محمود غزنوی نے اسکو سزا دے کر سلطنت غزنی کا باقاعدہ خراج گذار بنایا تھا۔ بنارس کے راٹھور راجہ پر متحدہ ہو کر احمد نیالتگین نے اس کو سلطنت غزنی کا باجگذار بنایا تھا یہی بنارس کا خاندان اب قنوج میں حکمران تھا۔ غرض یہ سارے کے سارے راجہ سلطنت غزنی کے خراج گذار و ماتحت تھے لیکن اب سلطان غزنی کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اُنھوں نے باقاعدہ خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔ انگ پال ثانی فرمانروائے دہلی کی دو بیٹیاں تھیں کوئی بیٹا نہ تھا۔ اُس نے ایک بیٹی کی شادی اجمیر کے راجہ مسمّی سومیشور یا سومیشور جی سے اور دوسری کی شادی قنوج کے راجہ گوبند چندر سے کی تھی۔ اجمیر کا راجہ قوم سے چوہان تھا اور قنوج کا راٹھور۔ انگ پال کی ان دونوں لڑکیوں سے ایک ایک لڑکا پیدا ہوا۔ انگ پال کے قنوجی نواسے کا نام جے چند اور اجمیری نواسے کا نام پرتھی راج تھا۔ جے چند عمر میں بڑا تھا وہ ۵۵۵ھ میں قنوج کا راجہ ہوا پرتھی راج جو چھوٹی بیٹی کا بیٹا اور عمر میں بھی چھوٹا تھا انگ پال کو زیادہ محبوب تھا۔ انگ پال نے پرتھی راج کو اپنا متبنیٰ بنا کر اپنا وارث و جانشین قرار دیا۔ پرتھی راج انگ پال کی وفات کے بعد دہلی اور اجمیر دونوں ریاستوں کا مالک اور فرمانروا قرار پایا۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیے کہ سلاطین غزنی جبکہ بعد کمزور ہو چکے تھے یعنے خسرو شاہ اور خسرو ملک کے زمانے میں بھی کسی ہندو راجہ کو یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ پنجاب پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں نے پنجاب کے ملک کو سلطنت غزنیں کا صوبہ اور مسلمانوں کا ملک تسلیم کر لیا تھا۔ اس عرصہ میں وشنو مذہب کی جگہ شیو کے مذہب کا رواج زیادہ ہو گیا تھا اور راجپوت قومیں جن کو برہمنوں نے چھتریوں کا قائمقام بنایا تھا اب اپنی ریاستیں قائم کر کے برہمنوں کی اطاعت سے بہت کچھ آزاد ہو چکی تھیں ہندوؤں میں مسلمانوں کی مصاحبت و ہمسائگی کے اثر سے بہت کچھ روشن خیالی اور تہذیب و شائستگی پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ مذہبی نفرت و عداوت جو محمود غزنوی کے ابتدائی زمانے میں برہمنوں نے مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں میں پیدا کر دی تھی سلطنت غزنی کے آخر ایام حکومت میں بہت کچھ مٹ چکی تھی اور برہمنوں کی گذشتہ انقلابی کوششوں اور ہندو قوموں نیز ہندی ریاستوں اور راجاؤں کو اپنے مشوروں اور منصوبوں کے موافق متحرک اور معمول بنائے رکھنے کا یہ قدرتی اثر تھا کہ ہندوستان کی محکوم و مغلوب

ہندو قوم نے برہمنوں کو اپنا رہبر، پیشوا اور دیوتا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے
سلطان شہاب الدین غوری بلکہ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے تک ہندو ریاستیں متزلزل اور ہندو
طاقت روبانحطاط رہی لیکن اس عرصہ میں برہمنوں کا اثر و اقتدار ہندو اقوام میں برابر ترقی کرتا رہا۔ مسلمانوں کو
برہمنوں سے اگر مخالفت ہو سکتی تھی تو محض اسلیے کہ وہ قرامطہ اور ملاحدہ کی سازشوں میں شریک ہو کر
سلطنت اسلامیہ کی بربادی کے خواہاں رہتے تھے۔ لیکن جب قرامطہ اور ملاحدہ کا خاتمہ ہو گیا یا برہمنوں نے
اُن سے تعلق نہ رکھا تو مسلمانوں نے بھی ان کے اس اثر و اقتدار کو جو وہ ہندو اقوام میں حاصل کر رہے تھے
قطعاً کوئی نقصان پہونچانا نہیں چاہا ورنہ اُن کو اسکی ضرورت تھی کہ وہ ہندو اقوام کے مذاہب و معتقدات
میں دخل دیتے اور ہندوؤں کو برہمنوں کی سیادت و پیشوائی سے نکالنے کی کوشش کرتے۔ برہمنوں نے
اسی زمانے میں نئے نئے مذاہب اور نئے نئے عقیدے ایجاد کیے۔ پوران تصنیف ہوئے، اور
برہمنوں کی ہستی ایک مافوق الانسانیت ہستی سمجھی جانے لگی۔ ہندو اقوام میں برہمنوں کا یہ درجہ ابھی
ماضی قریب تک بدستور باقی رہا لیکن اب بہت جلد جلد اُن کا اثر و اقتدار فنا ہو رہا ہے۔ خلاصہ کلام
یہ کہ ہندوستان کے ہندو مذاہب اور پرانوں کی عمر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے زمانے سے
زیادہ پرانی نہیں ہے اور خاندان غزنی کے عہد حکومت میں ہندو مذاہب و اقوام کا ایک بڑا حصہ تعمیر
و مرتب ہوا تھا۔ یہ بات بھی فراموش نہ ہونی چاہیے کہ مسلمانوں نے اگرچہ ہندوؤں کے مذہبی و قومی اور
اندرونی معاملات میں کوئی دخل نہیں دیا تاہم ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قائم ہونے کا یہ اثر
ضرور ہوا کہ غیر آریوں یعنی ہندوستان کے قدیم باشندوں پر بودھوں کے زوال سے جو مصائب کے پہاڑ
اُسی طرح ٹوٹنے والے تھے جیسا کہ بودھوں کی حکومت سے پیشتر منوشاستر کے موافق ٹوٹ چکے تھے
اُن میں ضرور تخفیف ہوئی۔ برہمنوں نے اگرچہ جدید برہمنی مذہب میں برہمنوں کی تکریم اور شودروں کو
حقوق انسانیت سے محروم رکھنے کے اصول کو فراموش نہیں کیا لیکن مسلمان حاکموں کے ماتحت وہ آزادانہ
شودروں کو چوپاؤں کی طرح ہدف مظالم بنانے کی جرأت نہیں کر سکے اگرچہ معتقدات اور معاشری تعلقات
میں شودروں کی ذلت و تحقیر بخوبی موجود رہی یہی وجہ ہے کہ سندھ میں جہاں مسلمانوں کی حکومت سب سے
پہلے قائم ہوئی برہمن اور شودر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ پنجاب میں جہاں سندھ کے بعد مگر باقی
تمام صوبجات ہند سے قریباً دو سو سال پہلے سلطان محمود نے اسلامی حکومت قائم کر دی تھی برہمن اور
شودر کا امتیاز موجود تو ہے مگر دوسرے صوبوں کے مقابلے میں اُسکی کوئی حقیقت نہیں۔ دکن کو مسلمانوں
نے سب سے بعد کو فتح کیا لہٰذا دکن میں یہ امتیاز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور آج بھی وہاں

برہمنوں اور غیر برہمنوں کا ہنگامہ برپا نظر آتا ہے۔ جن جن صوبوں یا ضلعوں میں اسلامی حکومت کے قائم ہونے میں دیر ہوئی انہی صوبوں اور ضلعوں میں برہمنوں کو غیر آریوں یعنے شودروں کے ذلیل کرنے اور اپنا اقتدار قائم کرکے شودروں کو حقوق انسانیت سے محروم رکھنے کا زیادہ موقع ملا۔ اور اسی لیے آج ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف مراسم اور مختلف طرز عمل نمایاں ہیں۔ پس اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کا اِس ملک میں آنا اور اپنی حکومت قائم کرنا غیر آریہ قوموں اور شودروں کے لیے ایک ابر رحمت تھا۔

یہ دوسرا باب کسی قدر طویل ہوگیا مگر اظہار و بیان کے قابل بہت سی باتیں ابھی باقی رہگئی ہیں جن کی طرف اشارہ انشاء اللہ آیندہ ابواب میں کیا جائیگا۔ اِس دوسرے باب میں بھی جس حقیقت کو بے پردہ کیا گیا ہے اُسکا یہ منشا ہرگز نہیں کہ اِس ملک کی کسی قوم کو رنج پہونچایا جائے بلکہ اُس شرارت سے ہموطنوں کو آگاہ کرنا ہے جو تاریخ کے نام سے اس ملک میں شائع اور سلطان محمود غزنوی کو بلا وجہ بدنام و مطعون کرنے کا باعث ہوئی ہے

باب سوم

پہلے اور دوسرے باب میں سندھ اور پنجاب کے صوبوں کی فتح اور ان کے سلطنت اسلامیہ میں شامل ہونے کا حال بالتفصیل بیان ہوچکا ہے۔ اِس باب میں یہ بیان ہونے والا ہے کہ پنجاب کے علاوہ باقی شمالی ہند یعنے پنجاب کی مشرقی سرحد سے بنگال کی مغربی حدود تک کا علاقہ کس طرح سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوا اور تمام شمالی ہند پر قابض ہوتے ہی مسلمانوں نے ہندوستان میں ایک مستقل حکومت قائم کرلی اور اس ملک کو اپنا وطن قرار دیکر کسی دوسرے ملک کی سیادت اور کسی دوسری مرکزی حکومت کی ماتحتی سے ہندوستان کو آزاد اور ہندوستانی سلطنت کو خودمختار بنا دیا اور اِس طرح ہندوستانی مال و دولت کو غور و ہرات و بخارا و کابل و بغداد و خوارزم وغیرہ کہیں بھی جانے کا موقع نہیں ملا اور نہ مغولان چنگیزی ہندوستان کو کوئی نقصان پہونچا سکے پہلے باب کا مرد میدان (ہیرو) محمد بن قاسم اور دوسرے کا سلطان محمود غزنوی تھا۔ اِس تیسرے باب کا ہیرو سلطان شہاب الدین غوری کو سمجھنا چاہیے۔ اور اسی لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اول خاندان غوری کے مختصر حالات بیان کردیے جائیں۔

غوری خاندان کا تذکرہ شروع کرنے سے پیشتر یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ اس باب کو شروع کرتے وقت تاریخ فرشتہ، تاریخ بدایونی، خلاصۃ التواریخ، مفتاح التواریخ، طبقات ناصری، تاریخ ہنٹر، تاریخ الفنسٹن وغیرہ پچیس سے زیادہ تاریخیں میں نے اپنے سامنے الماریوں سے نکالکر رکھ لی ہیں۔ لیکن میں سب سے زیادہ طبقات ناصری پر اعتماد کرونگا اور واقعات کی نگارش میں اسی کو زیادہ پیش نظر رکھونگا۔ کیونکہ سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت سے قریباً پچاس سال بعد طبقات ناصری لکھی گئی ہے۔ طبقات ناصری کا مصنف ابو عمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین جوزجانی جو منہاج سراج کے نام سے مشہور ہے سلاطین غوریہ سے خصوصی تعلق رکھتا اور اکثر اپنے چشم دید حالات قلمبند کرتا ہے۔ اس تیسرے باب کے لیے طبقات ناصری اور تاج الماثر سے بڑھ کر کوئی اور کتاب قابل التفات اور لائق اعتماد نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ دوسرے باب کے لیے تاریخ بیہقی سب سے زیادہ مفید اور قابل اعتماد کتاب تھی۔

غوری خاندان کے مختصر حالات

اوپر دوسرے باب میں محمد بن سوری حاکم غور کا ذکر آچکا ہے کہ اس نے قرامطہ کی سازش و تحریک سے سلطان محمود غزنوی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور بالآخر سخت معرکے کے بعد گرفتار و مقتول ہوا تھا۔ اس محمد بن سوری کا خاندان عرصہ دراز سے غور کے پہاڑی علاقے میں برسر حکومت چلا آتا تھا پٹھانوں یا افغانوں کی دو مشہور قومیں ہیں۔ ایک شنسبی دوسری قیسی۔ قیس بن عیص المعروف بہ عبدالرشید کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانے میں مدینہ منورہ حاضر ہو کر مسلمان ہوئے اور افغانستان واپس آکر اپنے قبیلے کو مسلمان بنایا۔ انھیں کو آنحضرت صلعم نے بتان (پٹھان) کا خطاب دیا تھا۔ قیس عبدالرشید کی اولاد افغانستان وصوبہ سرحدی کی غالب آبادی ہے۔

شنسب بن حریق جو علاقہ غور کا رئیس تھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے میں مسلمان ہوا اسکی اولاد افاغنہ شنسبی کہلائی۔ انھیں میں لودی و سوری وغیرہ پٹھان شامل ہیں۔ محمد بن سوری مذکور اسی شنسب بن حریق کی اولاد میں تھا۔ عباسیوں اور علویوں نے ملکر جب بنو امیہ کے خلاف سازشیں اور کوششیں شروع کیں تو علاقہ غور کا یہ شنسبی خاندان جو اس علاقے میں حکومت و سرداری بھی رکھتا تھا ابو مسلم خراسانی کا شریک کار بن گیا۔ خلافت عباسیہ کے قائم ہو جانے پر اس خاندان کی عزت افزائی کی گئی اور اسکو علاقہ غور کی سند حکومت خلیفہ کی طرف سے مل گئی۔ چند ہی روز کے بعد جب علویوں نے عباسیوں کے خلاف سرگرمی شروع کی تو غور کا یہ خاندان محب اہلبیت ہونے کی وجہ سے علویوں کی خفیہ سازشوں میں شریک ہو گیا۔ جب قرامطہ نے خراسان و افغانستان نے اپنی تحریک شروع کی تو سب سے پہلے یہی خاندان قرامطہ کا ہمنوا ہوا اور ناقابل تسخیر پہاڑی

علاقہ ہونے کی وجہ سے قرامطہ نے اس علاقے اور اس شنسبی خاندان کو اپنی خصوصی کوششوں کا محل و معمول بنایا
حتیٰ کہ محمد بن سوری نے سلطان محمود غزنوی کا زبردست مقابلہ کیا۔ سلطان محمود غزنوی نے محمد بن سوری کے بعد اسکے
بیٹے ابو علی کو غور کا حاکم مقرر کر دیا۔ ابو علی سلطان محمود کا ہم عقیدہ اور قرمطی مسلک سے سخت متنفر تھا امیر ابو علی کے بعد
اسکا بھائی شیش (شیث) غور کا امیر مقرر ہوا شیش کے بعد اسکا بیٹا عباس امیر غور ہوا۔ عباس کے بعد اسکا بیٹا امیر محمد
اور امیر محمد کے بعد اسکا بیٹا قطب الدین حسن اور قطب الدین حسن کے بعد اس کا بیٹا عزالدین حسین غور کا امیر مقرر ہوا
یہ سب کے سب اپنے مورث اعلیٰ محمد بن سوری کی تقلید میں مذہب قرامطہ کے پیرو دیگر سلاطین غزنی کے مطیع رہے
سلطان محمود غزنوی اور سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے بعد عبد الرشید بن مسعود اور فرخ زاد بن مسعود کے عہد حکومت
میں مصر کے عبیدی فرمانروا مستنصر باللہ نے اپنے معتمد خاص اور مرید با اختصاص حکیم ناصر خسرو علوی خراسانی کو
جو اسمٰعیلیہ عقیدہ کا پیرو اور عبیدی سلطنت کا دل ہوا خواہ تھا۔ ممالک مشرقیہ کی طرف اس مہم پر روانہ کیا کہ غزنوی
و سلجوقی و عباسی حکومتوں کے خلاف کوششیں عمل میں لائے اور عبیدی خاندان کی اسمٰعیلیہ سلطنت کو مذہبی سلطنت
اور فرمانروائے مصر کا خلیفہ برحق ہونا ثابت کرے چنانچہ حکیم موصوف مصر سے گجرات ہوتا ہوا ملتان اور ملتان سے
لاہور پہونچا لاہور سے افغانستان و خراسان پہونچکر اسمٰعیلیت کی اشاعت میں مصروف رہا اور غوریوں نے
سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ حکیم ناصر خسرو نے اپنے سفر نامے میں واضح طور پر اپنے مقصد سفر کو بیان نہیں کیا اور
نہ کر سکتا تھا لیکن خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے حکیم موصوف کی زندگی کے حالات لکھتے ہوئے بہت کچھ حقیقت کو
نمایاں کر دیا ہے چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ

> در بارۂ او انست کہ خلفائے فاطمیین (عبیدیین) ہمیشہ داعیہ آن داشتند کہ سایۂ صولت و اقتدار خویش بر ممالک
> آسیا اندازند و عظمت و بزرگی خلفائے بغداد را از قلوب اہالی شرق محو کردہ ایشان را بسوئے خویش مائل سازند
> خاصہ مستنصر باللہ کہ شصت سال متصدی امر خلافت بود و فرصت این کار بیشتر از خلفائے ماضیہ اورا
> دست دادہ بود و ہموارہ از طرف او جواسیس و دعاة در [illegible] میرسیدند تا مردم را بروش اسمٰعیلیت
> دعوت کنند و حکومت مصر [illegible]

حکیم ناصر خسرو نے [illegible] افغانستان و خراسان میں نہایت سرگرمی سے اسمٰعیلیہ مذہب
اور عبیدی سلطنت کی خدمات انجام دیں [illegible] آپ کبھی صوفی باصفا کبھی شاعر غرا اور کبھی اعلم العلماء کی
حیثیت سے پیش کیا اور سلاطین غور [illegible] نقصان پہونچایا۔ غرض ملک عزالدین حسین جس زمانے میں غور کے
علاقے پر حکومت کرتا تھا اس زمانے میں غزنی کی سلطنت سلطان ابراہیم غزنوی کی وفات کے بعد بہت کمزور
ہو چکی تھی۔ ملک عزالدین حسین نے سلطان سنجر سلجوقی سے نیازمندانہ مراسم پیدا کرکے سلطنت غزنی کی اطاعت سے

سی طور پر کامل آزادی حاصل کر لی تھی۔ مسعود بن ابراہیم اور اسکے بیٹے ارسلان بن مسعود نے بھی چشم پوشی اور
بے اتفاقی سے کام لیکر عزالدین حسین کی آزادی کو تسلیم اور گوارا کر لیا تھا۔ عزالدین حسین جب فوت ہوا تو
اسکے سات بیٹے تھے جو سب کے سب جوان اور مردان کار تھے۔ انکے نام یہ ہیں (۱) فخرالدین مسعود (۲)
قطب الدین محمد (۳) سیف الدین سوری (۴) بہاؤالدین سام (۵) علاؤالدین حسین (۶) شہاب الدین محمد
(۷) شجاع الدین علی۔ سب سے بڑا فخرالدین مسعود اور اس سے چھوٹا قطب الدین محمد تھا۔ یہ دونوں ترکیہ
پرستاروں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ باقی پانچ بیٹوں میں سب سے بڑا سیف الدین سوری
تھا لہٰذا عزالدین حسین کی وفات کے بعد سیف الدین سوری باپ کا جانشین اور غور کی ریاست کا جو
عزالدین حسین کے زمانے میں بہت وسیع ہو چکی تھی فرمانروا مقرر ہوا لیکن سیف الدین سوری نے تنہا فرمانروا
بنکر باقی بھائیوں کو حکومت و فرمانروائی کے لطف سے محروم رکھنا گوارا نہ کر کے غور کی ریاست کو سات چھوٹی چھوٹی
ریاستوں میں تقسیم کر کے ہر ایک بھائی کو ایک ایک ریاست کا خود مختار فرمانروا بنا دیا۔ اپنے پاس بھی برحصہ
مساوی ایک چھوٹی سی ریاست رکھی۔ اتفاق کی بات قطب الدین محمد کی باقی بھائیوں سے ان بن
اور ناچاقی ہو گئی۔ اور اس آپس کی مخالفت نے یہانتک نوبت پہنچائی کہ قطب الدین محمد اپنی ریاست
چھوڑ کر غزنی چلا آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ غزنی میں بہرام شاہ بن مسعود فرمانروا تھا۔ بہرام شاہ قطب الدین کے ساتھ
بہت خاطر اور عزت سے پیش آیا۔ قطب الدین محمد غزنی میں رہنے لگا۔ چند روز کے بعد حاسدوں اور واقعہ پسند
لوگوں نے بہرام شاہ سے قطب الدین کی شکایت کی کہ وہ آپ کو قتل اور غزنی کے تخت پر قبضہ کرنیکی سازش اور
کوشش کر رہا ہے۔ بہرام شاہ نے قطب الدین کو قتل کرا دیا اور وہ غزنی میں مدفون ہوا۔ قطب الدین محمد کے
حادثہ کا حال سنکر سیف الدین محمد سوری نے فوج لیکر اور اپنی ریاست اپنے بھائی بہاؤالدین سام کی نگرانی میں
چھوڑ کر غزنی پر انتقاماً چڑھائی کی۔ بہرام شاہ غزنوی نے مقابلہ کر کے شکست کھائی اور ہندوستان کی طرف چلا آیا
سیف الدین محمد سوری نے غزنی پر قبضہ کر کے تخت سلطنت پر جلوس اور اپنے نام کے ساتھ سلطان کے لقب کا اضافہ
کیا۔ خاندان غوری میں سیف الدین سب سے پہلا سلطان ہوا۔ سیف الدین نے غزنی میں نہایت عدل و انصاف
کے ساتھ حکومت کی۔ باشندگان غزنی نے بھی اسکی اطاعت و فرمانبرداری میں کوتاہی نہ کی۔ جب موسم سرما آیا اور
برف باری سے غور و غزنی کے درمیان آمد و رفت کا راستہ بند ہو گیا تو بہرام شاہ نے ہندوؤں کی فوج اور ہندو
ماتحت راجاؤں اور ٹھاکروں کو ہمراہ لیکر غزنی پر حملہ کیا۔ سیف الدین مقابلہ کے لیے غزنی سے باہر نکلا۔ اہل غزنی
جو سیف الدین کی فوج میں شامل تھے میدان جنگ میں پہنچتے ہی بہرام شاہ سے جا ملے اور سیف الدین
بآسانی گرفتار کر لیا گیا۔ بہرام شاہ نے سیف الدین سوری کو نہایت ذلت کے ساتھ ایک مریل بیل کے اوپر

سوار کرا کر شہر میں تشہیر کرایا اور پھر قتل کرا دیا سیف الدین سوری کے وزیر سید مجد الدین موسوی کو بھی اسی ذلت کے ساتھ قتل کیا گیا۔ یہ حال سن کر بہاؤ الدین سام نے غور کی ریاست اور اپنا تمام علاقہ اپنے چھوٹے بھائی علاؤ الدین حسین کے سپرد کیا اور خود فوج لے کر اپنے دونوں مقتول بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے غزنی کی جانب روانہ ہوا۔ لیکن ابھی راستے ہی میں تھا کہ فوت ہو گیا۔ یہ خبر سن کر علاؤ الدین حسین نے ایک زبردست لشکر فراہم کیا اور علاقہ غور کے جنگجو لوگوں کو اپنے مقتول بھائیوں کی مظلومی کے حالات سنا سنا کر انتقام پر مستعد اور بیحد پُر جوش بنا دیا۔ علاؤ الدین کی فراہمی لشکر اور غزنی پر فوج کشی کے ارادے کا حال سن کر بہرام شاہ نے ہندی رایوں اور راناؤں کو ہمراہ لے کر غور کی طرف پیشقدمی کی مقام زمینداور کے قریب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل خیمہ زن ہوئے، بہرام شاہ نے علاؤ الدین کے پاس پیغام بھیجا کہ تم غور کی وسیع ریاست پر قناعت کرو اور ہماری مخالفت کا خیال ترک کر دو تو ہم تم سے مطلق تعرض نہ کرینگے۔ علاؤ الدین نے جواب دیا کہ میں اپنے مظلوم بھائیوں کا انتقام لینے کے لیے نکلا ہوں اسلیے مجھکو یقین ہے کہ میں ضرور فتحمند ہوں گا۔ آخر لڑائی ہوئی اس لڑائی میں بہرام شاہ کا بہادر بیٹا دولت شاہ جو بہرام شاہ کی فوج کا سپہ سالار بھی تھا مارا گیا۔ اسکے مارے جانے سے بہرام شاہ اور اسکی فوج بد دل ہو گئی۔ چنانچہ غوری لشکر نے غزنوی فوج کو بھگا دیا۔ تگین آباد میں آکر بہرام شاہ نے اپنی فوج اور مغرور ہندو سرداروں کو سمیٹ کر پھر ایک مقابلہ کیا مگر اس مرتبہ بھی شکست کھائی یہاں سے فرار ہو کر خاص شہر غزنی کی دیواروں کے نیچے ایک مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور ہندوستان کی طرف بھاگ آیا۔ علاؤ الدین حسین نے غزنی میں داخل ہو کر سات شبانہ روز قتل عام کرایا اور شہر میں آگ لگا کر ایک ایک عمارت کو جلایا حتی کہ سلاطین غزنی کے مقبروں کو اُدھیڑ کر لاشوں اور ہڈیوں کو نکلوایا اور آگ میں جلایا۔ صرف سلطان محمود غزنوی، سلطان مسعود غزنوی اور سلطان ابراہیم غزنوی کی قبروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ غزنی کا کوئی گھر اور کوئی خاندان جلنے اور قتل ہونے سے نہیں بچا اسی لیے علاؤ الدین کو جہانسوز کا خطاب ملا۔ علاؤ الدین جہانسوز غزنی کو برباد کر کے اپنے بھائیوں کے تابوت لے کر غور کی جانب چلا گیا اور اسکی ہیبت و شوکت کا دور دور تک سکہ بیٹھ گیا۔ بہرام شاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ علاؤ الدین غزنی سے غور چلا گیا ہے تو وہ ہندوستان سے پھر غزنی پہنچا اور چند روز کے بعد فوت ہو گیا۔ اُسکے بعد اُسکا بیٹا خسرو شاہ غزنی میں نہ ٹھہر سکا اور لاہور آکر قیام پذیر ہوا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ علاؤ الدین جہاں سوز نے غزنی کی فتح کے بعد ایک فخریہ نظم لکھی تھی جسکے بعض اشعار اس طرح ہیں ؎

آنم کہ ہست فخر ز عدلم زمانہ را　　آنم کہ ہست جور ز بذلم خزانہ را

انگشت دست خویش بدندان کند عدو — چوں برزہ کماں نہم انگشتوانہ را
بہرام شر بہ کینۂ من چوں کماں کشید — کندم بہ کینہ از کمر او کمانہ را
پشتی خصم گرچہ ہمہ رائے ورانہ بود — کردم بہ گرز خورد سر رائے ورانہ را
کیں توختن بہ تیغ در آموختم کنوں — شاہان روزگار و ملوک زمانہ را

اِن اشعار میں چوتھے شعر کے اندر رائے اور رانا خاص طور پر قابل توجہ ہیں جس محمود غزنوی کو آجکل ہندوؤں کا سب سے بڑا دشمن بتایا جاتا ہے اِسی محمود غزنوی کی اولاد کے طرفدار بنکر ہندوؤں کے رائے اور رانا غوریوں سے لڑنے کے لیے نہ صرف غزنی بلکہ حدود غور تک پہونچے تھے۔ پس سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس زمانہ کے ہندوؤں کی یہ حالت تھی تو آجکل کے ہندوؤں کو کس چیز نے غزنویوں کا مخالف و معاند بنا دیا ہے ؟ علاؤ الدین جہانسوز نے غزنی سے علاقہ غور کے شہر فیروزکوہ میں آکر تخت سلطنت پر جلوس کیا اور اپنے آپ کو سلطان کے لقب سے ملقب کرکے وہ نذرانہ جو عزالدین حسین کے زمانہ سے سلطان سنجر سلجوقی کی خدمت میں بھیجا جاتا تھا بھیجنا بند کر دیا اور اپنے دونوں بھتیجوں یعنے بہاؤ الدین سام کے بیٹوں شمس الدین اور شہاب الدین کو ایک قلعہ میں نظر بند کرکے ان کا روزینہ مقرر کر دیا۔ سلطان سنجر نے علاؤ الدین جہانسوز کی سرکشی و سرتابی دیکھ کر لشکر خراسان کے ساتھ غور پر حملہ کیا۔ علاؤ الدین نے مقابلہ کیا مگر شکست یاب ہو کر گرفتار ہوا سلطان سنجر علاؤ الدین جہانسوز کو پابزنجیر اپنے ہمراہ خراسان کی جانب لیگیا۔ یہاں تخت فیروزکوہ پر اُمرا نے مل کر علاؤ الدین کے بھتیجے ناصر الدین حسین ابن شجاع الدین علی ابن عزالدین حسین کو بٹھایا۔ چند روز کے بعد ترکان غز نے خراسان پر حملے شروع کر دیے۔ سلطان سنجر نے ترکان غز کے خطرات کو محسوس کرکے علاؤ الدین حسین جہانسوز پر احسان کرنا مناسب سمجھا اور اسکو غور کے علاقے پر حکومت کرنیکے لیے آزاد کر دیا۔ علاؤ الدین جہانسوز کے آنے کی خبر سُنکر اُمرا نے ناصر الدین حسین ابن شجاع الدین علی کو قتل کرا دیا۔ علاؤ الدین نے فیروزکوہ میں آکر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ انھیں ایام میں ترکان غز نے سلطان سنجر کو گرفتار کر لیا اور انھیں کی ایک جماعت نے آکر غزنی پر بھی قبضہ کر لیا یہی وہ زمانہ تھا کہ حسن بن صباح کی جماعت یعنے فدائیوں یا ملحدوں نے ممالک اسلامیہ میں ایک تہلکہ برپا کر دیا تھا اور اسی لیے ترکان غز کو ممالک اسلامیہ میں دست درازی کا موقع مل گیا تھا۔ حسن بن صباح کے جانشین محمد بن کیا بزرگ اُمید فرمانروائے الموت (قہستان) نے علاؤ الدین جہانسوز کے دوبارہ غور میں آکر تخت نشین ہونے کے بعد اپنے ایلچی اسکے پاس بھیجے اور اپنے کیش و مذہب میں داخل ہونے کی ترغیب دی۔ علاؤ الدین جہانسوز اور اسکے باپ دادا چونکہ عرصہ دراز سے قرامطہ عقائد کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے مگر اول غزنویوں اور اب بعد میں سلجوقیوں کی وجہ سے اپنے خیالات و عقائد کی تشہیر و اشاعت میں

احتیاط سے کام لیتے تھے۔ فرمانروائے الموت کی ترغیب و تبلیغ سے علاؤالدین جہانسوز کو فدائی مذہب کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ کیونکہ سلطان سنجر ترکان غز کے ہاتھ میں جن کو اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا گرفتار ہو چکا تھا۔ فدائی مذہب قرامطہ مذہب سے مشابہ اور اسی کا ثنی تھا۔ علاؤالدین نے نہ صرف خود ہی ملاحدہ کے عقیدے کو قبول کیا بلکہ محمد بن کیا بزرگ امید کے بھیجے ہوئے مناودں کو جا بجا اپنی حدود حکومت میں تبلیغ کرنے اور لوگوں کو بے دین بنانے کا آزادانہ موقع عطا کیا۔ منہاج سراج کے الفاظ یہ ہیں:۔

"باآخر عمر رسل ملاحدہ الموت بہ نزدیک سلطان علاؤالدین آمدند وایشان را اعزاز کرد و بہر جا از مواضع غور در سر دعوت کردند و ملاحدہ الموت طمع بضبط و انقیاد اہل غور در بستند و این معنی غبار بدنامی شد بر ذیل دولت علاؤالدین"

۵۵۱ھ میں سلطان علاؤالدین جہانسوز کا انتقال ہوا۔ اور اسکی جگہ اس کا بیٹا سیف الدین محمد تخت نشین ہوا۔ سیف الدین محمد نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے دونوں چچازاد بھائیوں شمس الدین و شہاب الدین کو قید و نظر بندی سے آزاد کر دیا۔ چنانچہ آزاد ہو کر شہاب الدین تو اپنے چچا فخر الدین مسعود کے پاس بامیان چلا گیا اور شمس الدین دارالسلطنت فیروز کوہ میں سلطان سیف الدین محمد کی خدمت میں رہنے لگا۔ سیف الدین بن علاؤالدین نہایت پاک طینت اور باخدا سلطان تھا، وہ اپنے باپ کے خلاف اسلامی عقائد کا سختی سے پابند اور ملاحدہ الموت سے سخت متنفر تھا۔ اسنے تخت نشین ہو کر ملاحدہ کے ان تمام مناودں اور مبلغوں کو جو حدود سلطنت غور میں پھیلے ہوئے لوگونکو بے دین بنانے میں مصروف تھے دارالسلطنت میں طلب کیا اور جب سب کے سب فیروز کوہ میں آگئے تو سب کو قتل کرا دیا اور اپنی سلطنت سے ملاحدہ کی تعلیمات کے اثر کو مٹانے کی مؤثر کوشش کی منہاج سراج کے الفاظ یہ ہیں:۔

"و آں رسل را کہ از ملاحدہ الموت آمدہ بودند و در سر ہر کس را بطلان و بدعت و ضلال دعوت میکردند بار طلب فرمود و جملہ را فرمان داد تا بزیر تیغ آوردند و ہلاک کردند و بہر موضعے کہ از رواج فتنہ ایشاں بوئے یافت فرمان داد تا در کل بلاد ملحد کشی کردند و ہمہ را بہ دوزخ فرستاد"

سلطان سیف الدین نے صرف ایک سال اور چند ماہ سلطنت کی۔ ترکان غز جو خراسان و غزنی پر مستولی ہو چکے تھے حدود سلطنت غور پر حملہ آور ہونے لگے۔ سلطان سیف الدین نے لشکر فراہم کر کے ترکان غز پر حملہ کیا رود بار مرو کے قریب لڑائی ہوئی۔ جس وقت معرکہ کارزار تیزی سے گرم تھا سلطان سیف الدین کے سپہ سالار ابو العباس شیش نے پیچھے سے آکر سلطان کے پہلو میں نیزہ مارا۔ سلطان کو اس طرح مقتول دیکھ کر تمام فوج ترکان غز کے مقابلہ سے فرار ہو گئی اور سلطان کی لاش کو اسی طرح میدان میں چھوڑ آئی۔ سپہ سالار ابو العباس کو سلطان

سیف الدین سے اسلیے دلی عناد تھا کہ وہ ملاحدہ الموت کی تعلیمات سے متاثر اور اُن کا خفیہ الحِبّ تھا۔ غور کی یہ بھاگی ہوئی فوج جب شہر فشین سے بھی گزر کر ایک قصبہ میں پہونچی تو سپہ سالار ابوالعباس شیش کی شمس الدین ابن بہاؤالدین سام سے ملاقات ہوئی جو سلطان سیف الدین مرحوم کی فوج میں شامل تھا۔ ابوالعباس نے اسی جگہ تمام سرداران لشکر کو جو فراہم ہو سکتے تھے فراہم کیا اور شمس الدین کے بادشاہ تسلیم کر لینے پر سب کو رضامند کر لیا۔ چنانچہ اسی جگہ شمس الدین کو تخت نشین کر کے سب نے بیعت کی۔ اور شمس الدین کا لقب غیاث الدین تجویز ہوا۔ اور اسی جگہ ہر قسم کا انتظام کر کے ترکان غز کو شکست دیکر پسپا کیا۔ فیروز کوہ میں آکر سلطان غیاث الدین ابن بہاؤالدین سام نے مراسم تخت نشینی ادا کیے۔ یہ واقعہ ۵۵۲ھ یا ۵۵۳ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ شہاب الدین نے باسیاں میں جب بھائی کے تخت نشین ہونے اور سلطان بن جانے کا حال سنا تو وہ اپنے چچا فخر الدین مسعود سے رخصت ہو کر فیروز کوہ میں بھائی کے پاس پہنچا۔ سپہ سالار ابوالعباس نے چونکہ غیاث الدین کو تخت نشین کیا تھا اسلیے وہ بہت قابو یافتہ تھا اور غیاث الدین اپنے سلطانی اختیارات پورے طور پر کام میں لا سکتا تھا۔ ابوالعباس کو جب معلوم ہوا کہ سلطان غیاث الدین بھی سلطان سیف الدین کی طرح ملاحدہ الموت کا دشمن اور ان سے سخت متنفر ہے تو اس نے غیاث الدین کے خلاف غور کے لوگوں میں شورش برپا کرادی اور خود اس شورش کو بنظر اطمینان دیکھتا رہا۔ غیاث الدین کے بھائی شہاب الدین نے بھائی سے کہا کہ ہم کو اپنے چچازاد بھائی سیف الدین کے خون کا بدلہ ابوالعباس سے ضرور لینا چاہیے۔ چنانچہ سر دربار ابوالعباس کو قتل کیا گیا۔ اسکے بعد تمام شورشیں فرو ہو کر سلطان غیاث الدین کی حکومت و سلطنت خوب مستحکم ہو گئی۔ سلطان غیاث الدین نے اپنے بھائی شہاب الدین کو تگین آباد اور گرم سیر کے علاقہ کا حاکم مقرر کیا۔ شہاب الدین تگین آباد سے بار بار غزنین پر جو ترکان غز کے قبضے میں تھا حملہ آور ہوتا رہتا تھا۔ آخر سلطان غیاث الدین نے فرشتہ کی روایت کے مطابق ۵۶۸ھ میں اور منہاج سراج و نظام الدین ہروی کی روایتوں کے موافق ۵۶۹ھ میں غزنی کو فتح کر کے اپنے بھائی شہاب الدین کو غزنی کے تخت پر بٹھا کر اسکا لقب سلطان معز الدین قرار دیا اور خود اپنے دارالسلطنت فیروز کوہ کی جانب چلا گیا۔ اس طرح دونوں بھائی مستقل سلطان ہو گئے مگر چھوٹے بھائی شہاب الدین نے اپنے بڑے بھائی کی بزرگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھ کر اپنے آپ کو ہر ایک کام میں اسکا تابع فرمان رکھا اور دونوں بھائیوں نے بڑی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ حکومت کی سلطان شہاب الدین کو سلطان غیاث الدین کا وزیر بھی کہہ سکتے ہیں اور سپہ سالار بھی جس طرح بڑا بھائی شمس الدین اپنے لقب غیاث الدین کے نام سے مشہور ہوا۔ اس طرح چھوٹا بھائی شہاب الدین اپنے لقب معز الدین کے نام سے مشہور نہیں ہوا بلکہ عام طور پر اس کو شہاب الدین غوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

سلطان غیاث الدین غوری نے ۵۹۹ھ تک حکومت کی اس نے مشرق و مغرب اور شمال وجنوب کی جانب فتوحات حاصل کرکے اپنے حدود ملک کو بہت وسیع کیا سلطان غیاث الدین ابتداءً مذہب اہل حدیث رکھتا تھا مگر آخر عمر میں شافعی مذہب کا پابند ہو گیا تھا۔ سلطان غیاث الدین غوری نے ترکان غز کو بھی اپنا مطیع بنایا۔ امرائے سنجر کو شکست دیکر ہرات و بلخ وغیرہ کا علاقہ فتح کیا اور خوارزم شاہی سلطنت کو شکست دیکر اپنا لوہا منوایا۔ اور ملاحدہ الموت کے اثر کو اپنی حدود حکومت سے ہٹایا۔ سلطان غیاث الدین نے ۴۳ سال حکومت کرکے بعمر ۶۳ سال ۵۹۹ھ میں وفات پائی اور سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت ۶۰۲ھ میں ہوئی یعنے سلطان غیاث الدین کے بعد سلطان شہاب الدین صرف تین سال تنہا مطلق العنان سلطان رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین کے زمانے میں بھی سلطان شہاب الدین غوری بطور خود مختار فرمانروا برسر حکومت تھا سلطان شہاب الدین غوری اپنے بھائی غیاث الدین غوری سے تین سال چھوٹا تھا اور تین ہی سال بعد شہید ہوا۔ یعنے دونوں بھائیوں نے برابر عمر پائی۔

سلطان شہاب الدین غوری کی حملہ آوری کے وقت ہندوستان کی حالت

مسلمانوں نے ۹۲ھ سے ۵۹۰ھ تک سندھ وملتان اور پنجاب تک ہی اپنی سلطنت کو محدود رکھا حالانکہ ان کی فتحمند فوجیں سومنات سے کالنجر تک ہندوستان کے وسیع صوبوں کو پامال کرچکی تھیں۔ وہ اگر چاہتے اور ان کے داخلی واندرونی جھگڑے ان کو اپنی طرف متوجہ نہ رکھتے تو جنوب میں راس کماری اور مشرق میں آسام تک ہندوستان کو فتح کرکے اپنی حکومت وسلطنت میں شامل کرلینا مسلمانوں کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ سندھ وپنجاب پر پانسو سال تک قانع رہنا اور مشرق کی جانب آگے نہ بڑھنا دلیل اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے نہ کوئی خصوصی عداوت تھی نہ مسلمان ہندوستان پر قابض ہونے اور اسکو اپنی حدود سلطنت میں شامل کرلینے کے زیادہ شائق تھے۔ انکو ہندوؤں سے کوئی خطرہ واندیشہ نہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ انکے استیصال اور بربادی کے خواہاں ہوتے۔ ہندو موریا اور گپت خاندانوں کی حکومت کے زمانے اور بودھ مذہب کے عروج ورواج کے زمانے میں ضرور کسی شایستہ تمدن اور مناسب وموزون معاشرت کے مالک ہونگے لیکن بودھ مذہب کے زوال اور گپت خاندان کی بربادی کے بعد تو ہندوؤں میں مذہبی اخلاقی سیاسی تمدنی اور معاشرتی پستی اسقدر داخل ہو چکی تھی کہ وہ مسلمانوں کی آمد اور ان کی صحبت کے بغیر کسی طرح بھی کسی قسم کی ترقی نہیں کرسکتے تھے۔ مسٹر کے ایم پانیکار اپنی تاریخ ہند قدیم میں ہندوؤں کی ناقص حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"اسی پراگندگی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر ہندوستان میں سیاسی نظام کی

ترقی ناپید ہو چکی تھی۔

پہلے باب میں کسی قدر بیان ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت سندھ میں اخلاق و معاشرت کی پستی کا کسقدر دور دورہ تھا۔ مسلمانوں کے سندھ میں داخل اور قابض ہو جانیکے بعد انکی صحبت سے سندھ کے ہندوؤنکی اخلاقی پستی نہ صرف رک گئی تھی بلکہ اُنھوں نے مسلمانوں کی صحبت سے متاثر ہو کر نمایاں ترقی کی اسی طرح سندھ کے ملحقہ علاقوں پر مسلمانوں کا اثر پڑا۔ یہی حال محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد پنجاب کا ہوا لیکن ہندوستان کے جن صوبوں اور جن حصوں میں مسلمانوں کا اثر نہیں پہونچ سکا وہاں ہندوؤنکی اخلاقی و معاشرتی حالت برابر رو بہ تنزل رہی۔ یہانتک کہ مسلمانوں نے تمام ہندوستان پر حکومت قائم کرکے ہندوؤنکی رو بانحطاط قوم کو سنبھالا اور اسکے اخلاق و معاشرت میں ایک خوشگوار تبدیلی و ترقی پیدا کی۔ ہندوؤں کے تنزل کی رفتار کا اندازہ کرنیکے لیے سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے سے چند روز پہلے کی حالت کا معائنہ اگر ممکن ہو تو از بس ضروری ہے۔ دوسرے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ ۱۰۴۵ء مطابق ۴۳۷ھ میں وشن پوران تصنیف ہوا تھا۔ وشنو مت کی ایجاد کا مقصد اصلیہ جب پورا نہ ہوا تو سو برس کے بعد ۱۱۵۰ء مطابق ۵۴۵ھ میں رامانج نامی ایک شخص نے دکن میں وشن مت کی تجدید و اصلاح کرکے اسکو بالکل ایک جدید قالب میں ڈھال دیا اور وشن پوران میں بھی تحریف و تبدیل و تجدید کا سلسلہ حسب دستور جاری رہا۔ مگر اسی زمانے میں شیومت کی خوب گرم بازاری ہوگئی تھی۔ چولایا چلوکیہ خاندان کے ایک راجہ نے شیومت کی سرپرستی اختیار کرکے رامانج کو جو وشن مت کا پیرو تھا اپنی حدود حکومت سے خارج کیا۔ رامانج نے میسور کے راجہ کی پناہ میں جاکر جو جینی مذہب کا پیرو تھا اسکو وشن مت کا پیرو بنالیا۔ ۱۱۸۰ء مطابق ۵۷۶ھ میں چلوکیہ بنس کا خاتمہ ہوا۔ اور اسکی جگہ کالابھوریا بنس حکمران ہوا۔ اس خاندان کے عہد حکومت یعنی ۱۱۹۲ء مطابق ۵۸۸ھ میں جبکہ شمالی ہند میں شہاب الدین غوری اور پرتھی راج برسر پیکار تھے۔ دکن کے ایک پنڈت نے شیومت کے اندر لنگ کی پوجا کو اصل عبادت قرار دیکر ایک نیا فرقہ جاری کیا۔ نیز شیو کے لنگ کی مورت کے ساتھ شیو کی بیوی کی شرمگاہ کی پرستش بھی ضروری قرار دیگئی۔ دکن میں آجتک بھی لنگ اور بھگ کی پوجا کرنے والے بہ کثرت موجود ہیں۔ انھیں شیوی فرقوں میں اگھوریوں کا بھی ایک فرقہ ہے جو انسان کے گوشت کو کھانا جائز سمجھتا اور ناقابل تصور افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ مہادیو کی لنگ کی پوجا کرنے والوں کا معاصر ایک دوسرا گروہ الگمزنامی پیدا ہوا۔ اس گروہ کے عقیدے میں ناقابل بیان بے حیائیاں موجب ثواب سمجھی جاتی ہیں اور ان بے حیائیوں کو اس فرقہ نے مستحسن قرار دیا۔ اس گروہ کے عقیدے میں پرش میدھ یعنے انسان کا قتل کرنا اور اسکے گوشت کو آگ میں بھون کر کھانا ثواب کا کام ہے۔ تاریخ مالوہ میں لکھا ہے کہ ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو نیجی کا پجاری ہے اور جب کوئی شخص ان میں مرتا ہے تو وہ مرشے کو زمین میں دفن

کردیتے ہیں جب اس کا گوشت پھول کر پھٹتا ہے تو اسکو سب ملکر کھا جاتے اور اسکو بڑا نیک کام سمجھتے ہیں
یہ فرقہ بھی اسی مذکورہ زمانہ کی پیداوار ہے۔ اسی زمانے میں ایک فرقہ ہندوؤں میں پراگ پنتھی پیدا ہوا۔
ان کے مذہب میں کوئی چیز حرام نہیں اگھوری فرقے کے عقیدے میں جسکا ذکر ابھی ہوا پیشاب اور پاخانہ ملاکر
پارچہ بیز کرکے پینا اور حبس دم کو عبادت قرار دیا گیا (دیکھو تاریخ مالوہ) اسی زمانے میں ایک فرقہ پرم ہنس نامی
پیدا ہوا جنھوں نے داڑھی مونچھ اور سر کو منڈانا۔ مادرزاد ننگے پھرنا اور عورتوں سے ......
پوجا کرانا حسن عمل قرار دیا۔ سنا ہے کہ ان لوگوں کو ناگے کہتے ہیں اور ہردوار کے بعض میلوں میں وہ آتے
اور مذکورہ پوجا بھی کراتے ہیں۔ ایک فرقہ ایسا پیدا ہوا جس نے اپنے اندر اس رسم کو لازمی قرار دیا کہ
جو شخص لاولد مرجائے اسکی بیوہ عورت کا گھر کے ایک ستون سے عقد کردیا جاسے اور عزیز و اقارب میں سے
جو شخص اس گھر میں تعزیت کے لیے جائے وہ ....
..............................اس طرح جو لڑکا پیدا ہو وہ اس
فوت شدہ مرد کا بیٹا سمجھا جائے اور اسکی میراث پائے (تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ مالوہ) بطور مشتے نمونہ از خروارے
یہ چند فحش باتیں مجبوراً نہایت افسوس کے ساتھ بیان کرنی پڑی ہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ
میں ہندوستان کی تہذیب۔ اخلاق اور جذبات کسقدر پست و ذلیل ہو چکے تھے یہ تمام فرقے اور پنتھ برہمن لوگ
ہی ایجاد کرتے اور کسی نہ کسی راجہ کی سرپرستی سے امداد پاتے اور مذکورہ بیحیائیوں کو رواج دیتے تھے۔ خلاصۂ کلام
یہ کہ ہندوستان میں ظلم و عصیان اور بے شرمی و طغیان کا وہ عظیم الشان طوفان آچکا تھا کہ بابلیوں، عادیوں، لوطیوں،
نمرودیوں وغیرہ اقوام کی طرح ہندوؤں کی قوم بھی صفحۂ ہستی سے نابید و بے نشان ہو جائے اور عذاب الٰہی کی
تلوار اس قوم کو تہس نہس کر ڈالے لیکن ہند اور اہل ہند کی خوش نصیبی تھی کہ پرستاران الٰہی یعنی مسلمانوں کے قدم
اس سرزمین پر پہونچ چکے تھے اُنھوں نے جلد جلد تمام شمالی ہند اور دکن پر بھی قابض و متصرف ہو کر ان بیہودہ کاریوں ان
حیا سوز بداخلاقیوں اور انسانیت کش مظالم کی بیخکنی میں کوتاہی نہیں کی اور ہندو قوم کو اپنے شریفانہ نمونہ سے تہذیب
و متانت اور آدمیت و انسانیت کی تعلیم دے کر برباد ہونے سے بچا لیا۔ مذکورہ اقسام کے قریباً تمام فرقے اور تمام
بداعمالیاں اس بدتہذیبی و بداخلاقی کے طوفان کا پتہ بتانے کے لیے آج بھی ہندوؤں کی قوم میں غالباً تلاش
کیا جانا ممکن ہے لیکن اسلامی عہد حکومت میں یہ تمام فرقے ٹھٹھرنے سکڑنے اور اپنے اعمال و عقائد کو عیب سمجھ کر
چھپانے لگے اور تہذیب و متانت و انسانیت کا رواج ترقی پانے لگا۔ اسلامی حکومت کے مٹنے کے بعد پھر سننے
میں آتا ہے کہ بعض جدید مذہبی فرقے نیوگ جیسی حیا سوز مراسم پر عملدرآمد کرانا ضروری سمجھنے لگے ہیں۔
محمود غزنوی، و شہاب الدین غوری کا درمیانی زمانہ ایسا ہے کہ سندھ و پنجاب کے علاوہ ہندوستان کے

تاریخی حالات نہایت گہری تاریکی میں روپوش ومدفون ہیں اور کسی طرح بھی ہم اِس زمانہ کے تفصیلی حالات معلوم نہیں کرسکتے۔ حالانکہ محمود غزنوی سے پہلے کے حالات بہت کچھ معلوم ہوسکتے ہیں۔ اسکی وجہ یہی کہ اِس زمانے میں ہندوستان کے اندر قومی ومذہبی نظامات تمام درہم برہم ہوچکے تھے۔ برہمنوں کی مطلق العنانی اور ان کی اغراض نفسانی نے اخلاق وتہذیب ومعاشرت کو تباہ کردیا تھا اور ان کی پیدا کردہ راجپوت قوم نے خوب قابو یافتہ ہوکر برہمنوں کے حقیقی اقتدار کو فنا کرکے بے دست وپا اور اپنی خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کے لیے مذہبی تائید حاصل کرنے کا آلہ بنالیا تھا۔ ایسی حالت میں جبکہ بداعمالیوں کا ہرطرف دور دورہ ہو۔ اور یہی خواہشات وجذبات نے عام طور پر لوگوں کو مغلوب کرکے اخلاق وتہذیب کو مفلوج کردیا ہو نہ کسی کو کسی تصنیف کا موقع مل سکتا ہے نہ ایسے زمانے کی یاد تازہ رکھنے کا کوئی سامان کیا جاسکتا نہ کوئی یادداشت رکھی جاسکتی ہے۔ اس زمانے کی تصانیف میں شاکت مت اور بام مارگیوں کی تصانیف کا خصوصیت سے نام لیا جاسکتا یا چند ایسی دوراز عقل باتوں سے مملو کہانیوں کا پتہ بتایا جاسکتا ہے جن سے انسان کو کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا اور کوئی مفید واقفیت حاصل نہیں کیجاسکتی۔

سلطان شہاب الدین غوری کے حملے ہندوستان پر

اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ ۵۶۹ھ میں سلطان غیاث الدین غوری نے اپنے بھائی شہاب الدین غوری کو غزنی کے تخت پر بٹھاکر سلطان معزالدین کا لقب یا خطاب دیا تھا۔ سلطان شہاب الدین نے تخت سلطنت پر جلوس کرکے سب سے زیادہ اپنی توجہ ملاحدہ الموت کا اثر مٹانے میں صرف کی۔ علاؤ الدین جہانسوز ملاحدہ کے مسلک پر عامل ہوچکا تھا۔ اسکے زمانے میں ملاحدہ الموت کے منادوں اور مبلغوں نے سلطنت غور کے قصبوں شہروں اور گاؤں میں اپنے مسلک کی خوب تبلیغ کی تھی، علاؤ الدین جہانسوز کے بیٹے سلطان سیف الدین نے ملاحدہ کے اثر کو مٹایا۔ اسکے بعد سلطان غیاث الدین غوری بھی چونکہ ملاحدہ الموت کا دشمن تھا ان کے اثر کو مٹانے اور شریعت اسلام کو رواج دینے میں مصروف رہا۔ اب جبکہ سلطان شہاب الدین غوری غزنی کا بادشاہ بنا تو اس نے بھی اپنی تمام تر توجہ اسلام کے رواج دینے اور الحاد وکفر کے مٹانے میں صرف کی۔ دو سال تک سلطان شہاب الدین نواح غزنی کے انتظام اور اردگرد کے ملاحدہ کو خارج کرنے میں مصروف رہا ۵۷۱ھ میں اس کو اطلاع پہنچی کہ ملاحدہ نے ملتان پہنچکر اپنی حکومت قائم کرلی ہے چونکہ اس سے پہلے ملتان قرامطہ کا مسکن وملجا رہ چکا تھا اسلیے ملاحدۂ الموت کو ملتان پر قابض ہونے اور ہندوؤں کی اعانت حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ غوری خاندان چونکہ غزنوی خاندان کا جانشین اور اپنے آپ کو محمود غزنوی کی قائم کی ہوئی سلطنت کا وارث ومالک سمجھتا تھا لہذا غزنی پر قابض ومتصرف ہونے کے بعد سلطان غیاث الدین غوری کے

حسب الایما سلطان شہاب الدین کا مصمم ارادہ تھا کہ پنجاب پر چڑھائی کر کے خسرو ملک سے پنجاب کا صوبہ چھین لیا جائے۔ کیونکہ غزنی پر قابض ہونیکے بعد سلطنت غزنی کے تمام صوبوں کو اپنے قبضے میں لانے کا حق خاندان غور کو حاصل ہو چکا تھا۔ مگر چونکہ اپنی حدود حکومت سے ملاحدۂ الموت کا استیصال زیادہ ضروری تھا لہذا دو سال تک کسی دوسری جانب متوجہ ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ اب ملتان پر ملاحدہ کے قابض ہونے کی خبر نے پنجاب کی طرف متوجہ ہونے سے باز رکھا اور ملتان کو پنجاب پر ترجیح دینا ضروری سمجھا گیا۔ کیونکہ ملتان بھی پنجاب کی طرح سلطنت غزنی کا ایک جزو تھا۔ چنانچہ ۵۷۱ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے ملتان پر حملہ کیا ملاحدہ نے سخت مقابلہ کے بعد شکست کھائی اور اکثر گرفتار و مقتول ہوئے۔ سلطان شہاب الدین غوری نے اپنے سپہ سالار علی کرماخ کو ملتان کا حاکم و عامل مقرر کیا اور ملتان کے انتظام سے فارغ ہو کر مقام اُچ پر حملہ کیا، جہاں ملتان کے مفرور ملاحدہ نے پناہ لی تھی۔ اُچ کا راجہ مقابلہ پر آمادہ ہوا اور قلعہ بند ہو کر مدافعت کرنے لگا، راجہ کی بیوی نے سلطان کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر میری خوبصورت جوان بیٹی سے نکاح کرنے کا وعدہ کرو اور میرے مال و زیور و جائداد وغیرہ کو نقصان نہ پہنچاؤ تو میں راجہ کا کام تمام کیے دیتی ہوں۔ اس طرح تمہارا کام بہت ہلکا ہو جائیگا سلطان نے جواباً راج کماری سے نکاح کر لینے کا وعدہ کیا۔ رانی نے راجہ کو ہلاک کر دیا جو خود ہی مغلوب ہو کر ہلاک ہونے والا تھا۔ سلطان نے قلعہ اُچ پر قابض ہو کر اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ راج کماری سے نکاح کر کے اسکو اپنے ہمراہ غزنی لیگیا۔ دو برس کے بعد یہ لڑکی فوت ہو گئی تھی سلطان ابھی اُچ سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اسکے پاس مقام سنقران میں بغاوت برپا ہونے کی خبر پہونچی۔ قلعۂ الموت میں ملاحدہ کا بادشاہ محمد بن علی ذکرہ تخت نشین تھا جو تمام سلاطین ملاحدہ میں سب سے زیادہ مستعد و چالاک اور سب سے زیادہ اپنے مسلک کی اشاعت میں سرگرم تھا سنقران کے لوگ سلطان محمد بن علی ذکرہ کے ہوا خواہ اور فدائی بنکر اسی کے اشارے سے باغی ہوئے تھے کہ کہ ملتان کی فتح معرض التوا میں پڑ جائے مگر سلطان شہاب الدین نے ملتان و اُچ کو بھی فتح کر لیا اور وہاں سے سنقران کے ملحد باغیوں کا بھی قتل عام کیا۔ ملتان کی فتح کو شہاب الدین غوری کا ہندوستان پر پہلا حملہ سمجھنا چاہیے۔ محمد بن علی ذکرہ فرماں روائے الموت اور راجہ بھیم دیو حاکم نہروالہ (ملک گجرات) کے درمیان سلطان شہاب الدین کے خلاف سلام و پیام کا سلسلہ جاری ہو کر دوستی کا عہد نامہ ہو چکا تھا۔ راجہ بھیم دیو نے ملاحدہ سے امداد پاکر سندھ و ملتان کو علی کرماخ سے چھین لینے کی تیاری کی اور ایک عظیم الشان لشکر اس مقصد کے حاصل کرنیکے لیے مرتب کیا اس خبر کو سُن کر ۵۷۴ھ کے آخر ایام میں سلطان شہاب الدین غزنی سے روانہ ہو کر ملتان پہنچا اور یہاں سے نہروالہ کی جانب روانہ ہوا۔ اس سفر میں سلطان سے ریگستان کی صعوبات اور پانی نہ ملنے کا صحیح اندازہ کرنے اور بھیم دیو کی جنگی طاقت کا تخمینہ لگانے میں غلطی ہوئی۔ نہروالہ کے قریب

سلطان اسوقت پہنچا جبکہ اسکی فوج کا بڑا حصہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے راستے میں ہلاک ہو چکا تھا۔ بھیم دیو نے فدائی لشکر کے ساتھ سلطان کی تھکی ماندی اور نہایت قلیل فوج کو آرام لینے اور سستانے کی مہلت نہ دی۔ سلطانی لشکر کو ہندوؤں اور ملحدوں کی تازہ دم اور کثیر التعداد فوج کے مقابلہ میں ناکامی تو ہوئی مگر دشمنوں کے دلیر اس مٹھی بھر فوج کی شمشیر زنی وجانبازی دیکھ کر ہیبت زدہ ہو گئے۔ سلطان کو بلے حصول مقصد نہر والہ سے ۵۷۴ھ میں واپس آنا پڑا۔ اور واپسی میں بھی ریگستانی سفر بڑی دشواریوں سے طے ہوا۔ اس سفر کے تجربے نے سلطان پر ثابت کر دیا کہ گجرات سے پہلے پنجاب پر قبضہ کرنا ضروری ہے سلطان کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ کیونکہ بھیم دیو کو بھی سندھ و ملتان پر چڑھائی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ سلطان نے ۵۷۵ھ میں غزنی سے پشاور کی طرف کوچ کیا اور شہر پشاور کو فتح کر کے پنجاب کے مغربی اضلاع کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان اضلاع کے انتظام و تحکیم سے فارغ ہو کر ۵۷۷ھ میں لاہور پر حملہ آور ہوا خسرو ملک تاب مقابلہ نہ لا کر لاہور میں محصور ہوا۔ اور اپنے عجز کا اقرار کر کے ایک ہاتھی بطور پیشکش سلطان کی خدمت میں بھیجا اور اپنے بیٹے کو بھی بطور یرغمال سلطان کے پاس بھیج دیا۔ سلطان لاہور سے محاصرہ اٹھا کر غزنی پہنچا اور اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کو تمام حالات سے مطلع کیا۔ مغربی پنجاب کے شامل سلطنت اور خسرو ملک کے مطیع ہو جانے کے بعد پنجاب کی طرف سے اطمینان حاصل ہو چکا تھا۔ لہذا گجرات کے راجہ اور ملاحدہ ملتان کے خطرہ کا انتظام ضروری تھا سلطان نے اس خطرے سے مطمئن ہونے کے لیے بہترین تدبیر سوچی اور پنجاب سے غزنی ہو کر آرام کیے بغیر فوراً دیبل (کراچی) کی طرف فوج کشی کی۔ ساحل سمندر اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا علاقہ فتح کر کے اپنی طرف سے دیبل میں ایک عامل مقرر کر دیا۔ اس فتح اور اس انتظام سے سلطان کا مقصد یہ تھا کہ ملاحدہ ملتان اور حاکم گجرات کے درمیان فوجی امداد کے آنے جانے کا راستہ مسدود ہو جائے۔ چنانچہ یہ مقصد بخوبی حاصل ہو گیا اور بظاہر سلطان کے ہندوستان پر حملہ آور ہونیکی کوئی ضرورت باقی نہ رہی لیکن خسرو ملک نے لاہور میں پنجاب کے ہندوؤں کی مشہور جنگجو قوم گکھڑوں کی بھرتی شروع کی اور ان کو اپنی طرف مائل کر کے مغربی پنجاب کو فتح کرنیکی تیاری شروع کی۔ سلطان کو جب خسرو ملک کے اس ارادے کا حال معلوم ہوا تو وہ ۵۸۱ھ میں فوج لے کر پنجاب آیا۔ خسرو ملک لاہور میں متحصن ہوا جہاں وہ مدافعت کی پوری تیاری کر چکا تھا۔ سلطان نے لاہور کو چھوڑ کر راوی و چناب کے دوآبہ میں سیالکوٹ کا قلعہ تعمیر کیا اور پنجاب کے ایک بڑے علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے قلعہ سیالکوٹ میں اپنی طرف سے اپنے ایک سردار حسین خرمیل کو متعین کیا کہ تمام مفتوحہ ملک پر قبضہ رکھو اور خسرو ملک کی تادیب پر مستعد رہو۔ اس انتظام کو کافی سمجھ کر اور خسرو ملک کے قبضے سے ایک بڑا علاقہ نکال کر سلطان غزنی واپس چلا گیا۔ سلطان کے جاتے ہی خسرو ملک نے گکھڑوں اور بقول بعض کھوکھروں کی جنگجو اور جرائم

پیشہ ہندو قوم کو ہمراہ لیکر سیالکوٹ پر حملہ کیا اور حسین خرمیل کو محصور کیا حسین خرمیل نے بھی مخلص ہوکر حق مدافعت ادا کر دیا اور بڑی جوانمردی کے ساتھ خسرو ملک کا مقابلہ کیا۔ یہانتک کہ خسرو ملک قلعہ سیالکوٹ کو فتح نہ کرسکا اور مجبور ہوکر لاہور چلا آیا مگر اس تمام علاقے پر جو سلطان شہاب الدین نے دوسری مرتبہ آکر فتح کیا تھا قبضہ کرلیا یہ خبریں سن کر ۵۸۲ھ میں سلطان شہاب الدین نے لاہور پر حملہ کیا اور خسرو ملک کو گرفتار کرلیا۔ اس طرح تمام ملک پنجاب سلطان شہاب الدین غوری کے قبضے میں آگیا سلطان نے ملتان سے علی کرماخ کو لاہور طلب کرکے پنجاب وملتان دونوں صوبوں کی حکومت اسکو سپرد کی اور طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کے باپ مولانا سراج الدین کو لشکر ہندوستان کا قاضی اور امام مقرر کیا۔ خسرو ملک کو اپنے ہمراہ غزنی لیگیا غزنی سے سلطان غیاث الدین کی خدمت میں بمقام فیروزکوہ روانہ کیا۔ جہاں پانچ سال قیدرہ کر ۵۸۷ھ میں خسرو ملک اور اسکا بیٹا دونوں فوت ہوئے یا ہلاک کیے گئے۔ خسرو ملک کی نسبت اوپر بیان ہوچکا ہے کہ اس نے اپنے ایام حکومت میں پنجاب کے مشرقی علاقے پر دہلی کے راجہ کو قبضہ کر لینے دیا تھا اور کوئی تدارک اسکا نہ کرسکا تھا۔ اب جبکہ سندھ وملتان وپنجاب کے صوبے بھی سلطان کے قبضے میں آچکے تھے تو یہ کسی طرح جائز نہ تھا کہ سلطنت محمودی کا ایک حصہ دہلی کے راجہ کو غصب کر لینے دیا جائے اور اس سے واپس نہ مانگا جائے جس پر کہ اس نے خسرو ملک کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا۔ چنانچہ سلطان نے راے تھورا (پرتھی راج) حاکم دہلی واجمیر کو خط لکھا کہ سلطنت غزنی کے علاقہ کو خالی کردو اور جس طرح سلطان محمود غزنوی کے خاندان کی سیادت کو تسلیم کرتے تھے اسی طرح اب ہماری سیادت کو تسلیم کرو۔ پرتھی راج نے بجائے اسکے کہ وہ مغصوبہ علاقے سے دستبردار ہوجاتا سلطان کے خط کا جواب سختی سے دیا اور مقابلہ ومقاتلہ پر آمادگی ظاہر کی سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۷ھ میں لاہور آکر حالات کی تحقیق لی۔ اس کو معلوم ہوا کہ کرنال وتھانیسر تک کا علاقہ پرتھی راج کے قبضے سے نکالنا ضروری ہے چنانچہ اس نے لاہور سے روانہ ہوکر سرہند کے قلعہ کو پرتھی راج کے آدمیوں سے چھین لیا اور قلعہ سرہند میں طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کے ایک قریبی رشتہ دار قاضی ضیاءالدین تولکی کو بارہ سو آدمی دیکر قلعدار مقرر کیا اور اسی تصرف کو کافی سمجھ کر اور قلعہ سرہند پر قبضہ قائم رکھنے کا انتظام کرکے لاہور کی طرف واپس ہوا طبقات ناصری، طبقات اکبری منتخب التواریخ۔ خلاصۃ التواریخ وغیرہ اکثر کتابوں میں قلعہ سرہند لکھا ہے لیکن تاریخ فرشتہ میں اس قلعہ کا نام بھٹنڈہ بتایا گیا ہے۔ اس قلعہ سے لاہور کی جانب روانہ ہونے کے بعد سلطان نے سنا کہ پرتھی راج اور اسکا بھائی کھانڈے راے مع بہت سے راجاؤں کے دو لاکھ سپاہی اور بہت سے جنگی ہاتھی لیے سلطان کے مقابلے کو آرہے ہیں سلطان اگرچہ اسوقت ہرگز پرتھی راج کے مقابلہ کی استعداد اور لڑائی کا ارادہ نہ رکھتا تھا کیونکہ اس کے ہمراہ تین چار ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی۔ مگر یہ سن کر کہ پرتھی راج لڑائی کے ارادے سے نکلا ہے غیرت سلطانی نے

گھوڑے کی باگ موڑی اور دشمن کے استقبال کو تھانیسر کی جانب روانہ ہوا۔ پرتھی راج خود اجمیر میں رہتا تھا اور دہلی میں اپنی طرف سے اپنے ایک رشتے کے بھائی کھانڈے رائے کو بطور نائب السلطنت مقرر کر رکھا تھا یہ کھانڈے رائے پرتھی راج کی فوج کا سپہ سالار اعظم اور ہندوستان کا مشہور بہادر سردار سمجھا جاتا تھا۔

شہاب الدین اور پرتھی راج کا پہلا معرکہ

موضع ترائن میں جسکو آجکل تراوڑی کہتے ہیں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقام دریائے سرستی کے کنارے تھانیسر سے سات کوس اور دہلی سے چالیس کوس کے فاصلے پر تھا۔ سلطان لپنے مٹھی بھر ہمراہیوں کو میمنہ ومیسرہ وقلب میں تقسیم کرکے ہندو فوج کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ سلطانی لشکر کی صحیح تعداد کو کسی مورخ نے نہیں لکھی لیکن اِس میدان میں سلطانی لشکر تین چار ہزار سے زیادہ نہ تھا۔ ایک فروگذاشت یہ بھی ہوگئی تھی کہ بارہ سو کی تعداد میں جو سب سے بہتر انتخابی سوار تھے وہ قلعہ سرہند میں قاضی ضیاء الدین تولکی کو سپرد ہو چکے تھے اور وہ اِسوقت سلطانی لشکر میں شامل نہ تھے۔ ہندو لشکر نے بڑے جوش وخروش سے حملہ کیا۔ سلطان قلب لشکر میں موجود اور مصروف قتال تھا کہ ایک مصاحب نے آکر سلطان کو اپنی طرف متوجہ کرکے کہا کہ میمنہ ومیسرہ کی فوجیں فرار ہو چکی ہیں آپ کا اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے اسوقت یہاں سے جان سلامت لیجانا ہی مصلحت ہے۔ تاکہ دوسرے وقت پوری تیاری اور مضبوطی کے ساتھ آکر ہندوؤں کا مقابلہ کرسکیں سلطان نے کہا کہ میں میدان جنگ سے منھ موڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اسی اثنا میں ہندو لشکر نے اسلامی لشکر کے دونوں بازوؤں کو مفرور دیکھ کر اور زیادہ دلیر ہو کر پوری شدت سے حملہ کیا اور قلب کی قلیل جمعیت کو جس میں سلطان بھی موجود تھا چاروں طرف سے گھیر لیا سلطان نے پہلے سے جو گنی شمشیر زنی شروع کی کھانڈے رائے جو ہاتھی پر سوار تھا اس نے سلطان کو سب سے زیادہ مصروف شمشیر زنی دیکھ کر اپنا ہاتھی اس پر ریل دیا سلطان نے بھی چابکدستی وحملہ آوری میں مطلق کوتاہی نہیں کی کھانڈے رائے اور سلطان کے وار ایک دوسرے پر برابر پڑتے سلطان کا نیزہ ہودہ کو سوراخ کرتا ہوا کھانڈے رائے کے چہرے تک پہونچا اور اسکے دو دانت اِس نیزے کی ضرب سے ٹوٹ کر اسکے منھ میں گر گئے۔ کھانڈے رائے کے نیزے نے سلطان کے بازو کو زخمی کیا اور ساتھ ہی دوسرے ہندو سرداروں کے وار سلطان پر پڑے جس سے سلطان سخت زخمی ہو کر بیہوش ہو گیا اور قریب تھا کہ گھوڑے سے گر پڑے اتنے میں پیچھے سے ایک خلجی بچے نے سلطان کی اِس نازک حالت کو دیکھ کر جرأت وہمت اور بیحد قابل تعریف ہوشیاری سے کام لیا کہ اچھلکر فوراً سلطان کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اور سلطان کو کولی میں بھر کر گھوڑے کو مہمیز کر دیا۔ گھوڑے کی جفاکشی وشہ زوری اِس خلجی بچے کی چابک دستی سے بھی زیادہ قابل تعریف ہے کہ دو آدمیوں کو

لیکر اس ہجوم میں سے اِس طرح بھاگا کہ کسی کو تعاقب کی جرأت نہ ہوئی۔ میدان جنگ سے بیس میل کے فاصلے پر جاکر سلطان کو گھوڑے سے اُتار اگیا جہاں بعض مفرورین پہلے سے پہونچے ہوے تھے سلطان کی حالت بہت نازک تھی۔ سپاہیوں نے اپنے نیزے توڑکر اور نیزے کے بانسوں کو جوڑ کر سلطان کے لیے ایک ڈولی بنائی اور اس میں ڈال کر لاہور کی جانب لے چلے۔ سلطان لاہور سے غزنی کی جانب گیا۔ یہاں پرتھی راج نے ترّاوری کے میدان میں فتحمند ہوکر قلعہ سرہند پر حملہ کیا اور قاضی ضیاؤالدین کو محصور کر لیا۔ قاضی ضیاؤالدین نے قلعہ بند ہوکر اس خوبی کے ساتھ مدافعت کی کہ پرتھی راج کی زبان پر چھٹی کا دودھ آگیا۔ تیرہ مہینے تک محاصرہ جاری رہا مگر قلعہ فتح نہ ہوسکا آخر تیرہ مہینے کے بعد قاضی ضیاؤالدین نے خود ہی صلح کے ساتھ قلعہ خالی کر دیا اور تمام سامان لیکر لاہور پہونچ گیا جبکہ سلطان بھی غزنی سے فوج لیکر ہندوستان واپس آچکا تھا۔ لاہور اور ملتان کے عاملوں نے یہ بڑا کام کیا کہ مذکورہ قلعہ سرہند کے علاوہ ہندوؤں کو اور کسی سمت سے قدم آگے نہیں بڑھانے دیا۔ سلطان شہاب الدین کے زخمی ہونے اور میدان جنگ سے زندہ بچکر نکل آنے کا جو حال درج ہوا اس میں بہت ہی خفیف اور ناقابل التفات اختلاف کے ساتھ تمام مورخ متفق ہیں۔ لیکن تاریخ زین الماثر کا یہ بیان یقیناً قابل التفات ہے کہ سلطان جب زیادہ زخمی ہوا تو بیہوش ہوکر گھوڑے سے نیچے گر پڑا چونکہ سلطان کے جسم پر کوئی امتیازی لباس اور مخصوص شاہی نشان نہ تھا اسلیے کسی نے نہ پہچانا کہ یہ سلطان شہاب الدین غوری ہے اور کوئی اسکی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اسلامی لشکر کے بقیۃ السیف مفرورین نے سلطان کو شہید سمجھا۔ جب رات ہوئی تو سلطان کے چند غلام جو میدان کے قریب کسی جگہ چھپ گئے تھے میدان جنگ میں آئے اور سلطان کی لاش کو تلاش کرنے لگے۔ چنانچہ اُنھوں نے سلطان کو لاشوں میں پڑا ہوا نہایت نازک حالت میں پایا۔ وہاں سے اُٹھاکر نوبت بہ نوبت اپنے کاندھوں پر بٹھاتے ہوے رات بھر سفر کرکے بیس کوس چلکر صبح ہوتے اس مقام پر پہونچے جہاں لشکر کے مفرورین جمع تھے وہاں نیزوں کی ڈولی بناکر اور اس میں سلطان کو ڈالکر لاہور کی جانب لے گئے۔

پرتھی راج کا کچھ حال

پرتھی راج کا اکثر حال اوپر بیان ہوچکا ہے۔ اِس جگہ یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض ہندو اور یورپی مورخین نے پرتھی راج اور جے چند کے متعلق بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا اُس زمانے کے قریب العہد مورخین نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ہندوؤں کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے بزرگوں کے صحیح حالات کبھی نہیں لکھے اور ہمیشہ فرضی کہانیوں اور جھوٹے افسانوں ہی سے دل بہلاتے رہے۔ تاریخ کی طرف سے اِس بے اتفاقی کا افسوس جسقدر خود ہندوؤں کو ہوتا ہوگا اس سے بڑھ کر اُن لوگوں کو ہے جو قدیم ہندو راجاؤں اور ہندو رہبروں کے حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں اور کہیں بھی حسب ضرورت سامان نہیں پاتے ہندو انھاس کی کتابوں میں اگر

کسی شخص کی عمر چودہ لاکھ سال بتائی جائے یا کسی مرد کو کسی جگہ کی آب وہوا یا جادو کی تاثیر سے عورت بنا کر اسکے
پیٹ سے بہت سے بچے بھی جنوا کر پھر اسکو مرد بنا دیا جائے۔ یا کسی شخص کے جسم میں کثیر التعداد عورت کی شرمگاہیں
پیدا کردی جائیں یا کسی کی ہتھیلی پر سیکڑوں میل مکعب پہاڑ رکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچا دیا جائے یا کسی
ایک شخص کے دو پاؤں پر ایسا جسم بتایا جائے جس میں بیں ہاتھ اور دس گیارہ سر ہوں تو ہمکو نہ کوئی تعجب ہونا چاہیے
نہ شکایت کرنا چاہیے۔ مگر تعجب اس بات پر ہے کہ ٹاڈ صاحب، ہنٹر صاحب، لیتھبرج صاحب، الفنسٹن صاحب
وغیرہ یورپین مؤرخ اگرچہ ان دوراز عقل ہندو اتہاس کی کتابوں اور عقل سوز فرضی کہانیوں کو پا لیتے ہیں تو
اس بات کی کوشش کرنے لگتے ہیں کہ ان ناقابل قبول باتوں کو لوگ وحی والہام سمجھ کر ان پر ایمان لے آئیں
اور کسی قسم کے شک وشبہ اور خدشہ کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔ اسی قبیل کی باتوں میں سے ایک جے چند کی بیٹی کا سوئمبر
(مجلس شوہر پسندی) اور پرتھی راج کا اس تقریب کے موقع پر اس کو زبردستی قنوج کے محل شاہی سے اٹھا لانا ہے
اسی طرح شہاب الدین غوری کا ایک دو مرتبہ نہیں سات مرتبہ پرتھی راج کے ہاتھ میں گرفتار ہونا ہے۔ اس قسم
کی بیہودہ اور دوراز حقیقت باتوں کو درست اور صحیح یقین کر لینے کے لیے ہمکو پرتھی راج کے کسی بھاٹ کی
بنائی ہوئی نظم کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے ہندو مصنفین کی تاریخی تصانیف ہی کونسی قابل اعتماد اور لائق
قبول ہیں کہ ایک بھاٹ کے کبت پر ایمان لانے کی فرمائش کیجاتی ہے۔ پرتھی راج اور جے چند کی نسبت ایک
طرف تو بیان کیا جاتا ہے کہ وہ آپس میں خالہ زاد بھائی تھے۔ دوسری طرف یہ بتایا جاتا ہے کہ پرتھی راج جے چند
کی بیٹی سنجوگتا کو زبردستی قنوج سے اٹھا لایا اور اپنی بیوی بنا لیا۔ لیکن ہندوؤں اور چوہان راجپوتوں میں تو خالہ زاد
بھائی کی بیٹی یعنے بھتیجی کو بیوی بنانا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے چہ جائیکہ اس زبردستی اور دھینگامشتی کی بداخلاقی
کا ارتکاب کیا جائے اور اسکو مستحسن سمجھا جائے۔ ہاں اگر سندھ کے راجہ داہر کا طرز عمل ملحوظ رکھا جائے تو پرتھی راج
پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ لیکن ہم تو اپنے اعتراض کا جواب موجودہ زمانہ کے ہندوؤں سے لیا چاہتے ہیں۔ زمانہ
حال کے چالاک اور ہوشیار ہندوؤں نے ایک یہ ڈھکوسلا بھی تراش لیا ہے کہ جے چند نے سلطان شہاب الدین
غوری کو پرتھی راج پر دوبارہ حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی اور اسی نے سلطان کو دوبارہ بلا کر اور خود پرتھی راج
کی اعانت سے محترز رہ کر پرتھی راج کو ہلاک کرا دیا۔ لیکن وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ پہلی لڑائی جو ۵۸۷ھ میں
بمقام تراوری ہوئی جے چند پرتھی راج کے ساتھ تھا۔ اسوقت تک سنجوگتا کا سوئمبر نہیں ہوا تھا اور جے چند و
پرتھی راج کے درمیان نااتفاقی وعداوت کا پیدا ہونا تراوری کی پہلی لڑائی کے بعد بتایا جاتا اور اسی کو دوسری
لڑائی میں پرتھی راج کے مغلوب ہونے کی وجہ قرار دیا جاتا ہے۔ بابو جوالا سہائے صاحب اپنی تاریخ وقائع راجپوتانہ
میں لکھتے ہیں کہ پرتھی راج کو گرفتار کرکے سلطان شہاب الدین غوری اپنے ہمراہ غزنی لیگیا تھا۔ وہاں ایک روز

موقع پاکر پرتھی راج نے شہاب الدین کو قتل کردیا۔ یہی مؤرخ ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ شمس الدین التمش سلطان شہاب الدین غوری سے پہلے فرمانروا رہ چکا تھا۔ مگر قدیم زمانے کے مسلمان مورخوں میں سے کسی نے بھی پرتھی راج اور جے چند کے متعلق ان مذکورہ باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ پھر لطف یہ کہ ۵۸۷ھ کی لڑائی کے بعد اور ۵۸۸ھ کی دوسری لڑائی سے پہلے جن واقعات کا ظہور پذیر ہونا ہندو مورخ بیان کرتے ہیں ان کا درست ہونا کسی طرح فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ شہاب الدین غوری کے شکست پانے کے بعد جے چند نے اپنی بیٹی کی مجلس شوہر پسندی منعقد کی اور پرتھی راج کو دربانی کی خدمت پر طلب کیا پرتھی راج نے اس مجلس میں شریک ہونے سے انکار کیا تو جے چند نے پرتھی راج کی شکل کا ایک سونے کا بت بنوا کر دربان کی جگہ نصب کردیا۔ قنوج سے اجمیر دعوت بھیجنے۔ وہاں سے انکاری جواب آنے۔ پھر سونے کا بت بنوانے میں یقیناً ہفتے نہیں کئی مہینے صرف ہوئے ہونگے۔ پھر پرتھی راج کو اپنی مورت کے دربان کی جگہ نصب ہونے کا حال معلوم ہوا اور وہ اپنی اس بے عزتی کو برداشت نہ کرسکا اور عین وقت پر قنوج پہونچ گیا بھری مجلس کے سامنے سنجوگتا کو جبکہ وہ اس سونے کی مورت کے گلے میں ہار ڈال رہی تھی اُٹھا کر چل دیا۔ جے چند نے تعاقب بھی کیا۔ لڑائی بھی ہوئی مگر پرتھی راج سنجوگتا کو دلی لے آیا اور اسکو اپنی بیوی بنالیا۔ حالانکہ اس کو بجائے دہلی کے اجمیر لیجانا چاہیے تھا۔ تاہم ان ہنگاموں اور سنجوگتا سے شادی کرکے کسی دوسری مہم کی طرف متوجہ ہونے میں بھی کافی زمانہ صرف ہوا ہوگا۔ سنجوگتا سے شادی کرنیکے بعد پرتھی راج نے بندیلکھنڈ کے راجہ پر چڑہائی کی اور تمام بندیلکھنڈ فتح کرلیا۔ تعجب ہے کہ بیچ میں قنوج کا ملک چھوڑ کر بندیلکھنڈ کو کیسے فتح کرسکا اور جے چند جو بندیلکھنڈ کا زیادہ حقدار تھا خاموش رہا۔ یہ کام بھی مہینوں اور برسوں کا تھا۔ اسکے بعد دہلی یا اجمیر میں آکر اور اپنے رشتہ داروں کو سیرتھو ۔ علی گڈھ وغیرہ کے قلعوں میں نامزد کرکے اس علاقہ کا بندوبست کیا۔ اسکے بعد ملک مالوہ پر چڑہائی کی۔ مالوہ میں کئی راجاؤں سے معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ اس میں بھی بڑا وقت صرف ہوا۔ اسکے بعد پرتھی راج اور جے چند کے درمیان بعض خیر خواہوں نے صلح کی تحریک کی۔ آخر دونوں میں صلح ہوگئی۔ اس صلح کی تحریک اور صلح ہونے میں بھی کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف ہوا ہوگا۔ صلح کے بعد پرتھی راج تو جے چند کی طرف سے بالکل صاف تھا۔ لیکن جے چند نے کوربا طنی اور دغابازی کی راہ سے خفیہ سلطان شہاب الدین سے خط و کتابت شروع کی اور اسکو ترغیب دی کہ پرتھی راج پر چڑہائی کیجیے۔ چنانچہ قنوج و غزنی کے درمیان خط و کتابت کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۵۸۸ھ میں سلطان شہاب الدین فوج لیکر پرتھی راج پر چڑھ آیا اور پرتھی راج کا کام تمام ہوا ان تمام مذکورہ باتوں پر غور کرو اور سوچو کہ یہ سب کچھ ۵۸۷ھ اور ۵۸۸ھ کی لڑائیوں کے درمیان ہوا۔ ان دونوں لڑائیوں میں صرف پندرہ یا سولہ مہینے کا فاصلہ ہے۔ اس قلیل مدت میں مذکورہ بالا سلسلۂ واقعات کو انسانی عقل کسی طرح

فرض نہیں کرسکتی ساتھ ہی جب اس طرف توجہ کیجاتی ہی کہ پرتھی راج کو تیرہ مہینے تک قلعہ سرہند کے محاصرہ میں مصروف رہنا پڑا تھا تو سرے سے اِس سلسلہ واقعات کا ہر ایک واقعہ غائب ہو جاتا ہے۔ مسلمان مورخین کے بیان پر اس قسم کی کوئی جرح اور کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا بلکہ ان کے بیان کی بیساختگی خود انکی صداقت کی زبردست دلیل ہے اور حقیقت یہ ہی کہ مذکورہ بالا کہانی محض فرضی اور من گھڑت افسانہ ہی جسکو اصلیت سے اس قدر بعد ہی جسقدر مشرب اور مشرق میں فاصلہ ہے ہندو مورخین کے دور از عقل بیان کا تذکرہ کرنیکے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ پرتھی راج کے خاندان کا شجرہ بھی درج کر دیا جائے۔

- سارنگ دیو
  - گنگ داس
    - جے سنگھ
      - بھیکم جی
        - کرن جی
          - دولا راؤ
          - گوتم جی
          - پیپل جی
            - دیون
              - کنور پال
          - باجی راؤ
          - مانکسراؤ
          - قائم خان
        - سومیشور
          - پرتھی راج
            - رین جی
            - اکولہ جی

اس شجرہ کے اندر پرتھی راج کے چچازاد بھائیوں میں ایک نام قائم خاں بھی موجود ہے۔ کرن جی کا یہ بیٹا مسلمان ہوگیا تھا اور اسکا اسلامی نام قائم خان رکھا گیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں قائم خانی مسلمانوں کی ایک قوم اب تک موجود ہے جو اسی قائم خان کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

پرتھی راج کا مفرور ہو کر گرفتار و مقتول ہونا

سلطان شہاب الدین نے غزنی پہونچکر اپنی فوج کے ان لوگوں کو جنھوں نے ۵۸۷ھ کی جنگ ترا وری میں اپنی جان بچاکر مجبورانہ فرار کی عار گوارا کی تھی نہایت سخت اور ذلت آفریں سزائیں دیں۔ یعنے جس طرح گھوڑوں کو دانہ کھلایا جاتا ہے اس طرح توبروں میں جو بھر کران کی گردنوں میں لٹکا دیئے اور غزنی کی گلی کوچوں میں گشت کرایا۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ ان میں سے جو شخص جو نہ کھائے اُسکی گردن اُڑادی جائے۔ غرض اس طرح گھوڑوں کی طرح جو کھلا کر اور ذلیل کرکے چھوڑ دیا اور نئی فوج کی بھرتی اور ترتیب و تہذیب میں مصروف ہوا۔ جن لوگوں کو یہ سزائیں دی گئیں تھیں وہ عموماً غور و خلج و خراسان کے لوگ تھے۔ افغان ان میں کوئی نہ تھا۔ یعنی افغانوں نے ترا وری کے میدان میں سلطان کے ہمرکاب رہ کر اپنی جانیں قربان کردیں مگر فرار کی عار گوارا نہ کی۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"با افغانان ہیچ نہ گفت و امرائے غور و خلج و خراسان را معاتب و مواخذ گردانید و توبرہ ہائے پر جو بہ گردن ایشاں در آویختہ گرد شہر بہ گردانید و حکم کرد کہ ہر کہ آنچہ در توبرہ ہست نخورد سرش از تن جدا کنند۔"

اِس سزادہی کے واقعہ سے بھی صاف ثابت ہی کہ سلطان شہاب الدین غوری نے خود اپنے گھوڑے کی باگ میدان جنگ سے نہیں موڑی تھی بلکہ وہ بیہوشی کی حالت میں میدان جنگ سے باہر لایا گیا تھا۔ اگر اپنی جان بچانیکے لیے سلطان اپنے گھوڑے کی باگ موڑتا تو یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے ہمراہیوں کو اِس قسم کی سزائیں دیتا۔ بہرحال سلطان نے نہایت خموشی کے ساتھ چند مہینے غزنی میں قیام کیا اور کسی کو اپنے عزم داراد سے مطلع نہیں کیا۔ آخر ایک طاقتور لشکر لے کر غزنی سے روانہ ہوا اور پشاور پہنچا۔ پشاور سے روانہ ہوکر اول ملتان آیا۔ ملتان کے عامل اور وہاں کی فوج کا تحسین و آفرین کے ذریعے دل بڑھایا۔ کیونکہ ان لوگوں نے ملتان کے علاقے کی حفاظت نہایت عمدگی سے کی تھی اور نواحی ہندو راجاؤں کے حملوں کو جو اُنھوں نے ترا وری کی سابقہ جنگ کے بعد دلیر ہو کر ملتان پر کیے تھے نہایت دلیری کے ساتھ روکا تھا۔ ملتان کی جانب سے مطمئن ہو کر لاہور آیا یہ وہ زمانہ تھا کہ ضیاؤ الدین تولکی سرہند سے لاہور پہونچ چکا تھا اور پرتھی راج اجمیر جاکر شہاب الدین غوری کے مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ لاہور پہونچکر سلطان نے اپنی فوج خاصہ سے

سردار قوام الملک رکن الدین حمزہ کو سفیر یا ایلچی بناکر پرتھی راج کے نام خط دیکر اجمیر کی جانب روانہ کیا۔ رکن الدین حمزہ نے سلطان کا خط پرتھی راج کے پاس اجمیر میں پہنچایا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا کہ:۔ بے راہروی چھوڑ دو اور سرہند و تھانیسر کا علاقہ جو قدیم سے سلطنت اسلامیہ کا ایک حصہ ہے خالی کردو اور جس طرح اجمیر کے راجا سلطان محمود غزنوی اور اسکی اولاد کے مطیع رہتے تھے اسی طرح ہماری سیادت کو تسلیم کرو۔ ورنہ پھر تلوار میدان جنگ میں اپنا فیصلہ صادر کردیگی۔ پرتھی راج کو پہلے ہی سے سلطان کے پنجاب و ملتان میں آنے کا حال معلوم تھا اور وہ ترادری کی پہلی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد ہی سے بخوبی جانتا تھا کہ سلطان شہاب الدین یقیناً انتقامی یورش کریگا اور مسلمان اپنی اس شکست کی تلافی کے لیے ضرور دوبارہ حملہ آور ہونگے۔ محمود غزنوی اور اسکی اولاد کے زمانے میں چونکہ ہندو برابر اسلامی فوج میں کام کرتے رہے اور مسلمانوں کے طریق جنگ سے ہر طرح واقف و آگاہ ہوکر اپنے اندر جنگی قابلیت پیدا کرچکے تھے اور اب حال ہی میں وہ مسلمانوں کو ایک شکست دیکر اور بھی زیادہ جری ہوچکے تھے۔ لہذا پرتھی راج کی فوج کو اس ہندو فوج پر قیاس نہیں کرنا چاہیے جس نے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی سے شکستیں کھائی تھیں۔ پرتھی راج پہلے ہی سے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس نے ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کو اپنی امداد و اعانت پر آمادہ کرلیا تھا اور چھوٹے بڑے ڈیڑھ سو راجا بذات خود اپنی اپنی انتخابی فوجیں لیکر پرتھی راج کے ساتھ میدان جنگ میں مسلمانوں کے مقابل داد شجاعت دینے پر آمادہ ہوچکے تھے۔ لہذا پرتھی راج نے بڑی نخوت کے ساتھ نہایت سخت و درشت جواب سلطان کے پاس بھیجا اور لکھا کہ تمھاری خیر اسی میں ہے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے غزنی کی طرف سدھار جاؤ ورنہ ہم اچھی طرح تم کو مزا چکھائیں گے اور اس مرتبہ زندہ بچکر بھاگنے کا موقع بھی نہ دینگے۔ اس خط و کتابت کے بعد پرتھی راج نے ترادری کے میدان جنگ کو جہاں وہ پہلے ایک مرتبہ فتح حاصل کرچکا تھا مبارک سمجھ کر اسی جگہ اپنی فوجیں فراہم کرنا شروع کیں اور قرارداد کے موافق دوسرے راجا بھی اپنی اپنی فوجیں لے لے کر آنا شروع ہوئے۔ سلطان نے بھی اس بات کو غنیمت سمجھا کہ جس میدان میں اس کو ایک مرتبہ شکست ہوچکی تھی اسی میدان میں حریف کو شکست دیکر سرخروئی حاصل کرے۔ چنانچہ حریف کے فوجی اجتماع کا حال سن کر وہ بھی لاہور سے ترادری کی جانب روانہ ہوا۔ اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر یہ بات یاد دلادی جائے کہ جے چند کی دختر سنجوگتا کے اٹھا کر بھاجانے کی کہانی بالکل فرضی اور از سرتاپا غلط ہے۔ اس قسم کی ہزارہا فرضی کہانیاں قدیم ہندو لٹریچر میں موجود ہیں جن کو کوئی بھی سمجھدار شخص صحیح سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا کوئی مسلمان مورخ حتی کہ فرشتہ تک بھی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ مسلمان مورخوں کو چھوڑو۔ سجان رائے کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ بھی اس کا ذکر نہ کرے اگر یہ فرضی کہانی کوئی تاریخی حیثیت اور ذرا سی بھی اصلیت اپنے

رکھتی تو مسلمانوں کا کیا ہرج تھا زندہ ان کا ذکر نہ کرتے اور ہندو مورخوں کو بھی مجبور کرتے کہ اس کا ذکر زبان تک نہ لائیں۔ قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ وہ خوب مزے لے لے کر اس کا ذکر کرتے۔ کیونکہ اب سے سو یا دو سو برس پہلے تک کسی کو ان حالات اور ان خیالات و جذبات کا وہم و گمان بھی نہ تھا جو آجکل ہندو و مسلمانوں کے درمیان بدقسمتی سے پیدا ہو چکے ہیں۔ پرتھی راج نے جنگ تراوری کے بعد تیرہ مہینے تک قلعہ سرہند کا محاصرہ جاری رکھا۔ طبقات ناصری میں منہاج سراج لکھتا ہے کہ:۔

"رائے پتھورا بپائے قلعہ آمد و جنگ، پیوست و مدت سیزدہ ماہ و چیزے جنگ بہ داد"

سجان رائے لکھتا ہے کہ:۔

"رائے پتھورا بعد فتح در سرہند آمدہ قلعہ را از کسان سلطان بعد محاصرہ یک سال و یک ماہ تسخیر نمودہ بہ کسان خود سپرد"

فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔

"رائے پتھورا آمدہ قلعہ تبھندہ را کہ ضیاء الدین تولکی در انجا بود یک سال و یک ماہ محاصرہ نمود و آخر بصلح گرفت"

غرض تمام مورخ اس پر متفق ہیں کہ پرتھی راج تیرہ مہینے قلعہ کے محاصرہ میں مصروف رہا اس قلعہ پر قبضہ پاتے ہی یا قبضہ پانے سے بھی پہلے ہی اس کو شہاب الدین غوری کے آنے کا حال معلوم ہوا۔ وہ فوراً اجمیر آیا اور جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ تراوری کی پہلی جنگ سے دوسری جنگ تک کا زمانہ ایک سال اور چند مہینے ہے۔ اس میں سے ابتدائی تیرہ مہینے جو قلعہ سرہند کے محاصرے میں صرف ہوئے نکال دیے جائیں تو پھر سنجوگتا والی کہانی اور بندیلکھنڈ و مالوہ کی فتوحات وغیرہ کے لیے کون سا وقت بچتا ہے۔ قصہ مختصر دونوں طرف کی فوجیں تراوری کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل چند کوس کا فاصلہ اور سرستی ندی کو بیچ میں حائل چھوڑ کر خیمہ زن ہوئیں۔ اسلامی لشکر کی کل تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی جس میں اسی ہزار پیادے اور چالیس ہزار سوار تھے یہ ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد تو طبقات ناصری میں درج ہے۔ لیکن سوار و پیادے کی تقسیم اس میں نہیں بتائی گئی۔ سواروں اور پیادوں کی الگ الگ تعداد منتخب التواریخ سے معلوم کی گئی ہے۔ پرتھی راج کے لشکر کی تعداد تاریخ فرشتہ اور دوسرے مورخین نے تین لاکھ سوار اور تین ہزار سے زیادہ جنگی ہاتھی بتائی ہے۔ پیادوں کی صحیح تعداد کسی نے نہیں لکھی۔ بلکہ لاتعداد اور بے قیاس کے الفاظ سے پیادوں کی کثرت کو ظاہر کیا ہے۔ سرستی ندی کے کنارے پہونچ کر سلطان نے اتمام حجت کے لیے پھر ایک خط پرتھی راج کے پاس بھیجا اور وہاں سے وہی درشت و نادرست جواب آیا جس میں اپنی فوج کی کثرت اور جنگی ہاتھیوں سے ڈرایا

گیا تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے لیے اس مرتبہ بھی خطرات موجود تھے کیونکہ ہندو لشکر کی کثرت کے مقابلہ
میں اسلامی لشکر کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ پرتھی راج کو اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ اپنی فتح کا یقین تھا۔ سلطان
کے لشکر میں کسی اضافہ کا کوئی امکان نہ تھا اور ہندو فوجیں برابر آ آ کر شامل ہو رہی تھیں۔ ہندو راجاؤں
نے پرتھی راج کے سامنے جمع ہو کر پہاڑ اٹھا لینے کی قسمیں کھائیں کہ جب تک مسلمانوں کو شکست دیکر فنا نہ کر دینگے
دم نہ لیں گے اور کسی کو منھ نہ دکھائیں گے۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"راجہائے راجپوت کہ یک صد و پنجاہ نفر می شدند باتفاق شجاعت برجبین کشیدہ بقاعدہ ہنود سوگندہائے
غلیظ و شدید یاد نمودند کہ رقم ہزیمت از صحیفہ خاطر محو سازند تا دفع خصم نمایند دست از کارزار بر نخواہند"

پرتھی راج نے کھانڈے راے کو ہندو افواج کا سپہ سالار اعظم قرار دیا اور خود ڈیڑھ سو راجاؤں اور انکے
انتخابی سورماؤں کے ساتھ قلب لشکر میں قائم ہوا۔ ان راجاؤں میں قنوج کا راجہ جے چند موجود نہ تھا۔ جسکا
سبب یا تو پرتھی راج سے ایک قسم کی رقابت کا ہونا تھا جو اپنے نانا اننگ پال ثانی کی ریاست سے حصہ
نہ پانے اور پرتھی راج کے متبنّی ہونے کی وجہ سے قرین قیاس ہے یا کوئی بیماری یا کسی دوسری مجبوری نے اس کو
تراوری کے میدان میں پہونچنے سے باز رکھا ہوگا۔ لیکن پرتھی راج اور جے چند کے درمیان ایسی عداوت ہرگز
نہ تھی کہ جے چند پرتھی راج کے مقابلہ میں سلطان شہاب الدین غوری کا ہمدرد بن جاتا۔ اگر ایسی عداوت ہوتی تو وہ ضرور دوسرے
راجاؤں کو بھی روکتا اور پرتھی راج کا شریک نہ ہونے دیتا۔ کیونکہ پہلی لڑائی میں پرتھی راج کے ساتھ صرف ساٹھ یا چونسٹھ
راجہ تھے اور اس مرتبہ ڈیڑھ سو۔ پہلی مرتبہ پرتھی راج کی کل فوج دو لاکھ تھی اور اس مرتبہ صرف سواروں کی
تعداد تین لاکھ بیان کی گئی ہے۔ اگر جے چند واقعی کوئی بڑا صاحب اقتدار عظیم الشان راجہ تھا تو ممکن نہ تھا کہ جے چند
کے ہواخواہ ہونیکی حالت میں جسقدر راجہ اور جسقدر فوج پرتھی راج فراہم کر سکا اب اس سے کئی حصے زیادہ فراہم کر سکتا
اور اگر یہ کہا جائے کہ جے چند نے تو ضرور مخالفت کی ہوگی مگر اس کی بات کو سمجھ کر کسی نے سنی ہی نہیں اور پرتھی راج
کی امداد سب نے ضروری سمجھی تو ثابت ہوا کہ جے چند کی مخالفت پرتھی راج کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکی۔ اور
جے چند کی شرکت پرتھی راج کو کوئی قابل تذکرہ اعانت نہیں پہونچا سکتی تھی۔ غرض یہ کہنا کہ جے چند کی مخالفت
کی وجہ سے پرتھی راج کو تراوری کی دوسری لڑائی میں شکست ہوئی سراسر غلط اور واہیات بات ہے۔ حقیقت
یہ ہے کہ جے چند اور پرتھی راج کے تعلقات تراوری کی جنگ اول کے وقت تھے وہی جنگ دوم کے وقت بھی
تھے، ان دونوں لڑائیوں کے درمیان کوئی نئی اور جدید بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جے چند نہ پہلی لڑائی میں
شریک تھا۔ نہ دوسری میں شریک ہو سکا۔ اگر جے چند اور سلطان شہاب الدین کے درمیان کوئی ہمدردی اور
محبت قائم تھی اور سلطان نے جے چند ہی کی ترغیب سے ۵۸۸ ہجری میں ہندوستان پر یہ چڑھائی کی تھی

تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد جے چند اور سلطان شہاب الدین کے درمیان لڑائی کیوں ہوئی۔ جس کا آگے ذکر آتا ہے۔ بہر حال سلطان نے پرتھی راج کے پاس اس دوسرے خط کا بھی جواب پاکر اور اپنی طرف سے حجت پوری کرنیکے بعد زیادہ تامل مناسب نہ سمجھا اور اپنی قابلیت سپہ سالاری کا اظہار اس طرح کیا کہ رات کے وقت فوج کو چار حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصہ ایک ایک تجربہ کار بہادر سردار کے سپرد فرماکر حکم دیا کہ پہلے ایک سردار حملہ کرے۔ باقی اپنی اپنی جگہ خاموش تماشا دیکھتے رہیں۔ جب خوب زور شور کی لڑائی ہونے لگے تو مصروف جنگ سردار اپنی فوج کے ساتھ اس طرح پسپا ہونا شروع کردے کہ دشمنوں کو اپنی فتح کا یقین ہو جائے اور وہ دلیر ہو کر تعاقب کرنے لگیں۔ اس حالت میں دوسرا سردار اپنی تازہ دم فوج کے ساتھ حملہ آور ہو کر ہندو حملہ آوروں کو اپنی طرف متوجہ کرے اور پہلے سردار کی طرح تھوڑی دیر جم کر مقابلہ کرنے کے بعد وہ بھی پیچھے ہٹنے لگے۔ اسکے بعد تیسرا اور اسی طرح چوتھا سردار حملہ آور ہو اور پیچھے ہٹ کر دم لینے والے پھر اپنی جمعیت کو درست کرکے اور تازہ دم ہو کر حملہ آور ہونیکے لیے مستعد ہو جائیں۔ سلطان نے بارہ ہزار انتخابی سوار جدا کرکے اپنے ہمراہ رکاب رہنے کے لیے مخصوص کر لیے۔ اس انتظام اور صدور احکام کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے اسلامی لشکر نے سرستی ندی کو عبور کیا اور ہر حصۂ فوج نے اپنی اپنی جگہ متعین کرلی۔ سلطان اپنے بارہ ہزار سوار لیکر ایک بلند مقام یا اونچے ٹیلے پر کھڑا ہو کر لڑائی کا تماشا دیکھنے اور تیز رو سواروں کے ذریعے سرداران لشکر کے پاس احکام بھیجنے لگا۔ سلطانی حکم کے موافق اول ایک حصۂ فوج نے حملہ کیا۔ اسکے پسپا ہونے پر دوسرا حصہ حملہ آور ہوا۔ ہر مرتبہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو مغلوب یقین کرکے ان کا تعاقب کیا اور اس طرح ہندو لشکر جو ایک ٹھوس اور مضبوط پہاڑ کی طرح قائم تھا مختلف حصوں میں پھیلکر بکھرنے لگا اور اسلامی لشکر نے نہایت خوبی کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا۔ طلوع سحر سے لڑائی شروع ہوئی تھی۔ سہ پہر تک میدان جنگ کی بچھی ہوئی بساط پر سلطان کے حسب منشا مہرے حرکت کرتے رہے اور ہندوؤں کی کثرت مسلمانوں کی قلت پر غالب نہ آسکی۔ سلطان نہایت ہوشیاری کے ساتھ میدان جنگ کے نظاروں کی تبدیلیوں کو معائنہ کررہا تھا۔ عصر کے قریب سلطان نے فیصلہ کیا کہ اب میرے حملہ آور ہونے کا وقت آگیا ہے چنانچہ اس نے اپنے بارہ ہزار سواروں کو جو اب تک سلطان کے ہمراہ خاموش کھڑے تھے لیکر ہندو لشکر کے قلب کو جہاں پرتھی راج ڈیڑھ سو راجاؤں اور انتخابی سورماؤں کے درمیان موجود تھا مطمح نظر قرار دیکر حملہ کیا۔ سلطان اور اس کے بارہ ہزار ہمراہیوں نے جو سب زرہ پوش سوار تھے اپنے نیزے گھوڑوں کی کنوتیوں پر رکھ کر اس طرح حملہ کیا کہ چشم زدن میں ہر سد راہ کو ہٹاتے اور پامال کرتے ہوئے قلب پر جا پڑے۔ حریف افگنی میں وہ چابکدستی دکھائی کہ پرتھی راج کو فرار ہی میں عافیت نظر آئی اور کھانڈے راؤ نے بھی بصد دشواری میدان سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ سرداروں کی

جب یہ حالت ہوئی تو دوسروں کا کیا حوصلہ تھا کہ میدان میں قدم جمائے رہتے۔ یکایک ایک آندھی تھی کہ ہندو لشکر کو درختوں کے خشک پتوں اور ریت کے ذروں کی طرح اڑا کر لے گئی۔ غروب آفتاب سے پہلے مقتولوں کی لاشوں اور مسلمان فتحمندوں کے سوا تراوڑی کا میدان ہندوؤں سے خالی تھا۔ مسلمانوں نے بھاگنے والوں کا تعاقب کیا اس تعاقب میں پرتھی راج کو قلعہ سرستی کے قریب جا لیا اور زندہ گرفتار کرکے غروب آفتاب کے ساتھ ہی اسکی شعل حیات کو گل کر دیا۔ کھانڈے رائے بھی بھاگتا ہوا زخم کھا کر مارا گیا۔ لیکن سبحان رائے کہتا ہے کہ وہ گرفتار نہیں ہوا بلکہ زندہ و سلامت بچکر نکل گیا۔ چنانچہ سبحان رائے کے الفاظ ملاحظہ ہوں:-

کھانڈے رائے برادر رائے پتھورا کہ سپہ سالار بود ہزیمت را غنیمت دانستہ بصد حیلہ نقد جان خود را ازاں مہلکہ سلامت برد۔

چناں ہمناک و ہراساں گریخت　　کہ زنار را از کمر برگسیخت

سبحان رائے نے کھانڈے رائے کے بھاگنے کا مکمل نقشہ ایک شعر میں جس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اسکی لطافت مستحق آفرین ہے۔

مشرقی اضلاع کی فتوحات اور سلطان شہاب الدین کی شہادت

اس فتح عظیم کے بعد سلطان نے ہانسی، سرستی، سامانہ، کہرام وغیرہ قلعوں کو فتح کیا۔ اس کے بعد پرتھی راج کے دار السلطنت اجمیر کی طرف گیا۔ شہر اجمیر کو سلطان نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور پرتھی راج کے بیٹے اکو لجی کو اجمیر کا راجہ بنا کر اور اقرار اطاعت لیکر واپس چلا آیا۔ دہلی میں پرتھی راج کا دوسرا بھتیجا رین جی موجود تھا جو کھانڈے رائے کی غیر موجودگی میں اس کا قائم مقام تھا جب اجمیر سے واپس ہو کر سلطان دہلی کے قریب پہنچا تو رین جی نے سلطان کے پاس عاجزانہ درخواست بھیجکر جان کی امان چاہی سلطان اس کو دہلی کا راجہ بنا کر شہر دہلی میں داخل ہوئے بغیر باہر سے باہر ہی واپس چلا آیا اور قلعہ کہرام میں اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اس نو مفتوحہ علاقہ کا جو پہلے بھی سلطنت اسلامیہ میں شامل تھا عامل بنا کر غزنی کو واپس چلا گیا یہ واقعہ ۵۸۸ھ میں ظہور پذیر ہوا میرٹھ کے قلعہ میں پرتھی راج کا رشتہ دار کوئی راجہ حکومت کرتا تھا اس سے سلطان نے کوئی تعرض نہیں کیا سلطان کے واپس چلے جانیکے بعد ہی میرٹھ کے راجہ نے دہلی کے راجہ پرتھی راج کے بیٹے کو سرکشی کی ترغیب دیکر خود اسکی اعانت پر آمادگی ظاہر کی اور جے چند نے پرتھی راج کا انتقام لینے پر آمادگی ظاہر کرکے ان دونوں کی ہمت افزائی کی چنانچہ میرٹھ و دہلی کے یہ دونوں راجہ قطب الدین ایبک کے خلاف مستعد ہو گئے قطب الدین ایبک نے یہ سنتے ہی بلا تامل چڑھائی کر دی اور یکے بعد دیگرے دہلی و میرٹھ

دونوں کو فتح کرکے اپنے قبضے میں لے آیا۔ قلعہ علیگڈھ بھی پرتھی راج کے کسی رشتہ دار کی حکومت میں تھا اس نے بھی علاقات ناشتودہ اور مقابلہ کی تیاری کا اظہار کیا۔ قطب الدین نے علی گڈھ بھی بلا تامل فتح کرکے اِس نواح کے تمام علاقے کو قبضے میں لاکر بجائے کہرام کے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ کولہ جی بسر پرتھی راج اپنے عہد پر قائم رہا اسلیے قطب الدین ایبک اس کو نقصان پہونچانے کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا۔ مذکورہ علاقے قطب الدین نے ۵۸۹ھ میں فتح کیے۔ ان فتوحات سے جے چند اور قطب الدین ایبک کے مقبوضات کی حد ملگئی۔ جے چند جو اپنے بھائی پرتھی راج کے مقتول ہونے کی خبر سننے کے بعد ہی سے کانٹوں پر لوٹ رہا تھا اور مسلمانوں کی طرف سے خار کھائے بیٹھا تھا قطب الدین کی ان فتوحات کو خوشی سے نہ دیکھ سکا۔ اس نے پرتھی راج کا انتقام لینے کی تیاری کی اور قطب الدین کو مار کر نکال دینے پر آمادہ ہوا اور راجہ گوالیار و راجہ بدایوں کے علاوہ اودھ و بہار تک کے راجاؤں کو امداد کے لیے بلایا۔ قطب الدین نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہی احتیاطاً سلطان کو اطلاع دی اور سلطان یہ اطلاع پاتے ہی بلا توقف ہندوستان کی طرف روانہ ہوگیا۔ دہلی پہونچکر قنوج کے راجا جے چند کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ قطب الدین ایبک کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بطور ہراول چند کوس آگے آگے چلنے کا حکم دیا۔ جے چند نے مقام چند داڑہ میں جو اٹاوہ سے جانب شمال ہے اپنی فوجیں آراستہ کرکے میدان کارزار گرم کیا۔ سلطانی لشکر کے ہراول یعنے قطب الدین ایبک نے جے چند کے مقابل پہونچتے ہی سلطان کا جو چند میل پیچھے لشکر لیے آرہا تھا انتظار کیے بغیر حملہ کردیا اور سلطان کے میدان جنگ تک پہونچنے سے پہلے ہی جے چند کے لشکر کو شکست دیکر بھگا دیا۔ جے چند اس لڑائی میں قطب الدین ایبک کے تیر سے مارا گیا۔ سلطان قنوج پر قبضہ کرکے بنارس پر بھی جو جے چند کا مقبوضہ تھا حملہ آور ہوا۔ بنارس کے بعد گوالیار اور بدایوں وغیرہ کئی قلعوں کو فتح کیا اور سب جگہ اپنے عامل مقرر کرکے اسلامی حکومت قائم کی۔ اس طرح شمالی ہند کا ایک بڑا حصہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوگیا پنجاب و ملتان و سندھ تو پہلے ہی سے اسلامی حکومت کے صوبے تھے۔ اب وہ ملک بھی جسکو آجکل صوبہ متحدہ کہتے ہیں سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوگیا۔ قطب الدین ایبک کی قابلیت سرداری چونکہ اب اچھی طرح ثابت ہوچکی تھی لہذا قطب الدین کو تمام مقبوضات ہند کا حاکم اور وائسرائے بناکر ۵۹۱ھ میں سلطان غزنی کی جانب روانہ ہوگیا۔ اسی سال سلطان کے غزنی چلے جانے کے بعد پرتھی راج کے کسی رشتہ دار مسمی ہیمراج نے بہت سے راجپوتوں کو اپنے ساتھ ملاکر پرتھی راج کے بیٹے کولہ جی کے خلاف خروج کیا اور اس کو شکست دیکر اجمیر پر قبضہ کرلیا۔ کولہ جی نے قطب الدین ایبک سے فریاد و استمداد کی۔ قطب الدین فوراً دہلی سے فوج لیکر اجمیر گیا۔ ہیمراج نے زبردست مقابلہ کیا۔ آخر لڑائی میں مارا گیا اور قطب الدین ایبک نے کولہ جی کو پھر اجمیر کی گدی پر بٹھادیا۔ اس کے بعد

۵۹۲ھ میں قطب الدین ایبک نے ایک زبردست فوج لیکر گجرات کے راجہ بھیم دیو پر چڑھائی کی۔ یہ وہی بھیم دیو ہے جس پر شہاب الدین غوری نے بھی حملہ کیا تھا۔ قطب الدین ایبک کو فتح حاصل ہوئی اور گجرات کے راجہ سے اقرار اطاعت اور خراج لیکر واپس ہوا۔ ۵۹۳ھ میں راجپوتوں نے کولہ جی کے خلاف متفق ہو کر پھر اجمیر پر قبضہ کر لیا قطب الدین ایبک نے پھر جا کر راجپوتوں کو سزائیں دیں اور کولہ جی کو پھر اجمیر کا راجہ بنا دیا۔ اس سال کے آخری ایام میں بیانہ و گوالیار میں بغاوت و سرکشی نمودار ہوئی اور راجپوتوں نے ان دونوں قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ خبر سن کر ۵۹۴ھ میں سلطان خود ہندوستان آیا اور قلعہ بیانہ فتح کر کے اپنے ایک سردار بہاؤالدین طغرل کو بیانہ میں مقرر کر کے اس طرف کے علاقہ کا مستقل گورنر مقرر کیا اور گوالیار کے قلعہ کی فتح اسکے سپرد کر کے خود غزنی کی جانب چلا گیا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شہاب الدین بڑی باریک بین اور دقیقہ رس نظر رکھتا اور انتظام ملکی سے خوب واقف و آگاہ تھا۔ اسی لیے اُس نے بیانہ کا ایک الگ صوبہ بنا دینا ضروری سمجھا تاکہ قطب الدین ایبک کو کسی قدر سہولت ہو۔ بہاؤالدین طغرل نے گوالیار کا قلعہ فتح کر لیا۔ مگر اسکے چند روز بعد وہ فوت ہو گیا اور یہ علاقہ پھر قطب الدین ایبک ہی کے زیر حکومت آ گیا۔ قطب الدین ایبک نے اسکے بعد بیش از بیش ملک گیری کا ثبوت دیا۔ یعنے قلعہ کالپی اور کالنجر کو بھی فتح کر لیا۔ ۵۹۹ھ میں سلطان شہاب الدین غوری کے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کا انتقال ہوا اور اسکی وصیت کے موافق سلطان شہاب الدین غوری تمام غوری سلطنت کا فرمانروا بن گیا۔ سلطان شہاب الدین نے اپنے بھتیجوں اور رشتہ داروں کو خراسان و ایران و افغانستان وغیرہ کے علاقوں پر حاکم مقرر کیا۔ خاندان خوارزم شاہی اور خاندان غوریہ میں عرصہ سے کشمکش چلی آتی تھی، سلطان غیاث الدین کے فوت ہوتے ہی خوارزم شاہیوں نے حملے شروع کر دیے اور سلطان شہاب الدین کو ان کے مقابلہ میں خود جانا پڑا۔ اتفاقاً ایک لڑائی میں سلطانی لشکر کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا۔ اور سلطان برف باری اور راستے کی صعوبات برداشت کرتا ہوا بمشکل اپنے دارالسلطنت میں واپس آیا۔ اس نقصان و اذیت اور صعوبات سفر کا ایک یہ نتیجہ تھا کہ سلطان کے شہید یا فوت ہونے کی غلط افواہ اکثر شہروں میں پھیل گئی۔ بعض شرارت پیشہ اشخاص نے ہندوستان میں اس خبر کو خوب شائع کیا اور جا بجا بغاوت و سرکشی کا سلسلہ جاری ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ عزالدین محمد بختیار خلجی نے جو قطب الدین ایبک کے ماتحت مشرقی اضلاع کا عامل تھا ایک قلیل جمعیت کے ساتھ بہار و بنگال میں فتوحات شروع کر دی تھیں۔ مشرقی علاقوں کو تو قطب الدین نے خوب قابو میں رکھا لیکن پنجاب و ملتان میں شورش پسند و جرائم پیشہ قبائل اور ملاحدہ نے جو خفیہ طور پر جا بجا پھیلے ہوئے تھے ایک اودھم مچا دی۔ ملاحدہ جو شاہ الموت کے زیر ہدایات جا بجا مسلمانوں کے لباس میں پھیلے ہوئے موقع کے منتظر تھے ان جرائم پیشہ قبائل کی رہبری و ہمت افزائی کا موجب ہوئے۔ یہ واقعہ ۶۰۰ھ کے اواخر اور ۶۰۱ھ کے شروع ایام سے تعلق رکھتا ہے، سلطان نے خوارزم شاہیوں سے نبرد آزما ہونیکو مؤخر کر کے

اول سندھ وملتان کی خبر لینا ضروری سمجھا۔ کیونکہ وہ ملاحدہ کے خطرے کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا تھا۔ چنانچہ اوّل ملتان کی بغاوت فرو کرکے باغیوں کو سخت سزائیں دیں۔ پھر غزنی پہنچکر پشاور کی طرف روانہ ہوا، شمالی و مغربی پنجاب کے اضلاع کا امن وامان برباد ہوگیا تھا لہٰذا اسکی طرف متوجہ ہونا بھی ضروری تھا سلطان کے پنجاب پہنچنے کی خبر سنکر دہلی سے قطب الدین ایبک بھی روانہ ہوکر سلطان کی خدمت میں پہونچگیا گکھڑوں یا کھوکھروں کو جو بانیٔ فساد بنے ہوئے تھے خوب سزائیں دیں اور اس طرح اپنے زندہ موجود ہونے کا عملی ثبوت پیش کرکے امن وامان پھر قائم کردیا۔ اس جگہ تاریخ فرشتہ سے ایک حکایت کا نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ ان گکھڑوں یا کھوکھروں کی قوم اسوقت تک نامسلمان اور زناردار تھی ان کا پیشہ رہزنی تھا اور مسلمانوں کے قتل کو ثواب جانتے تھے اسی لیے ملاحدہ کو ان کے اندر خوب رسوخ حاصل تھا۔ ایک مسلمان اتفاقاً ان کے ہاتھ میں گرفتار ہوا جسکو انھوں نے بجائے قتل کرنے کے قید رکھا۔ اس مسلمان قیدی کے اوضاع واطوار اور حرکات وسکنات اس شخص کو بہت پسند آگئے جسکے یہاں وہ مسلمان قید تھا۔ قیدی نے موقع پاکر اسلام کی تبلیغ وتلقین شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ گکھڑ نے اسلام قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ قیدی نے سلطان کے پاس یہ خبر بھجوائی سلطان شہاب الدین غوری نے اس نومسلم گکھڑ کو اس علاقے کا حاکم بنادیا تاکہ وہ خود اپنی قوم کا بندوبست کرسکے اور قتل وغارت سے یہ قوم باز آئے۔ اس نومسلم گکھڑ کی کوشش سے کئی لاکھ گکھڑ دائرۂ اسلام میں داخل ہوکر بہت شایستہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ورنہ اس سے پیشتر ان میں کثرت البعول اور دختر کشی وغیرہ کا عام رواج تھا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہندو قوموں میں اسلام کس طرح پھیلا ہے اور مسلمان بادشاہوں نے کہانتک لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا ہے۔ سلطان شہاب الدین غوری نے مذکورہ انتظام سے فارغ ہوکر قطب الدین ایبک کو لاہور سے دہلی کی جانب روانہ کیا اور خود لاہور سے غزنی کی طرف روانہ ہوا۔ ملاحدہ الموت کی سرگرمیاں اس زمانے میں اپنے معراج الکمال کو پہنچی ہوئی تھیں سلطان شہاب الدین کے لشکر میں حضرت امام فخر الدین رازی روزانہ درس دیتے اور نمازوں کی امامت فرماتے تھے ان کے درس میں جو مسلمان بڑی عقیدت اور شوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے ان میں بعض ملاحدہ بھی شامل تھے جن سے امام صاحب بالکل بیخبر تھے۔ یہ ملاحدہ جب مسلمانوں میں شامل رہتے تو اپنے آپ کو اعلیٰ درجہ کا عابد زاہد ثابت کرتے بعض اوقات سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہوجاتے تھے اور کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ یہ ملحد اور مسلمانوں کے جانی دشمن ہیں۔ سلطان شہاب الدین ملاحدہ کا سخت دشمن اور ان کی بیخکنی پر ہمیشہ آمادہ رہتا تھا۔ مگر ان ظالموں کا وجود اسکے لشکر میں موجود تھا اور سلطان کیا ہر ایک مسلمان اس سے بیخبر تھا سلطان لاہور سے روانہ ہوکر جبوقت مقام دمیک میں جو پنجاب کے ضلع جہلم میں بتایا جاتا ہے پہنچا اور دریائے جہلم کے کنارے سلطانی لشکر خیمہ زن ہوا تو رات کے وقت ان ملاحدہ نے جو سلطانی لشکر میں موجود اور ان میں سے بعض

دربانی کی خدمت پر بھی مامور تھے۔ موقع پاکر سلطان کے قتل کی تمہید اور چند مل گیا اور خنجر سے سلطانی خیمہ پھاڑ
کرکے دس بیس ملاحدہ اندر داخل ہوئے اور سوتے ہوئے سلطان کو چھریوں سے شہید کر ڈالا اور خیمہ کے اسی
شگاف سے نکل کر بھاگ گئے۔ ان میں سے بعض بھاگتے ہوئے پکڑے اور پہچانے گئے تو وہی اشخاص تھے جو حضرت
امام فخر الدین رازی کی مجلس میں بڑے شوق اور گرویدگی سے شامل ہوا کرتے اور اسی لیے امام صاحب کے
مقرب و خدام خاص سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں نے یہ قیاس کیا کہ امام فخر الدین رازی کا ملاحدہ سے تعلق ہے اور
انھوں نے ہی سلطان کو شہید کرایا ہے۔ لہذا امام صاحب کو اسیر و دستگیر کر لیا اور سلطان کے جنازے کو لیکر غزنی
کی جانب روانہ ہوئے۔ امام صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی براءت ثابت کرکے جان بچائی۔ سلطان شہاب الدین
غوری ۲ شعبان ۶۰۲ھ کو شہید ہوا۔ اس وقت سندھ و گجرات سے لیکر بنگال و آسام تک تمام شمالی ہند مسلمانوں کے
قبضے میں آچکا تھا۔ بہار و بنگال کو اسی عہد یعنی زمانے میں بختیار خلجی فتح کرکے آسام پر چڑھائی کر چکا تھا۔

بہار و بنگال کا فتح ہونا

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہار و بنگال کی فتح کا تفصیلی حال درج کردیا جائے۔ غور کے نواح میں جو قبائل آباد تھے ان میں ایک قبیلہ
خلجیوں کا بھی تھا۔ قبیلہ خلجی کے اکثر افراد سلطان شہاب الدین غوری اور ملک قطب الدین ایبک کی فوج میں
نوکر تھے۔ اسی قبیلہ کا ایک شخص محمد محمود خلجی ہندوستان آیا اور فتح قنوج کے بعد قنوج کے علاقے میں ایک جاگیر
حاصل کرسکا جب محمد محمود کا انتقال ہوا تو اسکے بھتیجے محمد بختیار خلجی کو وہ جاگیر مل گئی۔ محمد بختیار نے یہاں اپنے
لیے ترقی کی راہیں مسدود دیکھ کر اس جاگیر کو چھوڑ دیا اور اودھ کے حاکم ملک حسام الدین اغلبک کے پاس
پہنچا۔ اس نے محمد بختیار کو اسکی خواہش کے موافق ایک جاگیر اودھ کے مشرقی حصے میں عطا کردی۔ وہاں
محمد بختیار نے ملک حسام الدین کو کئی معرکوں میں اپنی بہادریاں دکھا کر اپنے اوپر اسقدر مہربان کرلیا کہ
اس نے اس چھوٹی سی جاگیر کے عوض اودھ کے ایک پورے قطع کی حکومت سپرد کی۔ اب محمد بختیار نے موقع
پاکر ایک بہار کے علاقے پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کیا اور اس ملک کے ہندو راجا سے
کئی قلعے چھین لیے۔ جس سے محمد بختیار کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور اسکی قوم کے آدمی جو مختلف شہروں
میں پھیلے ہوئے تھے ہر طرف سے آآکر محمد بختیار کے پاس جمع ہوگئے۔ محمد بختیار کی اولوالعزمی اور بہادری کی خبر
جب ملک قطب الدین ایبک وائسرائے ہند کے پاس پہنچی تو اس نے اس بہادر سپاہی کی قدر دانی
اور عزت افزائی ضروری سمجھ کر دہلی سے اسکے لیے خلعت و انعام بھیجا اور ملک حسام الدین اغلبک حاکم
اودھ کو لکھا کہ اس بہادر کی قدر دانی و عزت افزائی کا ضرور خیال رکھو۔ اس طرح صاحب عزت اور صاحب
طبل و علم ہوکر محمد بختیار نے بہار کے علاقے پر باقاعدہ حملہ شروع کیا اور صرف ایک سال کے اندر بہار کا ملک فتح

کرکے قلعہ بہار پر بھی قبضہ کر لیا۔ قلعہ بہار کی تسخیر کے وقت محمد بختیار خلجی کے ساتھ کل دو سو آدمیوں کی فوج تھی اور یہ قلعہ ملک بہار میں سب سے زیادہ مضبوط اور ناقابل تسخیر مقام سمجھا جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بہار کی سلطنت جو بوجہ مذہب بدھ کمزور ہو رہی تھی کس قدر کمزور تھی اور مسلمانوں نے اسکو کتنے تھوڑے آدمیوں سے فتح کیا تھا۔ یہ بوجہ حکومت مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ ہندوستان میں شروع ہونیکے سبب راجپوت ریاستوں کی طاقت اور ہی سے بچی ہوئی تھی۔ فتح بہار کے بعد قطب الدین ایبک نے محمد بختیار خلجی کو اپنے پاس دہلی بلوایا اور خلعت خسروانہ دیکر بہار کا گورنر مقرر کیا۔ بختیار خلجی نے واپس آکر ملک بہار میں اپنی طرف سے عامل مقرر کیے اور انتظام ملکی سے مطمئن ہوکر بنگال کی طرف بڑھا۔ بنگال کا دار السلطنت اس زمانہ میں شہر نودیہ یا ندیہ تھا۔ ندیہ کا راجہ لکشمن سین جو لکھمنیہ کے نام سے مشہور تھا محمد بختیار خلجی کا مقابلہ نہ کر سکا۔ محمد بختیار جب ندیہ کے قریب پہنچا تو اس نے اپنی فوج پیچھے چھوڑی اور صرف اٹھارہ آدمی لیکر شہر ندیہ کے اندر داخل ہوا۔ شہر کے دروازہ پر محافظوں نے یہ سمجھ کر کہ کوئی سوداگر یا مسافر یا سفیر ہیں جو اس طرح بے تکلف شہر میں داخل ہو رہے ہیں ان کو نہ روکا۔ ان اٹھارہ بہادروں نے راجہ کی محلسرائے کے دروازے پر جاکر محلسرائے کے دربانوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ اسوقت لکشمن سین رسوئی میں کھانا کھانے بیٹھا تھا۔ شور و غل کی آواز سنکر معلوم ہوا کہ مسلمان آپہونچے۔ اسقدر حواس باختہ ہوا کہ فوراً اٹھکر سرنگ کے راستے اپنے محل سے بھاگا اور ندیہ سے فرار ہوکر اڑیسہ کے شہر ... میں پہونچکر وہاں کے مندر میں پناہ لی اور پوجاریوں میں شامل ہوکر بقیہ چند روزہ زندگی بسر کی محمد بختیار نے داخل ہوکر دیکھا کہ چاندی اور سونے کے برتنوں میں کھانا چنا ہوا رکھا ہے۔ جس کو چھوڑ کر راجہ بھاگ گیا تھا۔ غرض اس طرح بلا کشت و خون بڑی آسانی سے مسلمانوں کا بنگالہ پر بھی قبضہ ہو گیا۔ محمد بختیار نے ندیہ چھوڑ کر مقام لکھنوتی کو بنگالہ کا دار الحکومت قرار دیا۔ لکھنوتی کا خرابہ آجکل ضلع مالدہ میں موجود اور سیاحوں کے لیے جاذب توجہ مقام ہے (دیکھو سفرنامہ مظہری)۔ اسی لکھنوتی کا نام گور بھی تاریخوں میں لیا گیا ہے اور اسی کا نام ہمایوں نے جنت آباد رکھا ہے۔ لکھنوتی میں محمد بختیار اپنا نائب مقرر کرکے خود دس ہزار کا لشکر لیکر آسام کی فتح کے لیے روانہ ہوا۔ آسام ذکامروپ ... کے راجہ نے اطاعت قبول کی۔ طبقات ناصری کی روایت کے موافق ملک کامروپ میں کوچ، میچ، تھارو تین قومیں آباد تھیں ان میں سے کوچ اور میچ کا سردار جو میچ قوم سے تعلق رکھتا تھا محمد بختیار خلجی کے ہاتھ پر برضا و رغبت مسلمان ہو گیا تھا چنانچہ منہاج سراج کے الفاظ یہ ہیں:-

"در اطراف آں کوہہا کہ میان تبت و بلاد لکھنوتی ہست سہ جنس خلق اند یکے را کوچ گویند دوم را میچ وسوم را تھارو۔ ہمہ ترک چہرہ اند و ایشاں را زبانے دیگر است میان لغت ہند و تبت۔ یکے از رؤسائے قبائل کوچ و میچ کہ او را علی میچ گفتندے بر دست محمد بختیار اسلام آوردہ بود"

اس کے بعد محمد بختیار نے دریائے برہمپتر کو عبور کر کے ملک تبت پر حملہ کیا۔ دریا کو عبور کرنے کے بعد پندرہ دن
تک برابر پہاڑوں کے دروں اور گھاٹیوں میں لشکر اسلام کو سفر کرنا پڑا۔ سولہویں دن تبت کے میدانی علاقہ
میں پہنچے سامنے ایک مضبوط قلعہ آیا وہاں کے لوگوں نے مقابلہ کیا سخت لڑائی کے بعد اس قلعہ کو فتح کیا گیا۔ یہاں
سے پندرہ کوس کے فاصلہ پر کرم پٹن نامی شہر تھا جس میں دشمنوں کی نہایت زبردست فوج موجود تھی۔ محمد بختیار
کی فوج اس طویل و اذیت رساں سفر اور اس لڑائی میں بہت ہی خستہ ہو چکی تھی۔ مصلحت یہی سمجھی گئی کہ اس وقت
آگے نہ بڑھیں اور اگلے سال پوری تیاری کے ساتھ آکر اس ملک کو فتح کریں۔ چنانچہ وہاں سے واپس ہوئے
راستے میں دیکھا کہ پہاڑی لوگوں نے تمام درختوں اور سبزہ کو جو اس پہاڑی راستے میں مل سکتی تھی جلا دیا ہے
پندرہ روز تک نہ بار برداری کے جانوروں اور سواری کے گھوڑوں کو گھاس ملی نہ سپاہیوں کو کوئی سامان
رسد ہاتھ آیا۔ بہت سے آدمی اور جانور ہلاک ہوئے۔ دریائے برہمپتر کے کنارے پہنچے تو اس پل کو جس کی
حفاظت کے لیے ایک دستہ فوج کا چھوڑ گئے تھے شکستہ اور فوجی دستے کو غیر موجود پایا۔ ایک جگہ پایاب
سمجھ کر عبور کرنا چاہا مگر پانی زیادہ نکلا تمام آدمی غرق ہوئے، صرف سو آدمیوں کے ساتھ محمد بختیار دریا سے پار پہنچا
علی میچ اور دوسرے آسامی سردار استقبال کو آئے اور اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کیا۔ دیوکوٹ پہنچ کر
محمد بختیار سخت بیمار ہو گیا۔ اس بیماری کے عالم میں بار بار اس کی زبان سے یہ کلمات نکلتے کہ شاید مخدوم محترم
کہ سلطان شہاب الدین غوری کو کوئی آسیب پہنچا ہے اسی لیے مجھ پر مصیبت آئی ہے چنانچہ وہ اس
بیماری سے جانبر نہ ہو سکا اور ۶۰۲ھ میں فوت ہو گیا۔ انہی ایام میں سلطان شہاب الدین غوری شہید ہوا تھا۔ بختیار
خلجی کے بعد اُسکے جانشینوں نے بنگال میں حکومت کی۔ غرض سلطان شہاب الدین غوری کی زندگی میں تمام
شمالی ہند سلطنت اسلامیہ میں شامل ہو چکا تھا۔

سلطان شہاب الدین کے کارناموں پر ایک نظر

اگر محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ آور ہونا سندھ و پنجاب
اور سندھ کی قوم کے لیے نقصان رساں تھا
تو اس نقصان کی ذمہ داری محمد بن قاسم پر نہیں بلکہ راجہ داہر پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح سلطان محمود غزنوی کا
ہندوستان پر حملہ آور ہونا اگر برا تھا تو اس برائی کا باعث محمود غزنوی نہیں بلکہ راجہ جے پال اور اُسکے بعد
بیٹا انندپال تھا جیسا کہ باب اوّل اور باب دوم میں اسکی تفصیل موجود ہے۔ سلطان شہاب الدین غوری کی حالت بھی
ان پہلے ہر دو محمدوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اگر تھانیسر وغیرہ کے علاقہ کو جو پنجاب میں شامل و سلاطین
غزنی کی حدود مملکت میں داخل چلا آتا تھا پرتھی راج زبردستی اپنے قبضہ میں رکھنے کی کوشش نہ کرتا تو سلطان
شہاب الدین غوری کے لیے خوارزم شاہیوں سے نبرد آزما رہنے اور خراسان و ترکستان وغیرہ کی طرف

اپنی حکومت کے وسیع و مستحکم کرنے کے کافی مشاغل موجود تھے جس طرح سلطان محمود کو قرامطہ کی وجہ سے ہندوستان کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا اسی طرح سلطان شہاب الدین کو ملاحدہ کے سبب اس طرف آنیکی ضرورت پیش آئی تھی۔ ہندوؤں کی ایک اس غلطی کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اُنھوں نے مسلمانوں کے دشمن قرامطہ اور ملاحدہ کو اپنے پہلو میں لیا اور ان کے حامی بن کر مسلمانوں کو لڑائی کا چیلنج دیا۔ گذشتہ پانسو سال کے تجربوں سے یہ بات بخوبی ثابت ہوچکی تھی کہ ہندو پست اخلاقی میں ترقی کر رہے ہیں اور موقع پاکر باعث تکلیف بن سکتے ہیں۔ پس وقت آچکا تھا کہ مسلمان ہندوستان کو فتح کرکے یہاں ایک مستقل سلطنت قائم کریں اور ہندوستان میں بسنے والی کثیر التعداد عظیم الشان نسل انسانی کو تہذیب و انسانیت سکھا کر بداخنی و بدتہذیبی کا شکار ہونے سے بچائیں اور ترقیات کے راستے دکھائیں۔ محمود غزنوی کی ہندوکشی اور بت شکنی کی حقیقت اوپر بیان ہوچکی ہے تاہم اگر وہ بت شکن تھا تو بجائے شہاب الدین پر تو یہ الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ اُس نے مندروں اور مورتیوں کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ شہاب الدین غوری ہندوستان کے اندر جنوب میں بھی اور مشرق میں بھی وہاں تک نہیں پہنچا جہاں تک محمود اپنی فتحمند فوجوں کے ساتھ پہنچ چکا تھا۔ محمود دکن میں سومنات تک پہونچا۔ لیکن شہاب الدین نہروالہ سے بھی ادہر ہی رہا۔ محمود نے کالنجر فتح کیا لیکن شہاب الدین بنارس سے آگے نہیں بڑھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ محمود نے باوجود اس قدر عظیم الشان فتوحات حاصل کرنیکے ہندوؤں کو اُن کے ملک واپس کردیئے کہ وہ آنکھیں کھولیں اور مسلم آزاری سے باز رہیں۔ لیکن شہاب الدین غوری کے لیے دوبارہ اس تجربہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب شہاب الدین غوری فوت ہوا ہے تو بنگال و آسام تک شمالی ہند سلطنت اسلامیہ میں شامل تھا اور اُسکے چند ہی روز بعد جنوبی ہند بھی سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوگیا۔ تمام براعظم ہندوستان کو فتح کرکے اسلامی سلطنت میں شامل کرلینا مسلمانوں کے لیے نہ محمود کے زمانے میں مشکل تھا نہ شہاب الدین کے زمانے میں مشکل ثابت ہوا۔ جس کام کو مسلمانوں نے عرصے سے ملتوی چھوڑ رکھا تھا اوس کو تجربے کے بعد شہاب الدین کے زمانے میں اتمام کو پہونچا دینا ضروری ہوگیا تھا ہندوؤں کی حکومت برطرف ہوکر مسلمانوں کی حکومت قائم ہونیکے اسباب سب کے سب بیساختہ اور پیکے بادیگرے پیش آنیوالے واقعات کا ایک سلسلہ ہے۔ اِس سلسلہ میں کہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہندوؤں کو صرف اسلیے ذبح کیا جارہا ہو کہ وہ ہندو کیوں ہیں یا کوئی فتحمند مسلمان محض اسلیے ہندوؤں پر فوج لیکر چڑھا ہو کہ وہ اسلام میں کیوں داخل نہیں ہوتے مسلمانوں کی کوئی بھی چڑھائی اور ایک بھی لڑائی ایسی نہیں جسکا کوئی نہ کوئی ایسا سبب نہ ہو کہ اُس سبب کے واقع ہونے سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر اور ایک ہندو دوسرے ہندو پر چڑھائی کرسکتا تھا۔ محمود غزنوی پر ایک یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان سے ہندوؤں کو پکڑ پکڑ لیگیا۔ لیکن شہاب الدین غوری پر

اس غلط الزام کے لگانے کا بھی کوئی موقع نہیں کیونکہ جیسا بیان کیا گیا سلطان شہاب الدین کی وفات کے وقت تمام شمالی ہند اسلامی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا جس کا بڑا حصہ سلطان شہاب الدین کے آخری ایام حیات میں فتح ہوا تھا۔ سلطان کے فوت ہوتے ہی ہندوستان کا یہ حصہ بشمول پنجاب و سندھ تمام شمالی ہند غزنی کی حکومت سے آزاد ہو کر ایک مستقل خود مختار سلطنت بن گیا اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنا لیا اور کبھی بھول کر بھی افغانستان و خراسان کی طرف جانے یا وہاں کے لوگوں کو ہندوستان کی دولت سے مالا مال کرنے کا خیال نہ کیا۔ جس طرح محمود غزنوی نے جے پال کے خاندان کو حکومت و سلطنت سے محروم نہیں کیا تھا اسی طرح سلطان شہاب الدین نے بھی پرتھی راج کے بیٹوں کو حکومت و سلطنت سے محروم نہیں کیا مگر چونکہ ہندوستان کے ان فرمانروا خاندانوں سے قابلیت فرمانروائی قدرتی طور پر جاتی رہی تھی لہٰذا وہ مسلمانوں کی اس شفقت سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے اور خود ہی اپنی نااہلیت کے سبب گمنامی کے قعر ذلت میں روپوش ہو گئے۔ سلطان شہاب الدین غوری کے جانشین اُس کے غلام ہوئے اور وہی ہندوستان کے ابتدائی خود مختار مسلم فرمانروا قرار پائے۔ اُنھوں نے اس ملک میں کیسی حکومت کی اور ہندوستان کو کس طرح بربادی سے بچایا اور ان کا اخلاق کیسا تھا یہ آئندہ بیان ہونے والا ہے۔ اس وقت صرف اس طرف توجہ دلانی مقصود ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری پر بھی ہرگز ایسا جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ ہمارے ہندو دوست اُس بے گناہ کو سمجھ رہے ہیں حقیقت اصلیہ قارئین کرام کے سامنے ہے اور وہ خود ہی بہترین فیصلہ کر سکتے ہیں۔

اس جگہ یورپی مورخین کی ابلہ فریبی اور چالاکی کی نسبت کچھ لکھنا فضول ہے کیونکہ ان کا منشائے تاریخ نویسی اور نقطۂ نظر چھپا ہوا نہیں ہے۔ تاہم ہنٹر صاحب کی ایک دیدہ دلیری کی طرف اشارہ ازبس ضروری ہے۔ ہنٹر صاحب اپنی تاریخ میں سلطان شہاب الدین غوری کے ہاتھ سے پرتھی راج کا حال درج کرتے ہوئے مجلس شوہر پسندی کا حال یعنی پرتھی راج کا زبردستی قنوج کے محل شاہی سے سنجوگتا کو اٹھا لانا، جے چند کا مسلمانوں کو حملہ آوری کی ترغیب دینا، سنجوگتا کا پرتھی راج کے قتل کی خبر سن کر ستی ہونا وغیرہ باتیں لکھ کر آخر میں لکھتے ہیں کہ:-

"تاریخ ہند کے یہ خاص واقعات فارسی مورخوں کے بیان سے لیے گئے ہیں۔"

اس موقع پر فارسی کی یہ ضرب المثل شاید سب سے زیادہ خوبی کے ساتھ چسپاں ہو سکتی ہے کہ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ فارسی مورخوں کے بیانات ان لغویات سے قطعاً پاک ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہنٹر صاحب کے زمانے میں کسی نے فارسی زبان میں کوئی غیر معروف و ناقابل التفات کتاب لکھی ہو اور اس سے ہنٹر صاحب نے ان باتوں کو نقل کر کے اپنی مورخانہ تحقیق کا سکہ جمانے کی کوشش کی ہو جو درحقیقت اُن کے مورخانہ مرتبہ کی پردہ دری کا موجب ہے۔

سلطنت غلامان

سلطان شہاب الدین غوری کے فوت ہوتے ہی ہندوستان میں مسلمانوں کا تعلق غزنی کی سلطنت سے منقطع ہو کر ہندوستان کی ایک الگ خود مختار سلطنت قائم ہو گئی تھی جس کا سب سے پہلا شہنشاہ قطب الدین ایبک تھا۔ ادھر قطب الدین ایبک ہندوستان کا سلطان و فرمانروا بنا اُدھر شہاب الدین غوری کے خاندان والے خوارزم شاہیوں کے لڑائی جھگڑوں میں مصروف ہوئے جن کا ذکر اِس تصنیف کے مقصد سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ سلطان شہاب الدین کا کوئی بیٹا نہ تھا اُس نے اپنے غلاموں ہی کو بیٹوں کی طرح تربیت کیا تھا۔ چنانچہ اسکے بعد قطب الدین ایبک، تاج الدین یلدوز، ناصر الدین قباچہ وغیرہ جو شہاب الدین غوری کے غلام تھے سب حکومت و سلطنت کے مرتبے تک پہونچے۔ قطب الدین ایبک سے ہندوستان میں جس خاندان سلطنت کی بنا پڑی وہ غلاموں کا خاندان کہلاتا ہے۔ اِس خاندان میں قطب الدین ایبک، آرام شاہ، شمس الدین التمش، رکن الدین، رضیہ بیگم، بہرام شاہ، علاؤالدین مسعود، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن، کیقباد، کل دس بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ اِس خاندان نے سنہ ۶۰۲ھ سے سنہ ۶۸۹ھ تک چھیاسی سال حکومت کی، اِس خاندان کو غلاموں کا خاندان صرف اِسی لیے نہیں کہا جاتا کہ قطب الدین ایبک غلام تھا بلکہ شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن نے بھی غلامی کے مرتبے سے ترقی کرکے شہنشاہی حاصل کی تھی اسی زمانے میں مصر کے اندر بھی اسی قسم کے غلاموں کی حکومت تھی۔ ہندوستان اور مصر کے غلاموں کی شہنشاہی پر غور کرنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان اپنے غلاموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھتے تھے اور غلاموں کے لیے اسلام نے کہانتک ترقی کی راہیں کشادہ رکھی ہیں۔ ہندوستان میں غلاموں کے اِس خاندان میں شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود، اور غیاث الدین بلبن تین بادشاہوں نے بیس بیس سال یا اِس سے زیادہ مدت تک حکومت کی اِن تینوں بادشاہوں کی حکومت کا زمانہ ملکر ستر سال ہوتا ہے باقی سولہ سال میں سات بادشاہوں کی حکومت پوری ہوئی۔ اِس خاندان نے صرف شمالی ہند کو اپنے قبضے میں رکھ کر امن و امان کے قیام اور سلطنت کے استحکام کی کوشش کی اور ملک دکن کی جانب نئی فتوحات حاصل کرنا نہ چاہیں۔ یہ بات کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں

اپنی حکومت قائم کرتے ہی ہندوؤں کو تہذیب سکھانے اور ترقی دیکر اُبھارنے کی کوشش شروع کردی تھی ایک الگ مستقل باب میں بیان ہوگی۔ اسوقت نہایت مجمل طور پر خاندان غلامان اور خاندان خلجی کا ذکر اور ملک دکن کی فتح کا تذکرہ مدنظر ہے تاکہ مسلمانوں کی ہندوؤں پر حملہ آوری کا بیان ختم ہونے پر اس داستان کو شروع کیا جاسکے کہ مسلمان فرمانرواؤں نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا تھا۔ لہذا اس باب میں نہایت مختصر طور پر حکومت اور ملک دکن کی فتوحات کا ذکر کیا جائیگا۔ اس کتاب کے قاری کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آئندہ ابواب میں اُن چیزوں کو مطالعہ کرسکیگا جن سے واقف ہونے کا شوق اس باب کو پڑھتے ہوئے اُسکے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔

سلطان قطب الدین ایبک

سلطان قطب الدین ایبک کا حال خواجہ صدر نظامی نے اپنی کتاب تاج المآثر میں اور قاضی منہاج سراج نے اپنی کتاب طبقات ناصری میں تفصیل سے لکھا ہے لیکن میں اس جگہ صرف اُس خلاصہ کو درج کرتا ہوں جو اخوند شاہ نے اپنی کتاب روضۃ الصفا میں سلطان قطب الدین ایبک کے ابتدائی حالات کی نسبت لکھا ہے۔ اخوند شاہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"بازرگانے قطب الدین را از ترکستان بہ نیشا پور آورد و قاضی فخر الدین عبد العزیز کوفی کہ از اولاد امام اعظم بود و قضائے نیشا پور تعلق باو میداشت ایبک را بخرید و او در خدمت فرزند قاضی قرآن بخواند و بعد ازان تیر اندازی و سواری تعلیم گرفت و در آن ماہر گشت۔ آنگاہ بازرگانے او را از قاضی بخرید و بغزنین بردہ بسلطان شہاب الدین بفروخت گویند کہ شبے سلطان شہاب الدین غلامان خود را بانعامات فاخرہ اختصاص داد و قطب الدین حصہ خود را از نقد و جنس ہم دران مجلس بفراشان بخشید و چون این معنی بسمع سلطان رسید او را بمزید عنایت و قرب مخصوص گردانیدہ سرخیل سائر ممالک ساخت و کار او در ظل حمایت سلطان تضاعف می پذیرفت تا امیر آخور شد"

سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد اسکے بھتیجے سلطان محمود نے دار السلطنت فیروزکوہ سے قطب الدین کے پاس ایک خلعت اور چتر شاہی بھیجا۔ خلعت میں لکھا تھا کہ آپ شوق سے اپنے آپ کو سلطان کے لقب سے ملقب کریں اور ہندوستان میں عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کریں۔ اس سند حکومت اور چتر شاہی کے آنے پر سلطان قطب الدین نے دہلی سے لاہور جاکر ماہ ذیقعدہ ۶۰۲ھ میں مراسم تخت نشینی ادا کیے جس طرح سلطان قطب الدین ایبک کے پاس ہندوستان کی سند حکومت بھیجی گئی تھی اسی طرح غزنی کی حکومت تاج الدین یلدوز کو سپرد ہوئی تھی۔ تاج الدین یلدوز نے صوبہ پنجاب کو غزنی کی سلطنت میں شامل رکھنا چاہا۔

اور سلطان قطب الدین ایبک تخت نشینی سے پہلے ہندوستان کا سپہ سالار تھا [illegible] پانچ برس تک جنگ ہوتی رہی
اول تاج الدین یلدز نے لاہور کو فتح کر لیا تھا [illegible] سلطان قطب الدین ایبک نے غزنی پر چڑھائی کی اور
شہر غزنی سے بھی تاج الدین یلدز کو [illegible] غزنی کے تخت پر جلوس کر کے وہاں سے
لاہور واپس چلا آیا۔ اسکے بعد [illegible] تاج الدین یلدز دوبارہ غزنی پر قابض ہو گیا۔ سلطان قطب الدین ایبک
کی شادی تاج الدین یلدز کی [illegible] سے ہوئی تھی۔ سلطان قطب الدین ایبک کی ایک بیٹی کی شادی سلطان
شہاب الدین غوری کے غلام ناصر الدین قباچہ سے اور [illegible] دوسری بیٹی کی شادی قطب الدین ایبک کے غلام شمس الدین
التمش سے ہوئی تھی۔ ناصر الدین قباچہ کو سلطان قطب الدین ایبک نے سندھ کا حاکم مقرر کیا تھا اور شمس الدین
التمش کو بدایوں کا۔ ان دونوں دامادوں میں شمس الدین التمش سے قطب الدین ایبک کو زیادہ محبت تھی
اور اسکو مثل بیٹے کے سمجھتا تھا۔ چونکہ تاج الدین یلدز بار بار پنجاب پر حملہ آور ہوتا تھا اسلیے اسکا مقابلہ کرنے کے
لیے قطب الدین ایبک کو بجائے دہلی کے لاہور ہی میں رہنا پڑا۔ ایک مرتبہ وہ چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑا اسکا ٹھوکر کھا کر اس طرح گرا
کہ سلطان گھوڑے کے نیچے دب گیا۔ گھوڑے کی زین کا پیش کوہہ سلطان کے سینہ میں گڑا اور فوراً مرغ روح
قالب عنصری سے پرواز کر گیا۔ سلطان قطب الدین نے فتح دہلی کے بعد سے اپنی وفات تک بیس سال ہندوستان میں
حکومت کی لیکن ابتدائی سولہ سال میں وہ نائب السلطنت کی حیثیت سے تھا آخری چار سال خود مختار اور مستقل
شہنشاہ ہند رہا۔ اسکے بڑے بڑے جنگی کارنامے جن میں اس نے راجپوتوں اور ہندوؤں کو بار بار شکستیں دیں
نائب السلطنت ہونیکے زمانے میں وقوع پذیر ہوئے۔ ہندوستان کا خود مختار سلطان ہونیکے بعد اسکی کوئی قابل
تذکرہ جنگ کسی ہندو راجا سے نہیں ہوئی۔ اس نے دست سخاوت کو اسقدر کشادہ کیا کہ حاتم ہند مشہور ہوا۔ اس
جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ ادھر ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک الگ مستقل سلطنت قائم ہونیوالی
تھی اور ادھر منگولستان میں چنگیز خاں اپنی بادشاہت قائم کر چکا تھا۔ ماہ رجب ۶۰۲ھ میں چنگیز خاں نے
جس کا اصلی نام تموچین تھا اپنا لقب چنگیز خاں یعنے شہنشاہ تجویز کیا اور ۱۸ ذیقعدہ ۶۰۲ھ کو قطب الدین ایبک
نے لاہور میں تخت نشین ہو کر تاج شاہی سر پر رکھا دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ چنگیزی سلطنت
اور ہندوستان کی مستقل اسلامی سلطنت ساتھ ہی ساتھ قائم ہوئی تھیں۔

آرام شاہ ابن قطب الدین ایبک

قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد امرائے سلطنت نے اسکے بیٹے آرام شاہ کو دہلی میں تخت سلطنت پر
بٹھایا۔ آرام شاہ میں سلطنت کی قابلیت نہ تھی۔ ناصر الدین قباچہ نے سندھ و ملتان پر قبضہ کر کے سلطان کا لقب
اختیار کیا۔ ادھر بنگالہ میں حسام الدین عوض خلجی نے خود مختار ہو کر تاج شاہی سر پر رکھا اور اپنے آپ کو سلطان کے

لقب سے ملقب کرکے بہار و بنگالہ میں اپنی سلطنت قائم کی۔ تاج الدین یلدوز نے غزنی سے پنجاب پر حملہ آور ہوکر لاہور اور تمام ملک پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ جس ملک کو آجکل صوبہ آگرہ و اودھ کہا جاتا ہے یہ آرام شاہ کے قبضے میں رہا۔ اس طرح سلطان قطب الدین کے فوت ہوتے ہی ہندوستان کی سلطنت اسلامیہ چار حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ مسلمانوں کی حیرت انگیز بہادری اور اودھ و بہار و بنگالہ و آسام تک کی فتوحات دیکھ کر اس ملک کے راجپوت اور ہندو لوگ اسقدر مرعوب ہو چکے تھے کہ مالوہ و روہیلکھنڈ و راجپوتانہ کے بعض مضبوط مقامات مثلاً گوالیار و اجین و رنتھنبور و قنوج و مندور وغیرہ کے قلعوں پر جہاں کوئی اسلامی فوج موجود نہ تھی خود مختارانہ قبضہ کر لینے کے سوا کوئی ایسی مؤثر کوشش نہ کر سکے کہ اس اختلال کے زمانے میں مسلمانوں کو ہندوستان سے خارج کر دیتے۔ آرام شاہ اس بدنظمی کا کوئی تدارک نہ کر سکا۔ امرائے سلطنت نے یہ حالت دیکھ کر شمس الدین التمش حاکم بدایوں کو دہلی بلوایا اور آرام شاہ کو معزول کرکے اسے تخت سلطنت پر بٹھایا۔ آرام شاہ نے دہلی سے نکلکر اور اپنے ہوا خواہوں کو فراہم کرکے التمش کا مقابلہ کیا مگر گرفتار ہوکر قید خانہ میں فوت ہوا۔ آرام شاہ نے ایک سال سے بھی کم مدت تک سلطنت کی۔

شمس الدین التمش

شمس الدین التمش ترکان قراخطائی میں سے تھا اس کا باپ اپنے قبیلہ کا ایک نامور اور امیر آدمی تھا چچازاد بھائیوں نے حضرت یوسف کے بھائیوں کی طرح اسکو باہر لیجا کر ایک سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اس سوداگر نے بخارا میں لاکر فروخت کیا یہاں جس نے خریدا تھا اس نے اسکی پرورش اور تعلیم اپنے بچوں کی طرح کی پھر حاجی جمال الدین چست قبا نے خریدا۔ حاجی جمال الدین چست قبا سے قطب الدین ایبک نے ایک لاکھ جیتل (ڈھائی ہزار روپیہ) کے عوض خرید کر اپنے بیٹے کی طرح تربیت کی اور میر شکار کا عہدہ عطا فرمایا۔ پھر گوالیار کا حاکم بنایا پھر برن (بلند شہر) کا حاکم مقرر کیا۔ اسکے بعد بدایوں کا ناظم بنایا جب سلطان شہاب الدین غوری آخری مرتبہ گکھڑوں کا فساد رفع کرنے پنجاب میں آیا اور قطب الدین ایبک دہلی سے سلطان غوری کی خدمت میں حاضر ہوا تو شمس الدین التمش بھی قطب الدین ایبک کے ہمراہ گیا تھا اس نے گکھڑوں کی لڑائی میں ایسی بہادری دکھائی کہ سلطان شہاب الدین غوری بہت ہی خوش ہوا اور التمش کو خلعت فاخرہ عطا کرکے قطب الدین سے سفارش کی کہ التمش کو غلامی سے آزاد کرکے اسکے مرتبہ کو بڑھانا چاہیے۔ چنانچہ قطب الدین ایبک نے التمش کو سند آزادی عطا کی اور اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔ ۶۰۷ھ میں شمس الدین التمش تخت نشین ہوا۔ اسکی تخت نشینی کے بعد بعض امرانے مخالفت پر کمر باندھی۔ تین چار سال اس خانہ جنگی کے فرو ہونے میں صرف ہوئے اور جو صوبے سلطنت دہلی سے جدا اور خود مختار ہو گئے تھے بدستور خود مختار رہے۔ دہلی

اور نواح دہلی کی لڑائیوں سے فارغ ہو کر سلطان التمش پنجاب کو تاج الدین یلدوز کے قبضے سے نکالنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ تاج الدین یلدوز نے خود ہی دہلی کی جانب فوج کشی کی. التمش نے آگے بڑھ کر مقام تراوری میں اُسکا مقابلہ کیا۔ اِس لڑائی میں تاج الدین یلدوز شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ التمش نے اُس کو بدایوں میں قید کیا جو چند روز کے بعد بحالت قید فوت ہو کر بدایوں میں مدفون ہوا۔ اِس عرصہ میں موقع پاکر ناصر الدین قباچہ نے پنجاب پر حملہ کر کے لاہور کو فتح کر لیا۔ التمش نے اسکو بھی شکست دیکر سندھ و ملتان کی طرف بھگا دیا. یہاں یہ لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اُدھر سلطان خوارزم نے غور و غزنی کو فتح کر کے خاندان غوری کا خاتمہ کر دیا اور اب اُسکی فوجیں ہندوستان کی طرف بڑھیں اور ملتان کے قریب ناصر الدین قباچہ سے جو التمش کے مقابلے میں ابھی شکست کھا چکا تھا شکست پاکر واپس لوٹ گئیں۔ ۶۱۴ھ میں سلطان شمس الدین التمش نے ناصر الدین قباچہ کو شکست دیکر گجرات کی طرف بھگا دیا اور مقام دیبل یعنے ساحل سمندر تک سندھ کا ملک اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مگر چند روز کے بعد ناصر الدین قباچہ نے پھر سندھ و سیوستان پر قبضہ کر لیا۔ ۶۱۸ھ میں سلطان جلال الدین خوارزمی چنگیز خاں سے شکست کھا کر ہندوستان کی طرف آیا اور پنجاب کے ایک حصہ پر قابض ہو گیا یہ سنتے ہی سلطان التمش لاہور گیا۔ سلطان جلال الدین پنجاب سے سندھ کی طرف اور وہاں سے کیچ مکران کی جانب روانہ ہوا۔ اِسی سال سلطان التمش نے بنگال کی جانب فوج کشی کی اور حسام الدین عوض خلجی سے اقرار اطاعت اور تیس ہاتھی بطور نذرانہ لیکر اور اپنے بیٹے ناصر الدین کو بہار و بنگالہ کا ناظم مقرر کر کے واپس ہوا۔ سلطان کے چلے آنے کے بعد ناصر الدین اور بنگالے کے خلجی سلطان میں لڑائی ہوئی جس میں خلجی سلطان مارا گیا اور بنگالہ کا ملک بھی براہ راست سلطنت دہلی میں شامل ہو گیا۔ ۶۲۳ھ میں قلعہ رنتھمبور کو چند مہینے کے محاصرے کے بعد سلطان نے فتح کیا۔ ۶۲۴ھ میں قلعہ منڈر یا قلعہ منڈاور کو فتح کیا۔ اس فتح کی خوشی میں امیر روحانی بخاری نے قصیدہ لکھکر پیش کیا جسکے بعض اشعار یہ ہیں ؎

خبر بہ اہل سما بردہ جبرئیل امین — ز فتحنامۂ سلطان عہد شمس الدین
کہ از بلاد ملاحدہ شہنشہ اسلام — گشاد بار دگر قلعۂ سپہر آئین
شہ مجاہد و غازی کہ دست تیغش را — روان حیدر کرار میکند تحسین

اسی زمانے میں ناصر الدین قباچہ نے اُچ اور ملتان پر قابض ہو کر مخالفت شروع کی ۶۲۵ھ میں سلطان التمش نے ناصر الدین قباچہ کی سرکوبی کے لیے سندھ و ملتان کی طرف فوج کشی کی، ناصر الدین قباچہ نے اپنے وزیر کو فوج دیکر قلعہ اُچ میں چھوڑا اور خود خزانہ لیکر قلعہ بھکر میں چلا گیا۔ ایک مہینے کے محاصرے کے

بعد بروز شنبہ ۲۰ ماہ جمادی الاول ۶۲۵ھ کو قلعہ اُچ فتح ہوا اور ناصرالدین قباچہ اُچ کی فتح کا حال سنکر دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا۔ سلطان نے بندر گاہ دیبل یعنے سمندر کے کنارے تک تمام ملک قبضے میں لاکر اپنے عامل مقرر کئے اور دہلی کی طرف واپس ہوا۔ مقام اُچ سے طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کو جو چند ہی روز پہلے وارد ہندوستان ہو کر اُچ میں مقیم تھا اپنے ہمراہ لیگیا۔ ۶۲۶ھ میں خبر پہونچی کہ شہزادہ ناصرالدین بنگالہ میں فوت ہو گیا سلطان شمس الدین التمش نے اپنے چھوٹے بیٹے کو ناصرالدین کا خطاب دیکر بدایوں کا حاکم مقرر کیا۔ یہی وہ ناصرالدین محمود ہے جسکے نام پر منہاج سراج نے طبقات ناصری اپنی کتاب کا نام رکھا۔ اسی سال یعنی ۶۲۶ھ میں بغداد کے عباسی خلیفہ المستنصر باللہ نے سلطان شمس الدین التمش کے پاس خلعت روانہ کیا اور سلطان شمس الدین التمش نے اس خوشی میں شہر کو آئینہ بند کر کے جشن ترتیب دیا۔ اسی سال ملکا ملک خلجی نے بنگالہ پر قبضہ کر کے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ سنکر سلطان بنگالہ کی طرف روانہ ہوا اور ۶۲۷ھ میں ملکا ملک کو گرفتار اور اڑیسہ کا ملک بھی بنگال میں شامل کر کے ملک علاؤالدین جانی کو وہاں کا حاکم بناکر دہلی واپس آیا۔ ۶۲۹ھ میں قلعہ گوالیار کی فتح کے لیے روانہ ہوا۔ ماہ صفر ۶۳۰ھ میں گوالیار فتح ہوا۔ اِس سفر میں منہاج سراج سلطان کے ہمراہ موجود اور نمازوں کا امام تھا۔ قلعہ گوالیار کی فتح پر دبیر الملک تاج الدین ریزہ نے یہ رباعی لکھی ؎

ہر قلعہ کہ سلطان سلاطین بگرفت　　از عون خدا و نصرت دین بگرفت

آن قلعہ گوالیار و آن حصن حصین　　در سنہ ستہ و ثلاثین بگرفت

۶۳۲ھ میں سلطان نے مالوہ کے باغیوں کو سزائیں دیں اول بھیلسے کو فتح کیا اُسکے بعد اُجین فتح ہوا۔ یہاں مہاکال دیو کا بتخانہ تھا اس بتخانہ میں راجہ بکرماجیت کی بہت بڑی مورت پتھر کی بنی ہوئی براجمان تھی اُسکے اردگرد چند چھوٹی چھوٹی مورتیں تانبے اور پیتل کی بنی ہوئی نصب تھیں یہ بتخانہ چونکہ مالوہ کے تمام بلوئیوں کا مرکز اور بغاوت کی سازش کا دفتر تھا لہذا سلطان نے اِس مندر کو مسمار کیا اور دھات کی مورتیوں کے ساتھ پتھر کی مورت کو بھی دہلی لیگیا۔ اِس طرح تمام ملک مالوہ میں اسلامی سلطنت مستحکم ہو گئی۔ دہلی آکر سلطان کو پھر ایک سفر پیش آیا۔ طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ یہ سفر بیانہ کی جانب تھا مگر تاریخ فرشتہ، طبقات اکبری، منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ بہر حال اِس سفر میں سلطان بیمار ہو کر دہلی واپس آیا اور ۲۰ ماہ شعبان ۶۳۳ھ بروز دوشنبہ فوت ہوا۔ اُس کا مقبرہ پرانی دہلی میں مسجد قوۃ الاسلام کے متصل غیر مسقف آج تک موجود ہے۔ یہ سلطان بڑا خدا ترس، رحمدل، عابد، زاہد، سخی، بہادر اور شب زندہ دار شخص تھا۔ پنجوقتہ نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کرتا اور درویش خدا آگاہ حضرت خواجہ

قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں اکثر حاضر رہتا تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کی فتح کے بعد مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار کی تعمیر شروع کی تھی۔ قطب مینار کے صرف دو نیچے کے درجے قطب الدین ایبک کے زمانے میں تیار ہوسے تھے سلطان التمش نے باقی اوپر کے درجے تعمیر کرا کر اس مینار کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا اور مسجد قوۃ الاسلام میں بھی تین دروازے اضافہ کیے۔ حوض شمسی بھی جسکو تالاب شمسی کہتے ہیں اُسکی یادگار ہے۔ اِس سلطان پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اُس نے مہاکال کے بتخانے کو توڑا لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ کیا دریائے سندھ کے ڈیلٹا سے برہم پتر کے ڈیلٹا تک تمام شمالی ہند جس میں اُڑیسہ کا ملک بھی شامل ہو مندروں سے بالکل خالی تھا۔ شمس الدین التمش مذہب کا پابند اور خود مذہب سے بخوبی واقف ہونیکے علاوہ علمار کی صحبت میں رہتا تھا وہ اسلامی تعلیم کے خلاف غیر مذہب والوں کی عبادت گاہوں کو بلا سبب ہرگز نقصان پہونچانے اور مسمار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مہاکال کا مندر توڑنے اور پتھر کی مورت دہلی لانے کا حال جس نے بھی لکھا ہے طبقات ناصری سے لکھا ہے۔ ہندوؤں کی کسی قدیم کتاب سے اِس مندر کے اُجین میں ایک مرکزی عبادت گاہ ہونیکی حیثیت سے مسمار ہونیکا ثبوت نہیں ملتا۔ ہندوؤں کے ساتھ ملاحدہ الموت کے خصوصی تعلقات قائم تھے ملاحدہ کو ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قائم ہونے کا سخت ملال تھا۔ وہ چند روز پہلے سلطان شہاب الدین غوری کو پنجاب میں شہید کر چکے تھے۔ ملتان و سندھ کو وہ اپنا ملک سمجھ کر اُس پر قبضہ کرنے کی کوششوں میں مسلسل مصروف رہے تھے۔ گجرات میں جہاں سومنات کا مندر تھا وہ کافی رسوخ حاصل کر چکے تھے۔ گجرات میں سنہ ۵۰۰ھ سے اُنھوں نے ہندوؤں کو اپنے مسلک میں باقاعدہ طور پر شامل کرنا شروع کر دیا تھا اسی زمانے میں ملاحدہ الموت کے ایک واعظ نورستاگر نامی نے گجرات کے راجہ سدھاج کے عہد میں وارد گجرات ہوکر اپنا نام ہندوؤں کا سا ظاہر کیا اور کنبی۔ کھارو۔ اور کوری قوموں کو باقاعدہ اپنے مسلک میں شامل کر لیا تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک کو سلطان بننے کے بعد دہلی میں قیام کرنیکا بہت ہی کم موقع ملا تھا۔ سندھ و راجپوتانہ کے ہندو ملاحدہ کے دھوکے میں اب اسلیے کم آتے تھے کہ وہ اسلامی طاقت کا اچھی طرح اندازہ کر چکے تھے شمس الدین التمش ہی کے زمانے میں دہلی ہندوستان کی سلطنت اسلامیہ کا دار السلطنت اور مرکز حکومت بنی تھی لہذا ملاحدہ کی تمام تر توجہ دہلی کی جانب منعطف ہوئی اُنھوں نے گجرات و سندھ سے آگے بڑھ کر مالوہ کے ہندوؤں کو اپنا معمول بنایا اور اُجین و بھیلسہ کو بجائے گجرات کے اپنا ساقہ یا سنگاہ تجویز کر کے وہاں سے دوآبہ گنگ و جمن میں پھیلا دیے۔ برج کے دوآبے اور روہیلکھنڈ میں جو راجپوت موجود تھے وہ فوراً اسلام کش سازش میں شریک ہوگئے۔ منداور کے مقام کو کسی نے

مندو اور کسی نے مندور لکھا اور مالوہ کا مقام سمجھا ہے لیکن حقیقتاً یہ مقام گنگا اور مالن ندی کے درمیان ضلع بجنور میں آجتک منڈاور کے نام سے موجود ہے یہ بودھوں کے زمانے میں ایک مرکزی مقام تھا ہیونگ سیانگ چینی سیاح بھی یہاں آیا تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے میں فتح قنوج سے پہلے قطب الدین ایبک نے اسکو پہلی مرتبہ سلطنت اسلامیہ میں شامل کیا تھا۔ ملاحدہ نے اس مقام کو بھی اپنا مرکز بناکر تمام راجپوتوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کرلیا تھا اور کوہ ہمالیہ تک جا بجا مضبوط قلعوں اور دشوار گذار کوہی دروں میں مامن بنالیے گئے تھے۔ ۶۲۴ھ میں سلطان نے جب قلعہ منڈاور کو فتح کیا ہے تو دو مہینے تک منڈاور میں قیام کرکے یہاں سے فوجیں بھیج بھیجکر کوہ ہمالیہ تک تمام سرکشوں کو سزائیں دینے کے بعد امن وامان قائم کیا تھا پھر منڈاور میں ایک عامل کو مناسب ہدایات کے ساتھ مامور کرکے دہلی کی جانب واپس ہوا تھا منڈاور کے قلعہ کا تو اب نام ونشان بھی موجود نہیں ہے لیکن سلطان شمس الدین التمش کے قدوم میمنت لزوم کی یادگار کے طور پر منڈاور جامع مسجد آجتک موجود ہے فتح منڈاور کی تہنیت میں امیر روحانی بخاری نے جو قصیدہ لکھا تھا اسکا ذکر اوپر آچکا ہے اُس میں بھی صاف مذکور ہے کہ سلطان نے اس قلعہ کو جو ملاحدہ کے قلعوں میں سے تھا بار دگر فتح کیا دوابہ گنگ وجمن میں نور نامی ملحد نے دہلی کا تختہ الٹ دینے کی خفیہ ہی خفیہ پوری تیاری کرلی تھی۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ کی روایت کے موافق سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ایک ہزار ملحدوں کی فوج جو تمام ہتھیاروں سے مسلح تھی ٹھیک اُسوقت جبکہ تمام مسلمان جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کررہے تھے جامع مسجد میں داخل ہوکر مسلمانوں کو بے محابا قتل کرنے لگی مدعا یہ تھا کہ سلطان بھی مع تمام سرداروں کے بآسانی قتل ہوجائے۔ ہزارہا مسلمان اس طرح جامع مسجد میں قتل ہوئے اور پھر بعض سرداروں نے موقع پاکر مسلح جمعیت کے ساتھ باہر سے جامع مسجد میں داخل ہوکر ان ملاحدہ کو محصور کرلیا۔ جو مسلمان مسجد کے اندر تھے اور بچ گئے تھے اُنھوں نے مع سلطان مسجد کی چھت پر چڑھ کر جان بچائی اور تمام ملاحدہ ایک ایک کرکے مسجد ہی میں قتل کیے گئے۔ یہ ملاحدہ خدا جانے کیا کیا مصائب ہندوستان کی سلطنت اسلامیہ پر لاتے مگر خیریت گذری کہ تھوڑے ہی دنوں بعد یعنی ۶۵۵ھ میں مغلوں کے سیلاب نے ملاحدہ کے مرکز الموت کو غارت کرکے انکے آخری بادشاہ خورشاہ کو گرفتار کرلیا اور ملاحدہ کے فتنے سے عالم اسلامی نے نجات پائی۔ سلطان شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں دہلی اور دہلی کے متصلہ اضلاع میں ملاحدہ کی اس قوت وشوکت واثر ونفوذ کا اندازہ کرو پھر ملاحدہ وقرامطہ کے ان تمام کارناموں پر جو اوپر کے ابواب میں بیان ہوچکے ہیں غور کرو تو بڑی آسانی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ملاحدہ کے ذریعے اسی قسم کے فتنے سر اٹھانے والے تھے جو قرامطہ کے ذریعہ رونما ہوکر سلطان محمود غزنوی کے لیے موجب تکلیف ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی

کر بھیلسہ اور اُجین کو جو مالوہ اور اُنکے شرکاء کا یہ ہندو نیکہ مرکزی مقام تھے سلطان التمش نے نقصان پہنچایا
اور اُنکے سازش خانوں کو جو ہمیشہ جتھا داروں کی خفیہ سازشوں کے مرکز رہتے تھے اور جن میں منصوبے قائم کیے جاتے تھے مسمار کیا۔ اگر
ان مندروں کو اس امن سوز اور انسانیت کُش مقصد کے لیے استعمال نہ کیا جاتا تو سلطان التمش ان کو کبھی
ہاتھ نہ لگاتا اگر مندروں کے مسمار کرنے ہی کا اسکو شوق ہوتا تو متھرا، مہابن، الہ آباد، بنارس، تھانیسر، کانگڑہ، قنوج،
گوالیار، جگناتھ پوری وغیرہ میں اسوقت مندروں کی کمی نہ تھی وہ ان تمام مقامات کے مندروں کو بھی مسمار
کرتا اور اپنا شوق پورا کرکے خوش ہوتا۔ پھر لطف یہ کہ اُجین میں مہاکال کے مندر کے سوا اور بھی مندر موجود تھے
مگر اس نے صرف ایک ہی مندر کو توڑا باقی کو ہاتھ نہ لگایا۔ اُسکی غرض صرف یہ تھی کہ آئندہ ہندو اپنے مندروں کو
سازش خانہ اور بغاوت خانہ نہ بننے دیں بلکہ عبادت خانے ہی رہنے دیں اگر کسی مندر کو سازش خانہ بنایا جائیگا تو
وہ عبادت خانہ نہ رہیگا اور اسکو مسمار کر دیا جائیگا۔ یہ صاف اور سیدھی بات اگر کسی کی سمجھ میں نہ آسے تو اسی
کے فہم کا قصور ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

سلطان شمس الدین التمش نے ہندوؤں کو بھی اپنی مصاحبت میں داخل کرکے ان کی دلدہی اور عزت
افزائی کو ملحوظ خاطر رکھا تھا مگر اس جگہ سلطان التمش کے تذکرہ کو اس سے زیادہ طول نہیں دیا جاسکتا۔ خلاصۂ کلام
یہ کہ سلطان التمش نے شمالی ہند میں اسلامی شہنشاہی قائم کرکے قطب الدین ایبک کے زمانے سے بھی زیادہ طاقتور
اور ہر قسم کے خرخشوں سے پاک پر امن سلطنت چھوڑی۔

رکن الدین فیروز شاہ ابن التمش

سلطان شمس الدین التمش جب چھبیس سال کی حکومت سلطنت
کے بعد فوت ہوا تو اُمرائے سلطنت نے اُسکے بیٹے رکن الدین
کو فیروز شاہ کے لقب سے تخت سلطنت پر بٹھایا۔ اُس نے تخت نشین ہوتے ہی انعام و اکرام میں تمام خزانہ
لٹا دیا۔ اپنی ماں کو جو ایک ترکی کنیز تھی امور سلطنت سپرد کرکے خود عیش و عشرت میں مشغول ہوا۔ رکن الدین کی
ماں نے سلطان التمش کی دوسری بیویوں کو جن سے وہ رشک و حسد رکھتی تھی سخت اذیتیں پہونچائیں بعض کو
قتل کرا دیا۔ سلطان التمش کے سب سے چھوٹے بیٹے قطب الدین کو اول اندھا پھر قتل کرایا۔ ان مظالم اور
بدانتظامیوں کو دیکھ کر اودھ، بدایوں، ہانسی، لاہور، ملتان وغیرہ کے عامل باغی ہوگئے اور سب نے آپس میں
خط و کتابت کرنیکے بعد متحد ہو کر سلطان رکن الدین کے معزول کرنیکا تہیہ کیا۔ رکن الدین دہلی سے فوج لے کر
لاہور کی جانب روانہ ہوا کہ وہاں کے حاکم ملک علاء الدین شیر خانی کو اول راہ راست پر لائے ابھی منصور پور
تک ہی پہونچا تھا کہ اُسکے ہمراہی سرداروں اور امیروں میں سے بہت سے اُس سے جدا ہو کر دہلی واپس

آئے اور آتے ہی سلطان التمش کی سب سے بڑی لڑکی رضیہ سلطانہ کے ہاتھ پر بیعت کرکے اُسکو تخت سلطنت پر بٹھادیا۔ رضیہ سلطانہ نے تخت نشین ہوتے ہی رکن الدین کی ماں کو جو مختار کل سمجھی جاتی تھی گرفتار کراکر قید کرادیا رکن الدین منصور پور سے دہلی کی طرف واپس ہوا رضیہ سلطانہ نے دہلی کے متصل رکن الدین کا مقابلہ کرکے اُسکو بتاریخ ۱۸ ربیع الاول ۶۳۴ھ گرفتار کرکے محبوس کیا۔ چند روز کے بعد قیدخانہ میں رکن الدین فوت ہوا اُس نے سات مہینے سلطنت کی۔

رضیہ سلطانہ

رضیہ سلطانہ نے تخت نشین ہوکر ملک کا نہایت خوبی کے ساتھ انتظام کیا۔ بعض امیروں نے اُسکی بادشاہی کے تسلیم کرنے سے انکار کیا اور متفق ہوکر مقابلہ پر مستعد ہوئے۔ رضیہ سلطانہ نے سب کو شکست دی۔ پھر کسی کو قید۔ کسی کو قتل اور کسی کو معاف کردیا۔ چند ہی روز میں بنگالہ و اڑیسہ سے پشاور و کراچی تک تمام ملک میں اُسکی سلطنت مسلم اور خوب مستحکم ہوگئی۔ رضیہ سلطانہ امور ملک داری سے خوب واقف اور تعلیم یافتہ عورت تھی وہ گھوڑے پر سوار ہوتی اور صف قتال میں شمشیر زنی کرتی تھی چھوٹے بڑے تمام امرا اُسکی اطاعت کرتے اور اُسکے احکام کی تعمیل میں چون و چرا کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ اگر رضیہ سلطانہ سے ایک لغزش نہ ہوجاتی تو وہ یقیناً عرصہ دراز تک نہایت کامیابی اور نیکنامی کے ساتھ سلطنت کرتی اُس سے غلطی یہ ہوئی کہ اُس نے جمال الدین یاقوت نامی ایک غلام کو اُسکی قابلیت سے بڑھ کر امیرالامرا کا عہدہ عطا کردیا بڑے بڑے ترک و افغان اُمرا جو اس غلام کو اپنی نگاہ میں کمتر و کہتر سمجھتے تھے اُسکی امیرالامرائی سے برافروختہ ہوکر بغاوت پر آمادہ ہوگئے اور لاہور کے صوبہ دار ملک اعزالدین سے علامات سرکشی نمایاں ہوئے۔ رضیہ سلطانہ لشکر لیکر لاہور پہونچی ملک اعزالدین نے خائف ہوکر عفو تقصیر کی درخواست کی چنانچہ اُسکی خطا معاف کرکے لاہور سے دہلی واپس آئی۔ اسی عرصہ میں امیرالامرا جمال الدین یاقوت کی زیادتی سے تنگ آکر بھٹنڈے کے عامل ملک التونیہ نے علم بغاوت بلند کیا رضیہ سلطانہ اُسکی سرکوبی کے لیے فوج لیکر بھٹنڈے کی جانب روانہ ہوئی اس سفر میں جمال الدین یاقوت بھی ہمراہ تھا۔ اُمرا نے لشکر نے موقع پاکر بھٹنڈے پہونچنے سے پہلے ہی یاقوت حبشی کو قتل کیا اور رضیہ سلطانہ کو گرفتار کرکے ملک التونیہ کے پاس بھیجدیا اور خود سب کے سب دہلی کی جانب واپس آگئے یہاں آتے ہی معزالدین بہرام شاہ ابن سلطان التمش کو تخت پر بٹھایا۔ یہاں بھٹنڈے میں ملک التونیہ نے سلطانہ رضیہ سے نکاح کیا اور دونوں نے جاٹوں اور گکھڑوں کی ہندو فوج بھرتی کرکے دہلی پر چڑھائی کی۔ ادھر سے سلطان معزالدین بہرام شاہ نے فوج مقابلہ پر بھیجی مقام کیتھل کے قریب ۶۳۸ھ میں لڑائی ہوئی۔ رضیہ و التونیہ کی فوج تھوڑا سا مقابلہ کرکے فرار ہوئی۔ رضیہ و التونیہ بمشکل میدان سے اپنی جان بچاکر بھاگے۔ راستے میں کسی گاؤں کے ہندو کاشتکاروں نے ان دونوں کو

قتل کر دیا۔ رضیہ سلطانہ کی لاش دہلی میں لاکر دفن کی گئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ خود رضیہ کی ہندو فوج نے رضیہ و التونیہ کو گرفتار کرکے بہرام شاہ کی فوج کے سپرد کر دیا تھا اور جب یہ دونوں گرفتار ہو کر دہلی آئے تو بہرام شاہ نے ان کو قتل کرایا۔ طبقات ناصری کے الفاظ یہ ہیں:-

"سلطان معزالدین لشکر دہلی را بدفع ایشاں بیروں برد سلطان رضیہ و التونیہ منہزم شدند چوں بہ کیتھل رسیدند لشکرے کہ با ایشاں بود ہمہ تخلف نمودند سلطان رضیہ و التونیہ بدست ہندوان گرفتار شدند و ہر دو شہید گشتند و ہزیمت ایشاں بست و چہارم ماہ ربیع الاول ۶۳۸ھ بود و شہادت سلطان رضیہ روز سہ شنبہ بست و پنجم ماہ ربیع الآخر ۶۳۸ھ بود"

معزالدین بہرام شاہ

سلطان معزالدین بروز دوشنبہ ۲۷ رمضان ۶۳۷ھ دہلی میں تخت نشین ہوا۔ اسکی تخت نشینی کے بعد ہی اُمرائے سلطنت میں اسلیے بددلی پیدا ہو گئی کہ اُس نے بعض سرداروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا چند روز کے بعد سلطنت ہند کی بدنظمی کا حال چنگیز مغلوں نے پنجاب پر حملے شروع کر دیے۔ لاہور کے صوبہ دار ملک قراقش نے ان کا مقابلہ کیا لیکن وہ پنجاب کے ہندؤں یعنے گکھڑوں وغیرہ غارت گروں کو بھی مغلوں کا معاون اور اپنی جمعیت کو قلیل دیکھ کر لاہور سے دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ مغلوں نے ۶۳۹ھ میں لاہور پہونچکر ملک قراقش کا تعاقب کیا مگر وہ ہاتھ نہ آیا صحیح سلامت دہلی پہونچگیا۔ لاہور پر قابض ہو کر مغلوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور بڑی بربادی پھیلای سلطان معزالدین بہرام نے ایک زبردست فوج مرتب کرکے مغلوں کے مقابلہ کو پنجاب کی جانب روانہ کی۔ یہ فوج دریائے بیاس کے کنارے قصبہ سلطانپور تک جو اُسی زمانے میں آباد کیا گیا تھا پہونچی یہاں سرداران لشکر نے بجائے اسکے کہ پنجاب کو مغلوں سے پاک کرتے سلطان معزالدین بہرام کے معزول کرنے کی سازش کی اور سب نے آپس میں عہد و پیمان محکم کرکے سلطان کے خلاف دہلی کی جانب مراجعت کی۔ سلطان نے اس واقعہ سے مطلع ہو کر شیخ الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجا کہ ان باغیوں کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لائیں مگر ان پر خواجہ صاحب رحمہ کی نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا اور اُنھوں نے آتے ہی دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ انھیں ایام میں قاضی منہاج سراج مصنف طبقات ناصری کو دہلی اور کل سلطنت اسلامیہ کا قاضی القضاۃ بنایا گیا تھا۔ قاضی صاحب ممدوح نے بھی بہت کچھ ان باغیوں کو سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے ساڑھے تین مہینے تک دہلی کا محاصرہ رہا اور طرفین سے بہت سے آدمی مارے گئے۔ آخر سلطان معزالدین بہرام کو گرفتار کرکے باغی اُمرائے دہلی پر قبضہ کر لیا اور روز شنبہ ۸ ذیقعدہ ۶۳۹ھ کو بہرام شاہ قتل کیا گیا۔ اس نے دو سال ایک مہینہ پندرہ روز سلطنت کی۔ اسکے بعد اُمرا نے سلطان رکن الدین فیروز شاہ کے بیٹے علاء الدین

مسعود کو قید خانہ سے نکالکر تخت نشین کیا۔ علاء الدین مسعود کے علاوہ دو شہزادے اور بھی قید تھے یعنے ناصر الدین محمود اور جلال الدین پسران سلطان التمش۔ مگر امرا نے سلطان التمش کے ان دونوں بیٹوں پر اُسکے پوتے علاء الدین مسعود کو ترجیح دی۔

سلطان علاء الدین مسعود

سلطان علاء الدین مسعود نے تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے مغلوں کو پنجاب سے نکالا اور اپنے دونوں چچاؤں کو قید خانہ سے نکالکر جلال الدین بن التمش کو قنوج کا اور ناصر الدین محمود کو بہرائچ کا حاکم مقرر کیا۔ ماہ شوال ۶۴۲ھ میں مغلوں نے اس راستے سے کہ جس سے محمد بختیار خلجی نے ملک تبت پر حملہ کیا تھا دریائے برہمپتر کو عبور کرکے بنگالہ پر حملہ کیا اور ملک بنگالہ کے ایک حصے کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ یہ سنکر علاء الدین مسعود نے اپنے ایک سردار تیمور خاں قیران کو ایک زبردست فوج دیکر بھیجا کہ صوبہ دار بنگالہ کے ساتھ ملکر مغلوں کو بنگالہ سے نکالے چنانچہ مغلوں کو شکست دیکر جدہر سے آئے تھے اُدہر ہی کو بھگا دیا گیا۔ ماہ رجب ۶۴۳ھ میں منکوتہ نامی مغل نے ایک زبردست لشکر کے ساتھ اُچ و ملتان پر حملہ کیا اور اس نواح کے بہت سے مسلمان مغلوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ سلطان علاء الدین مسعود نے یہ سنکر فوجیں تمام صوبوں سے طلب کیں اور ایک نہایت عظیم الشان لشکر لیکر خود مغلوں کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ اس لشکر کی کثرت و شوکت کا حال سنکر مغل اسقدر مرعوب ہوئے کہ ابھی سلطانی لشکر دریائے بیاس کے کنارے پہونچا تھا کہ وہ اُچ اور ملتان کو چھوڑکر خراسان کی جانب بھاگ گئے اور سلطان مظفر و منصور دہلی کی جانب واپس آیا۔ اس سفر میں بعض نااہل لوگوں کو سلطان کی خدمت میں تقرب حاصل ہوا اور اُنکی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ یہ نوجوان سلطان لہو و لعب اور عیش و عشرت میں اپنا وقت گذارنے لگا اور سلطنت کے کاموں کی طرف سے توجہ ہٹالی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام سلطنت مضبوط ہونیکے بعد پھر کمزور ہوگیا اور اُمرائے سلطنت تخت سلطنت کے معاملے میں مشورے کرنے لگے۔ شہزادہ ناصر الدین محمود ابن التمش نے بہرائچ کی حکومت پر فائز ہوکر اپنی اعلیٰ قابلیت اور پاک باطنی کا اظہار کیا تھا وہاں کی رعایا اُس سے بہت خوش تھی۔ آخر اُمرائے سلطنت نے اس بات پر اتفاق کیا کہ شہزادہ ناصر الدین محمود کو بہرائچ سے بلاکر تخت سلطنت پر بٹھایا جائے۔ چنانچہ ۲۳ محرم ۶۴۴ھ کو امرا نے متفق ہوکر سلطان علاء الدین مسعود کو قید خانہ میں محبوس کردیا اُس نے چار برس ایک ماہ سلطنت کی۔

سلطان ناصر الدین محمودؒ

۲۳ محرم ۶۴۴ھ کو سلطان ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں مغلوں نے دریائے سندھ کو عبور کرکے ملتان وغیرہ علاقوں پر پھر قبضہ کرلیا تھا۔ سلطان ناصر الدین محمود نے ماہ رجب ۶۴۴ھ میں لشکر لیکر مغلوں کے دفع کرنے کے لیے دہلی سے کوچ کیا۔

ماہ ذیقعدہ ۶۴۴ھ میں دریائے راوی کو عبور کر کے مقام سوہدرہ میں قیام کیا اور غیاث الدین بلبن المخاطب بہ الغ خاں کو فوج دیکر دوابہ سندھ ساگر کی طرف روانہ کیا الغ خاں نے مغلوں کو خارج کر کے دریائے سندھ کے پار بھگا دیا اور گکھڑوں وغیرہ کو مناسب سزائیں دیکر مطیع و منقاد بنا دیا سلطان نے واپس ہوکر عید اضحیٰ کی نماز جالندھر میں پڑھی اور محرم ۶۴۵ھ میں دہلی واپس آیا۔ جمادی الثانی ۶۴۵ھ میں سلطان دہلی سے پانی پت آیا مگر یہیں سے قنوج کے ہندوؤں کی بغاوت کا حال سنکر واپس ہوا اور قنوج کے قریب ایک مضبوط قلعہ کا جس میں ہندوؤں نے مقابلہ اور مدافعت کا سامان فراہم کیا تھا محاصرہ کیا آخر سخت معرکے کے بعد قلعہ فتح کر کے باغیوں کو سزائیں دیں۔ یہاں سے فارغ ہوکر ماہ ذیقعدہ ۶۴۵ھ میں سلطان کڑہ مانکپور کے علاقہ میں پہونچا۔ اس طرف ایک ہندو راجہ جسکا نام دلکی ملکی تھا باغی ہو گیا تھا اُسکو گرفتار کر کے اس فتنہ کو فرو کیا۔ اسی سال کے آخر ایام میں سلطان دہلی واپس پہونچا۔ ماہ ذیحجہ ۶۴۶ھ میں سلطان نے قلعہ رنتھمبور کو جہاں ہندوؤں نے پھر شورش و فساد برپا کیا تھا فتح کیا۔ ماہ شوال ۶۴۷ھ میں دوابہ گنگ وجمن اور رقبہ بلکھنڈ میں ہندوؤں نے پھر شورش برپا کی اور سلطان نے دہلی سے روانہ ہوکر اس فساد کو مٹایا اور اسی سال کے ماہ ذی الحجہ میں دہلی واپس آیا۔ مغلوں نے دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان پر پھر چڑھائی کی اور ملک اختیار الدین گریز نے اُن کو شکست دیکر بھگایا اور بہت سے مغلوں کو جو گرفتار ہوئے تھے دہلی بھیجا۔ یہ واقعہ ماہ شوال ۶۴۸ھ میں ظہور پذیر ہوا۔ اسکے بعد ملتان کی صوبہ داری غیاث الدین بلبن المخاطب بہ الغ خاں کے چچا زاد بھائی شیر خاں کو سپرد ہوئی۔ اس شیر خاں نے مغلوں کے حملوں کو بار بار روکا۔ تاریخ ہند میں مغلوں کے حملات کو بار بار رد کرنے اور مغلوں پر چیرہ دست رہنے کی وجہ سے شیر خاں بہت بڑا آدمی سمجھا جاتا اور اُسکا ذکر نمایاں طور پر بیان ہوتا ہے۔ گوالیار، چندیری اور مالوہ وغیرہ میں پھر ہندوؤں نے علامات سرکشی کا اظہار کیا اور ماہ شعبان ۶۴۹ھ میں سلطان ناصر الدین محمود نے ہندوؤں کے سردار جاہر دیو کو جس نے دو لاکھ پیادے جمع کر لیے تھے شکست دیکر گرفتار کیا اور ماہ ربیع الاول ۶۵۰ھ میں دہلی واپس آیا۔ الغ خاں کو ۶۵۰ھ میں سلطان نے وزارت سے معزول کر کے عماد الدین ریحانی کو قلمدان وزارت سپرد کیا اس تبدیلی کو لوگوں نے پسند نہیں کیا کیونکہ الغ خاں کی وزارت سے سب خوش تھے ۶۵۱ھ میں شیر خاں نے مغلوں کے تعاقب میں دریائے سندھ کو عبور کیا اور غزنی تک اُنکے تعاقب پہونچا۔ بروز پنجشنبہ ۱۳ ماہ محرم ۶۵۲ھ کو سلطان ناصر الدین محمود نے دریائے گنگ کو میاپور کے گھاٹ پر عبور کیا اور پہاڑ کے دامن میں سفر کرتا ہوا دریائے رامگنگا کے کنارے تک پہونچا۔ اثنائے سفر میں کئی جگہ ہندوؤں نے چھاپے مارے مقام تگیہ پانی کے قریب بروز یکشنبہ ۵ صفر ۶۵۲ھ کو پیش رو دستہ کے سردار رضی الملک عز الدین درشی نے ہندوؤں کے ہاتھ سے شہادت پائی۔

اگلے دن بروز دوشنبہ ۱۶ ماہ صفر کو سلطان ناصر الدین نے کٹھیر کا قصد کیا تاکہ ان ہندوؤں پر حملہ کرکے اُن کو ایسی سخت سزا دی کہ پھر عرصہ دراز تک اُن کو کان ہلانے کی جرأت نہ ہوسکی۔ اسکے بعد بدایوں کی جانب کوچ کیا اور ۱۹ ماہ صفر ۶۵۲ھ کو لشکر شاہی بدایوں پہونچا۔ یہاں تو روز قیام کرکے بادشاہ کول علیگڈھ کی جانب روانہ ہوا۔ اور کول میں ۲ ربیع الاول ۶۵۲ھ کو طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کو جو اس سفر میں ہمراہ تھا "صدر جہاں" کا خطاب عطا کیا اور ۲۶ ربیع الاول کو دہلی واپس آیا۔ جلندھر وناگور کے عاملوں نے دوسرے اُمرا کو بھی اپنا شریک کرکے آثار بغاوت نمایاں کیے۔ سلطان نے دہلی سے روانہ ہوکر عید الفطر کی نماز مقام سنام میں ادا کی۔ سنام سے ہانسی کی طرف روانہ ہوا۔ ان باغی سرداروں کا کہرام وکیتھل میں اجتماع ہوا۔ یہ بغاوت درحقیقت سلطان کے خلاف بغاوت نہ تھی بلکہ ایک قسم کا احتجاج تھا جس سے مقصود یہ تھا کہ عماد الدین ریحانی کو بادشاہ دربار سے نکال دے اور الغ خاں کو پھر وزیر بنالے۔ چنانچہ بعد غور و تحقیق اس مطالبے کو درست سمجھ کر بادشاہ نے عماد الدین کو بدایوں کا عامل بناکر دربار سے رخصت کردیا اور الغ خاں کو قلمدان وزارت عطا ہوا اُمرا نے اقرار فرمانبرداری کیا۔ ۶۵۳ھ میں سلطان نے بعض عمال کی گوشمالی اور حالات کا معائنہ کرنیکی غرض سے اودھ اور کالنجر تک کا سفر کیا۔ ۶۵۴ھ میں قتلغ خان نامی ایک سردار نے بغاوت اختیار کرکے اُس علاقے پر قبضہ کیا جو آجکل ضلع دہرہ دون کے نام سے مشہور ہے اور پہاڑی ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملاکر مقام سرمور میں سامان جنگ فراہم کیا۔ سلطان نے ۶۵۵ھ میں دہلی سے فوج لیکر سرمور پر حملہ کیا۔ اس لڑائی میں ہندوؤں کی فوج کو شکست ہوئی اور سرمور پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ یہ فتح ماہ ربیع الاول ۶۵۵ھ میں حاصل ہوئی اور ۲۶ ربیع الثانی ۶۵۵ھ کو بادشاہ دہلی واپس پہونچا۔ قتلغ خاں کوہستان ہمالہ سے نکلکر قلعہ چتور میں چلا گیا۔ اسی سال کے آخر میں مغلوں نے اُچ وملتان کی طرف حملہ کیا اور سلطان ناصر الدین محمود اُن کے مقابلے کے لیے خود لشکر لیکر بروز یکشنبہ ۶ محرم ۶۵۶ھ دہلی سے روانہ ہوا اور سرداران لشکر کو مناسب مقامات پر تعینات کرکے بماہ رمضان دہلی میں واپس آیا۔ اسی سال کے ماہ صفر میں ہلاکو خاں نے بغداد کو برباد اور خلیفہ مستعصم باللہ عباسی کو شہید کیا اور خلافت بغداد کا خاتمہ ہوا۔ ماہ محرم ۶۵۷ھ میں ہندوؤں نے بیانہ وگوالیار کی طرف پھر سر اُٹھایا اور سلطان ناصر الدین محمود نے اُس طرف جاکر اس فتنے کو فرو کیا۔ ماہ صفر ۶۵۸ھ میں علاقۂ میوات میں میواتیوں نے لوٹ مار اور رہزنی شروع کرکے اس علاقے کے امن وامان کو بدامنی سے تبدیل کردیا۔ یہ خبر سنتے ہی بادشاہ نے الغ خاں کو اس فتنے کے فرو کرنے پر مامور کیا۔ الغ خاں نے میواتیوں کو خوب اچھی طرح درست کیا۔ اسی سال چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کا سفیر سلطان ناصر الدین محمود کی خدمت میں دہلی آیا۔ اس سفیر کی آمد پر دہلی میں شان وشوکت کے اظہار کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔

خان اعظم الغ خاں وزیر سلطنت پچاس ہزار سوار باساز و یراق اور دو لاکھ پیادے زرق برق لباس اور بجلی ہتھیاروں سے آراستہ و مسلح اور دو ہزار جنگی ہاتھی اور تین ہزار عرادہ آتشباری ہمراہ لیکر دہلی سے استقبال کے لیے نکلا۔ اس تمام فوج کو شہر سے باہر قرینے کے ساتھ استادہ کیا گیا طبل و دہل اور نفیری و بگل وغیرہ جنگی باجے ہر پلٹن اور رسالے میں بج رہے تھے۔ اس فوج کی دو طرفہ قطار و نکے بیچ میں سفیر مذکور کو استقبال کرکے لایا گیا۔ جب یہ سفیر دربار سلطانی میں داخل ہوا تو وہاں اور بھی زیادہ مرعوب کن نظارہ پیش نظر ہوا تمام دربار جگمگا رہا تھا سونے چاندی اور جواہرات کے آرائشی سامان اور تخت شاہی کی عظمت سے دلوں پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ سلطان تخت پر جلوہ افروز تھا۔ تخت کے ایک پہلو پر سادات و مشائخ و قضاۃ عظام کی صف تھی۔ دوسری جانب اُن پچیس شہزادوں اور بادشاہوں کی قطار تھی جو خراسان و ایران و عراق و آذربائیجان وغیرہ ممالک سے اپنی سلطنتوں کو مغلوں کے ہاتھوں برباد کرا کر ہندوستان میں بطور پناہ گزین آئے ہوئے تھے اور شاہی مہمان تھے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے اُمرائے نامدار و سپہ سالار و عمال سلطنت ایک صف میں مؤدب کھڑے تھے ایک قطار ہندو راناؤں، راجاؤں اور رائے زادوں کی تھی جو دست بستہ تخت شاہی کے گرد کھڑے تھے منہاج سراج نے اِس موقع پر یہ اشعار موزوں کیے تھے ؎

زہے جشنے کزاں اطراف چوں خلد بریں گشتہ — خہے بزمے کزاو اکناف عدن زشتیں گشتہ

زترتیب نہاد در رسم و آئین و نشاط او — تو گفتی عرصۂ دہلی بہشت ہشتمیں گشتہ

زفر ناصر الدین شاہ محمود ابن التمش — ملک نزد غش عا خواندہ فلک پیشش زمین گشتہ

شہنشاہے کہ در عالم بہ فیض فضل ربانی — سزائے چتر شاہی لائق تخت و نگیں گشتہ

چو خاقانان کیں آور چو سلطانان دیں پرور — بدل ماحی کفر است و بجاں حامی دیں گشتہ

مبارک باد بر اسلام ایں بزم شہ عالم — کزیں ترتیب ہندوستاں بسے خوشتر زچیں گشتہ

معین از جملہ شاہان باد ہر بندہ ز درگاہش — چو منہاج سراج از جاں دعا گوئے کمیں گشتہ

ہلاکو خاں کے سفیر پر اس شان و شوکت کے معائنے سے بڑی ہیبت طاری ہوئی ہلاکو خاں نے اس سفیر کے واپس جانے کے بعد ہندوستان پر حملہ کرنیکے خیال کو ترک کر دیا اور اپنے سرحدی امیروں کے پاس احکام بھیج دیئے کہ آئندہ ہندوستان پر ہرگز کوئی فوج حملہ آور نہ ہو۔ اِس سفارت کے آنے سے یہ بڑا فائدہ ہوا کہ چندروز کے لیے مغلوں کے حملوں کا سلسلہ رک گیا۔ سلطان ناصر الدین محمود کی سلطنت کے آخری چھ سال یعنی ۶۵۸ھ سے ۶۶۴ھ تک نہایت امن و امان اور اطمینان کے ساتھ گذرے اور کوئی اہم قابل تذکرہ واقعہ نہیں ہوا۔ سلطان ناصر الدین محمود ایک طرف شجاع و جفاکش اور ہمہ اوقات مستعد رہنے والا بادشاہ تھا

تو دوسری طرف عابد شب زندہ دار اور زاہد خوش اطوار بھی تھا۔ چھ مہینے میں ایک قرآن مجید اپنے ہاتھ سے پورا لکھ لیتا تھا۔ سال بھر میں دو قرآن مجید اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے فروخت کرکے اسی سے سال بھر تک اپنی گذر کرتا تھا۔ اُسکے ایک ہی بیوی تھی وہی اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی تھی۔ ایک مرتبہ اس سلطانہ نے عرض کیا کہ کوئی خادمہ روٹی پکانے کے لیے نوکر رکھ دیجیے۔ سلطان نے کہا کہ میری آمدنی میں اسقدر گنجائش کہاں ہے کہ کوئی خادمہ نوکر رکھ سکوں رہا شاہی خزانہ تو وہ سب رعایا کا مال ہے۔ میں اُس میں سے ایک کوڑی بھی اپنی ذات کے لیے نہیں لے سکتا۔ چنانچہ یہ شہنشاہ بیگم اپنے ہاتھ ہی سے روٹی پکاتی رہی اسی ایک واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود کس قدر نیک اور باخدا شخص تھا۔ ۱۱ جمادی الاول ۶۶۴ھ کو بیس سال کی سلطنت کے بعد اس پاک باطن سلطان نے وفات پائی۔

سلطان غیاث الدین بلبن

سلطان ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد شمس الدین کی اولاد میں کوئی شخص تخت و تاج کے سنبھالنے کے قابل نہ تھا لہٰذا اُمرائے سلطنت نے وزیر سلطنت الغ خاں کو سلطان غیاث الدین بلبن کے لقب سے تخت سلطنت پر بٹھایا۔ سلطان بلبن شمس الدین التمش کا غلام اور اُسکا ہم قوم بھی تھا۔ سلطان التمش کی وفات کے وقت اُسکے چالیس غلام جو اُمرائے چہلگانی کہلاتے تھے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ سلطان التمش کی وفات کے بعد قریباً دس سال تک اُسکے کئی بیٹے بیٹی اور پوتا تخت نشین ہوئے جو سب کے سب ناتجربہ کار اور بار سلطنت کے اُٹھانے کی پورے طور پر اہلیت نہیں رکھتے تھے اس دس سال کے عرصے میں اُمرائے چہلگانی کا اثر و اقتدار اور بھی ترقی کرتا رہا اور ان کی خودسری و خودمختاری دن بدن بڑھتی رہی۔ سلطان ناصر الدین محمود نے اپنی شجاعت و مستعدی سے سلطنت کے کاموں کو سنبھالا اور اُمرائے چہلگانی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہونچانا چاہا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بار بار صوبوں میں بغاوتیں برپا ہوئیں اور سلطان ناصر الدین کو یہ بغاوتیں خود جا جاکر فرو کرنی پڑیں۔ ان بغاوتوں میں اُمرائے چہلگانی بڑی آسانی سے ماتحت ہندو راجاؤں کو اپنا شریک کر لیتے تھے جیسا کہ قتلغ خاں نے سرمور کے راجہ دیپال سنگھ کو بغاوت میں اپنا شریک کر لیا تھا۔ یا مالوہ اور بیلکھنڈ وغیرہ صوبوں میں ہندو راجاؤں نے بار بار سرکشی کا اظہار کیا۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے ۶۶۴ھ میں تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی توجہ ان اُمرائے چہلگانی کا اثر و اقتدار مٹانے میں صرف کی حالانکہ وہ خود بھی اُمرائے چہلگانی میں شامل تھا۔ مگر وہ سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے سے جانتا تھا کہ جبتک یہ سرکش اُمرائے چہلگانی باقی رہیں گے اُسوقت تک نظام سلطنت معرض خطر ہی میں رہیگا۔ چنانچہ اُس نے ایک ایک کرکے سب کا اثر و اقتدار مٹا دیا۔ بعض فوت ہوئے جو باقی رہے وہ بے دست و پا ہوکر رہ گئے سلطان

ناصر الدین محمود کے زمانے میں ہندوؤں کو برابر سلطنت کے اعلیٰ عہدے سلطان کی مصاحبت۔ راجائی کے خطاب۔ اور بڑے بڑے اضلاع کی حکومتیں سب کچھ میسر تھا۔ سلطان بلبن نے اپنے عہد سلطنت میں اس بات کی بھی کوشش کی کہ ہندوؤں کو بار بار بغاوتیں برپا کرنے اور امن وامان کے برباد کرنے کا موقع نہ ملے وہ تخت وتاج کا مالک ہونے سے پہلے بھی امارت اور سرداری کے مرتبے پر فائز اور مختلف صوبوں کی حکومت پر قریباً بیس سال مامور رہ چکا تھا۔ بیحد عقلمند۔ ذی ہوش اور باریک بیں شخص تھا اُس کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ برہمنوں نے کس کس طرح سازشوں اور چالاکیوں کے ذریعہ سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے لے کر اب تک ملک کے امن وامان کو بار بار معرض خطر میں ڈالا اسلیے اُسکو برہمنوں سے سخت نفرت تھی اور بار بار اُسکی زبان سے برہمنوں کے طبقے کی برائی سنی گئی۔ لیکن ہندوؤں میں جو راجہ اور شریف سردار امارت وحکومت کا مستحق تھا اُسکو سلطان بلبن نے ضرور حکومت وامارت کے مرتبہ پر قائم رکھا۔ ہندوؤنکے اخلاق ومعاشرت کی پستی چونکہ انتہا کو پہونچی ہوئی تھی اسلیے اُس کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ مسلمانوں میں اس قسم کی بداخلاقیاں اور بیحیائیاں پیدا نہ ہونے پائیں چنانچہ اس نے تخت نشین ہوتے ہی اِس خطرہ کی طرف سب سے زیادہ توجہ مبذول کی۔ وہ حسب ونسب اور قوم وخاندان کی شرافت کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھتا تھا اور اجلاف وکم قوم لوگوں کو اعلیٰ عہدے نہیں دیتا تھا۔ اِس قسم کی بہت سی حکایتیں ضیاء برنی کی تاریخ فیروزشاہی میں سلطان بلبن کے متعلق مندرج ہیں جو بخوف طوالت نظر انداز کی گئی ہیں۔ سلطان شمس الدین التمش کے بعد اوسکی اولاد کے ایام حکومت میں گجرات اور مالوہ کا کچھ حصہ سلطنت دہلی سے نکل گیا تھا اور وہاں کے ہندو راجہ خود مختار ہوگئے تھے سلطان بلبن سے اُسکے اُمرانے بار بار تقاضا کیا کہ گجرات پر چڑھائی کیجیے لیکن سلطان بلبن نے ہمیشہ انکار کیا اور کہا کہ اگر میں دوسرے ملکوں پر چڑھائی کروں اور دار السلطنت سے بہت دنوں غیر حاضر رہوں تو اندیشہ ہے کہ مغل ہندوستان پر حملہ کرکے سلطنت اسلامیہ کو درہم برہم نہ کرڈالیں اُسکی تمامتر توجہ مغلونکے دفع کرنے اور ہندوستان کو اُنکے حملوں سے محفوظ رکھنے میں صرف ہوئی اُس نے بائیس سال سلطنت کی اس بائیس سال میں وہ صرف ایک مرتبہ لکھنوتی یعنی بنگالہ تک گیا اور بہت دنوں دہلی سے غیر حاضر رہا۔ اُس نے بنگالہ کے باغی سردار طغرل کو جو مغیث الدین کے لقب سے بنگالہ کا خود مختار بادشاہ بن چکا تھا قتل کیا اور اپنے بیٹے ناصر الدین محمود المعروف بہ بغرا خاں کو بنگالہ کی حکومت پر مامور کرکے واپس ہوا۔ یہی اُسکا سب سے بڑا سفر تھا۔ اسکے علاوہ ایک مرتبہ وہ چناب وجہلم کے دوآبے تک بھی گیا۔ سلطان بلبن نے خود بھی شاندار عمارتیں بناکر دہلی کی رونق اور شان وشوکت میں اضافہ کیا اور اُمراء کو بھی ترغیب دی کہ وہ عالیشان عمارتیں بنائیں۔ موسم سرما میں

ہر روز سلطان پچھلی رات سے بغرض شکار روانہ ہوتا اور پندرہ کوس کے فاصلے پر پہونچکر شکار کھیلتا اور بعد عشا دہلی میں واپس آتا۔ اِس شکار میں کئی ہزار فوج بھی ہمراہ ہوتی مدعا اس کا اس شکار اور سفر سے صرف یہ تھا کہ فوج اور گھوڑے جفاکش رہیں اور ضرورت کے وقت میدان جنگ میں خوب کام کرسکیں۔ اسکے آزادہ رو بیلکھنڈ اور دوابہ گنگ و جمن کے سرکشوں کو وہ خود کئی مرتبہ سزا دینے آیا۔ عدل و انصاف کے قائم رکھنے کا اُسکو سب سے زیادہ خیال تھا۔ اِس معاملے میں وہ اپنے بھائیوں، بیٹوں، اور بھتیجوں کی بھی مطلق پرواہ نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک نہایت عالیجاہ امیر نے جو بداؤں کا صوبہ دار اور چار ہزار اپنے ذاتی سوار رکھتا تھا ایک پیش خدمت کو کسی بات پر ناراض ہو کر تازیانہ سے پٹوایا۔ تازیانہ کی ضربات سے وہ جانبر نہ ہوسکا۔ اِس خدمت گار کے اِس طرح مرنے کا حال سلطان بلبن کو معلوم ہوا تو اُس نے امیر مذکور کو اُسی طرح کوڑوں سے پٹوایا۔ یہاں تک کہ اُسکا دم نکل گیا۔ پھر اُسکی لاش کو شہر کے دروازے پر لٹکا دیا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ اپنے ضعیف ماتحتوں پر ظلم روا رکھنے اور بیدردانہ سزائیں دینے کی جرأت نہ کرسکیں۔ ایک ہیبت خاں حاکم اودھ نے ایک شخص کو ناجائز طور پر قتل کیا مقتول کی بیوی نے بادشاہ سے فریاد کی بادشاہ نے ہیبت خاں کے پانسو کوڑے لگوائے اور مقتول کی بیوہ سے کہا کہ یہ آجتک ہمارا غلام تھا اب تیرا غلام ہے چاہے اسکو جان سے مار ڈال اور چاہے زندہ رہنے دے ہیبت خاں نے بہت سے لوگوں کو منت سماجت کرکے اپنا سفارشی بنایا اور بیس ہزار روپیہ دیکر اُس عورت سے دستاویز لکھا کر اُس کی غلامی سے آزادی حاصل کی اور پھر گوشہ نشین ہو کر کسی کو اپنی صورت نہ دکھائی چند روز اسی حالت میں رہ کر فوت ہوگیا۔ ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سلطان بلبن کس مزاج اور کس قماش کا آدمی تھا اور اس نے ملک کی اخلاقی حالت کو کسقدر سُدھار دیا تھا۔ فسق و فجور اور بیحیائی کے کاموں کا اُس نے بالکل قلع قمع کردیا تھا۔ نہایت عابد زاہد اور متقی شخص تھا۔ نیک لوگوں اور عالموں کی مجلس میں عام لوگوں کی طرح شریک ہوتا اور وعظ و پند کی باتیں سنکر اکثر زار و قطار رونے لگتا تھا۔ باوجود اسکے رعب و ہیبت کی یہ حالت تھی کہ ہندوستان کے راجہ اور دوسرے ملکوں کے سفیر اُسکے دربار میں آتے تو رعب سلطانی سے لرزہ براندام ہوتے ضیاء برنی لکھتا ہے کہ:-

"اگر دراں محل رسولان و وردست درابان و رایان و راےزادگان و مقدمان آمدہ درگاہ را خاکبوس کنانندے بیشتر آں بودے کہ ایشان مدہوش و بے خبر شدندے و از پا در افتادندے"

سلطان بلبن کا قول تھا کہ:-

"رعایا در عصر پادشاہ بے حشمت و ہیبت زندقہ بار آرد و تمرد و طغیان رونماید ہندوان سرتابی باکنند و مسلمانان از

کثرت فسق و فجور بہجت شوند"

ایک مرتبہ سلطان بلبن سے اُسکے امیروں نے کہا کہ ملک دکن بھی ہندوں سے فتح کر لینا چاہیے سلطان نے جواب دیا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ ہندوں کے پاس مجموعی طور پر شاید ایک لاکھ فوج لڑنے والی ہوگی جسکو میرے لشکر کے صرف چھ سات ہزار آدمی باسانی مغلوب کر سکتے ہیں لیکن بعد فتح اگر میں اُن نومفتوحہ علاقوں کے انتظام کے لیے تجربہ کار اور لائق آدمیوں کو مامور کرتا ہوں تو دار السلطنت اور اپنے مقبوضہ صوبوں میں کام کے آدمیوں کی کمی واقع ہوتی ہے جس سے ملکی انتظام اور امن و امان کی اس خوبی کے جاتے رہنے کا اندیشہ ہے اور اگر ان نومفتوحہ علاقوں میں لائق اور تجربہ کار اشخاص نہ بھیجے گئے تو نالائق عمال امن و امان قائم نہ رکھ سکیں گے۔ اسلیے میں اپنے حلقہ حکومت کو وسیع کرنے کے عوض اُس میں ہر قسم کی خوبیاں پیدا کرنا اور نقائص کو دور کرنے میں مصروف رہنا زیادہ اچھا جانتا ہوں۔ تاریخ فیروز شاہی میں اس موقع پر سلطان بلبن کے یہ الفاظ بھی درج ہیں کہ

"پیش از ما پادشاہان پختہ و گرم و سرد روزگار چشیدہ گفتہ اند کہ مملکت خود را مضبوط و مستقیم داری و حق آں بگذاری بہتر از اں بود کہ در اقلیم دیگراں دست زنی و آنرا نتوانی داشت"

سلطان بلبن پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے روہیلکھنڈ اور موجودہ ضلع فرخ آباد کے علاقے میں بہت سے میواتیوں کو جو اُس زمانے میں ہندو تھے قتل و غارت کیا۔ لیکن ان میواتیوں کی حالت یہ تھی کہ اُنھوں نے رہزنی اور لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر کے نواح دہلی تک کے علاقے کو ویران اور راستوں کو بند کر رکھا تھا۔ کئی مرتبہ اُن کی تادیب کی گئی لیکن وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئے آخر سلطان بلبن نے قصبہ پٹیالی۔ بھوجپور۔ کمپل وغیرہ میں جہاں میواتیوں نے اپنی مضبوط پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں خود پہونچکر میواتیوں کو قرار واقعی سزائیں دیں اور ان تمام علاقوں میں قلعے بنا کر اور تھانے قائم کر کے ان تھانوں میں افغانوں کو مامور کیا کہ آیندہ کسی قسم کی بدامنی و رہزنی وقوع پذیر نہ ہو۔ یہ انتظام اسقدر مفید ثابت ہوا کہ عرصہ دراز تک اِن علاقوں میں امن و امان قائم رہا۔ ضیاء برنی لکھتا ہے کہ

"آں قصبات را بجمعیت افغاناں چناں مستحکم گردانید کہ شر رہزنی رہزناں دبلاے قطاع طریق از راہ ہندوستان (اودھ و بہار) دفع شد و الی یومنا ھٰذا کہ از بر آمد دن آں حصار پا دشاہ است آں تھانہا قریب سہ قرن (قرن = ۳۰ سال) گذشتہ است راہ ہندوستان مسلوک گشتہ است رہزنی بکلی مرتفع شد و ہم دراں نہضت حصار جلالی عمارت فرمود و آں حصار را ہم با فغاناں داد"

سلطان بلبن کا چچازاد بھائی شیرخاں جسکا ذکر اوپر آچکا ہے ملتان و پنجاب میں مغلوں کے حملوں کو سد سکندری

بنگر روک رہا تھا۔ جب شیر خاں کا انتقال ہوا تو سلطان نے اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان المعروف بہ خان شہید کو شیر خاں کی جگہ مامور کیا اور خان شہید نے بھی بڑی بہادری اور شجاعت کے ساتھ مغلوں کو ہر مرتبہ شکست دے دیکر واپس بھگایا۔ جب بنگالہ کے باغی حاکم کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی گئی اور اس سلطانی فوج کو شکست ہوئی تو راستے کے ہندو رئیسوں نے اس منہزم شدہ لشکر کو تباہ کیا آخر خود سلطان کو بنگالے کی طرف جانا پڑا جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اس موقع پر ہندو راجہ مسمّی بھوج رائے یا دنوج رائے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا سلطان نے اُس سے صرف اس بات کا اقرار لیا کہ بنگالے کے باغی حاکم کو اُسکے فرار ہو کر جان بچانے میں کسی قسم کی مدد نہ دیگا اور کسی قسم کا مواخذہ اس ہندو راجہ سے نہ ہوا۔ اور اس باغی حاکم کے متعلقین کو جو سب مسلمان تھے لکھنوتی کے بڑے بازار میں بڑی بیدردی سے قتل کرایا گیا۔ سلطان بلبن نے کبھی کسی ہندو کو ہندو ہونیکی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہونچایا وہ مذہب اسلام کا سختی سے پابند تھا اور مذہب اسلام کسی کو محض اختلاف عقائد کی بنا پر نقصان پہونچانے یا قتل کرانے کی اجازت نہیں دیتا جب تک کہ مخلوق خدا کو اُس سے جان و مال کا نقصان نہ پہونچے اور ملک کا امن و امان اُسکی وجہ سے برباد نہ ہونے لگے۔ سلطان بلبن نے اپنے چھوٹے بیٹے ناصر الدین بغرا خاں کو بنگالہ کا حاکم بنا کر جب وہاں سے دہلی کی جانب کوچ کیا ہے تو بغرا خاں کو چند نصیحتیں کی تھیں منجملہ اُن نصائح کے ایک یہ بھی تھی کہ

"ہر گاہ کہ خلق ایں دیار پادشاہ را و اعوان و انصار پادشاہ را و حشم و خدم پادشاہ را در شرب و شاہد مشغول خواہند دید ہر ہمہ خرد و بزرگ و زن و مرد و مسلمان و ہندو در فساد مستغرق خواہند شد و با چندیں کفر و شرک کہ ہندوان ایں دیار راست زندقہ و اباحت در مسلمانان ہم از بسیاری فسق و فجور پیدا خواہد آمد و چنانچہ ہندوان مشرک بت پرست از خدا اے فراموش کردہ اند مسلمانان ہم فراموش خواہند کرد و نام خدا پاکی و صدق بر زبان کسے نخواہد رفت و بواسطہ آں من و تو در عذاب گرفتار خواہم ماند"

سلطان بلبن کے یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ کس قدر خدا ترس بادشاہ تھا اور اُسکو عقبیٰ کا کس قدر خیال تھا ایسے بادشاہ سے ممکن نہ تھا کہ ہندوؤں پر کوئی بیجا ظلم کرتا مذکورہ الفاظ سے یہ بھی ثابت ہے کہ اُس زمانے میں ہندوؤں کے اندر مذہب کی پابندی اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور اُس کا خوف بالکل جاتا رہا تھا اور اسی لیے سلطان بلبن کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ ہندوؤں کی صحبت سے مسلمانوں میں بد اعمالیاں پیدا نہ ہونے پائیں اسکے لیے اس نے یہ تدبیر اختیار نہیں کی کہ وہ ہندوؤں کو قتل کرتا اور اُن کا نام و نشان مٹا دینے پر آمادہ ہو جاتا بلکہ اُسنے اپنے اور اپنے اُمراء کے اعلیٰ نمونے دکھا کر مسلمانوں کو اسلام پر قائم رکھنے کی کوشش کی اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے شمالی ہند کو ہندوؤں سے پاک اور صاف کر دیتا کیونکہ ہندوؤں کی کوئی طاقت

ایسی باقی نہ رہی تھی جو اس کام میں اسکی مزاحم ہو سکتی۔ اُسکو ہر ایک بدیقین اور فاسق و فاجر سے نفرت تھی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اگر ہندوؤں سے محض ہندو ہونے کے سبب نفرت ہوتی تو اُسکے دربار میں ہندو رایان و رائے زادگان کو ہرگز بار نہ مل سکتا قسم کھانے کو ایک بھی ایسا واقعہ بیان نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے کبھی کسی ہندو و رمارت کو مسلمان بننے اور اپنا مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دی ہو۔ سلطان بلبن جب بنگالہ سے دہلی کی جانب واپس آیا ہے تو راستے میں جا بجا ہندو سرداروں یعنی رایوں اور راناؤں نے اسکی خدمت میں حاضر ہو کر فتح کی مبارکبادیں دیں اور سلطان سے قیمتی خلعت حاصل کیے۔ پھر جب سلطان دہلی میں پہونچگیا تو ملک کے ہر حصے سے سردار اور رئیس آ آکر تہنیت و مبارکبادیں پیش کیں۔ ضیاء برنی کے الفاظ تاریخ فیروز شاہی میں یہ ہیں کہ

"وہر کرا از مسلمان و ہندو، و ترک، و تاجیک عزتے و شہرتے و ملکے و اقطاعے داشت ہر یک بہ تہنیت فتح بدرگاہ آمدند و شرائط ہائے خاک بوس بجا آوردند و اسپاں و شتراں و تحف و ہدایا خدمتے درگاہ گذرانیدند و خلعت ہا و نوازشہا یافتند"

سلطان بلبن کے وزیر اعظم خواجہ ذکی تھے جو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ہمشیرہ زادے تھے، دہلی میں بڑے بڑے علما اور ہر علم و فن کے ماہر اور باکمال اُستاد موجود تھے حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ صدر الدین پسر حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ بدر الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ (خلیفۂ شیخ قطب الدین بختیار کاکی رح) وغیرہ مشائخ اس سلطان کے عہد میں تھے۔ ان بزرگوں کے اعلیٰ اخلاق اور مہذب طرز زندگی کو دیکھ کر ممکن نہ تھا کہ ہندو اسلام سے واقف ہونیکی کوشش نہ کرتے چنانچہ اسی زمانے میں ٹوانہ قوم کا مورث اعلیٰ ہندو راجپوت خواجہ فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر برضا و رغبت مسلمان ہوا جسکی اولاد آج تک پنجاب کے ضلع شاہ پور وغیرہ میں آباد ہے۔ اسی زمانے میں سیال، کھیپے، گکھڑ، بگے، کھر، کھچی، جیاٹ وغیرہ قومیں انہیں مشائخ عظام کی خدمت میں حاضر ہو کر بابت مسلمان ہوئیں۔ جواہر فریدی میں لکھا ہے کہ ہندوؤں کی سولہ قومیں حضرت بابا صاحب رح کے ہاتھ پر مسلمان ہوئیں۔ سلطان بلبن کے عہد میں ہندوؤں کے اندر اسلام کو قدرتی طور پر سوخ حاصل کرنا چاہیے تھا کیونکہ سلطان ناصر الدین محمود اور سلطان بلبن دو ہی بادشاہ ایسے گذرے تھے کہ نئے ملکوں کی فتوحات کا سلسلہ بند ہو کر پہلی مرتبہ شمالی ہند میں سلطنت اسلامیہ نے ایک سکون کی حالت قائم کرکے تمام تر ہمت رعایا میں امن و سکون پیدا کرنے کے لیے صرف کی تھی۔ سلطان بلبن نے دہلی کی وحشت و پریشانی کا ازالہ کرکے اس یقین کو پائدار بنا دیا کہ اب دوام شمالی ہند کو اسی نظام سلطنت یعنی اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا پڑے گا۔ اس حالت کے پیدا ہوتے ہی ہندو و مسلمان دونوں کے

ایک دوسرے کے اعمال و عقائد یعنی مذہب کے سمجھنے اور جاننے کی مہلت پائی جس کا لازمی نتیجہ ہندوؤں کا اسلام میں داخل ہونا تھا۔ سلطان بلبن کے عہد کی ایک یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ مسلمان سردار اور بڑے بڑے اُمرا سخاوت اور سیر چشمی کے مقابلے میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا چاہتے اور اسی لیے اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سب کے سب ہندو ساہو کاروں سے قرض لیتے اور اپنی جاگیر یا تنخواہ کا روپیہ ملنے پر تمام و کمال ہندو ساہو کاروں کو ادا کرتے تھے۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ سلطان بلبن ہی کے عہد میں ہندوؤں سے مسلمان اُمرا کے سودی روپیہ قرض لینے کا ذکر آتا ہے اور شاید اسی زمانے سے ہندی مسلمان سود دینے کو سود لینے کے برابر گناہ نہیں سمجھتے۔ جس چیز کو سلطان بلبن کے اُمرا کی سخاوت بیان کیا جاتا ہے وہ در حقیقت اُن کا اسراف تھا۔ قرآن کریم میں صاف موجود ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْن۔ اِس اسراف کے گناہ سے ایک دوسرا گناہ پیدا ہوا اور اس نے ممتد ہو کر آج تک مسلمانوں کو سخت پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کاش مسلمان اب بھی سمجھ جائیں اور سودی روپیہ قرض لینے کی لعنت سے اپنے آپ کو بچائیں۔ ذی الحجہ ۶۸۳ھ میں سلطان بلبن کا بڑا بیٹا خان شہید مغلوں کی لڑائی میں شہید ہوا۔ اُس کے بعد بمشکل دو سال زندہ رہ کر ذی الحجہ ۶۸۶ھ میں بائیس سال کی سلطنت کے بعد اسّی سال کی عمر میں سلطان بلبن کا انتقال ہوا۔

سلطان بلبن کے تخت نشین ہونے سے پہلے پچیس فرمانروا جن کی سلطنتیں مغلوں کے ہاتھ سے بر اعظم ایشیا میں برباد ہوئی تھیں ہندوستان میں پناہ گزین تھے اور سلطان ناصر الدین محمود کے دربار میں مصاحبوں اور امیروں کی طرح حاضر رہتے تھے۔ سلطان بلبن کے زمانے میں اُن پچیس کے علاوہ پندرہ ایسے ہی شہزادے اور آ گئے تھے اور سب کے سب وقت بستہ تخت کے گرد کھڑے ہوتے تھے۔ صرف دو شہزادوں کو جو عباسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اِس سلطان کی رائج شدہ پرشان و صاحب نے بھی اپنی تاریخ میں تعریف و توصیف بیان کر کے یہ فقرہ لکھا ہے کہ "وہ اپنا نام اور کام دونوں یادگار چھوڑ گیا"۔

سلطان معز الدین کیقباد

سلطان غیاث الدین بلبن کی وفات کے وقت اسکا بیٹا ناصر الدین بغرا خاں بنگال میں تھا۔ اُمرا نے اُسکے پوتے یعنی ناصر الدین بغرا خاں کے بیٹے کیقباد کو جسکی عمر اُس وقت سترہ اٹھارہ سال کی تھی تخت سلطنت پر بٹھایا۔ کیقباد نے تخت نشین ہوتے ہی تمام کاروبار سلطنت خود مطلب امیروں کے سپرد کر دیا اور خود عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا۔ کیقباد کی اس غفلت و عیش پرستی کا حال سنکر اُسکا باپ ناصر الدین جو بنگالہ کا خود مختار حاکم تھا بیٹے کو نصیحت کرنے کے لیے چلا ادھر سے معز الدین کیقباد بھی باپ کے استقبال کو دہلی سے روانہ ہوا۔ دریا کے

سرجو کے کنارے اور بقول بعض دریائے گنگا کے کنارے بمقام کڑہ دونوں کی ملاقات ہوئی باپ نے بیٹے کو سلطنت کے کاموں کی طرف توجہ دلائی اور اچھی اچھی نصیحتیں کیں اسکے بعد دونوں اپنے اپنے دارالحکومتوں کو واپس ہوئے کیقباد اسکے بعد بھی لہو ولعب میں مصروف رہا اور کاروبار سلطنت کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ بادشاہ کی نالائقی سے سلطنت اسلامیہ معرض خطر میں ہے اور سلطان کی اصلاح بظاہر غیر ممکن نظر آتی ہے تو انھوں نے اِس نالائق سلطان کو تین سال سے زیادہ مہلت نہ دی اور ۶۸۹ھ میں جبکہ وہ شراب خواری کی وجہ سے بیمار بھی ہو گیا تھا قتل کر ڈالا۔ چونکہ سلطان بلبن یا سلطان التمش یا سلطان ایبک کی اولاد میں کوئی لائق شخص موجود نہ تھا لہٰذا خلجی خاندان کے ایک امیر ملک جلال الدین کو جو سامانہ کا نائب ناظم اور ستر برس کی عمر کا تجربہ کار شخص تھا تخت پر بٹھایا گیا۔ اس طرح غلاموں کے خاندان کا (جو قوم سے ترک تھے) خاتمہ ہو کر خلجی خاندان کی (جو افغانی تھے) سلطنت شروع ہوئی۔

غلام خاندان کی حکومت پر ایک نظر

سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے میں تمام شمالی ہند پر اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی غلام سلاطین میں سے قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش نے شمالی ہند کے بعض بچے ہوئے خطوں کو بھی فتح کر کے سلطنت اسلامیہ کو مضبوط و مکمل بنا دیا۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ غلام سلاطین نے مفتوحہ علاقے پر حکومت قائم رکھ کر امن وامان اور رعایا کے فلاح و بہبود میں زیادہ ہمت صرف کی اور نئے ملکوں کے فتح کرنے کا خیال نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس خاندان کے دس بادشاہوں نے بچاسی یا چھیاسی سال تک نو مفتوحہ ہندوستان کی جدید اسلامی حکومت کے مستحکم و باآئین بنانے میں اپنی تمام تر توجہ صرف کی۔

اس خاندان کی ایک یہ خصوصیت بھی قابل التفات ہے کہ ان کے عہد حکومت میں مسلمانوں کے اندر بحیثیت مجموعی صحیح اسلامی جذبات بہت نمایاں تھے اور یہی وجہ تھی کہ جو بادشاہ ان میں سلطنت کی قابلیت اور لیاقت زیادہ رکھتا تھا اُسکو حکومت کرنے کی آزاد مہلت ملی اور کوئی اُسکی مزاحمت یا مخالفت پر آمادہ نہ ہوا لیکن جب کوئی بادشاہ تخت نشین ہونے کے بعد نالائق ثابت ہوا تو فوراً مسلمان سرداروں نے اُسکو سلطنت سے محروم کر کے دوسرے کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا اور اس طرح کسی نالائق سلطان کو تادیر حکمرانی و فرمانروائی کی مہلت نہیں مل سکی۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے کہ غلاموں کے عہد سلطنت کی بے اختیار تعریف کرنی پڑتی ہے۔

اِس عہد کی خوبیوں میں سے ایک یہ خوبی بھی قابلِ تذکرہ ہے کہ سلطنت کو کسی خاندان کے ساتھ مخصوص و مختص نہیں سمجھا گیا۔ شہاب الدین غوری کے بعد اُس کا غلام قطب الدین ایبک ہندوستان کا مطلق العنان بادشاہ بنا، قطب الدین ایبک کے بعد جب اُسکی اولاد کو نالائق دیکھا تو شمس الدین التمش کو سب نے بخوشی بادشاہ تسلیم کرلیا جو قطب الدین ایبک کا غلام تھا سلطان التمش کی اولاد جب نالائق ثابت ہوئی تو اُسکے غلام بلبن کو جو ایک لائق شخص تھا بادشاہ بنایا، جب بلبن کی اولاد کو نالائق دیکھا تو سلطنت خلجی قوم کے ایک معمر شخص کو سپرد ہوئی۔

ہندوستان پر ایک نامعلوم زمانے سے شمالی ومغربی ملکوں میں رہنے والی قومیں مسلسل حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔ مسلمانوں نے پنجاب پر قبضہ کرلیا تو اُسکے بعد سلاجقہ اور ترکان غز کے دو زبردست سیلاب وسط ایشیا سے اُٹھے جن کا رُخ حسب دستور قدیم یقیناً ہندوستان ہی کی طرف ہوتا اور یہ لوگ یقیناً سابقہ حملہ آوروں سے زیادہ طاقتور ہونے کے سبب تمام ہندوستان کو خاک سیاہ بنادیتے، لیکن سلطان محمود غزنوی کی اولاد نے سدِ راہ ہوکر اگرچہ اپنے آپ کو تباہ کرلیا مگر ان وحشیوں کو ہندوستان کی طرف قدم نہیں بڑھانے دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا رُخ ایران وعراق وایشیائے کوچک کی طرف پھر گیا اور اُن اسلامی ملکوں کو ان سے نقصان پہونچا لیکن مسلمانوں نے بہت ہی جلد ان کو اپنے رنگ میں رنگین کرکے مہذب و شایستہ اور خادم اسلام و پاسبان انسانیت بنالیا اور دوسری طرف شمالی ہندوستان کے وسیع میدانوں میں تہذیب و انسانیت بکھیر دیا حالانکہ اس ملک میں ایک مضبوط سلطنت قائم کرلی۔ یہ شمالی ہند کی اسلامی سلطنت جو غلاموں کے خاندان کی سلطنت کے نام سے مشہور ہے ابھی قائم ہی ہوئی تھی کہ تیسرا عظیم الشان سیلاب چین کے پہاڑوں سے اُٹھا۔ اُس کا رُخ بھی لازماً ہندوستان کی طرف ہوتا لیکن شمالی ہند کی سلطنت نے سدِ سکندر بنکر اسکو روکا۔ بار بار اسکی موجیں آآکر ہندوستان کو برباد کرنے پر آمادہ تھیں مگر اُن کو ملتان ولاہور سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہونا پڑا۔ یہ عظیم الشان اور برباد کن انسانیت سیلاب چنگیزی مغلوں کا سیلاب تھا جن کا کام نسل انسانی کے برباد کرنے اور خون کے دریا بہانے کے سوا اور کچھ نہ تھا اگر غلاموں کی اسلامی سلطنت مغلوں کو ہندوستان میں داخل ہونے سے نہ روکتی تو یقیناً ہندوستان کی موجودہ تینتیس کروڑ آبادی کے اکثر آبا واجداد اب سے سات سو سال پہلے ہی دنیا سے تخم سوختہ ہوچکے ہوتے۔ غلام سلاطین کے اِس احسان عظیم میں ہر ایک ہندی انسان کا ذرہ ذرہ دبا ہوا ہے کہ اُنھوں نے مغلوں کو پنجاب وملتان کی جانب بھی اور بنگال وآسام کی جانب بھی ہندوستان کے اندر قدم رکھنے سے بار بار روکا اور اس ملک میں آزادی سے قتل وغارت کے ہنگامے برپا کرنے کا موقع نہیں دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان وحشی مغلوں نے ایران وعراق وشام وآذربائیجان وغیرہ اسلامی ممالک کو

برباد کرکے خلافت عباسیہ کا چراغ بھی بغداد میں گل کر دیا اور لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمانوں کو خاک و خون میں ملا کر وسط ایشیا اور وسط یورپ تک کی دنیا کو تہ و بالا کر ڈالا۔ دنیا میں آجتک چنگیزی مغلوں کی مانند انسانوں کے قتل کرنے اور آبادیوں کو خاک سیاہ بنانے کی شوقین اور طاقتور قوم ظاہر نہیں ہوئی۔ اگر سلطان شمس الدین التمش چنگیز خاں کو ہندوستان میں داخل ہونے کا موقع دیدیتا اور مغل اپنی ہوس خونریزی ہندوستان میں پوری کرسکتے تو اُن کو ہرگز ممالک اسلامیہ کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ اور آج دنیا میں رام و کرشن کے نام کی سمرن جپنے والا ایک متنفس بھی موجود نہ ملتا۔ مغولان چنگیزی کی نسلوں سے ہندوستان کی بستیاں پُر ہوتیں اور چنگیز خاں کی مورتیں ایک سب سے بڑے اوتار کی مورتوں کی مانند ہندوستان کے مندروں میں براجمان نظر آتیں۔ مغولان چنگیزی نے تمام متمدن دنیا کو غارت و برباد کردیا اور اُن کی چیرہ دستی نے یورپ و ایشیا کو پتے کی طرح لرزا دیا۔ مغولان چنگیزی کا سیلاب مسلمانوں کے لیے ایک تازیانہ غفلت تھا کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں اور تعلیمات اسلامی سے دور و مہجور ہونیکی سزائیں پاکر پھر اعمال اسلامی کی پابندی میں اپنی نجات و فلاح تلاش کریں کیونکہ انھیں مغولان چنگیزی کو جن سے ساری دنیا لرزاں و ترساں تھی مسلمانوں کے غلاموں سے جو احکام اسلام کے پابند تھے جب مصر و ہندوستان میں واسطہ پڑا تو اُنھوں نے دونوں جگہ بار بار نہایت ذلت کے ساتھ شکستیں کھائیں تاریخ کا یہ ایک نہایت عبرت آموز سبق ہے اگر کوئی اہل دل چاہے تو اس پر بار بار غور کرے اور لطف اٹھائے۔

مغولان چنگیزی کے ظلم و ستم اور قتل و غارت کے شوقین ہونے کا راجہ شیو پرشاد صاحب ستارۂ ہند نے بھی صاف لفظوں میں اقرار کیا ہے وہ ایک جگہ اپنی تاریخ میں جلال الدین خوارزمی کے دریائے اٹک کے وار آنے اور اُسکے تعاقب میں مغلوں کی ایک فوج کے اس طرف پہونچنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"وہ (جلال الدین خوارزمی) سندھ سے ایران کی طرف روانہ ہوا تب اُن مغلوں کی فوج بھی اُلٹی پھر گئی لیکن نمونہ اپنے ظلم کا اتنے ہی عرصے میں دکھا گئی کہ دس ہزار ہندو غلام بنانے کے واسطے قید کرکے لے گئے اور جب اُن کے لشکر میں رسد کی قلت ہوئی تو بے تکلف ان سب غلاموں کے سر کاٹ ڈالے۔ چنگیز خاں .... اور اُس کے ساتھ کے مغل لوگ مسلمان نہ تھے بلکہ ایک قسم کے بودھ کا دین رکھتے اور مورتوں کو پوجتے تھے"

سر ڈی۔ میکنزی والس یورپی مصنف اپنی کتاب تاریخ روس میں لکھتا ہے کہ

"ملک روس پر فرقہ پلانشی صاحب اقتدار تھا اس فرقے نے ۱۰۶۶ء میں مستیسلاف حاکم گلیشیا کے پاس سفیر بھیجا کہ ہمارے ملک پر ایک ستم پیشہ اور قوی دشمن یعنے تاتار نے تاخت کی ہے جنوب سے بھی اور شمال سے بھی

یہ لوگ دیکھنے میں عجیب نظر آتے ہیں۔ گندم رنگ، کوچک چشم، موٹے موٹے ہونٹ، چوڑے چوڑے شانے کالے کالے بال .... ان سفیروں نے یہ بھی کہا کہ آج ہمارے ملک پر حملہ ہے کل تمہارے ملک پر ہوگا۔ مستسلاف جانتا تھا کہ پلانستی ہمارے ملک پر حملہ کیا کرتے ہیں لیکن اس جدید دشمن سے چونکہ ہم کو اور اُن کو مساوی اندیشہ ہے، لہٰذا مدد پر آمادہ ہوگیا اور گرد و نواح کے امیروں کو بھی ہمراہ لیا۔ مقابلہ ہونے پر سب نے تاتاریوں سے شکست کھائی۔ تاتاریوں نے پولینڈ ہنگری۔ سرویا تک کے ممالک کو برباد و غارت کرکے دریائے والگا کے جنوبی ملکوں میں آکر روس کے اُمراء کو پیغام بھیجا کہ ہمارے خان کی خدمت میں آکر حاضری دو۔ روسیوں کو اول معلوم نہ تھا کہ یہ نوی دشمن کون ہے کہاں سے یہ لوگ آئے ہیں اور کیا مذہب رکھتے ہیں نہ صرف کشور روس میں اُنھوں نے استیلا پایا بلکہ اُن کی وجہ سے مغربی یورپ اور انگلستان میں خوف سے زلزلہ پیدا ہو گیا۔ یہ گروہ جو تمام براعظم ایشیا میں پھیلا ہوا تھا اور جو وسط یورپ تک پہونچ گیا تھا درحقیقت چین کے شمالی پہاڑ و تمن دریائے آمور کے منبع کے قریب رہتا تھا بارہویں صدی عیسوی (چھٹی صدی ہجری) کے اختتام پر اُن میں ایک آدمی پیدا ہوا جس کا قد شل دیوکے تھا اور بہادری میں مشہور تھا، یہ دیوہیکل آدمی چنگیز خاں تھا۔ گرد و نواح کی قوموں کو شکست دیکر اپنے لشکر میں داخل کرکے شمالی چین کے بڑے ملک پر قابض ہو گیا اور اپنا ایک سردار روس کی فتح کے لیے نامزد کرکے خود جانب مغرب روانہ ہوا، چنگیز خاں نہ صرف ظالم و سفاک تھا بلکہ ایک عظیم الشان ناظم و مقنن بھی تھا، چنگیز خاں کے پوتوں میں سے ایک نے سرحد روس پر ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی کہ عام طور پر اُسکا نام جماعت طلائی مشہور تھا۔ والگا کی جانب جنوب ایک دارالسلطنت آباد کیا جس کا نام سرائی تھا اب وہ آباد نہیں بلکہ ویران ہے۔"

جس زمانے میں مغلوں کی خون آشامی کے سبب تمام دنیا میں قتل و غارت کے ہنگامے برپا اور خون کے نوارون کے ساتھ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر غلام سلاطین کی ہند و رعایا امن و امان کے ساتھ انند کے ستار بجا رہی تھی اور سلطان غیاث الدین بلبن کا چچازاد بھائی شیر خاں اور سلطان کا بیٹا خان شہید ہندوستان کی مغربی سرحد پر مغلوں کے حملوں کو روکنے اور بار بار اُن کو شکست دے کر بھگا دینے میں مصروف تھے۔ اس طوفانی زمانے میں غلاموں نے جس طرح ہندوستان میں امن و امان قائم رکھا اُس زمانے کی دنیا میں اُسکی کوئی نظیر تلاش نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس کے قریب تباہ شدہ فرماں رواؤں نے براعظم ایشیا کے مختلف ملکوں سے فرار ہو کر ہندوستان میں پناہ لی تھی اس جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے سلاجقہ اور ترکان غز کو بالآخر مسلمان بنا کر مہذب و شائستہ بنا لیا تھا، اسی طرح وہ مغولان چنگیزی کو بھی مسلمان بنا کر مہذب اور شفیق علی خلق اللہ بنا لینے میں کامیاب

ہوسے اور وہی مغول جو انسانوں کا خون بہانے میں لذت محسوس کرتے تھے مسلمان بنکر نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانوں کے خادم اور شفیق بن گئے۔

غلام خاندان کے عہد حکومت میں نظام سلطنت بہت ہی سادہ اور راحت رساں تھا، صرف بڑے بڑے راجاؤں سے جو موجودہ زمانے کے صوبوں اور کمشنریوں پر حکمران تھے حکومتیں چھن گئی تھیں مگر ان بڑے راجاؤں کے ماتحت جو چھوٹے چھوٹے رانا اور رائے ضلعوں اور پرگنوں پر حکمران تھے اُن کو بدستور ادائے خراج کے اقرار پر قائم رکھا گیا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں مسلمان صوبہ دار قاضی اور سپہ سالار مامور تھے، لیکن چھوٹے چھوٹے قصبات یا دیہات میں قاضیوں اور مفتیوں کی مطلق ضرورت نہ تھی کیونکہ دیہات وقصبات میں تمام تر آبادی ہندوؤں ہی کی تھی۔ اور وہ حسب دستور اپنے ہندو راجاؤں۔ راناؤں اور رایوں کے زیر حکومت زندگی بسر کرتے تھے۔ جب کبھی کوئی سلطان یا خان یا امیر یا سپہ سالار ان چھوٹے قصبوں یا گاؤں کے قریب ہو کر گذرتا اور اُسکے لشکر کی آمد کا حال معلوم ہوتا تو ان مقامات کے ہندو سردار اُسکی ملاقات کو آتے اور تحف وہدایا پیش کرکے خلعت وانعام پاتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ تمام شمالی ہند میں چھوٹی چھوٹی با اختیار ہندو ریاستیں اسلامی شہنشاہی کے ماتحت موجود تھیں۔ اسلامی شہنشاہی کا یہ اثر تھا کہ ہندو ریاستوں کی حالت اُس حالت کے مقابلے میں جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے تھی بدرجہا بہتر تھی اور ہندو رعایا بڑی تیز رفتاری کے ساتھ جہالت وپست خیالی سے نکلکر تہذیب وشائستگی سے ہمکنار ہوتی جاتی تھی۔ انھیں چھوٹے چھوٹے ہندو رئیسوں میں بعض اوقات بغاوت وسرکشی کا مادہ پیدا ہوکر سلطنت کے لیے مشکلات پیدا ہو جاتی تھیں پنجاب کے ہندو راجا بعض اوقات مغلوں سے سازباز کرکے اُن کے حملوں کو کامیاب بنانے کا موجب ہو جاتے تھے چنانچہ سنہ ۶۴۳ھ میں جو حملہ مغلوں نے پنجاب پر کیا وہ ضلع جہلم کے ایک ہندو رانا کی سازش سے کیا تھا اور اگلے سال اُسکو اس جرم بغاوت کی سزا بھگتنی پڑی تھی سنہ ۶۴۹ھ میں کالنجر کے راجا جاہر اجاچ یا جاہر دیو نے علامات سرکشی ظاہر کیے اور اُسکو سزا دی گئی۔ اسی طرح سنہ ۶۵۰ھ میں رنتھمبور کے راجا باہر دیو نے اردگرد کے دوسرے راناؤں کو شریک کرکے سرکشی پر کمر باندھی اور اسلامی لشکر نے اُسکی گوشمالی کرکے پھر اُس سے اقرار اطاعت لیا۔ جب قتلغ خاں صوبہ دار اودھ باغی ہوا تو ملک اودھ کے بہت سے ہندو سردار اُسکے لشکر میں شامل ہوگئے جب وہاں اُسکی دال نہ گلی اور شاہی فوج نے اُسکو ہزیمتیں دیں تو وہ بھاگ کر کوہستان سرمور میں چلا آیا۔ یہاں کے راجہ نے اُسکی خوب خاطر مدارات کی سنہ ۶۵۸ھ میں منکا نام ہندو رلجا نے نشدہ میں سرکشی پر کمر باندھ کر کوہ ہمالہ تک کے تمام ہندو سرداروں کو شریک کار بنا لیا اور اسلامی لشکر کو اس طرف متوجہ ہوکر اُسکی سرکوبی کرنی پڑی سلطان بلبن کے

عہد حکومت میں میوات کے علاقے میں ہندوؤں نے بدامنی پیدا کی اور اس بدامنی کو شاہی لشکر نے رفع کیا۔ اسی طرح کمپل و بھوجپور کے ہندوؤں کو راہ راست پر لایا گیا۔ بندیل کھنڈ میں اکثر ہندو راجپوتوں نے بے راہ روی اختیار کی اور ان کو سیدھا کیا گیا۔ سلطان بلبن کی فوج جب بنگالے کے مسلمان باغی صوبہ دار سے شکست کھا کر واپس ہوئی تو انھیں ہندو رئیسوں نے راستے میں اسکو پریشان کیا۔ سلطان بلبن جب بنگالے سے کامیاب واپس ہوا تو لکھنوتی سے دہلی تک برابر ہر منزل پر ہندو راجے اور رانا آ آ کر بادشاہ کو سلام کرتے مبارکباد دیتے اور خلعت و انعام سے سرخرو ہو کر اپنے گھروں کو واپس جاتے تھے جب سلطان بلبن نے بنگالے سے دہلی واپس آ کر دربار کیا تو شہر دہلی کے ہندوؤں نے دربار میں حاضر ہو کر سلطان کو مبارک باد دی اور خلعت و انعام پایا۔ سلطان بلبن کے اکثر امیروں کا روپیہ سود کے ذریعہ انھیں ہندو ساہوکاروں کے گھروں میں چلا جاتا تھا۔ ملتان کے ہندوؤں نے دہلی میں آ کر ساہوکارے کی دوکانیں کھول لی تھیں۔

جب سلطان معزالدین کیقباد دہلی سے ملک اودھ کی طرف باپ کی ملاقات کو روانہ ہوا ہے تو انھیں ہندو راجاؤں اور راناؤں نے ہر ایک منزل پر حاضر ہو کر بادشاہ کی خدمت میں اُسکے ذوق کے موافق گویے، سازندے اور پاتریں پیش کیں اور انعام و اکرام سے مالامال ہوئے۔ میرٹھ اور کول (علیگڈھ) کے کلالوں نے شراب کا نذرانہ پیش کر کے اس شرابی سلطان سے انعامات حاصل کیے۔ ان تمام واقعات کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ جس طرح آریوں نے فرماں روا ہو کر غیر آریوں کا قتل عام کیا تھا اور بقیۃ السیف کو انسانیت کے مرتبے سے گرا کر اور چوپایوں کا ہم مرتبہ بنا کر اپنی خدمت گذاری کے لیے محفوظ رکھا تھا، غلام سلاطین اور ہندوستان کے اولین فرماں روایان اسلام نے ہندوؤں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا بلکہ اُن کا سلوک ہندوؤں کے ساتھ اس قدر سیر چشمی اور کشادہ دلی کا تھا کہ حقوق انسانیت کے ہر ایک شعبے میں وہ اس حالت سے بہتر و فائق حالت میں تھے جو ان مسلمانوں کی آمد سے پیشتر حاصل تھی۔ قسم کھانے کو کوئی ایک بھی واقعہ ایسا نہیں بتایا جا سکتا کہ اسلامی لشکر نے کسی ہندو آبادی کو محض اسلیے تاراج کیا ہو کہ وہ ہندو کیوں ہے۔ اگر مسلمان ایسی زیادتی سے کام لیتے تو یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ آج ہندوستان کی آبادی میں صرف تہائی یا چوتھائی مسلمان اور باقی ہندو ہوتے۔

سلاطین خلجی

غلام سلاطین اگرچہ سب ایک ہی خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھے لیکن سب کے سب تاتاری النسل اور غلام یا غلاموں کے بیٹے تھے اس لیے ان سب کو ایک ہی خاندان سمجھا گیا ہے ان کے بعد خلجیوں کی حکومت شروع ہوئی۔ خلجی قبیلہ غور و ہرات کے علاقے میں قدیم سے آباد تھا لہٰذا ان لوگوں کو افغانی ہونے کے سبب پٹھانوں میں شمار کیا گیا ہے۔ بعض مؤرخوں نے تو ان کو پٹھانوں کی

تو ہم غلزئی قرار دیا ہے اُنکے نزدیک خلجی اور غلزئی ایک ہی چیز ہے سلطان شہاب الدین غوری کے آخر عہد حکومت میں اسی قبیلے کے ایک شخص بختیار خلجی نے بنگالہ کو فتح کیا تھا جسکا ذکر اوپر آچکا ہے اِس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خلجی قبیلے کے لوگ سلطان شہاب الدین اور سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے سے ہندوستان میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کی بہادری وصف شکنی کے تاتاری سردار بھی قائل تھے۔ اِس خاندان میں صرف تینتیس ۳۳ سال سلطنت رہی ۷۲۱ھ میں اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ خاندان ہندوستان کی خودمختار اسلامی سلطنت کا دوسرا فرمانروا خاندان تھا اسی خاندان کے عہد حکومت میں ملک دکن سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوا اور سلطنت اسلامیہ کی حدود کوہ ہمالہ سے راس کماری تک اور سندھ و گجرات سے بنگال و اڑیسہ تک وسیع ہو گئیں۔ ملک دکن کی فتح اور اس خاندان کے تذکرے پر یہ چوتھا باب ختم ہو جائے گا۔ جسکے ساتھ ہی مسلمانوں کی جدید فتوحات اور ابتدائی حملہ آوری کے اسباب تلاش کرنیکی ضرورت باقی نہ رہیگی آئندہ صرف اِس موضوع پر زیادہ تر روشنی ڈالی جائیگی کہ مسلمان فرمانرواؤں کا اپنی ہندو رعایا کیساتھ کس قسم کا سلوک تھا اور ہندو رعایا نے اپنے مسلمان فرمانرواؤں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا۔ اِس جگہ یہ بھی بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی ۷۵۸ھ میں تصنیف ہوئی۔ ضیاء برنی نے ۶۵۸ھ سے ۷۵۸ھ تک پورے سو برس کے واقعات اپنی تاریخ میں لکھے ہیں۔ اُس کا باپ اور چچا اور دوسرے رشتہ دار سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر مسلسل مامور رہے ہیں۔ اُس نے خاندان خلجی کے تینتیس ۳۳ سالہ واقعات کو دہلی میں رہ کر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لہذا چوتھے باب کے اس نصف آخر میں تاریخ فیروز شاہی کی روایت کو میں دوسری تاریخوں پر ترجیح دونگا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری تاریخوں سے بے نیاز ہونگا۔

سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی

۶۸۸ھ اور بروایت دیگر ۶۸۹ھ میں سلطان جلال الدین خلجی نے ستر سال کی عمر میں تخت سلطنت پر قدم رکھا اِس سلطان نے سلطنت سے پہلے برسوں مغلوں کے مقابلے میں شمشیر زنی کا حق ادا کر کے شہرت و ناموری حاصل کی تھی بڑا بہادر بڑا پاک باطن اور صاف طینت شخص تھا۔ رقیق القلب اور خدا ترس بھی انتہا کا تھا۔ مغلوں سے جب میدان جنگ میں لڑتا تھا تو کشتوں کے پشتے لگا دیتا تھا لیکن ویسے کسی شخص کے پھوڑے کو جراح نشگاف دیتا تھا تو اس نظارے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رحم و عفو و درگذر کا مادہ اُسکے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اپنے دشمنوں پر ہمیشہ احسان کر کے اُن کو اپنا دوست بنا لیتا اور خطا کاروں کو ہمیشہ معاف ہی کر دیتا تھا۔ قیامت کے دن کو یاد رکھتا اور ہر ایک خلاف شرع کام سے بچتا تھا مسجد میں عام نمازیوں کی طرح جا کر نماز باجماعت ادا کرتا اور اکثر خوف خدا سے چشم پُر آب رہتا تھا۔ اُس نے تخت نشین ہوتے ہی لوگوں پر

اسقدر احسانات کیے کہ سب اُسکے ہواخواہ بن گئے، اُس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطان بلبن کے بھتیجے
ملک چھجو المخاطب بہ کشلیخاں کو کڑہ کی صوبہ داری پر مامور کرکے بھیجا سلطان بلبن کے بیٹے ناصر الدین بغرا خانکو
لکھنوتی یعنی بنگال کی حکومت پر برقرار رہنے دیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد ایک بیٹی کی شادی اپنے بھتیجے
علاءالدین خلجی سے اور دوسری بیٹی کی شادی دوسرے بھتیجے الماس بیگ سے کی یہ دونوں بھائی سلطان
جلال الدین خلجی کے بھائی شہاب الدین مسعود خلجی کے بیٹے تھے۔ شہاب الدین خلجی کے فوت ہونے کے بعد سلطان
جلال الدین ہی نے ان کو اپنے بیٹوں کی طرح پرورش کیا تھا۔ سلطان کا ہمشیر زادہ احمد حبیب خلجی بڑا عقلمند اور
دور اندیش شخص تھا اُس کو سلطان نے وزارت و ندیمی کا رتبہ عطا کیا تھا۔ عہد بلبنی کے معززین کو اُن کے
مرتبوں پر قائم رکھا تھا۔ سلطان کے تین بیٹے تھے ان میں منجھلا بیٹا ارکلیخان بڑا شہ زور بہادر اور اعلیٰ
درجے کا سپہ سالار تھا۔ سلطان بلبن کا مولا زادہ امیر علی المخاطب بہ حاتم خاں اودھ کا صوبہ دار تھا۔ کڑہ اور
اودھ کے علاقے کے ہندو رؤسا پہلے ہی سے زیادہ چالاک اور وہاں کے مسلمان صوبہ داروں کے دربار
میں زیادہ دخیل تھے۔ سلطان بلبن اور سلطان معز الدین کیقباد جب اس نواح میں آئے تو ان ہندو
رئیسوں، راجاؤں اور مقدموں نے حاضر ہو ہو کر نذرانے اور تحفے پیش کیے اور خلعت پائے اس لیے اور بھی
ان کی عزت و رسوخ نے صوبہ داروں کے دربار میں ترقی کرلی تھی اب جبکہ سلطنت خاندان بلبنی سے نکل کر
ایک دوسرے خاندان میں پہونچی اور ان صوبوں میں سلطان بلبن کے متعلقین صوبہ دار مقرر ہوئے تو ان
ہندوؤں نے انکے درباروں میں قدیمانہ خدمت گذاری و اظہار وفاداری کے ساتھ زیادہ رسوخ حاصل کیا
اور ملک چھجو المخاطب بہ کشلیخاں کی مصاحبت میں داخل ہو کر اُسکو بار بار توجہ دلائی کہ سلطنت اور تخت حکومت کے
حقیقی مالک تو آپ ہیں خلجیوں کا کیا حق ہے کہ وہ ہندوستان کی شہنشاہی حاصل کریں اور آپ کو اپنا نوکر
سمجھیں۔ یہ باتیں بالطبع ملک چھجو کو اچھی معلوم ہوئیں کسی دوسرے مسلمان مصاحب کو ان کی تردید کی
جرأت نہیں ہوسکتی تھیں آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ملک چھجو اور حاتم خاں صوبہ دار اودھ دونوں متفق ہوگئے اور
ملک چھجو نے کڑہ میں تاج شاہی اپنے سر پر رکھ کر سلطان مغیث الدین اپنا لقب تجویز کیا۔ انھیں ہندوؤں کے
ذریعے جو وفاداری و بہادری کی لاف زنی کرتے تھے ہندوؤں کی فوجیں بھرتی کیں تمام ملک اودھ اور
علاقہ کڑہ میں سلطان مغیث الدین کے نام کا سکہ اور خطبہ جاری ہوا۔ سنہ ٦٨٩ھ میں ملک چھجو یعنی سلطان
مغیث الدین ہندوؤں کی لاتعداد فوج لیے ہوئے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ یہ کیفیت سُن کر سلطان
جلال الدین بھی اپنی انتخابی فوج لے کر دہلی سے روانہ ہوا۔ اپنے بیٹے ارکلیخان کو ایک دستۂ فوج
کے ساتھ بطور ہراول سلطانی لشکر سے دس بارہ کوس آگے چلنے کا حکم دیا۔ بدایوں سے آگے بڑھ کر ارکلیخان کا

ملک چھجو کے ہندو لشکر سے مقابلہ ہوا تو ان کے مقابلے سے پہلے ہندو پائک اور راوت جن کو اپنی بہادری پر بڑا ناز تھا ملک چھجو کے دربار میں پان کے بیڑے اٹھا اٹھا کر دعویٰ کر چکے تھے کہ ہم سلطان جلال الدین کو گرفتار کر کے آپکے سامنے لائیں گے۔ جب خلجی لشکر سے مقابلہ ہوا تو ان لوگوں نے خوب شور مچایا اور سلطان مغیث الدین کی جے کے نعرے لگائے۔ مگر ارکلی خاں کے پہلے ہی حملے کی تاب نہ لا کر اس طرح فرار ہوئے جیسے شیر کے حملے سے بکریاں بھاگتی ہیں۔ چند مسلمان سردار اور تھوڑی سی سلطانی فوج نے جو ملک چھجو کے ہمراہ تھی تھوڑی دیر ہاتھ پاؤں مارے۔ کچھ قتل اور کچھ گرفتار ہو گئے۔ ملک چھجو میدان جنگ سے نکل کر قریب کے کسی گاؤں میں پناہ گزین ہوا وہاں کے ہندو مقدم نے اسکو گرفتار کر کے ارکلی خاں کے ذریعہ سلطان جلال الدین کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔ اس لڑائی کا حال لکھتے ہوئے ضیاء الدین برنی رقم طراز ہے کہ

"ارکلی خاں با لشکر مقدمہ آب کالاب گذرہ عبور کردند از آن طرف لشکر ملک چھجو برآمد در لشکر ملک چھجو راوت و پایک ہندوستانی مانند مور و ملخ گرد آمدہ بودند راوتان و پایکان معروف از پیش ملک چھجو بیڑہ تنبول برگرفتہ بودند و دعوی کردہ کہ بر چتر سلطان جلال الدین خواہیم زد چون لشکر مقدمہ سلطان جلال الدین بر لشکر ہندوان تیر اندازی کردند ہندوان آب گرفتہ سست شدند و ہیچ دماغ خوار کہ شورے و شنیعے میکردند و دست و پائے گم کردند و شیران و شیر افگنان لشکر مقدمہ سلطان جلال الدین تیغ ہا بنام کشیدہ بر لشکر ملک چھجو حملہ کردند ملک چھجو و امرائے او و ہمہ ہندوان کہ در صف محاربہ مقابل لشکر مقدمہ ایستادہ کردہ بود شکستہ و منہزم گشتند و پشت دادند"

سلطان جلال الدین نے ملک چھجو کو ملتان بھیجدیا کہ وہاں نظر بند رہے اور اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائے ملک احمد حبیب نے کہا کہ آپ نے اس لڑائی کے تمام اسیروں کو آزاد کر دیا اور کسی کو بھی قتل نہ کیا اس سے رعب شاہی میں فرق آئیگا۔ سلطان نے جوابدیا کہ

"من بعد ہفتاد سال در مسلمانی پیر شدہ از دین اعراض نمی توانم کرد و خود را جبارے و قہارے نمی توانم ساخت"

اس فتح کے بعد سلطان بدایوں سے دہلی کی جانب آیا اور اپنے بھتیجے اور داماد علاء الدین کو ملک چھجو کی جگہ کڑہ کا حاکم بنا کر کڑہ کی جانب رخصت کیا علاء الدین اپنی بیوی اور ساس سے ناراض رہتا تھا اور اپنی ساس یعنی سلطان کی بیوی سے تو بہت ہی خائف تھا اسلیئے اُس نے دار السلطنت سے دور چلے جانے کو بہت غنیمت سمجھا۔ یہ خانگی جھگڑا اسقدر طول کھینچ چکا تھا کہ علاء الدین کو ہمہ اوقات اپنی جان کا خطرہ رہتا تھا کہ اسکی خوشدامن کہیں اُسکو قتل نہ کرا دے سلطان جلال الدین کو اسکی پوری اطلاع نہ تھی۔ بہر حال

علاءالدین دہلی کی سکونت سے برداشتہ خاطر اور اپنی ساس سے جو ملکہ جہاں تھی سخت ناراض و خائف
ضرور تھا۔ کرہ میں جب پہونچا تو وہی ہندو سردار جو ملک چھجو کو گھیرے رہتے تھے اور جو میدان سے بھاگ کر
یا قید سے آزاد ہو کر آگئے تھے اسکے گرد جمع ہو گئے ملک چھجو کی لڑائی اور شکست کے حالات بیان
کرتے ہوئے انھوں نے علاءالدین کو یقین دلا دیا کہ ملک چھجو کے پاس اگر خزانہ ہوتا اور روپیہ کی کمی نہ ہوتی
تو اسکو ہرگز شکست نہ ہوتی یہ معلوم کرنے کے بعد کہ علاءالدین اپنی ساس اور بیوی سے ناراض ہے اور
سلطان جلال الدین سے مطمئن نہیں ہے ان لوگوں نے اور بھی آزادی کے ساتھ اس قسم کی باتیں کہنی شروع
کیں کہ کرڑہ کے لشکر سے دہلی کا فتح کرنا ممکن ہے اور پہلے ہی سال میں اسکو بغاوت پر آمادہ کر کے اسکے
رازدار بن گئے۔ ضیاء برنی کہتا ہے کہ

"ہمدراں سال کہ علاءالدین مقطع کرڑہ شد و آنجا رفت ہمہ کارداران و مقربان ملک چھجو کہ مایۂ آں
فتنہ شدہ بودند و سلطان جلال الدین ایشاں را آزاد کردہ چاکر علاءالدین شدند وہم در سال اول
آں بلغاکیاں و باغیاں مشطتان در دماغ سلطان علاءالدین رساندند کہ در کرڑہ لشکر بسیار و مستعد
و مرتب می تواں کرد و ممکن ہست کہ از کرڑہ دہلی بدست آید زری باید کہ اگر بر ملک چھجو زری بودے ملک دہلی
بدست او آمدے اگر از جائے زر فراخ دست آید ملک دہلی گرفتن آسان ہست"

۶۹۱ھ میں ہلاکو خاں مغل کے پوتے نے ہندوستان پر ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ سلطان
جلال الدین خلجی اسکے مقابلے کے لیے خود پنجاب پہونچا۔ سلمانوں کو مغلوں پر معمولی ابتدائی معرکوں میں فتح
حاصل ہوئی اور کئی مغل سردار گرفتار ہو کر سلطان جلال الدین کی خدمت میں پیش ہوئے۔ آخر ایسی صورت
پیدا ہوئی کہ طرفین کے سرداروں نے کوشش کر کے دونوں میں صلح کرادی۔ ہلاکو خاں کا پوتا خود سلطان
جلال الدین کی ملاقات کے لیے اسکے لشکر میں آیا سلطان نے اسکو بیٹا کہہ کر اور اس نے سلطان کو پدر بزرگوار
کہہ کر مخاطب کیا اس صلح کے بعد مغل واپس چلے گئے مگر چنگیز خان کا ایک پوتا جس کا نام الغو خاں تھا معہ چند بڑے
بڑے سرداروں کے سلطان جلال الدین کی خدمت میں رہ گیا۔ یہ مغل سلطان کے ہمراہ دہلی آئے یہاں آکر
وہ سب کے سب بخوشی مسلمان ہو گئے۔ سلطان نے الغو خاں نو مسلم کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کردی باقی
نو مسلم مغلوں نے اپنے بیوی بچوں کو یہیں بلوا لیا۔ سلطان نے ان سب کے روزینے مقرر کر دیے اور انھوں نے
کیلوکھڑی۔ غیاث پور اور اندرپرست میں اپنے مکانات بنا لیے ایک دو سال کے بعد ان میں سے بعض کو یہاں کی
آب و ہوا موافق نہ آئی اسلیے وہ اپنے ملک کو واپس چلے گئے باقی یہیں رہے اور یہاں کے مسلمانوں میں انکے
بیاہ شادی ہونے لگے۔ لوگ ان کو نو مسلم کے نام سے پکارتے تھے ۶۹۶ھ کے آخری ایام میں ہندوستان کے ہندوؤں نے

پھر زور پکڑا اور سلطان نے بلا توقف وہاں پہنچکر اُن کو سزا دی اور دہلی واپس آیا اسی سال جبکہ سلطان مندور گیا ہوا تھا علاء الدین حاکم کڑہ نے سلطان سے بھیلسہ پر فوج کشی کرنے کی اجازت لی سب سے پہلے بھیلسہ کو سلطان شمس الدین التمش نے فتح کیا تھا جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اب بھیلسہ میں ہندوؤں نے پھر فساد کا مواد جمع کر لیا تھا۔ علاء الدین کے مصاحبوں نے اُسکو بھیلسہ پر فوج کشی کرنیکی یہ کہکر ترغیب دی کہ وہاں سے بہت کچھ مال و دولت ملنے کی توقع ہے۔ علاء الدین بھیلسہ کو فتح کرکے وہاں کے بڑے بت کو جو کانسی کا بنا ہوا تھا اور جسکو شمس الدین التمش نے علی حالہ رہنے دیا تھا گاڑی پر لدوا کر دہلی لایا جسے دہلی کے بدایوں دروازہ کے سامنے زمین پر گاڑ دیا گیا۔ سلطان جلال الدین نے اِس مرتبہ علاء الدین کو کڑہ کی جانب رخصت کرتے ہوئے اودھ کا ملک بھی اُسی کی حکومت میں دیدیا۔ علاء الدین نے سلطان کو اپنے اوپر مہربان دیکھکر عرض کیا کہ چندیری کا علاقہ آجکل سلطان دہلی سے تقریباً بے تعلق اور آزاد ہوگیا ہے وہاں سرکشوں کا اجتماع ہو رہا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک دو سال تک کڑہ و اودھ کا خراج سلطان کی خدمت میں نہ بھیجوں اور اِس روپیہ کو جنگی طاقت کے بڑھانے میں صرف کرکے چندیری کے سرکشوں کو سزا دوں اور اِس علاقہ کو فتح کرکے حدود سلطنت میں شامل کرنے کے بعد کڑہ و اودھ کا تمام خراج بیباق کردوں۔ سلطان نے بخوشی اجازت دے دی۔ علاء الدین خوشی خوشی دہلی سے کڑہ میں آیا اور ملک دکن پر حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہوا۔

دکن پر پہلا حملہ

علاء الدین نے ۶۹۱ھ کے آخر یا ۶۹۲ھ کے ابتدا میں بھیلسہ پر اپنے مشیروں کے مشورہ سے حملہ کیا جن میں بلبنی اُمراء اور ہندو رئیس شامل تھے۔ بھیلسے کے اِس حملے اور اسکے بعد دیوگیر کے مشہور حملے کا عام طور پر ایک ہی سبب مشہور ہے یعنے ایصال زر۔ ایصال زر کی ضرورت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اِسلیے تھی کہ کڑہ کی فوج سے دہلی پر قبضہ کیا جائے اور یہ ضرورت خود علاء الدین کے ہندو مشیروں نے ظاہر کی تھی لیکن بھیلسہ اور دکن کے جانب حملہ آور ہونیکا ایک سبب اسکے علاوہ اور بھی تھا۔ جسکی طرف سے بعد کے واقعات پیش آمدہ نے مؤرخین کی توجہ کو ہٹا دیا اور وہی پہلا مذکورہ سبب ہر ایک کے زیر توجہ رہا۔ اِس دوسرے سبب کو سمجھنے کے لیے پہلے ضیاء برنی کے الفاظ بغور کرو۔

"سلطان علاء الدین از ملکہ جہاں کہ زن سلطان جلال الدین وخشوی ذخوشد امن، او بود آزار بسیار داشت واز مخالفت حرم خود کہ دختر سلطان جلال الدین بود بجان رسیدہ واز خوف ملکہ جہاں کہ بر سلطان جلال الدین بنہایت مستولی بود واز حشمت دولت سلطان جلال الدین نمی توانست کہ مخالفت بے نعانی

حرم خود بیش سلطان عرض دارد واز ترس فضیحت و رسوائی نمی توانست کہ کیفیت درماندگی خود پیش دیگرے کشف کند و دائما در اندوہ وکاہش می بود و در کڑہ با محرمان خود مشورت کردے کہ سر در جہاں گیرد و در دیارے دیگر سر بزند"

یعنے علاء الدین اپنی بیوی اور خوشدامن کے تسلط سے سخت عاجز تھا اور اپنی مجبوری وبے کسی کا حال شرم کی وجہ سے کسی سے نہین کہہ سکتا تھا۔ سلطان سے بھی شکایت نہیں کرسکتا تھا لہذا وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ کسی دوسرے ملک میں چلا جائے اور سلطان جلال الدین کی حدود حکومت سے باہر ہو جائے اُسکے لیے سب سے زیادہ آسان بنگالہ کا ناصر الدین بغرا خاں سے فتح کر لینا تھا مگر اُسکے مشیروں نے جو سلطنت خلجی کی بربادی کے خواہاں تھے اُسکو بنگالہ کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا اور اوّل بھیلسہ کی پھر دکن کی فتح کی ترغیب دی۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے۔

"ودرانجہ علاء الدین در بھیلسہ رفت خبر بسیارے مال و پیل دیوگیر در سمع او افتادہ رفتن دیوگیر از آنجا بیاں پرسید و در خاطر کرد کہ از کڑہ استعداد کند و سوار و پیادہ بسیار چاکر گیرد و سلطان جلال الدین را علم نہ دہد وجانب دیوگیر لشکر کشد"

بھیلسہ ہندؤں کا مرکزی مقام تھا بھیلسہ میں کسی مسلمان یا مسلمانوں کے کسی ہمدرد کا تو نام و نشان بھی نہ تھا۔ بھیلسہ پر چڑہائی کرنے والی فوج میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ علاء الدین کے مشیروں میں ہندؤں کی کثرت تھی۔ بھیلسہ میں پہونچکر دیوگیر کے مال ودولت کی کثرت کا حال اُسکو معلوم ہوتا ہے اس سے پہلے اُسکو دیوگیر کی نسبت کچھ معلوم نہیں ہوتا یعنے بھیلسہ والے ہی جن کو اُس نے مغلوب ومفتوح کیا ہے اُسکو دیوگیر کی دولت کا حال سناتے ہیں پھر انھیں بھیلسہ والوں سے وہ دیوگیر پر حملہ کرنے کا مشورہ کرتا ہے اور وہ اسکو دیوگیر پر حملہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں پھر انھیں بھیلسہ والوں کے بڑے بت کو گاڑی میں لاد کر دہلی کی طرف آتا ہے اور اُسکے ہندو مشیر اور ہندو سپاہی مطلق اظہار ناراضی نہیں کرتے۔ تاریخ فیروز شاہی کے مذکورہ بالا الفاظ اور واقعات کے سلسلہ پر غور نظر ڈالنے سے یہ بات بالکل بے پردہ ہو جاتی ہے کہ علاء الدین کو خود ہندؤں ہی نے کسی زبردست سازش کے ماتحت دکن پر حملہ کرنیکی ترغیب دی تھی اور یہ سازش جلد کامیاب اسلیے ہو گئی کہ علاء الدین اپنے چچا سلطان جلال الدین اور اُسکی بیوی کی طرف سے بددل اور خائف تھا۔ بھیلسے کے بت کو بھی مصلحتاً دہلی بھجایا گیا تھا جس سے سلطان جلال الدین کو دھوکہ دینے کے سوا اور کچھ مقصود نہ تھا سلطان جلال الدین کو اپنے اوپر مہربان دیکھ کر اور اودھ کا صوبہ بھی حاصل کر لینے کے بعد دونوں صوبوں کے خراج کو کئی سال تک ادا نہ کرنے کی اجازت حاصل کر لینا بھی اسی سازش کا ایک جزو تھا۔ علاء الدین،

بالکل جاہل اور بے پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اُسکی زندگی کے پورے اور مفصل حالات تاریخوں میں مطالعہ کرنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاموں کے کرنے میں کسی چیز کی پرواہ نہ کرتا تھا اپنی مرضی اور خواہش کے مقابلے میں
شریعت اسلام کی پابندی کو بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا لیکن اگر کوئی شخص جرات کرکے اس کو سمجھاتا اور کسی
کام کے کرنے یا نہ کرنے کی ترغیب دیتا تو وہ اس سمجھانے والے کی بات کو فوراً مان لیتا تھا۔ عام طور پر جاہل اور
بے پڑھے لکھے آدمیوں کی ایسی ہی حالت ہوا کرتی ہے۔ جس طرح ہندوستان کا مغل بادشاہ اکبر جاہل تھا
اسی طرح علاء الدین بھی جاہل تھا۔ اکبر سے جس طرح ایک نیا دین جاری کرنے کی حماقت سرزد ہوئی اسی طرح
علاء الدین بھی اس حماقت میں مبتلا ہوا تھا مگر اُسکے درباریوں نے اُسکو سنبھال لیا۔ غرض بھیلسے کی چڑھائی اور
کڑہ و اودھ کے صوبوں کے خراج کی ادائیگی کو معرض التوا میں ڈالکر چندیری پر حملہ آور ہونے کی تیاری کا
بہانہ ایک ایسی سازش کا نتیجہ تھا جو علاء الدین کے مشیروں نے ترتیب دی تھی اور علاء الدین اُس پر عملدرآمد
کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ تاریخ فرشتہ کے الفاظ بھی اس جگہ قابل غور ہیں وہ چندیری پر حملہ کرنے کی
اجازت حاصل کرنے کا ذکر کرکے لکھتا ہے کہ

"سلطان جلال الدین ملتمس او را مبذول داشت و خاطر الذہن او نہ انکہ غرض ملک علاء الدین ازین مقدمات
ہمہ آنست کہ خود را از تحکمات ملکہ جہان کہ کمال تسلط بر پادشاہ داشت و از مبتلا سے او چیزے نمی توانست
رسانید خلاص ساختہ ہمیشہ در سفر و در در انباشد بلکہ اگر اتفاق شود در ولایت دور دست جائے مضبوط پیدا
کردہ آنجا فرو کش کند"

ضیاء برنی بھی اسی کے قریب قریب الفاظ استعمال کرتا ہے کہ

"و میخواہد کہ از جفائے ملکہ جہان و حرم خود در دست رود و اقلیمے و دیارے فرو گیرد و ہمانجا باشد و بیش درین
جانب دہلی باز نیاید"

غرض سنہ ۶۹۴ھ میں علاء الدین نے چھ ہزار سواروں کے ساتھ کڑہ سے کوچ کیا اور اس بات کو شہرت دی کہ
چندیری پر حملہ کرنے جاتا ہوں۔ کڑہ اور اودھ کی حکومت پر اپنی جگہ ضیاء برنی کے چچا علاء الملک کو حاکم بنا گیا۔ اس
سفر میں کڑہ کے ہندوؤں کی بھی ایک جمعیت ہمراہ لی۔ نو سو میل کا سفر دو مہینے میں طے کرکے ملک مرہٹہ میں
داخل ہوا راستے میں کئی ہندو راجاؤں کے علاقوں میں ہو کر گذرنا پڑا مگر چونکہ اُس نے بڑی تیز رفتاری سے
اس سفر کو پہاڑوں اور جنگلوں میں ہو کر بخط مستقیم طے کیا اور کسی بستی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اسلیے اُس کو
کسی نے نہیں روکا اور اُس نے ریاست دیوگیر یعنی ملک مرہٹہ کی سرحد میں داخل ہو کر شہر ایلچپور پر قبضہ کیا۔
ایلچپور میں دو روز قیام کرنے کے بعد شہر دیوگیر (دولت آباد) کی جانب بڑھا۔ دیوگیر کا راجہ رام دیو شہر سے نکلکر

دیوگیر سے دو میل کے فاصلے پر صف آرا ہوا۔ علاء الدین نے پہلے ہی حملے میں رام دیو اور اُسکی فوج کو میدان سے بھگا دیا۔ شہر کے متصل قلعہ تھا اور شہر میں نہیں ٹھہر سکا میدان سے فرار ہو کر قلعہ میں پناہ گزین ہوا اور علاء الدین نے آگے بڑھ کر شہر پر قبضہ کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ رام دیو کا بڑا بیٹا کسی مندر کی زیارت کے لیے باہر گیا ہوا تھا اُس نے جب یہ سُنا کہ میرے باپ کو قلعہ میں محصور کر لیا گیا ہے تو وہ اردگرد کے راجاؤں کو معہ افواج ہمراہ لیکر آیا اور دیوگڈھ سے تین کوس کے فاصلے پر ٹھہر کر علاء الدین کے پاس پیغام بھیجا کہ قلعہ سے محاصرہ اُٹھا کر چلے جاؤ ورنہ ہم حملہ آور ہوتے ہیں۔ علاء الدین نے ایک ہزار فوج محاصرہ پر مامور رکھی اور باقی پانچ ہزار سپاہی لیکر رام دیو کے بیٹے پر حملہ آور ہوا اُسکو معہ ہمراہی راجاؤں کے شکست دیکر بھگا دیا اور قلعہ کے محاصرہ میں پہلے سے زیادہ شدت کام میں لایا آخر رام دیو نے قریباً ایک مہینہ محصور رہنے کے بعد مجبور اور بیرونی امداد سے مایوس ہو کر اپنے ایلچی علاء الدین کے پاس بھیجے اور چھ سو من سونا ایک ہزار من چاندی سات من موتی اور دو من جواہرات اور چار ہزار ریشمی کپڑے کے تھان دیکر صلح چاہی۔ علاء الدین نے اس مال و دولت کے علاوہ ایلچپور اور اُسکے متعلقہ علاقہ کا بھی مطالبہ کیا اور رام دیو نے اپنی ریاست کا یہ حصہ علاء الدین کو دینا منظور کر لیا۔ تاریخ فرشتہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"ایلچیان بعد الحاح و مبالغہ تمام قرار داد ندکہ رام دیو ششصد من طلاء و ہفت من مروارید و دو من جواہر از لعل و یاقوت و الماس و زمرد و یک ہزار من نقرہ و چہار ہزار جامہ ابریشمی و دیگر اجناس کہ تفصیلش موجب تطویل می گردد و عقل نیز از تصدیق آں ابا دارد داخل سرکار ملک علاء الدین ساختہ ایلچ پور را با توابع و مضافات آن متصرف متعلقہ ایں اولیاء دولت دیا در ضبط خود داشتہ ہر سالی محصول آں ولایت بہ کڑہ می فرستادہ باشد"

آٹھ سو یا نو سو کوس کے فاصلے پر تھوڑی سی فوج کے ساتھ مالوہ و تلنگانہ و خاندیس وغیرہ کے زبردست راجاؤں کے علاقوں کو طے کر کے دیوگیر پر حملہ کرنا اور ایلچپور کے علاقے کو اپنے قبضے میں لانا اور اپنا علاقہ قرار دینا دلیل اس بات کی ہے کہ مسلمان ہندوؤں کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے اور ہندو مسلمانوں کے مقابلے کی ہرگز تاب نہیں لا سکتے تھے نیز یہ کہ علاء الدین دہلی اور سلطنت دہلی سے دور و بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرنے کے لیے کوئی زاویہ تلاش کرنا چاہتا تھا اُس نے ایلچپور اور متعلقہ علاقہ کو اپنے قیام کے لیے رام دیو کی ریاست سے جدا کر لینا ضروری سمجھا تھا ہندو ریاستوں کے بیچ میں ایک چھوٹے سے علاقے کو اپنے لیے مخصوص کر لینا بھی اِس امر کی دلیل ہے کہ علاء الدین کو ہندوؤں سے کوئی خوف نہ تھا اور وہ ہندوؤں کے درمیان اپنی آزادی کو قائم رکھ کر ایلچپور میں رہنے کی جرأت رکھتا تھا۔ غرض سلطان جلال الدین اور اپنی ساس ملکۂ جہان سے دور و مجبور رہنے کی خواہش کو اس حملۂ دیوگیر سے ضرور تعلق ہے جسکی تائید فرشتہ کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ

"روایت مولف طبقات ناصری کہ معاصر ایشان بود چنین است کہ ملک علاء الدین از کڑہ برآمدراہے پیش گرفت و بشکار مشغول گشتہ براجہائے کہ سرراہ واقع شدہ بودند اصلا مزاحمت نرسانید و بعد ازوورود بایلچپور کہ از بلاد مشہور دکن است بیاسائید ناگاہ رسید چنیں آوازہ انداخت کہ ملک علاء الدین از امرائے پادشاہ دہلی ست بنابر بعضے از مقدمات ترک خدمت او کردہ میخواہد کہ پیش راجہ راج مندری کہ از حلیہ حاکک تلنگانہ است رفتہ ملازم گردد۔"

طبقات ناصری سے مراد اگر منہاج سراج کی طبقات ناصری ہے تو اُس میں یہ عبارت موجود نہیں ہے نہ ہو سکتی ہے کیونکہ منہاج سراج علاء الدین کے زمانہ میں موجود نہ تھا اس سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا ممکن ہے کہ طبقات ناصری کے کسی ضمیمے میں جو بعد میں لوگوں نے لکھے تھے یہ عبارت موجود ہو۔ اگر طبقات ناصری کو کتابت کی غلطی سمجھ کر فیروز شاہی قرار دیا جائے "تو تاریخ فیروز شاہی میں بھی یہ الفاظ موجود نہیں ہیں مگر یہ بات بالکل یقینی ہے کہ یہ کسی ایسے مورخ کا قول ہے جو علاء الدین کا معاصر تھا اگر ان الفاظ میں کوئی اعتماد اور وزن ہوتا تو فرشتہ اس طرح حوالہ کے ساتھ اپنی کتاب میں درج نہ کرتا۔ بہت زیادہ ممکن ہے کہ علاء الدین کڑہ سے یہی ارادہ لے کر روانہ ہوا ہو کہ راج مندری کے راجہ کا مہمان بنے اور ممکن ہے کہ راج مندری کے راجہ سے اُسکی خط و کتابت بھی اس معاملے میں پیشتر ہو چکی ہو۔ اگر اس قیاس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ اعتراض بھی مرتفع ہو جاتا ہے کہ راستے کے کسی راجہ نے کیوں علاء الدین کو نہیں ٹوکا اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ علاء الدین بہت ہی تھوڑی فوج یعنی صرف چھ ہزار آدمی لیکر دیوگیر پہنچا راستے میں جاتے ہوئے مالوہ۔ گونڈوانہ اور خاندیس کے راجاؤں نے کان نہیں ہلایا۔ دیوگیر کا محاصرہ قریباً ایک مہینے رہا اور ان بڑے بڑے راجاؤں میں سے کوئی مدد کو نہیں پہنچا علاء الدین دیوگیر سے مال و دولت لے کر بھی چند روز ایلچپور میں مقیم رہا۔ پھر جب کڑہ کی جانب روانہ ہوا تو اس مال و دولت کو علاء الدین سے چھین لینے کی جرأت بھی ان مذکورہ راجاؤں میں سے کسی کو نہ ہوئی اس سے یہ شبہ اور بھی قوی ہو جاتا ہے کہ کڑہ کے ہندوؤں کی معرفت جو علاء الدین کی مصاحبت میں موجود تھے ان مذکورہ راجاؤں سے پہلے ہی ساز باز ہو چکا ہوگا اور انہوں نے دیوگیر کے راجہ رام دیو پر مصیبت وارد کرنے اور علاء الدین کو سلطان جلال الدین کے خلاف دولت مند بنا کر بغاوت و سرکشی کی جرأت دلانے کی یہ بہترین تدبیر سوچی ہو بہر حال اس معاملے میں موجود و مہیا شدہ تاریخوں کے ذریعے کوئی صاف اور روشن بیان پیش نہیں کیا جا سکتا۔ علاء الدین کو جب دیوگیر کے راجہ سے بے قیاس دولت حاصل ہو گئی تو وہ اب ایلچپور میں زیادہ دنوں نہیں ٹھہر سکتا تھا کیونکہ اس خلافت آمیز دولت کے حاصل ہو جانے پر وہ بڑی آسانی سے ان لوگوں کے مشورہ کو تسلیم کر سکتا تھا جو اسکو سلطان جلال الدین کے خلاف نبرد آزمائی پر آمادہ کرنا چاہتے تھے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ علاء الدین نے

کڑہ پہونچکر سلطان جلال الدین کے قتل کرنیکا مصمم ارادہ کرلیا اور اس مال و دولت نے جو دیوگیر سے وہ لیگیا تھا اُسکے ارادہ کو قوت سے فعل میں لانے کا موقع بہم پہنچا دیا۔ یہ دولت جو علاء الدین کو دیوگیر سے حاصل ہوئی اُس تمام مال و دولت کے مجموعے سے بدرجہا زیادہ تھی جو محمد بن قاسم کے زمانے سے لے کر شہاب الدین غوری کے زمانہ تک مسلمانوں نے ہندوستان سے حاصل کی تھی لیکن یہ دولت بھی بجز اسکے کہ جنوبی ہند سے شمالی ہند میں پہونچگئی ہندوستان کی حدود سے باہر نہیں گئی لہذا اسکے متعلق بھی کسی شکوہ و شکایت کی کسی کو ضرورت نہیں۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ جو ۷۳۴ھ میں یعنی حملہ دیوگیر سے پورے چالیس سال کے بعد ہندوستان میں داخل ہوا ہے اِس مال و دولت کے حاصل ہونے کا ایک اور ہی سبب بیان کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ علاء الدین جب دیوگیر کی جانب فوج لیکر گیا ہے تو وہاں کسی مقام پر جنگل میں سفر کرتے ہوئے علاء الدین کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گھوڑے کے سُم سے ایک زنجیر جو زمین میں دبی ہوئی تھی نمودار ہوئی اس زنجیر کے سرے کو دیکھ کر اُس مقام کو کھودا گیا تو ایک خزانہ برآمد ہوا۔ اِس خزانہ کو لے کر علاء الدین کڑہ میں واپس آیا اور سلطان جلال الدین کے قتل کی تدابیر میں مصروف ہوا۔ ۱۷ رمضان ۶۹۵ھ کو سلطان جلال الدین خلجی اپنے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی کے ہاتھ سے کڑہ اور مانک پور کے درمیان دریائے گنگ کے کنارے مارا گیا۔ اِس جگہ اِس حادثہ کی تفصیل بیان کرنیکی ضرورت نہیں۔

سلطان علاء الدین خلجی

سلطان علاء الدین خلجی اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کرنیکے بعد بھی دہلی کا تخت سلطنت حاصل کرنے سے مایوس تھا کیونکہ سلطان جلال الدین کا بیٹا ارکلیخان جو اس زمانے میں ملتان کا صوبہ دار اور مغلوں کے حملوں کو روکنے کی غرض سے ملتان ہی میں رہتا تھا دہلی پہونچکر باپ کی سلطنت کو سنبھال لینے کی پوری اہلیت و قابلیت رکھتا تھا اور علاء الدین کے لیے اُسکا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا مگر یہاں ملکہ جہاں یعنی سلطان جلال الدین کی بیوی نے اپنے چھوٹے بیٹے کو جو سلطنت کی قابلیت نہ رکھتا تھا دہلی کے تخت سلطنت پر بٹھا دیا تھا۔ یہ خبر سُن کر ارکلیخان ملتان ہی میں مقیم رہا اور دہلی کی طرف نہ آیا۔ علاء الدین کڑہ میں اِس خبر کو سُن کر بہت خوش ہوا اور ماہ صفر ۶۹۶ھ میں کڑہ سے دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ راستہ میں اُس نے خوب روپیہ لٹایا اور سخاوت و بخشش کے ذریعہ لوگوں کو اپنی جانب مائل کیا ملکہ جہاں بیٹے کو لے کر ملتان کی جانب ارکلیخاں کے پاس بھاگ گئی۔ علاء الدین نے دہلی پہونچکر ۶۹۶ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ اپنے بھائی الماس بیگ کو الغ خاں کا خطاب دیا۔ ملک نصرت جلیسری کو نصرت خاں کا خطاب ملا۔ ضیاء برنی کے باپ مؤید الملک کو برن (بلند شہر) کی حکومت عطا کی۔ ملتان کی جانب فوج بھیجکر سلطان جلال الدین کے بیٹوں کو گرفتار کرکے اندھا کرا دیا۔ اِسی سال یعنی ۶۹۶ھ

میں مغلوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ علاء الدین نے اُنکے مقابلہ کو فوج بھیجی جالندھر کے قریب لڑائی ہوئی اور مغل شکست کھا کر بھاگ گئے۔ سلطان علاء الدین کی سلطنت جب اچھی طرح مستحکم ہو گئی تو اُس نے ۶۹۷ھ میں اپنے بھائی الغ خاں اور ملک نصرت خاں کو فوج دیکر گجرات کی طرف روانہ کیا۔ مسلمان گجرات کو اپنا ملک سمجھتے تھے لیکن عرصہ دراز سے گجرات کے راجہ نے خراج بھیجنا بند کر کے اپنے آپ کو خودمختار بنا لیا تھا اور سلطان جلال الدین نے اُس طرف التفات نہ کیا تھا۔ یہ فوج جب گجرات پہنچی تو وہاں کا راجہ کرن تاب مقاومت نہ لاکر فرار اور دیوگیر کے راجہ رام دیو کے پاس جا کر پناہ گزین ہوا۔ راجہ کرن اس بدحواسی کے ساتھ فرار ہوا کہ اپنی بیوی کنولا دیوی اور خزانہ کو بھی ہمراہ نہ لے سکا۔ چنانچہ اُس کا خزانہ اور رانی کنولا دیوی اسلامی لشکر کے قبضے آئی جسکو سلطان کی خدمت میں دہلی کی جانب روانہ کیا گیا۔ دہلی پہونچکر کنولا دیوی نے اس شرط پر اسلام قبول کیا کہ اُسکو بانوئے سلطنت اور ملکۂ جہاں بنا دیا جائے۔ چنانچہ سلطان علاء الدین نے اُس کو بیوی بنا لیا۔ گجرات پر قبضہ کرنے کے بعد ملک نصرت خاں علاقہ کمبایت میں گیا وہاں کے ساہوکاروں سے جو بڑے مالدار تھے روپیہ وصول کیا۔ یہیں اُس نے ایک ہندو بچہ کو جو قوم کا برد ایا بردواری تھا اور جسے خوجہ بنا کر وہاں کے کسی ساہوکار نے اپنا غلام بنا رکھا تھا اُسکے مالک سے زبردستی چھین لیا۔ یہی وہ غلام تھا جو سلطان علاء الدین کی خدمت میں پہنچکر ملک کافور کے خطاب سے مخاطب اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ہزار دیناری اور بالآخر وزیر اعظم بن گیا تھا۔ ملک نصرت خان اور الغ خاں کے ہمراہ نومسلم مغلوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ گجرات و کمبایت کی فتح اور وہاں کے انتظام سے فارغ ہو کر یہ دونوں سردار جب دہلی کی جانب واپس ہوئے تو راستے میں ان نومسلموں نے بغاوت کی اور سلطان علاء الدین کا ہمشیر زادہ اس بغاوت میں نومسلموں کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔ ملک نصرت اور الغ خاں نے جب ان باغیوں کو بقیہ فوج کے ذریعے شکست دیکر منتشر کر دیا تو یہ سب آوارہ ہو کر رنتھمبور کے راجہ ہمیر دیو کے پاس چلے گئے اور اُس نے اُن کو تائید غیبی سمجھ کر بڑی آؤ بھگت کے ساتھ رکھا۔ اسی زمانہ میں ایک اور سردار ظفر خاں جو اپنی بہادری میں شہرۂ آفاق تھا سیوستان کی فتح کے لیے نامزد ہوا تھا۔ سیوستان سندھ کا ایک حصہ اور سلطنت اسلامیہ کا جزو تھا لیکن عرصہ سے یہاں بھی ایک ہندو راجہ صلدی یا چھیلدیو نامی مغلوں سے امداد پا کر خودمختار ہو چکا تھا۔ جب ظفر خاں فوج لیکر سیوستان کے قریب پہونچا تو مغلوں کی فوجیں نے بلوچستان کی طرف سے آکر سیوستان کے راجہ کی مدد کی آخر سخت لڑائی کے بعد ظفر خاں نے راجہ اور اُسکے بھائی اور مغل سرداروں کو گرفتار کر کے گلے میں طوق و زنجیر ڈال کر دہلی کی جانب روانہ کیا اور بعد میں خود بھی مع مال غنیمت دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ نصرت خاں نے جب کھمبایت سے لائے ہوئے غلام کو پیش کیا تو سلطان اُسکی تربیت کی طرف خصوصیت سے

متوجہ ہو گیا۔ الغ خان، نصرت خاں اور ظفر خاں کے سالماً غانماً واپس آنے اور گجرات وسیوستان وغیرہ کی فتوحات نے اس جاہل بادشاہ کو بہت مغرور بنا دیا۔ اُدھر کنولا دیوی کی صحبت نے جو بادشاہ کی منظور نظر اور محرم راز و انیس خلوت تھی یقیناً اُس پر اثر ڈالا ہوگا نیز چھ سات سال پیشتر سے جبکہ وہ کڑہ کا صوبہ دار تھا اُسکو ہندوؤں کی صحبت میں رہنے کی عادت ہو گئی تھی اب اُس نے اپنے ان نو مسلم سرداروں کے دہلی میں واپس آنے کے بعد ایک نئے مذہب کے جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ بادشاہ کی اس لا مذہبیت کے بد نتائج کی فوراً روک تھام ہو گئی یعنے اُس نے جب دربار میں اپنے ارکان سلطنت کے روبرو اس کا اظہار کیا تو بعض باہمت اور باخدا لوگوں نے مخالفت کا اظہار کرکے بادشاہ کو اس خطرناک و بھنگ ارادے کے نتائج سے ڈرایا اور قابلیت کے ساتھ سمجھایا چنانچہ بادشاہ باز آگیا۔ چند ہی روز کے بعد ۶۹۷ھ میں مغلوں نے خراسان میں ایک زبردست فوج فراہم کی اور ہندوستان پر حملہ کرکے علاء الدین کو ایک خطرناک مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ قتلق خواجہ یا قتلغ خواجہ نامی مغلوں کا ایک شہزادہ دو لاکھ جرار مغلوں کی فوج لیکر ہندوستان میں داخل ہوا۔ چونکہ راستے میں کوئی زبردست فوج اور تجربہ کار سپہ سالار اُسکا سدراہ ہونیکے لیے اتفاقاً موجود نہ تھا لہذا وہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ سیدھا دہلی تک چلا آیا مدعا اُسکا یہ تھا کہ دار السلطنت پر اول قبضہ کر لیا جائے پھر دوسرے شہروں میں لوٹ مار کا بازار گرم کرنا آسان ہوگا۔ دو لاکھ مغلوں کا یکایک فصیل دہلی کے نیچے پہنچ جانا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا خوف کے مارے ارد گرد کے گاؤں اور قصبوں کے لوگ بھی سب دہلی میں آ آ کر جمع ہو گئے اور تمام کوچہ و بازار آدمیوں سے پُر نظر آنے لگے سامان خور و نوش بھی غیر مکتفی تھا اور اس محاصرہ کی حالت کو تا دیر برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ علاء الدین نے لڑنے کے قابل آدمیوں کو منتخب کیا تو تین لاکھ آدمی شہر کے اندر موجود ملے۔ اس تین لاکھ کے لشکر کو لیکر وہ شہر سے باہر نکلا اور مغلوں سے نبرد آزما ہوا۔ ہندوستان میں اسوقت تک اتنی بڑی دو فوجوں کا ایک میدان میں کبھی مقابلہ نہ ہوا تھا سخت معرکہ آرائی کے بعد مغلوں کو شکست ہوئی۔ علاء الدین کا بہادر سپہ سالار ظفر خاں اس لڑائی میں اپنی شجاعت کے انتہائی جوہر دکھا کر شہید ہوا۔ مغل جس تیزی و سرعت کے ساتھ آئے تھے اُسی سُرعت کے ساتھ شکست خوردہ واپس چلے گئے اس فتح عظیم کے بعد علاء الدین نے سکندر ثانی کا خطاب اپنے لیے تجویز کیا اور یہی خطاب سکوں اور خطبوں میں داخل ہوا۔ ۶۹۹ھ میں علاء الدین نے قلعہ رنتھنبھور پر حملہ کیا یہاں کا راجہ ہمیر دیو پرتھی راج کی نسل سے تھا۔ اور عرصہ دراز سے خود مختار ہو گیا تھا۔ تازہ خطا اُسکی یہ تھی کہ اُس نے نو مسلم مغلوں کو جن کا سردار محمد شاہ نامی ایک شخص تھا اور جو الغ خان و نصرت خان کی فوج میں سے باغی ہو کر چلے آئے تھے اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ سلطان دہلی سے روانہ ہو کر ابھی رنتھنبور تک نہیں پہونچا تھا کہ راستے میں ایک روز اُسکے

بھتیجے سلیمان شاہ نے بادشاہ کو قتل کرکے خود بادشاہ بننے کی ناکام کوشش کی اور قتل ہوا۔ رنتھمبور پہنچکر
محاصرہ شروع کیا اس محاصرے نے طول کھینچا بادشاہ کو وہاں مصروف دیکھ کر اُسکے دو ہمشیرزادوں
امیر عمر اور منگو خاں نے بدایوں اور اودھ میں علم بغاوت بلند کیا آخر دونوں گرفتار ہو کر رنتھمبور میں بادشاہ
کے پاس بھیجے بادشاہ نے محصورین رنتھمبور کو خوف دلانے کے لیے قلعہ کی دیوار کے نیچے ان دونوں کو
بڑی اذیت کے ساتھ قتل کرایا ابھی امیر عمر اور منگو خاں کا فتنہ فرو ہوا ہی تھا اور رنتھمبور کا محاصرہ برابر جاری
تھا کہ دہلی میں حاجی مولی نام ایک شخص نے دہلی کے [illegible] بڑے بڑے اہلکاروں کو قتل کرکے علم بغاوت
بلند کیا اور ایک شخص علوی کو جس کی ماں شمس الدین التمش کی نسل سے تھی تخت سلطنت پر بٹھا دیا
مگر سلطان کے بعض وفاداروں نے حاجی مولی اور علوی دونوں کو قتل کرکے اس فتنہ کو فرو کر دیا رنتھمبور
کا محاصرہ ایک سال تک جاری رہا نصرت خاں اسی دوران میں قلعہ سے ایک پتھر کے لگنے سے مارا گیا۔
آخر سلطان نے قہر و شوکت کے ساتھ اس قلعہ کو فتح کر لیا ہمیر دیو اور اُسکے متعلقین سب قتل ہوئے۔ فتح
ہونے کے بعد سلطان نے مقتولین کے اندر محمد شاہ باغی کو زخمی پڑا ہوا دیکھا اور پہچان کر کہا کہ اگر تیری مرہم
پٹی کرا کر تجھ کو تندرست کر دیا جائے تو کیا احسان مانے گا اُس نے سلطان علاء الدین کو جواب دیا کہ اگر میں تندرست
ہو کر تجھکو قتل کرونگا اور تیری جگہ ہمیر دیو کے بیٹے کو ہندوستان کا بادشاہ بناؤں گا۔ علاء الدین نے ناراض ہو کر
اُسکو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد اُسکی بہادری اور وفاداری کا خیال آیا تو بڑی عزت
و احترام کے ساتھ اُسکے جنازہ کو دفن کرایا اور ہمیر دیو کے وزیر رنمل کو جو محاصرہ کے شروع ہی میں سلطان کی خدمت
میں حاضر ہو گیا تھا اپنے سامنے بلوایا اور کہا کہ تم نے اپنے قدیمی آقا کے ساتھ کونسی وفاداری کی ہے جو ہم
تم سے وفا کی توقع رکھیں یہ کہہ کر اُسکو بھی قتل کرا دیا۔ یہ قلعہ اپنے بھائی الغ خاں کو دیکر خود دہلی کی طرف روانہ
ہوا۔ الغ خاں پانچ مہینے کے بعد بیمار ہو کر دہلی کی جانب روانہ ہوا اور راستہ میں فوت ہو گیا۔ سلطان نے اپنے سالے
الپ خاں کو الغ خاں کا خطاب دیا اور دہلی پہنچکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شراب خوری سے توبہ کرکے منادی کرادی
کہ آیندہ کوئی شخص شراب استعمال نہ کرے۔ چنانچہ اُس نے اپنی عہد حکومت سے نہایت کامیابی کے ساتھ
شراب خوری کا نام و نشان مٹا دیا۔ خفیہ پولیس کا محکمہ قائم کیا تحصیلدار و پٹواری مقرر کرکے زمینداروں سے نقد
خراج وصول کرنے کا ضابطہ موقوف کرکے بٹائی کا قاعدہ جاری کیا۔ اس معاملہ میں اسقدر احتیاط کو مرعی
رکھا گیا کہ کسی کی مجال نہ تھی جو کاشتکار سے ایک حبہ یا ایک دانہ زیادہ وصول کر سکے۔ رشوت قطعاً موقوف
ہو گئی جھوٹ بولنے کی سخت سزا مقرر کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکی حدود حکومت سے کذب و دروغ کا نام و نشان
مٹ گیا۔ غارت گری اور لوٹ مار کا استیصال پورے طور پر کر دیا۔ بہار سے پنجاب و سندھ تک تمام سڑکیں

اور راستے اسی طرح محفوظ تھے کہ ایک عورت سونا اچھالتی چلی جاتی تھی اور کسی کو جرأت نہ تھی کہ اس سے یہ دریافت کرتا کہ تیرے منہ میں کے دانت ہیں۔ ملک میں ضروریات زندگی کی اسقدر ارزانی ہوگئی کہ گندم ساڑھے سات جیتل کے ایک من آتے تھے۔ جیتل تانبے کا سکہ تھا۔ ایک روپے میں چالیس جیتل ہوتے تھے یعنی فی روپیہ پونے چھ من گندم آتے تھے۔ تمام ملک سیراب ہونے لگی اور زمین کا کوئی قطعہ بنجر باقی نہ رہا یہ تمام انتظامات صرف دو سال کے عرصے میں پایہ تکمیل کو پہنچ گئے۔ اس حیرت انگیز کامیابی کا سبب صرف یہ تھا کہ دہلی میں ذی علم اور تجربہ کار لوگوں کی کثرت تھی اور تخت نشین ہونے کے بعد سلطان علاء الدین اس زمانے کے ذی علم اور باخدا لوگوں سے مشورہ لینے میں تامل نہ کرتا تھا اور ہر ایک بڑے اور اہم کام میں علماء سے مشورہ کرنے کو عیب نہیں جانتا تھا۔ چونکہ وہ جاہل تھا اسلئے کبھی علماء کی بات پر عمل نہیں بھی کرتا تھا۔ مگر جب کوئی بات اُسکے ذہن نشین ہو جاتی تھی تو اس پر پوری طاقت کے ساتھ عملدرآمد کرتا اور کامیابی حاصل کرکے رہتا تھا۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں بہت سے ذی لیاقت عمال اور نیک نیت اہل کاروں کی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ کاشتکار خوشحال اور سپاہی فارغ البال نظر آتے تھے مقدموں، نمبرداروں، اور رشوت خوار اہلکاروں کا طبقہ درمیان سے بالکل مرتفع ہوگیا تھا۔ باوجود اسکے کہ رعایا سے زر نقد لگان یا کسی قسم کا ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا تھا سلطانی لشکر کی تعداد پونے پانچ لاکھ سواروں پر مشتمل تھی اس کثرت فوج کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے ہر حصے سے بغاوت وسرکشی کا نام ونشان مٹ گیا۔ اس جاہل بادشاہ کے عہد حکومت میں علماء اور ہر علم وفن کے باکمال لوگوں کی اس قدر کثرت تھی کہ کسی دوسرے زمانے میں نظر نہیں آئی۔ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اخلاق میں کسقدر فرق وتفاوت تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے ضیاء برنی کے چچا علاء الملک کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔ علاء الملک اور سلطان علاء الدین خلجی کا ایک مکالمہ ضیاء برنی اور دوسرے مورخین نے نقل کیا ہے۔ سلطان ساری دنیا کے فتح کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا اور علاء الملک اس ارادہ سے سلطان کو باز رکھنا چاہتا ہے۔ اسی سلسلے میں علاء الملک سکندر یونانی کے زمانے کے لوگوں اور اپنے زمانے کے لوگوں کا فرق بیان کرتا ہوا کہتا ہے کہ

"بخلاف مردمان زمانہ وعصر ما خاصتہً ہندو کہ اصلاً در ایشاں عہد سے وپیمانے نیست کہ اگر پادشاہے قاہر کامگار بر سر خود نہ بیند وسوار وپیادہ انبوہ تیغ وتیر کشیدہ بر جان ودوان وملک واسباب خود معائنہ نکنند ہرگز فرمانبرداری نکنند وخراج نہ دہند وصد عصیاں وتمرد ورزند۔"

علاء الملک کے یہ الفاظ واقعات کی تصویر ہیں۔ سلطان علاء الدین چونکہ سخت گیر تند مزاج اور طاقتور سلطان تھا۔ اور کسی لڑائی میں اسکو کبھی شکست نہیں ہوئی تھی لہذا اس نے جب ایک مرتبہ طاقت اور شوکت کو کام میں لاکر

ملک میں امن وامان قائم کر دیا تو پھر کسی ہندو راجہ کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ سرتابی وبغاوت کا خیال بھی دل میں لاسکے یا کوئی گروہ ہندوؤں کا رہزنی پر آمادہ ہو۔ سکے شروع ۶۹۵ھ سے آخر ۷۱۵ھ تک سلطان علاء الدین شمالی ہند میں ایسے قوانین وآئین نافذ کر دیا تھا کہ کسی ہندو کی سرکشی کے سر ابھارنے یا رعایا میں سے کسی کے جان ومال کے تلف ہونے کا اندیشہ باقی نہ رہا تھا صرف ایک چتوڑ کا قلعہ باقی رہ گیا تھا جس نے سلطان کے حسب منشاء ابتک اطاعت نہیں کی تھی چنانچہ سلطان علاء الدین خلجی نے ۷۰۲ھ میں چتوڑ پر لشکرکشی کی اور ششماہہ محاصرہ کے بعد محرم ۷۰۳ھ میں اسکو فتح کر کے اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کو چتوڑ کا حاکم مقرر کیا اور چتوڑ کا نام خضر آباد رکھا اسی جگہ خضر خاں کو ولیعہد سلطنت قرار دیکر دہلی کی جانب واپس آیا اور چتوڑ کے راجہ رتن سین کو گرفتار کر کے ہمراہ لایا۔ رتن سین کا خواہرزادہ خود بادشاہ کی خدمت میں آکر حاضر ہوا اور مصاحبین سلطانی میں داخل کیا گیا۔ رتن سین کی بیوی جس کا نام پدماوت تھا فتح چتوڑ کے وقت فرار ہو کر کہیں جا چھپی تھی اسی طرح اور بھی بہت سے راجپوتوں نے فرار کی عار گوارا کر کے اپنی جانیں بچالی تھیں۔ کا کوئی تفحص وتعاقب نہیں کیا گیا تھا یہ کام خضر خاں کا تھا جو وہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا کہ وہ اُس تمام علاقہ میں اُن لوگوں کا استیصال کرتا جو ابھی تک سرکشی وبغاوت کا مادہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ خضر خاں میں ملک داری کی قابلیت نہ تھی لہذا وہ عیش وعشرت میں مشغول ہو گیا اور راجپوتوں کو رام کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لایا ان مفرور راجپوتوں نے پہاڑوں اور جنگلوں میں اپنا مرکز قائم کیا اور رانی کو حاکم قرار دیکر خودمختارانہ زندگی بسر کرنے لگے سلطان کو چتوڑ سے دہلی آئے ہوئے ایک ہی مہینہ گذرا تھا کہ طرغی بیگ مغل نے ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ سلطنت دہلی پر حملہ کیا مگر ناکام واپس ہوا۔ مغلوں کے اس حملے کو دفع کرنے کے بعد بادشاہ کو معلوم ہوا کہ چتوڑ کے نواح میں رتن سین کی رانی نے راجپوتوں کی جمعیت فراہم کی ہے۔ اُس نے راجہ کے بھانجے سے جو اُسکے مصاحبوں میں شامل تھا اُسکا ذکر کیا اُس نے کہا کہ رتن سین آپکی قید میں موجود ہے آپ اُس سے کہیں کہ وہ رانی کو اس حرکت اور سرکشی سے باز رہنے کا خط لکھے اور اُسکو اپنے پاس بلالے چنانچہ علاء الدین نے رتن سین کو جو معزز قیدیوں کی طرح نظر بند اور آرام وآسائش کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا اجازت دی کہ تم اپنی رانی کو بھی اپنے پاس بلالو۔ راجہ نے اس رعایت سے خوش ہو کر اپنے معتمد کے ہاتھ رانی کے پاس پیغام بھیجا کہ تم بھی میرے پاس چلی آؤ۔ رانی نے بہ ہوشیاری کئی بند پالکیوں میں مسلح راجپوتوں کو بٹھا کر بہت سے راجپوتوں کو تیز رفتار گھوڑوں پر محافظ دستہ کے طور پر مامور کر کے دہلی کی جانب روانہ کیا اور یہ شہرت دی کہ رانی حسب الاجازت سلطان اور حسب الطلب راجہ دہلی کو جارہی ہے چنانچہ چتوڑ سے دہلی تک کوئی بھی ان راجپوتوں کا مزاحم نہ ہوا۔ رانی کی یہ مصنوعی سواری رات کے ابتدائی حصے میں دہلی پہنچی اور شہر سے باہر رک کر سلطان کے پاس اطلاع بھیجی کہ رتن سین کو مقام نظربندی سے باہر

بھیجے کہ وہ رانی کو ہمراہ لیجائے سلطان نے اجازت دی اور رتن سین چند محافظوں کی نگرانی میں رانی کے استقبال کو شہر سے باہر نکلا جونہی اِس مصنوعی سواری کے قریب پہنچا راجپوتوں نے جو ڈولوں کے اندر تھے اور جو بطور محافظ دستے کے آئے تھے اِن چند شاہی محافظوں پر حملہ کرکے ان کو قتل کردیا اور رتن سین کو گھوڑے پر بٹھاکر وہاں سے فرار ہوگئے اور بطریق یلغار نواح چتور میں اپنے محفوظ مقام پر پہونچ گئے سلطان کو جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو راجپوتوں کی اس چالاکی پر حیران رہ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۷۰۴ھ میں علی بیگ اور ترپال خواجہ مغل نے کوہ ہمالہ کے اندر ہوکر اُس راستے سے جس راستے سے کہ سلطان محمود غزنوی اپنی فوج لیکر قنوج پر حملہ آور ہوا تھا ہندوستان پر حملہ کیا اور یکایک صوبہ روہیلکھنڈ میں پہاڑوں سے نکلکر دامن کوہ سے امروہہ تک کے علاقے کو تاخت وتاراج کرڈالا۔ اِن مغل سرداروں کے ساتھ چالیس ہزار فوج آئی تھی، سلطان نے غازی ملک تغلق کو جو سلطان کا امیر آخور تھا ان مغلوں کے مقابلہ پر بھیجا غازی ملک تغلق نے پہنچکر امروہہ میں ان کا مقابلہ کیا اس لڑائی میں مغلوں کو شکست ہوئی علی بیگ اور ترپال خواجہ دونوں سردار گرفتار ہوئے اور بہت سے مغل میدان میں مارے گئے، جو بھاگ کر اِدھر اُدھر منتشر ہوئے اُن کو چھوٹے چھوٹے سرداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں گھیر کر کیفر کردار کو پہنچایا صرف چند شخص بچکر ترکستان وخراسان میں بہزار خرابی پہونچے اور اپنی اس تباہی کی داستان سُنائی۔ چونکہ مغلوں کا یہ حملہ غیر مترقبہ اور ایک نئے راستے سے ہوا تھا اسلیے سلطان علاء الدین نے اپنا دار السلطنت سے غیر حاضر ہونا مناسب نہ سمجھا اور یہ سُنکر کہ راجہ رتن سین نے چتور کے نواح میں کسی مقام پر مضبوط ہوکر چتور کے قرب وجوار میں ڈاکہ زنی شروع کردی ہے اور خضر خاں اُسکے تدارک کی طرف ملتفت نہیں ہوتا خضر خاں کو چتور کی حکومت سے معزول کرکے رتن سین کے بھانجے کو جو سلطان کی خدمت میں موجود تھا چتور کی سند حکومت دیکر بھیجا چنانچہ اُس نے جاتے ہی خضر خاں کو دہلی کی جانب رخصت کیا اور تمام راجپوتوں کو قہر وجبر یا محبت سے اپنی جانب مائل کرلیا رتن سین اور اُسکی رانی گمنامی کی تاریکی میں غائب ہوگئے۔ یہ اصل واقعہ تھا جسکو قصہ گویوں نے علاء الدین اور پدماوت کے عشق وحسن کی ایک عجیب وغریب داستان بنادیا ہے اور آج ہمارے ملک کا بچہ بچہ اِس فرضی کہانی پر ایمان لائے ہوئے نظر آتا ہے۔ اِس کہانی میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ راجپوتوں نے قید خانہ میں پہونچکر رتن سین کی بیڑیاں کاٹیں اور اُسکو وہاں سے لیکر بھاگے لیکن سجان سنگھ بھنڈاری بٹالوی کہتا ہے کہ رانی کی مصنوعی سواری حوالی دہلی میں پہونچکر رُک گئی اور وہیں سے سلطان کے پاس پیغام بھیجا گیا۔

"القصہ لشکر بادولہا طے منازل وقطع مراحل نمودہ در حوالی دہلی رسیدہ نزول نمودند وسرداران لشکر

بوجب تلقین آں بانوے پُر فراست از زبان آں عصمت قباب سلطان را پیغام کردند"

پھر آگے چلکر سلطان کے اجازت دینے کا حال ان الفاظ میں درج کرتا ہے کہ

"بے توقف و تحاشی و بلا تعلل و تامل رائے را اخلاص دادہ ہمراہ کسان خود روانہ ساخت بمجرد آنکہ رائے بہ لشکر خود ملحق گردید جوانان شجاعت نشان بکسان سلطان بجنگ پیش آمدہ اکثرے را بقتل درآوردند"

اِس کہانی میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان خود اسکے بعد چتور پر حملہ آور ہوا اور قلعہ کو فتح کر کے رانی کو تلاش کرتا ہوا قلعہ میں داخل ہوا تو رانی چتا میں بیٹھ کر ستی ہو چکی تھی حالانکہ رتن سین کے دہلی سے بھاگ جانے کے بعد سلطان علاء الدین ہرگز دوبارہ چتور کی طرف نہیں گیا بلکہ رتن سین کے بھانجے کو چتور کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔ دہلی سے فرار ہو کر رتن سین کو قلعہ چتور پر قابض ہونے کا موقع نہیں ملا۔ پھر بھلا قلعہ کے فتح کرنے اور قلعہ کے اندر رانی کے ستی ہونے کا واقعہ کس طرح صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے پھر لطف یہ کہ کوئی پدماوت کو رتن سین کی بیوی لکھتا ہے اور کوئی بیٹی بتاتا ہے۔ چتور کے متعلق آخری نتیجہ فرشتہ نے ان الفاظ میں لکھا ہے کہ

"پادشاہ بمقتضائے صلاح وقت قلعہ را از خضر خاں گرفتہ بخواہر زادہ رائے گرنیز پائے کہ در ملازمت پادشاہ بود و لوازم اخلاص بطور رسانیدہ عنایت فرمودہ و در اندک زمانے در آنجا نہایت اقتدار بہم رسانید و جمیع راجپوتان بحکومت او راضی و با او متفق شدند و تا آخر حیات پادشاہ بر جادۂ عبودیت مستقیم بودہ ہر سال با تحف و ہدایائے آں ولایت بآستاں بوس شہریار کامگار مشرف می گردید و با اسپ و خلعت خاصہ سرفرازی یافتہ بمقر خود مراجعت می نمود و ہر گاہ بجائے نامزد می شد غاشیہ عبودیت بردوش انداختہ با پنج ہزار سوار و دہ ہزار پیادہ دراں سفر حاضر می گردید و جان سپاریہا می کرد"

سنہ ۷۰۵ھ میں گنگ نامی مغل سردار نے ساٹھ ہزار سواروں کے ساتھ علی بیگ اور خواجہ ترپال کا انتقام لینے کے لیے حملہ کیا غازی ملک تغلق نے ان کا مقابلہ دریائے سندھ کے کنارے کیا۔ ساٹھ ہزار مغلوں میں سے صرف چار ہزار بچکر فرار ہوسکے باقی سب مارے گئے اور انکا سردار گنگ زندہ گرفتار کر کے دہلی بھیجا گیا جہاں اُسکو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوایا گیا اسکے بعد اقبالمند نامی مغل سردار نے حملہ کیا اسکو بھی غازی ملک تغلق نے جو دیپالپور میں مغلوں کے حملوں کو روکنے کے لیے متعین تھا شکست دیکر قتل کیا اور بہت سے مغلوں کو گرفتار کر کے دہلی بھیجا جن کو ہاتھیوں کے پاؤں میں ڈالا گیا۔ ان پیہم شکستوں سے مغل بہت مرعوب

ہوئے اور غازی ملک تغلق کی دھاک اُن کے دلوں پر بیٹھ گئی اور عرصہ دراز تک اُن کو ہندوستان پر حملہ کرنیکی جرأت نہ ہوئی سنہ ۷۰۶ھ میں سلطان نے ملک کافور کو ملک نائب کا خطاب دیکر خلعت فاخرہ اور سُرخ شامیانہ جو بادشاہ کے سوا دوسرا استعمال نہیں کرسکتا تھا عطا کیا اور تمام اُمراء سے اُسکا مرتبہ بلند کرکے سپہ سالاری اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ جلیلہ دیکر ایک لاکھ سواروں کے ساتھ ملک دکن کی جانب روانہ کیا اور ایک نہایت تجربہ کار و ہوشیار امیر مسمّی خواجہ حاجی کو اُسکے ہمراہ کیا اور عین الملک ملتانی حاکم مالوہ اور الپ خاں المخاطب بہ الغ خاں حاکم گجرات کے نام فرامین جاری کیے کہ اپنی اپنی فوج لیکر بطور کمکی ملک کافور کے ساتھ شامل ہوجائیں۔ ملک کافور ایک ناتجربہ کار ہندو زادہ نوجوان غلام تھا۔ وہ ہرگز قابلیت سپہ سالاری نہیں رکھتا تھا۔ لیکن بادشاہ کو اُسکی عزت افزائی مقصود اور اپنے اقبال سلطانی کا امتحان منظور تھا اسی لیے اُسکو سب سے بڑا عہدہ دیکر تجربہ کار اُمراء کو اُسکے ساتھ کیا کہ یہ مہم ملک کافور کے نام سے کامیاب ہو۔ اسی طرح اُس نے ایک مرتبہ اپنی ایک پرستار گل بہشت نام کو سپہ سالار بنا کر جالور کے راجہ کانر دیو یا کنور دیو کے مقابلہ پر بھیجا تھا دکن کی جانب اِس فوج کشی کا سبب یہ تھا کہ دیوگیر کا راجہ رام دیو جو علاقہ ایلچپور کی آمدنی اور مقررہ خراج برابر سلطان کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا۔ اُس نے ۷۰۳ھ یعنے تین سال سے خراج بھیجنا بند کردیا تھا لہذا اُسکی گوشمالی ضروری سمجھی گئی۔ فتح گجرات کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ گجرات کا راجہ کرن اپنی بیوی کنولا دیبی اور خزانہ کو حملہ آوروں کے پنجہ میں چھوڑ کر دیوگیر کی جانب بھاگ گیا تھا۔ وہاں رام دیو کی مہربانی سے گجرات و دیوگیر کی سرحد پر مقام بگلانہ میں اُسکو جگہ مل گئی تھی۔ بگلانہ اور اُسکے مضافات پر وہ ایک چھوٹے سے رئیس کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا، گجرات اسلامی حکومت میں شامل تھا اور الغ خاں ثانی اُس پر حکمران تھا بگلانہ اگرچہ ملک گجرات ہی کا ایک حصہ تھا مگر مسلمانوں نے راجہ کرن کو وہاں سے بیدخل کرنیکی اب تک مطلق کوشش نہیں کی تھی ملک کافور اور خواجہ حاجی جب دہلی سے روانہ ہونے لگے تو کنولا دیوی نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں جب گجرات سے آپکی خدمت میں آئی تو اُسوقت میری ایک بیٹی راجہ کرن کے نطفہ سے چار سال کی تھی وہ اتفاقاً وہیں رہ گئی اور مجھکو معلوم ہوا ہے کہ وہ بگلانہ میں راجہ کرن کے پاس موجود ہے، آپ ایسی کوشش کریں کہ میری بیٹی جس کا نام دیول دیوی ہے میرے پاس آجائے اور میں اُسکو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کروں بادشاہ نے فوراً ملک کافور اور خواجہ حاجی کو تاکید کردی اور الغ خاں حاکم گجرات کو بھی لکھا کہ جس طرح ممکن ہو دیول دیوی کو راجہ کرن سے حاصل کرکے دہلی بھیجدو۔ ملک کافور۔ خواجہ حاجی، عین الملک۔ الغ خاں۔ سب نے سرحد دکن پر جمع ہوکر مقام سلطان پور میں مقام کیا۔ راجہ کرن اور رام دیو کو خطوط لکھ کر سلطانی احکام سے مطلع کیا اور راہ راست پر لانیکی کوشش کی۔ مگر ان خطوط کا جواب ان راجاؤں کی طرف سے حسب منشاء نہ ملا تو الغ خاں نے

کوہستان بگلانہ کی جانب اور ملک کافور و خواجہ حاجی نے دیوگیر کی جانب پیشقدمی کی۔ رام دیو کا بیٹا
سنگلدیو دیول دیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا مگر راجہ کرن اس رشتے کو اسلیئے ناپسند کرتا تھا کہ وہ رام دیو کو
قوم کے اعتبار سے گھٹیا جانتا تھا۔ الغ خاں کے حملے سے مجبور ہو کر راجہ کرن نے دیول دیوی کو دیوگیر بھیجدینا اور
سنگلدیو کے ساتھ شادی کرنا منظور کر لیا چنانچہ سنگلدیو کا بھائی بھیم دیو اس لڑکی کو لینے کے لیے راجہ کرن کے
پاس پہونچ گیا۔ الغ خاں دو مہینے تک راجہ کرن سے لڑتا اور اُسکا پہاڑوں میں تعاقب کرتا رہا۔ آخر مجبور ہو کر
مغارات ایلورا کے متصل پہونچکر اُس نے دو روز قیام کیا اُسکی فوج کے کچھ سپاہی مغارات ایلورا کی سیر کرنے گئے وہاں
اتفاقاً اُن کو دشمنوں کا ایک دستۂ فوج ملا جو دیول دیوی کا ڈولہ لیے ہوئے دیوگیر کی جانب جا رہا تھا مقابلہ
ہوا مسلمانوں نے ہندوؤں کو مقتول و مفرور بنا کر ڈولہ پر قبضہ کر لیا اور الغ خاں کے پاس لے آئے وہ بہت
خوش ہوا اور دیول دیوی کو بہ حفاظت دہلی کی جانب روانہ کیا۔ کنولہ دیوی بیٹی کو دیکھ کر خوش ہوئی اور اُسکی
شادی خضر خاں ولیعہد سلطنت سے ہوئی ملک کافور اور خواجہ حاجی نے دیوگیر کو فتح کر کے رام دیو کو اسیر کیا اور
بادشاہ کی خدمت میں لیکر حاضر ہوئے۔ جب رام دیو گرفتار ہو کر دہلی پہنچا تو سلطان علاء الدین نے اُسکے ساتھ
نہایت عزت و مرحمت کا برتاؤ کیا اُس سے اقرار اطاعت لیکر اور رائے رایاں کا خطاب دیکر چتر سفید عطا کیا اور
دیوگیر کی ریاست پھر اُسی کو واپس دیکر گجرات کے ملک میں سے بھی ایک قطعہ بطور انعام اپنی طرف سے عطا کیا
اُسکے تمام عزیز و اقارب اور بیٹوں کو بھی رہا کر کے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ دیوگیر کی جانب رخصت کیا
اسکے بعد جب تک رام دیو زندہ رہا سلطان کا وفادار و خدمت گذار رہا جس زمانہ میں ملک کافور کو دیوگیر
کی جانب روانہ کیا اُسی زمانہ میں قلعہ سیوانا کے راجہ ستیل دیو کی شکایت بادشاہ کے گوش گذار ہوئی۔ چنانچہ
بادشاہ خود اُسکی طرف روانہ ہوا ستیل دیو نے اپنی تمثال سونے کی بنوا کر اُسکے گلے میں زنجیر ڈال کر بادشاہ
کی خدمت میں روانہ کی مگر بادشاہ نے اُسکی خطا اُس وقت تک معاف نہ کی جب تک کہ وہ خود گلے میں زنجیر
ڈالکر حاضر نہ ہوا۔ سنہ ۷۰۸ھ میں ایک حملہ ورنگل کے راجہ لدر دیو پر اس نواح کے شاہی سرداروں نے کیا تھا
جسکا کوئی نتیجہ کامیابی کی شکل میں ظاہر نہ ہوا۔ یہ حملہ اڑیسہ کے راجہ کی ترغیب سے ہوا تھا جو سلطان علاء الدین کا
مطیع و فرمانبردار تھا۔ ورنگل کی اس ناکام مہم کا حال سنکر سلطان نے سنہ ۷۰۹ھ میں دوبارہ ملک کافور اور خواجہ
حاجی کو روانہ کیا اور ملک کافور کو نصیحت کی کہ خواجہ حاجی کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرے ساتھ ہی حکم دیا کہ
اول دیوگیر پہنچو پھر وہاں سے ورنگل پر حملہ کرو یہ بھی حکم دیا کہ تم دیوگیر پہنچکر اول لدر دیو کے پاس پیغام بھیجو
کہ سلطانی اطاعت قبول کر کے اپنے اوپر خراج سالانہ تسلیم کرے اگر وہ اطاعت پر آمادہ ہو اور خراج گذاری
کا وعدہ کرے تو اُس سے تعرض نہ کرو اور واپس چلے آؤ۔ اگر سرکشی پر آمادہ ہو تو اُسکو سزا دو۔ یہ فوج جب دیوگیر

کے قریب پہونچی تو رام دیو نے اس کا استقبال کیا۔ ملک کافور کی خدمت میں حاضر ہوکر آداب و مجرا بجالایا، شاہی
لشکر کو اپنا مہمان کیا اور علامات خدمت گذاری کے اظہار میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیا۔ جب
راجہ لدر دیو کی رعونت و سرکشی دیکھ کر لشکر اسلام دیوگیر سے ملک تلنگانہ کی طرف روانہ ہوا تو رام دیو کئی
منزل تک بطریق مشایعت لشکر کے ہمراہ آیا اور ملک کافور سے اجازت لیکر واپس ہوا۔ تلنگانہ کی حدود میں داخل
ہوتے ہی لشکر اسلام نے قلعوں اور شہروں کو فتح کرنا شروع کیا اور گرد کے کئی راجہ چھوٹے چھوٹے رئیس لدر دیو کے
پاس شہر ورنگل میں جمع ہوگئے۔ ورنگل کے قریب سب نے شکست کھائی اور لدر دیو مع اپنے رفیقوں کے قلعہ
ورنگل میں محصور ہوگیا کئی راجہ اور رئیس گرفتار ہوئے اور بہت سے آدمی لڑائی میں مارے گئے۔ آخر محاصرہ کی
شدت اور اپنی کمزوری کے احساس پر لدر دیو نے ملک کافور کی خدمت میں عاجزانہ درخواست بھیجی۔ اور
اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار کرکے تین سو ہاتھی سات ہزار گھوڑے بہت سا سونا چاندی قیمتی تحفے بطور
نذرانہ پیش کیے اور ایک معقول زر خراج اپنے اوپر تسلیم کرکے بلا عذر و حیلہ سال بسال بھیجتے رہنے کا وعدہ کیا
ملک کافور یہ تمام سامان لیکر دہلی کی طرف واپس ہوا اور تمام مال غنیمت پادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس
طرح ملک دکن کا ایک بڑا حصہ سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوگیا۔ مگر کنارہ، میسور، ملیبار وغیرہ یعنے دکن کا
انتہائی جنوبی حصہ باقی رہ گیا تھا۔ سلطان علاء الدین نے مناسب سمجھا کہ اس حصے کو بھی فتح کرکے آیندہ
خطرات کا بالکل خاتمہ کردیا جائے اور ہندوؤں کی طرف سے بالکل مطمئن ہوکر مغلوں کے مقبوضہ علاقوں پر شمال
کی جانب فوجیں بھیجنے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔ چنانچہ اُس نے ۷۱۰ھ میں تیسری مرتبہ پھر ملک کافور
اور خواجہ حاجی کو دکن کی جانب فوج دیکر روانہ کیا۔ اس مرتبہ بھی لشکر شاہی دیوگیر ہوتا ہوا دکن کی جانب گیا۔ اب
دیوگیر کے راجہ رام دیو کا انتقال ہوچکا تھا اُسکی جگہ اُسکے بیٹے کوسنا حکومت دیدی گئی تھی۔ اس لشکر نے اوّل
کنارہ کا علاقہ فتح کیا پھر کرناٹک اور ملیبار وغیرہ کو وہاں کے راجہ بلال دیو سے فتح کرکے راس کماری تک پہونچا۔
انتہائی جنوبی راس پر جسکو سیت بندر رامیشور کہتے تھے ایک چھوٹی سی پختہ مسجد گچ و سنگ سے بنوائی جو تاریخ
فرشتہ کی تصنیف کے زمانہ تک موجود تھی فرشتہ لکھتا ہے کہ

"مسجدے مختصر از گچ و سنگ مرتب ساختہ بانگ اذان محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در آنجا گفتہ خطبہ پادشاہ
علاء الدین خواندند تا ایں زماں کہ خامۂ عنبریں شمامہ در تحریر ایں وقایع است آں مسجد در نواحی سیت بندر
رامیشور موجود است و بمسجد علائی مشہور است"

راس کماری سے لشکر اسلام ساحل کارومنڈل کی طرف متوجہ ہوا اور اس طرف کے بھی تمام راجاؤں سے
خراج وصول کرتا اور اقرار اطاعت لیتا ہوا ۷۱۱ھ میں دہلی پہنچا۔ اس طرح کوہ ہمالہ سے راس کماری تک اور

خلیج کنبایت سے خلیج بنگالہ تک تمام برِاعظم ہند اسلامی شہنشاہی میں شامل ہوگیا۔ ۷۱۰ھ میں جب شاہی لشکر دیوگیر ہوتا ہوا ملک کنارہ میں داخل ہوا تھا تو رام دیو کے بیٹے سے جو چند ہی روز پیشتر اپنے باپ کا قائم مقام ہوا تھا کچھ خودسری کے آثار محسوس ہوئے تھے ۷۱۲ھ کے ابتدا میں اسکی نسبت شکایات پہنچیں اور ساتھ ہی تلنگانہ کے راجہ لدر دیو کی عرضی آئی کہ میں نے نائب ملک (ملک کافور) کے ذریعے خراج گذاری اور فرمانبرداری کا اقرارنامہ لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں بھجوا دیا ہے میرے پاس تین سال کا خراج جمع ہوگیا ہے یا تو سلطان مجھ کو اجازت دیں کہ میں وہ خراج دیوگیر بھجوا دوں تاکہ وہاں کے سالانہ خراج کے ہمراہ شاہی خزانہ میں پہونچ جائے یا سلطان کسی سردار کو یہاں بھیجکر براہ راست زرِخراج منگوالیں۔ اِس عرضی اور دیوگیر کے راجہ کی بے راہ روی کی خبر کے پہونچنے پر سلطان علاءالدین نے سوچا کہ دکن کے علاقوں کی نگرانی اور دکن میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے ایک ویسرائے یا نائب السلطنت کا دکن میں موجود رہنا ازبس ضروری ہے چنانچہ اُس نے چوتھی مرتبہ ۷۱۲ھ میں ملک کافور کو یہ حکم دیکر بھیجا کہ تم مقام ایلچپور میں جو براہ راست شاہی مقبوضہ اور ابتک ریاست دیوگیر کے زیر اہتمام رہا ہے پہونچکر قیام کرو لدر دیو اور دکن کے راجاؤں سے خراج وصول کرکے بھیجنا اور وہاں کے انتظام کو درست رکھنا تمھارا کام ہوگا اور اگر رام دیو کا بیٹا راہ راست سے منحرف ہوگیا ہو تو اُسکو قتل یا گرفتار کرکے تم دیوگیر کو اپنا قیام گاہ بناؤ اور اُس علاقہ میں اپنی طرف سے اُمرا اور صوبہ دار مقرر کردو ملک کافور نے رام دیو کے بیٹے کو جو واقعی منحرف ہوچکا تھا جاتے ہی قتل کیا اور تمام علاقۂ مرہٹہ میں گلبرگہ۔ مدکل اور رائچور تک اپنے اہلکار و اُمرا مقرر کردیے۔ راجاؤں سے خراج وصول کرکے دہلی بھیجا اور ملک دکن میں ہر جگہ شاہی تھانے قائم کردیے اور اسکے بعد کسی راجہ کی یہ ہمت نہ رہی کہ مسلمانوں کی اطاعت و فرمانبرداری کے سوا سرکشی و خودمختاری کا خیال تک دل میں لاسکے۔ اِس طرح ۷۱۲ھ میں اسلامی سلطنت کا غلبہ تکمیل کو پہونچکر کسی ہندو طاقت کا کوئی خطرہ مسلمانوں کے لیے باقی نہ رہا۔ اگرچہ دکن کا تمام ملک بختیٔ فوج خواجہ حاجی کی اعلیٰ قابلیت سے فتح ہوا۔ مگر سلطان علاءالدین کا تکلف دیکھیے کہ اُس نے مرہٹہ و گونڈوانہ سے راس کماری تک کا تمام ملک ملک کافور کی سرداری میں فتح کرایا اور آخر میں اُسی کو ملک دکن کا ویسرائے بھی بنایا۔

دکن کی فتوحات اور مال و دولت کی فراوانی نیز ہندو راجاؤں کے دہلی میں بار بار آنے اور خلعت و خطاب و انعام و اکرام پاکر واپس جانے کا یہ اثر ہوا کہ دہلی میں ہندو ساہوکاروں کے حوصلے بڑھ گئے جنمیں شاکت مت کے پیرو اور بام مارگی بھی شامل تھے ان لوگوں نے اپنے شرم انگیز اعمال و افعال کا ارتکاب بطور مراسم مذہبی شروع کیا اور اتفاقاً اسکی اطلاع سلطان کے کانوں تک بھی پہونچ گئی۔ ان لوگوں کو اُس

زمانہ میں لامذہب۔ بودھ اور اباحتی کے نام سے پکارا گیا۔ سلطان نے ان لوگوں کو گرفتار کرنے اور عبرت انگیز سزائیں دینے کا حکم دیا۔ اِس دار وگیر کا اثر یہ ہوا کہ اس بداعمال و بدافعال گروہ کا نام و نشان دہلی سے مٹ گیا۔ سلطان کے اِسی ایک کام کو اگر کوئی شخص چاہے تو مذہبی مداخلت قرار دے لے ورنہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ سلطان علاء الدین یا کسی دوسرے مسلمان سلطان نے کبھی کسی ہندو کو اُسکے دین و مذہب سے پھیرنے یا زبردستی مسلمان بنانے کی کوئی کوشش کی ہو اگر ایسا ہوتا تو آج ایک بھی ہندو اِس ملک میں نظر نہ آتا۔ سلطان علاء الدین کی اِس مداخلت مذہبی کا حال ضیاء برنی نے اپنی تاریخ میں اِس طرح لکھا ہے۔

"دہم در بیشتر سنوات مذکور در شہر اباحتیان و بودھگان پیدا آمدند سلطان علاء الدین فرمود تا بہ تتبع و تفحص بلیغ ہر ہمہ را بدست آوردند و بہ بدترین سیاست بکشتند"

ضیاء برنی ان لوگوں کے افعال ناستودہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا لیکن فرشتہ ان کے اعمال ناشایستہ کی طرف بھی اشارہ کرتا اور کہتا ہے کہ

"بسمع سلطان رسید کہ جمعے از مردم اباحتیان در دہلی جمع گشتہ اند و در سالے یک شب چنانکہ داب ایشان است مجمعے ساختہ باذن وخواہر و مادر و جمیع محارم فراہم می آیند سلطان ارہ سیاست بہ فرق ایشاں کشیدہ اثرے ازاں جماعت نہ گذاشت"

سلطان نے جب ملک کافور کو چوتھی مرتبہ دیوگیر کی جانب رخصت کیا ہے تو وہ بیمار تھا اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے بہت ناراض تھا کیونکہ وہ اِس بیماری میں سلطان کی تیمارداری کی کچھ زیادہ پرواہ نہ کرتے تھے اُدھر ملک کافور کے اس اثر و اقتدار کو بھی سب ناپسند کرتے تھے مگر سلطان کی وجہ سے دم بخود تھے۔ ملک کافور کو ایک نامرد غلام سمجھ کر تمام سردار بنظر حقارت دیکھتے اور کسی تکریم و التفات کا مستحق نہ سمجھتے تھے۔ سلطان کو اس بات کی ضد تھی کہ میں چونکہ اسکے حال پر مہربان ہوں لہذا سب کو اس کی عزت کرنی چاہیے۔ اِسی لیے اُس نے تمام اُمراء سے اُس کا مرتبہ بلند کیا اور اُسی کے ہاتھ پر دکن کا تمام ملک فتح کرایا۔ صرف خواجہ حاجی بخشی فوج ہی ایک ایسا بے نفس اور نیک دل سردار تھا جو اس معاملہ میں بادشاہ کی منشار کی تعمیل دل سے کرتا تھا اسی لیے بادشاہ نے ہر مرتبہ ملک کافور کے ساتھ اِسی جہاندیدہ اور سرد و گرم چشیدہ افسر کو بھیجا جس نے سلطان کی منشار کے موافق اپنی قابلیت کا اظہار کیا۔ الغ خاں ثانی جو گجرات کا حاکم تھا ملک کافور سے بیحد متنفر تھا اسی طرح ولیعہد سلطنت خضر خاں اور بادشاہ کے دوسرے بیٹے بھی ملک کافور کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے بادشاہ چونکہ جاہل اور خوشامد سے جلد متاثر ہونے والی طبیعت رکھتا تھا لہذا ملک کافور بادشاہ کی خوب خوشامد کرتا اور اپنی وفاداری و فداکاری کا یقین سلطان کو دلاتا رہتا تھا بنا بریں سلطان گویا

بالکل ملک کافور کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اِس چالاک غلام نے سلطان کے دل پر اپنا سکہ جما کر اُسکو دوسرے
سرداروں اور بیٹوں کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ سلطان کے بیٹے تھے بھی نالائق ہی
سلطان کے مرض میں طوالت ہوئی اور بیوی بیٹوں نے اِس حالت میں سلطان کی تیمارداری اور اپنے فرائض
کی ادائگی میں کوتاہی کی لہذا سلطان پہلے سے بھی زیادہ کافور کی طرف ملتفت اور بیٹوں کی طرف سے متنفر
ہوتا گیا۔ آخر ۷۱۵ھ میں سلطان نے ملک کافور کو دیوگیر سے اور الغ خاں کو گجرات سے طلب کیا۔ الغ خاں کو
دہلی کی جانب روانہ ہونے میں دیر ہوئی اور ملک کافور پہلے پہونچگیا، ملک کافور نے اس مرتبہ پادشاہ کو بیمار
اور بہت ضعیف پایا اُس نے رات دن پادشاہ کی خدمت میں رہ کر اس کا دل اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور
خضر خاں وشادی خاں دونوں بڑے شہزادوں کی طرف سے پادشاہ کو بدگمان کرنا شروع کیا ساتھ ہی الغ
خاں کی شکایت وسعایت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ پادشاہ نے الغ خاں کو قتل اور خضر خاں وشادی
خاں دونوں شہزادوں کو گوالیار کے ... قلعہ میں قید کر دینے کا حکم دیا ملک کافور نے دونوں شہزادوں کو گوالیار کے
قلعہ میں بھیجکر قید کر دیا اور اپنے آدمی بھیجکر الغ خاں کو جو دہلی کی جانب آرہا تھا راستے ہی میں قتل کرا دیا۔ الغ خاں کے ساتھ
اُسکے بھائی کو بھی قتل کرا دیا۔ ۶ر شوال ۷۱۶ھ کو رات کے وقت سلطان علاء الدین نے وفات پائی۔ بعض
لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ملک کافور (ملک نائب) نے پادشاہ کو زہر دیکر مار ڈالا۔ ملک کافور نے پہلے ہی یہ
انتظام کر لیا تھا کہ ایک دستاویز لکھ کر سلطان کی مُہر اُس پر لگوائی تھی یہ دستاویز سلطان کی طرف سے جمیع
اُمرا کے نام تھی جس میں لکھا تھا کہ میں نے خضر خاں کو ولیعہدی سے معزول کر دیا ہے میرے بعد میرا سب سے چھوٹا
بیٹا شہاب الدین تخت نشین کیا جائے شہاب الدین کی عمر اسوقت صرف پانچ چھ سال کی تھی ملک کافور کو پہلے ہی
وزارت عظمٰی کا عہدہ حاصل تھا۔ اُس نے ۷ر شوال کو دہلی کے موجودہ سرداروں کو دربار شاہی میں بلوا کر سلطان کا
مذکورہ وصیت نامہ سُنایا اور اس چھوٹے بچے کو تخت پر بٹھا کر سب سے اُسکی بیعت کرائی اور کاروبار سلطنت اپنے
ہاتھ میں لیا۔ سلطان علاء الدین کی سلطنت کے تمام حالات مختصر طور پر بیان ہو چکے ہیں پڑھنے والے خود نتائج اخذ
کریں اس جگہ کسی ریویو یا تنقید وتبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

شہاب الدین ابن علاء الدین خلجی وملک کافور

ملک کافور روزانہ تھوڑی دیر کے لیے
شہاب الدین کو تخت پر لاکر بٹھاتا اور پھر
اُسکی ماں کے پاس محل کے اندر بھجوا دیتا خود احکام وفرامین جاری کرتا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ سلطان علاء الدین
کے بعد ملک کافور ہی براعظم ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا۔ اس نے گوالیار میں اپنے معتمدوں کو بھیجکر
خضر خاں وشادی خاں دونوں شہزادوں کی آنکھیں نکلوالیں خواجہ سراؤں اور ہندوؤں کو اپنا

مصاحب و مشیر بنایا۔ انہی لوگوں کو بڑے بڑے عہدے دیکر ایسی تدبیریں سوچنے لگا کہ علاء الدین خلجی کے خاندان کی بیخکنی کرنے کے بعد خود تاج شاہی سر پر رکھے۔ خاندان علائی میں صرف ایک شہزادہ مبارک خاں ایسا باقی رہ گیا تھا جسکی عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی اور اُسکی طرف سے اندیشہ ہو سکتا تھا چنانچہ اُس کو بھی ملک کافور نے قید کر دیا تھا اب اُس نے ایک روز قصر ہزار ستون کے محافظوں میں سے دو شخصوں کو مامور کیا کہ شہزادہ مبارک خان کو قید خانہ میں جا کر قتل کر دیں یا اُسکی آنکھیں نکال لائیں۔ اِن دونوں شخصوں کو شہزادہ پر رحم آگیا اُنھوں نے دوسرے سپاہیوں کو بھی اپنے مشورہ میں شریک کر کے اگلے روز جبکہ ملک کافور اپنے رازدار خواجہ سراؤں کے ساتھ چوسر کھیلنے میں مصروف تھا اُس پر حملہ کیا اور قتل کر ڈالا۔ اِس طرح سلطان علاء الدین کی وفات سے ۳۵ روز کے بعد ملک کافور کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ قید خانہ سے شہزادہ مبارک خاں کو نکالکر ملک کافور کی جگہ شہاب الدین کا وزیر بنایا گیا۔ مبارک خاں نے دو مہینے تک اپنے چھوٹے شش سالہ بھائی شہاب الدین کی وزارت و نیابت کا کام انجام دیا آخر اُمراء کے مشورہ سے اُس نے خود تخت سلطنت پر بیٹھ کر تاج شاہی اپنے سر پر رکھا اور شہاب الدین بے گناہ کو بھی اندھا کر کے اپنے دونوں بڑے بھائیوں خضر خاں و شادی خاں کے پاس قلعہ گوالیار میں بھیجدیا۔ اِس طرح یہ تینوں نابینا شہزادے گوالیار کے قلعہ میں جمع ہو گئے۔ مبارک خاں نے تاج شاہی اپنے سر پر رکھکر اپنا لقب سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی رکھا۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی

قطب الدین مبارک شاہ جب تخت نشین ہوا ہے تو سلطان علاء الدین کے دو تین اور بھی نہایت خورد سال چھوٹے بچے فرید خاں و منگو خاں و عمر خاں موجود تھے اُن کو اُس نے نہایت محبت اور غور و پرداخت کے ساتھ رکھا۔ لوگوں کو انعام و اکرام سے مالامال کر دیا۔ اٹھارہ ہزار قیدیوں کو جو دہلی اور دہلی کے قرب و جوار میں قید تھے رہا کر دیا۔ اور ایک حکم عام تمام ملک میں جاری کیا کہ ہماری تخت نشینی کی خوشی میں تمام قیدی آزاد کر دیے جائیں۔ سلطان علاء الدین کی وفات کے بعد تین مہینے سے کچھ زیادہ دنوں تک جو بد انتظامی کاروبار سلطنت میں واقع ہوئی تھی اُسکا صرف یہ اثر ظاہر ہوا کہ گجرات کی فوج نے جو الغ خاں کے قتل کی وجہ سے ناراض تھی بغاوت اختیار کی یہ بغاوت جلد فرو ہو گئی نیز دیوگیر و علاقہ مرہٹ میں رامدیو کے داماد ہرپال دیو نے علم بغاوت بلند کیا۔ باقی تمام انتظام ملک کا بدستور قائم رہا۔ قطب الدین مبارک شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی بغاوتوں کے تمام امکانات جاتے رہے۔ عین الملک ملتانی کو گجرات بھیجا گیا اُس نے وہاں کی بغاوت کو فرو کیا اسکے بعد ظفر خاں کو جسکی بیٹی سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے شادی کی تھی گجرات کا حاکم بنا کر بھیجا ظفر خاں نے گجرات کا بہت اچھا انتظام کیا اور سرکشوں کا چن چن کر استیصال کیا۔

گجرات کا ایک ہندو بچہ جسکو سلطان علاء الدین کے ایک سردار ملک شادی خاں نے پرورش کرکے اسکا نام حسن رکھا تھا۔ سلطان نے اُس کو خسرو خاں کا خطاب دیا۔ اس خسرو خاں کی نسبت عام طور پر مورخین نے لکھا ہے کہ بروا یا برواری قوم سے تعلق رکھتا یعنی ملک کافور کا ہم قوم تھا۔ راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند اپنی تاریخ میں خسرو خاں کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"اصل نام اس ہندو بچہ کا کسی تواریخ میں نہیں ملتا"

سبحان رائے بھنڈاری بٹالوی اپنی تاریخ میں خسرو خاں کو "خدمت گار بچہ" لکھتا ہے۔ خسرو خاں کا ایک اور بھائی بھی تھا جو خسرو خاں کی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا مگر اُسکا باپ دوسرا تھا۔ اُس کا نام حسام الدین تھا۔ بادشاہ نے خسرو خاں اور حسام الدین دونوں ہندو بچوں پر خصوصی عنایت مبذول فرمائی۔ عہد علائی کے اکثر آئین منسوخ کر دیے مگر شراب خواری کے متعلق شاہی حکم بدستور جاری رکھا۔ ملک دکن یعنی علاقہ مرہٹ میں ہرپال دیو نے خوب طاقت حاصل کر لی تھی تخت نشینی کے دوسرے سال قطب الدین مبارک شاہ خلجی فوج لیکر دہلی سے دیوگیر کی جانب روانہ ہوا اور دہلی میں ملک شاہین نام ایک غلام کو وفاء الملک کا خطاب دیکر اپنا قائم مقام بنا گیا۔ دیوگیر پہنچکر شاہی افواج نے ہرپال دیو اور اسکے معاونین کو شکست دیکر گرفتار کیا۔ قلعہ دیوگیر کے دروازہ کے سامنے ان باغیوں کو قتل کیا گیا۔ سلطان نے دیوگیر میں خسرو خاں کو وزارت کا عہدہ دیکر دکن کا انتظام سپرد کیا۔ ملک دکن میں جا بجا تھانے بٹھائے دیوگیر میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ خسرو خاں کو چتر و دورباش عطا کرکے ملک کافور کی تمام املاک کا مالک قرار دیا اور ملک دکن کے تمام ماتحت راجاؤں کی نگرانی اور اُن سے خراج وصول کرنے کا اہتمام اُسکے سپرد ہوا۔ ظفر خاں کو بلا جرم محض خسرو خاں اور اُسکے ہم قوموں کی شکایت پر قتل کرا کر گجرات کی حکومت خسرو خاں کے بھائی حسام الدین کو سپرد کی۔ اس طرح گجرات و دکن پر ان دونوں ہندو زادوں کو متصرف و فرمانروا بنا کر یہ دیوگیر سے دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ اس جدید انتظام اور شغل پرستی سے امراء میں بڑی بد دلی پیدا ہوئی۔ دیوگیر اور دہلی کے درمیان بعض امرا نے یہ سازش کی کہ سلطان قطب الدین کو قتل کرکے سلطان علاء الدین کے بھتیجے اور بھائی ملک اسد الدین کو بادشاہ بنانا چاہیے اس سازش کا حال سلطان کو معلوم ہوا تو اُس نے مقام ساگون گھاٹی میں ملک اسد الدین اور بعض دوسرے امرا کو قتل کرا دیا۔ اُجین پہنچکر ایک سردار کو گوالیار روانہ کیا کہ خضر خاں و شادی خاں و شہاب الدین کو جو اس سے پہلے اندھے ہو کر قید میں پڑے تھے قتل کر دے۔ چنانچہ ان تینوں شہزادوں کو گوالیار میں قتل کیا گیا۔ خضر خاں کی بیوی دیول دیوی کو دہلی پہنچکر قطب الدین مبارک شاہ نے اپنی بیوی بنایا۔ دہلی پہنچکر بھی بعض امرا کو جن پر بغاوت کا شبہ ہو سکتا تھا قتل کرا دیا چنانچہ وفاء الملک شاہین بھی

قتل ہوا۔ اب تمام برِ عظیم ہند سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے زیرنگیں تھا۔ گجرات میں حسام الدین نے اپنی قوم کے ہندوؤں کو اپنے گرد فراہم کرکے بڑے بڑے عہدے عطا کیے اور اِس خیال خام میں مبتلا ہوا کہ خوب مضبوط ہو کر خود مختاری و بغاوت کا اعلان کرے ادھر خسرو خاں نے دکن میں گونڈوانہ کے راجہ سے بغیر اسکے کہ اُس سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہو ایک سو ایک ہاتھی چھین لیے۔ پھر بیدر کے راجہ سے بیس ہاتھی اور بہت سا خزانہ زبردستی حاصل کیا اور ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کرکے یہ تجویزیں اور مشورے کرنے لگا کہ ملک دکن میں خود مختار ہو کر مستقل سلطنت قائم کرے۔ ضیاء برنی سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی بدانتظامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"ترک دادن ضوابط علائی در مسلمانان فسق و فجور رست و در ہندوان تمردی و سرکشی روئے نمود"

ملک کافور کے ہمدرد ہوا خواہ جس قدر موجود تھے وہ سب کے سب خسرو خاں کے پاس آکر جمع ہو گئے۔ ضیاء برنی خسرو خاں کی نسبت کہتا ہے کہ

"وشبہا مجلس خلوت می ساخت و با ابنائے ہندوئے خود و با چند بخائی از یاران ملک نائب کہ محرم خود گردانیدہ بود اندیشہ بلغاکی (بغاوت) می کرد"

ادھر گجرات و دکن میں حسام الدین و خسرو خاں ہندوؤں کی سلطنت دوبارہ قائم کرنیکی تجویزیں کر رہے تھے اُدھر دہلی میں سلطان نے نماز اور روزہ دونوں کو ترک کر دیا تھا اور لہو و لعب میں مصروف ہو کر سلطنت کے کاموں سے بے پرواہ ہو گیا تھا حسام الدین نے گجرات سے ایک مسخرہ کو سلطان کی خدمت میں بھیجدیا کہ وہ اِس نوجوان سلطان کو لہو و لعب کی طرف متوجہ رکھے۔ ضیاء برنی دربار سلطانی میں اس مسخرہ کے مستولی ہونے کی نسبت کہتا ہے کہ

"تو بہ نام گجراتی مسخرہ را در مجلس خود مستیلا داد و آں بھنڈ کم اصل ملوک را نام زن و مادر می گفت"

حسام الدین کی نسبت کہتا ہے کہ

"آں ولد الزنا مرتد گشت و در گجرات خویشاوندو اقربائے خود را جمع کردہ جملہ برادران نام گرفتہ گجرات بر خود گرد آورد و بغی ورزید و فتنہ انگیخت"

چونکہ گجرات میں طاقتور اُمرائے سلطانی موجود تھے اُنھوں نے جب دیکھا کہ حسام الدین نے بغاوت و سرکشی کی پوری تیاری کر لی ہے تو وہ آپس میں متفق ہو کر اس بغاوت کے فرو کرنے پر مستعد ہو گئے اور حسام الدین کو

ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع دیے بغیر گرفتار کر کے سلطان کے پاس دہلی بھیج دینے میں کامیاب ہو گئے۔ ان امراء کو توقع تھی کہ سلطان ہمارے اس حسنِ عمل سے خوش ہوگا لیکن سلطان بجائے خوش ہونے کے ناراض ہوا ان امرا کا مرتبہ گھٹا دیا اور حسام الدین کو عزت کے ساتھ اپنی مصاحبت میں داخل کر کے گجرات کی حکومت پر وحید الدین قریشی کو روانہ کیا۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ گجرات میں ہندوؤں کی بغاوت کا خطرہ جاتا رہا مگر مسلمان امرا میں بددلی ترقی کرتی رہی خسرو خاں نے دکن میں اپنی خودمختاری کا منصوبہ مستحکم کر کے بندرگاہوں کے مسلمان سوداگروں کے اموال چھیننے اور ان کو قتل کرنے میں کوئی باک نہیں کیا اور اس بات کے درپے ہوا کہ شاہی سرداروں کو جو اُسکے ہمراہ تھے قتل کر کے علم استقلال بلند کرے۔ ان حالات کا علم چندیری کے عامل ملک تیمور اور ملک گل افغان اور ملک تلبغہ حاکم کوا کو جو بطور کمکی مامور تھے معلوم ہوا اُنھوں نے خسرو خاں کو لکھا کہ ہمکو تمھاری نیت درست نہیں معلوم ہوتی اور ہمارے پاس ایسی شہادتیں موجود ہیں جن کی تردید نہیں کیجا سکتی لہذا مناسب یہ ہے کہ تم معبر و ملیبار کی جانب سے فوراً دیوگیر پہنچو اور تمام ہاتھی اور خزانہ جو تمھارے پاس جمع ہے دہلی کی جانب روانہ کرو۔ خسرو خاں نے اس میں لیت و لعل کیا مگر ان ہمراہی امرا نے نہایت مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ خسرو خاں کو مجبور کیا کہ وہ ہاتھ پاؤں نکالنے سے پیشتر دیوگیر میں واپس آئے اُدھر بادشاہ کو اطلاع دی کہ ہم نے خسرو خاں کے فاسد ارادوں سے مطلع ہو کر اسکو دیوگیر میں مجبور کر کے بٹھا دیا ہے۔ شاہی فرمان پہنچا کہ اُس کو جسقدر جلد ممکن ہو بہ حفاظت ہمارے پاس پہونچا دو۔ چنانچہ پالکی میں سوار کر کے دیوگیر سے دہلی تک صرف آٹھ دن کے عرصہ میں خسرو خاں کو پہونچا دیا گیا۔ خسرو خاں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر نمک حلال سرداروں کی شکایتیں کیں اور کہا کہ اُنھوں نے محض حسد اور رشک کی راہ سے مجھ کو بغاوت کے جرم میں متہم کیا ہے۔ ملک تیمور و ملک تلبغہ بھی بعد میں دہلی پہونچے اور تمام واقعات بادشاہ کو سنا دیے۔ اُن کو اُمید تھی کہ بادشاہ اس حسنِ خدمت کے عوض کہ ہم نے فتنہ کو سر اُبھارنے سے پہلے ہی دبا دیا ہے ہمارا مرتبہ بڑھائے گا مگر بادشاہ نے خسرو خاں کی پُرفریب باتوں کو صحیح سمجھ کر ان امیروں کو مجرم قرار دیا۔ ملک تیمور کو چندیری کی حکومت سے معزول کر کے چندیری کا علاقہ خسرو خاں کی جاگیر میں شامل کر دیا اور ملک تلبغہ کو بندر کوا کی حکومت سے برطرف کر کے قیدخانہ میں ڈال دیا دوسرے سرداروں کو بھی جنھوں نے خسرو خاں کے خلاف گواہیاں دی تھیں سزائیں دی گئیں۔ اس طرزِ عمل کا یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد کسی کو بھی خسرو خاں یا اُسکے بھائی کے خلاف کوئی لفظ زبان تک لانے کی جرأت نہ ہوئی خسرو خاں کی جگہ دکن میں دوسرے سردار مامور کر دیے گئے اور خسرو خاں بادشاہ کی خدمت میں رہ کر وزیر اعظم اور مدار المہام سلطنت کی حیثیت سے کاروبار سلطنت انجام دینے لگا۔ تمام سرداران سلطنت مجبوراً خسرو خاں کی رضاجوئی کو

اپنی حفاظت کے لیے ضروری سمجھنے لگے۔ اب خسرو خاں کو احساس ہوا کہ دکن یا گجرات سے بڑھ کر مجھ کو دہلی میں سلطنت اسلامیہ کے برباد کر دینے کا موقع میسر آ سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے سلطان کو بالکل اپنے ہاتھ میں لینے کی پیش از پیش کوششیں کیں۔ ملک کافور کا مکان اور تمام جائداد و سامان تجمل اُسکو پہلے ہی مل چکا تھا ملک کافور کے مشیر و ہوا خواہ ہندو سب اُسکے متوسلین میں شامل ہو گئے تھے ملک کافور اسی کی قوم اور اُسی کے وطن کا آدمی تھا۔ ملک کافور کی ناکامی و بربادی کی تمام کیفیت وہ دیکھ چکا تھا۔ روزانہ ملک کافور کے مکان میں جو آجکل خسرو خاں کا مکان تھا ہندو رات کے وقت جمع ہوتے اور مشورے کرتے تھے۔ خسرو خاں نے بڑی احتیاط اور نہایت چالاکی کے ساتھ تمام ان لوگوں کو جو اُسکے حصول مقصد میں سد راہ نظر آتے تھے ایک ایک کر کے دہلی سے جدا کر دیا کسی کو قید کسی کو قتل کرایا کسی کو دور دراز کے صوبوں میں بھجوا دیا۔ پرانے زمانے کے اُن امیروں کو جن کو کسی نہ کسی وجہ سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی سے عناد تھا دہلی میں بلا کر عہدے سپرد کیے گئے۔ جن لوگوں پر سلطان قطب الدین نے ظلم کیے تھے اُن پر احسان و انعام کی بارشیں کر کے اپنا ہمدرد اور بعض کو راز دار بھی بنا لیا۔ اس خفیہ انتظام کے بعد خسرو خاں نے ایک روز بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھ پر حضور کی انتہا سے زیادہ مہربانیاں مبذول ہیں اور حضور کی نظر التفات کا نتیجہ ہے کہ میں ایک ادنیٰ درجہ سے ترقی کر کے وزارت عظمیٰ اور سلطنت کی مدار المہامی کے بلند ترین مرتبہ تک فائز ہو گیا ہوں تاہم قدیمی اُمراء مجھکو خاطر میں نہیں لاتے کیونکہ جس طرح اور قدیمی اُمراء کے عزیز و اقارب اور رشتہ داروں اور حامیوں کی جمعیتیں شہر میں موجود ہیں میرے ہمقوموں اور رشتہ داروں کی کوئی جمعیت نہیں ہے۔ اگر بادشاہ اجازت مرحمت فرمائیں تو میں بھی اپنے رشتہ داروں کو شاہی انعام و اکرام اور منصب و جاگیر کی توقع دلا کر اپنے وطن سے بلوا لوں اور اس طرح میرا اثر و اقتدار بھی میرے عہدے کے موافق شہر میں قائم ہو جائے اور بادشاہ جب مجھ کو کسی مہم پر مامور کرے تو میں اپنے ہمقوم لشکر کی مدد سے پوری آزادی اور اطمینان کے ساتھ اس مہم کو سرانجام دے سکوں۔ بادشاہ نے خسرو خاں کی اس درخواست کو بلا تامل بخوشی منظور کر لیا اور اس نے اپنے چچا رندھول اور جاہر دیو وغیرہ کو گجرات بھیجکر بیس ہزار گجراتیوں کو دہلی بلوا کر اپنی خاص فوج میں بھرتی کیا اور بقیہ نواح دہلی کے ہندوؤں کو اپنی جمعیت میں شامل کر کے چالیس ہزار کا لشکر نہایت خوشی کے ساتھ مرتب کر لیا۔ اس واقعہ کو ضیاء برنی ان الفاظ میں روایت کرتا ہے کہ

"وپیش از انکہ خسرو خاں عذر بہ کند پیش سلطان گذرانیدہ بود کہ من از دولت خداوند عالم بزرگ شدہ ام و در مہمات دور دست نامزد می شوم و ملوک و امراء خویش و قرابت و خیلخانہ دارند و من ندارم اگر مرا از پیش فرمان شود و بیائے خود را در زمین گجرات بفرستم تا چند قرابت نزدیک مرا بہ اُمید مرحمت

پادشاہ پیش گیرد پیارہ سلطان ہست و غافل آں ... ازیں بہانہ برادران تمام گرفتہ
گجراتیان را برتو آورد و بہانہ آنکہ از ایشان ... کشیدہ ایشاں را اسپ و جامہ می داد
و با قوت و شوکت می گردانید"

فرشتہ لکھتا ہے کہ

"سلطان التماس او را مبذول داشتہ رخصت طلب ... داشت خسرو خاں بایں بہانہ اکثر
ہندوہائے گجرات، اکثر اوقات گذران نداشتہ بہیرگونہ تسلی نمودہ قریب بیست ہزار گجراتی ہندو جمع ساختہ
ہر چہ داشت صرف ایشاں کردہ با اسپ و یراق ایشاں را آراستہ ... و قوت و مکنت تمام پیدا کردہ
از گجراتیان وغیرہ چہل ہزار سوار اعوان و انصار خود ... گشت"

دہلی میں خود مختار اسلامی سلطنت کے قائم ہونے کے بعد یہ پہلا ہی موقع تھا کہ بغیر علم ہندوستان کے
شہنشاہ کی اجازت سے چالیس ہزار سواروں کی ہندو فوج جمع ہو گئی ملک بہاء الدین دبیر سے بادشاہ ناراض
تھا اور اسکو قتل کرنا چاہتا تھا خسرو خاں نے اسکی سفارش کرکے اسکو قتل ہونے سے بچا لیا اور اس
احسان کے بعد اس پر اور بھی احسانات کرکے اپنا ہوا خواہ بنا لیا اسی طرح کئی مسلمان نالائقوں کو اپنے ظل حمایت
میں لیکر سلطان کے خلاف سازشوں میں شریک کار بنایا دہلی کے با اثر امراء میں صرف ایک قاضی ضیاء الدین
ایسا شخص تھا جو سلطان سے آزادانہ گفتگو کر سکتا اور سلطان کا سچا ہمدرد تھا۔ قاضی ضیاء الدین بادشاہ کا
اوستاد اور قاضی خاں کے نام سے مشہور تھا کوشک سلطانی یعنی قصر ہزار ستون کے دروازوں کی حفاظت
بھی اسی کے سپرد تھی۔ دہلی کے مسلمان ہندوؤں کے اس اقتدار اور ان کی قوت و شوکت اور فاسد ارادوں سے
واقف تھے مگر کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ سلطان کی خدمت میں خسرو خاں کے خلاف ایک لفظ بھی زبان تک
لائے۔ انہی ایام میں سلطان بغرض شکار دہلی سے سرساوہ کی طرف گیا وہاں خسرو خاں اور دوسرے ہندوؤں نے
ارادہ کیا کہ سلطان کو شکار کھیلتے ہوئے جنگل میں قتل کر دیا جائے مگر خسرو خاں کے بعض ہمدردوں نے اس کی
مخالفت کی اور کہا کہ یہ کام ہمکو قصر سلطانی میں انجام دینا چاہیئے تاکہ دہلی پر قبضہ ہو۔ اگر یہاں قتل کیا گیا تو ممکن ہے
کہ دہلی پر قبضہ کرنا دشوار ہو اور مسلمان سردار ہمارے تخت سلطانی تک پہونچنے سے پہلے مخالفت پر اٹھ کھڑے
ہوں۔ سلطان سرساوہ سے دہلی آیا اور قاضی خاں نے شہر کی عام افواہوں سے متاثر ہو کر سلطان کی خدمت
میں عرض کیا کہ ہندو فوج کی کثرت خطرہ سے خالی نہیں ہے میں نے سنا ہے کہ روزانہ خسرو خاں کے مکان میں ہندو
جمع ہو کر مشورے کرتے ہیں اور خسرو خاں کا ارادہ ہے کہ سلطان کو قتل کرکے خود بادشاہ بن جائے آپ کم از کم اتنا تو
کریں کہ خسرو خاں کی فوج کے بعض گجراتی ہندوؤں کو اپنے پاس تنہائی میں بلا کر ان سے اس معاملہ کی نسبت

استفسار فرمائیں ممکن ہے کہ وہ خوف سلطانی سے پوست کندہ حالات بیان کر دیں اور کوئی فتنہ برپا ہونے
والا ہے تو اس سے آپ اپنی حفاظت کر سکیں اگر میری نسبت غلط ثابت ہو تو پھر سلطان کو اختیار حاصل
ہے کہ از راہ قدردانی اسکی عزت بڑھائیں۔ انشاء اللہ فرمائیں۔ ابھی قاضی خاں یہی بات ختم کرنے نہ پایا تھا
کہ خسرو خاں بھی حاضر ہو گیا۔ سلطان نے قاضی خاں کے سامنے ہی خسرو خاں کو مخاطب کر کے کہا کہ تیری
نسبت قاضی خاں ایسا ایسا کہہ رہا ہے۔ یہ سنکر خسرو خاں مکار نے فوراً رونا شروع کر دیا اور رو رو کر
کہنے لگا کہ یہ تمام مسلمان سردار چونکہ میرے دشمن ہو گئے ہیں کہ حضور نے مجھکو سب سے بلند مرتبہ عطا کر دیا ہے یہ
ضرور مجھکو حضور کے ہاتھ سے قتل کرا کر رہیں گے۔ ان سب کا مطلب یہی ہے کہ آپ بخوشی قتل کر دیں یہ کبھی چین سے
نہ بیٹھیں گے یہ کہکر اور بھی زیادہ زور زور سے رونے لگا۔ خسرو خاں کی یہ حالت دیکھ کر بادشاہ کا دل بھر آیا
اور اسکو اپنے سینے سے لگا کر کہنے لگا کہ تیری نسبت اور تیری قوم کی نسبت میں کسی کی شکایت کو ہرگز ہرگز
صحیح نہیں سمجھ سکتا تجھکو بالکل مطمئن رہنا چاہئیے۔ یہ دیکھ کر قاضی صاحب بادشاہ کی حماقت پر افسوس
کرتے ہوئے اپنا سا منہ لیکر چلے آئے اور اُن کو بھی خسرو خاں یا دوسرے ہندوؤں کی نسبت بادشاہ سے کچھ
کہنے کی جرأت نہ رہی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ

"پادشاہ را از گریہ او دل بدرد آمدہ او را در کنار گرفت و بوسہ بر رخسارہ اش دادہ گفت کہ خاطر
جمع دار"

اِس واقعہ کے اگلے روز خسرو خاں نے زیادہ تامل کرنا مناسب نہ سمجھ کر سلطان کے قتل کرنے کا مصمم
ارادہ کر لیا اور رات کے وقت بعد عشاء قصر ہزار ستون کے بالاخانہ پر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نیچے
دروازوں کی نگرانی اور پہرہ بدلوانے کے لیے قاضی خاں موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد خسرو خاں کا چچا رندھول
مع جاہر دیو قاضی خاں کے پاس آیا اور پان کا بیڑا قاضی خاں کی خدمت میں پیش کیا۔ قاضی خاں رندھول سے
بیڑا لینے لگے تو جاہر دیو نے جو رندھول کے ساتھ آیا تھا نہایت پھرتی سے قاضی خاں کے پہلو میں خنجر بھونک کر
اُن کو شہید کر دیا اور مسلح ہندوؤں کی ایک جمعیت نے فوراً داخل ہو کر پہرہ والوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ جب
شور و غوغا صحن میں بلند ہوا تو سلطان نے خسرو خاں سے پوچھا کہ یہ کیا شور ہے۔ خسرو خاں فوراً اٹھ کر لب بام آیا
اور تھوڑی دیر تامل کر کے سلطان کے پاس واپس گیا اور کہا کہ اصطبل کے چند گھوڑے کھل گئے ہیں وہ صحن میں چھوٹے
بھاگے پھرتے ہیں اور لوگ اُن کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اسلئے شور مچ رہا ہے۔ سلطان یہ سنکر مطمئن ہو گیا اور خسرو
خاں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اسی وقت جاہر دیو اور دوسرے ہندو جو اس کام پر مامور تھے بالاخانے
پر چڑھنے لگے۔ زینہ کے دروازے پر ابراہیم اور اسحاق نامی دو پہرہ دار موجود تھے انھوں نے ان کو روکنا چاہا

لہٰذا دونوں مارے گئے اور قاتلوں کی یہ جماعت اوپر پہنچ گئی ابراہیم اور اسحاق کے مزاحمت کرنے اور قتل ہونے کا
شور چونکہ قریب ہی تھا سلطان کو کچھ شک پیدا ہوا قاتلوں کی اس جماعت کو بے محابا شمشیر بدست آتے ہوئے
دیکھ کر سلطان فوراً اٹھا اور محلسرائے کی طرف بھاگنے لگا۔ خسرو خاں نے سمجھا کہ اگر سلطان محلسرائے کے اندر
داخل ہو گیا تو پھر اسکے پکڑنے اور قتل کرنے میں دقت ہو گی لہٰذا وہ فوراً سلطان کے پیچھے بھاگا اور محلسرائے
کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی سلطان کو جا لیا۔ سلطان اپنے سر پر لمبے لمبے بال رکھتا تھا خسرو
خاں کے ہاتھ میں سلطان کے بال آ گئے۔ سلطان طاقتور تھا اس نے فوراً خسرو خاں کو زمین پر پٹک دیا مگر خسرو
خاں نے سلطان کے بال نہ چھوڑے۔ خسرو خاں نیچے پڑا تھا اور سلطان اسکے اوپر تھا مگر بالوں کی وجہ سے اٹھکر
بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اسی حالت میں جاہریو پہنچ گیا اور دونوں کو گتھم گتھا دیکھ کر رات کی تاریکی کے سبب
متامل ہوا کہ کہیں میرے ہاتھ سے خسرو خاں زخمی نہ ہو جائے۔ خسرو خاں نے پکارا کہ میں نیچے پڑا ہوں میرے اوپر
سلطان ہے جلدی اپنا کام کرو ورنہ میرا کام تمام ہو جائیگا۔ جاہریو نے سلطان کے پہلو میں خنجر بھونک دیا اور پھر
اسکا سر کاٹ کر نیچے قصر ہزار ستون کے صحن میں اوپر سے پھینک دیا۔ اسکے بعد خسرو خاں، رندھول، اور جاہریو
اور دوسرے ہندو محلسرائے سلطانی میں داخل ہوئے وہاں سلطان علاء الدین خلجی کی بیوی اور دوسری بیگناہ
عورتوں کو قتل کر کے فرید خاں و منگو خاں، و عمر خاں پسران سلطان علاء الدین کو قتل کیا اور خاندان علائی
کے کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑا۔ اسی وقت جبکہ آدھی رات ہو چکی تھی تمام امراء کو قصر ہزار ستون میں بلا توقف
حاضر ہونے کا حکم بھجوایا جب تمام امراء جمع ہو گئے تو ان سب کو گرفتار و نظر بند کر لیا صبح ہوئی تو خسرو خاں نے
تاج شاہی سر پر رکھ کر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ امراء نے اطاعت قبول کی جن کی نسبت کچھ شبہ تھا ان کو قتل
کرا دیا۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی شب پنجم ربیع الاول ۷۲۱ھ کو ہندوؤں کے ہاتھ سے شہید ہوا۔
چار سال اور چند ماہ سلطنت کی۔

خسرو خاں نمک حرام

ضیاء برنی اپنی تاریخ میں اس حادثۂ الم انگیز کو درج کرتے ہوئے جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کر رہے ہیں ان الفاظ کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔

"و بعد آنکہ خسرو خاں و برادران از کار غدر فارغ شدند و ملوک و امرائے دولت بر بام ہزار ستون
آوردند و در نظر خود داشتند و صبح بدمید و آفتاب برآمد خسرو خاں ملعون خود را سلطان ناصر الدین خطاب
کرد۔ آنچنان غلام بچہ و برادر بچہ ولد الزنا از موت برادران و ہندوان بر تخت علائی و قطبی نشست و روزگار
غدار نابکار شغال بچہ را بجا و را بر جائے شیران نشستن روا داشت و خوک بچہ و سگ صفت را بر تخت پیلان

صف شکن برادرنگ صفدران تہمتن بہ پسندید دہم در ساعت جلوس آں ملعون ولعون بچہ دمابون ومابون زادہ فرمان داد تا چند نفر غلامان سلطان قطب الدین راکہ اختصاص براو داشتند وازامرائے کبار شدہ بودند بگیرند وبکشند در روز بعضے از ایشان را در خانہائے ایشان کشتند وبعضے در سرائے آوردند ودر گوشہ بردند وگردن زدند وخانمان وزنان وغلام وکنیزک ایشاں بہ برواران وہندوان بخشیدند وخانہ قاضی ضیاء الدین را با جمیع اسبابیکہ درخانہ او بود خارج ازاں بچہ کہ ہم در اول شب فرار نمودہ بودند بہ رندھول دادند۔

خسرو خاں پہلے ہی تمام اہتمام کرچکا تھا جو صوبہ دار دور دراز کے صوبوں میں مامور تھے اُن کے اکثر عزیز و اقارب دہلی میں موجود تھے اِن سب کی نگرانی اور دیکھ بھال کا بندوبست کیا گیا تاکہ یہ لوگ دہلی سے فرار نہ ہوسکیں اور وہ صوبہ دار اپنے اِن عزیزوں کی وجہ سے سرکشی پر آمادہ نہ ہوسکیں جن لوگوں کے اہل وعیال دہلی میں نہ تھے ان کے بیٹوں یا بھائیوں کو خسرو خاں نے پہلے ہی سلطان قطب الدین کے حکم سے بطور یرغمال دہلی بلوالیا تھا۔ لہٰذا اُسکو زبردست بغاوت کا اندیشہ نہ تھا۔ تمام صوبہ داروں میں سب سے زیادہ جس شخص کا خیال تھا وہ غازی ملک تغلق صوبہ دار دیپالپور تھا جو سلطان علاء الدین کے زمانے سے مغل افگنی کے سبب بڑی شہرت اور اثر رکھتا تھا۔ غازی ملک تغلق کا ذکر اوپر آچکا ہے اُسکا بیٹا ملک فخر الدین جونا خاں جو بعد میں سلطان محمد تغلق کے نام سے مشہور ہوا دہلی میں موجود تھا۔ خسرو خاں نے تخت نشین ہوتے ہی ملک جونا خاں کو امیر آخور کا عہدہ عطا کیا اور اُسکی سب سے زیادہ دلدہی اور خاطر مدارات کرنے لگا تاکہ اُس کا باپ غازی ملک مخالفت پر آمادہ نہ ہوسکے جاہر دیو کو جو قاضی خاں اور سلطان قطب الدین خلجی کا قاتل تھا زر وجواہر سے تلوایا گیا۔ رندھول کو رائے رایاں کا خطاب ملا۔ اپنے بھائی حسام الدین کو خان خاناں کا خطاب دیا قصر ہزار ستون اور سلطانی محلسرائے میں ہندو ہی ہندو نظر آنے لگے۔ دہلی میں پہلے ہی چالیس ہزار ہندو سواروں کی مسلح فوج موجود تھی مسلمانوں کی کوئی طاقت دہلی میں باقی نہیں رکھی گئی تھی جو مسلمان موجود تھے اُن کو خسرو خاں نے اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ اب بادشاہ ہوکر اُس نے ہندوؤں کی بھرتی شروع کردی۔ ہندوؤں میں جابجا خوشیاں منائی گئیں کہ دہلی پھر ہندوؤں کے قبضہ میں آگئی۔ دیول دیوی جو خضر خاں کے بعد سلطان قطب الدین مبارک شاہ کی بیوی بن گئی تھی اب سلطان کے قتل ہونے پر اُس کو خسرو خاں نے اپنی بیوی بنالیا۔ خسرو خاں کو اسلام سے پہلے ہی کوئی تعلق نہ تھا اب بادشاہ بننے کے بعد اُس نے اپنے نام کا تبدیل کرنا اسلیے مناسب نہ سمجھا کہ ملک میں بہت سے ایسے مسلمان سردار موجود تھے جن کو دہ فریب

صف شکن برادرنگ صفدران تہمتن بہ پسندید دہم در ساعت جلوس آں ملعون ولملعون بچہ
دما بون و مابون زادہ فرمان داد تا چند نفر غلامان سلطان قطب الدین را کہ اختصاص براو داشتند
وازامرائے کبار شدہ بودہ بگیرند و بکشند در روز بعضے از ایشاں را در خانہائے ایشاں کشتند
و بعضے درسرائے آوردند و در گوشہ بردند و گردن زدند و خانماں و زنان و غلام و کنیزک ایشاں
بہ برواراں وہندواں بخشیدند و خانہ قاضی ضیاء الدین را با جمیع اسبابیکہ درخانہ او جود خارج
از زن و بچہ کہ ہم در اول شب فرار نمودہ بودند بہ رندھول دادند۔"

خسرو خاں پہلے ہی تمام اہتمام کر چکا تھا جو صوبہ دار دور ودراز کے صوبوں میں مامور تھے
اُن کے اکثر عزیز و اقارب دہلی میں موجود تھے اِن سب کی نگرانی اور دیکھ بھال کا بندوبست کیا گیا تاکہ
یہ لوگ دہلی سے فرار نہ ہو سکیں اور وہ صوبہ دار اپنے اِن عزیزوں کی وجہ سے سرکشی پر آمادہ نہو سکیں
جن لوگوں کے اہل وعیال دہلی میں نہ تھے ان کے بیٹوں یا بھائیوں کو خسرو خاں نے پہلے ہی سلطان
قطب الدین کے حکم سے بطور یرغمال دہلی بلوا لیا تھا۔ لہٰذا اُسکو زبردست بغاوت کا اندیشہ نہ تھا۔ تمام
صوبہ داروں میں سب سے زیادہ جس شخص کا خیال تھا وہ غازی ملک تغلق صوبہ دار دیبالپور تھا
جو سلطان علاء الدین کے زمانے سے مغل افگنی کے سبب بڑی شہرت اور اثر رکھتا تھا۔ غازی ملک تغلق کا
ذکر اوپر آچکا ہے اُسکا بیٹا ملک فخر الدین جونا خاں جو بعد میں سلطان محمد تغلق کے نام سے مشہور ہوا دہلی میں
موجود تھا۔ خسرو خاں نے تخت نشین ہوتے ہی ملک جونا خاں کو امیر آخور کا عہدہ عطا کیا اور اُسکی سب
سے زیادہ دلدہی اور خاطر مدارات کرنے لگا تاکہ اُس کا باپ غازی ملک مخالفت پر آمادہ نہ ہو سکے جاہر
دیو کو جو قاضی خاں اور سلطان قطب الدین خلجی کا قاتل تھا زر و جواہر سے تلوایا گیا۔ رندھول کو رائے
رایاں کا خطاب ملا۔ اپنے بھائی حسام الدین کو خان خاناں کا خطاب دیا قصر ہزار ستون اور سلطانی
محلسرائے میں ہندو ہی ہندو نظر آنے لگے۔ دہلی میں پہلے ہی چالیس ہزار ہندو سواروں کی مسلح فوج موجود
تھی۔ مسلمانوں کی کوئی طاقت دہلی میں باقی نہیں رکھی گئی تھی جو مسلمان موجود تھے اُن کو خسرو خاں نے
اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ اب بادشاہ ہو کر اُس نے ہندوؤں کی بھرتی شروع کر دی۔ ہندوؤں میں جا بجا خوشیاں
منائی گئیں کہ دہلی پھر ہندوؤں کے قبضہ میں آگئی۔ دیول دیوی جو خضر خاں کے بعد سلطان قطب الدین
مبارک شاہ کی بیوی بن گئی تھی اب سلطان کے قتل ہونے پر اُس کو خسرو خاں نے اپنی بیوی بنا لیا۔
خسرو خاں کو اسلام سے پہلے ہی کوئی تعلق نہ تھا اب بادشاہ بننے کے بعد اُس نے اپنے نام کا تبدیل
کرنا اسلیے مناسب نہ سمجھا کہ ملک میں بہت سے ایسے مسلمان سردار موجود تھے جن کو وہ فریب

دیکر اپنی مخالفت سے باز رکھنے کا خواہاں اور بتدریج اسلامی سلطنت کو خالص ہندو سلطنت بنانا چاہتا تھا۔ باوجود ان تمام احتیاطوں کے خسرو اور حامیان خسرو کی پست فطرتی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ دہلی کی مسجدوں کو ہندوؤں نے مسلمانوں سے چھین لیا۔ مسجدوں کی محرابوں میں بت رکھے گئے اور مسجدوں کو مندر بنا کر ان میں گھنٹے بجنے اور بت پجنے لگے۔ اذان کی آوازیں بلند ہونی موقوف ہوئیں۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ بےجا حرکت ہوئی کہ مسلمانوں سے قرآن شریف زبردستی چھین چھین کر جمع کیے گئے۔ ان قرآن شریفوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر خسرو خاں کے دربار میں چھوٹے چھوٹے چبوترے بنائے گئے اور ان پر ہندو درباری بیٹھے۔ غرض ایسی ایسی کمینہ حرکات سرزد ہوئیں جن کے لکھنے کی تاب زبان قلم نہیں لاسکتی۔ خزانوں کے منہ ہندوؤں کے لیے کھول دیے گئے اور لاتعداد ہندو روزانہ آآکر فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ ملک جونا خاں ابن غازی ملک ڈھائی مہینے تک تو مجبوراً اس ہندوگردی کو دیکھتا اور برداشت کرتا رہا ایک روز موقع پاکر اور گھوڑوں کی ڈاک بٹھا کر وہ دہلی سے دیپالپور کی طرف بھاگا۔ چند گھنٹے کے بعد ملک جونا خاں کے فرار ہونے کا حال خسرو خاں کو معلوم ہوا، اس نے تعاقب میں سوار بھیجے مگر وہ ملک جونا خاں کی گرد کو بھی نہ پا سکے، ملک جونا خاں جب اپنے باپ غازی ملک کے پاس پہونچ گیا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے ولی نعمت سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے خون کا انتقام لینے کے لیے تیار ہوا۔ ملتان کے امیر کو لکھا کہ فوج لے کر میرے شریک ہوجاؤ تاکہ ہم دونوں ملکر خسرو خاں سے سلطان قطب الدین کا انتقام لیں۔ امیر ملتان نے لکھا کہ جو شخص دہلی کا بادشاہ ہوچکا ہے اسکا مقابلہ ہم جیسے چھوٹے امیروں سے کہاں ہوسکتا ہے۔ غازی ملک نے ملتان کے ایک رئیس بہرام ایبہ نامی کو ایک خط لکھا کہ امیر ملتان امارت کے قابل نہیں رہا تم اوسکو قتل کرکے ملتان کی حکومت اپنے قبضے میں لاؤ اور وہاں کی فوج لے کر میرے پاس چلے آؤ۔ بہرام ایبہ نے باسانی حاکم ملتان کو قتل کیا اور فوج لے کر غازی ملک کے پاس دیپالپور چلا آیا۔ غازی ملک نے فوج لیکر دہلی کی طرف کوچ کیا۔ خسرو خاں نے یہ خبر سن کر ایک زبردست فوج اپنے بھائی کی سرداری میں روانہ کی۔ سرستی کے قریب لڑائی ہوئی خسرو خاں کی فوج شکست کھاکر بھاگی۔ غازی ملک سرستی سے روانہ ہوکر اندرپرست کے خرابے میں پہونچکر خیمہ زن ہوا۔ خسرو خاں ہندوؤں کا لاتعداد لشکر لے کر شہر سے نکلا۔ غازی ملک کے مٹھی بھر مسلمانوں کے مقابلے میں یہ بے شمار ہندو فوج زد و خورد کا ہنگامہ گرم ہونے پر کچھ بھی نہ کرسکی اور حواس باختہ ہوکر بھاگی۔ خسرو خاں جب دہلی سے غازی ملک کے مقابلہ کو نکلا تھا تو اس نے تمام شاہی خزانے کو جو سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے سے ابتک

جمع ہوتا چلا آیا تھا نکلوا کر ہندوؤں کو تقسیم کر کے خزانہ میں تھا وہ دے دیا تھی۔ اسکو غازی ملک کا خوف تھا اس لیے اس نے یہ کہہ کر خزانہ ہندوؤں کو تقسیم کر دیا تھا کہ اگر ہماری فتح ہوئی تو پھر اس روپیہ کو اپنی سہ سالہ پیشگی تنخواہ سمجھو اور اگر ہم ہارے گئے تو کم از کم یہ روپیہ تو مسلمانوں کے ہاتھ نہ آسکیگا۔ خسرو خاں شکست خوردہ میدان سے فرار ہو کر ایک مقبرہ میں چھپا ہوا تھا، غازی ملک کے آدمیوں نے وہاں سے گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔ غازی ملک نے دہلی میں آکر تلاش کیا کہ شاہی خاندان کا کوئی فرد چھوٹی یا بڑی عمر کا ملے تو اسکو تخت پر بٹھائے، مگر خسرو خاں پہلے ہی شاہی خاندان کو ختم ہی کر چکا تھا۔ تب غازی ملک نے تمام مسلمان سرداروں کو جمع کر کے کہا کہ بھائیو میں تو صرف سلطان قطب الدین کا انتقام لینا چاہتا تھا اپنا کام پورا کر چکا اب تم جسکو مناسب سمجھو پادشاہ بنالو میں اسکی فرمانبرداری کے لیے تیار ہوں۔ سب نے بالاتفاق غازی ملک ہی کو اپنا سلطان منتخب کیا اور وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے دہلی کے تخت پر بیٹھ کر براعظم ہندوستان کا شہنشاہ بنا۔

قابل توجہ

سلطان قطب الدین ایبک کی وفات سے قریباً سو برس کے بعد سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں مسلمان براعظم ہندوستان کے پورے رقبہ پر حاکم و فرمانروا اور قابض و مسلط ہو گئے۔ اس تکمیل فتوحات کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی محکوم ہندو قوم کے افراد کو عدارت عظمیٰ اور سلطنت کی مدار المہامی کا بلند ترین عہدہ عطا کر دیا۔ ہندو قوم میں ایسے بزرگ و جلیل عہدے کی قابلیت مفقود تھی، تاہم مسلمانوں نے فتوحات سے فارغ ہوتے ہی ہندو قوم کو اپنی سیر چشمی و فیاضی اور خوش اعتمادی کا جو عملی ثبوت دیا وہ ہندوؤں نے کیا دنیا کی کسی محکوم قوم نے کبھی اپنے فاتحین سے نہ دیکھا ہوگا۔ یہ رواداری اور یہ مساوات مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم میں تلاش نہیں کی جاسکتی۔ ہندوؤں نے اس اعتماد اور اس فیاضی کے معاوضے میں جو چیز پیش کی اسکی تفصیل ابھی اس باب کے آخری حصہ میں قارئین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ مسلمانوں نے تمام براعظم ہند پر قابض و متصرف اور فرمانروا ہونے کے بعد بھی ہندوؤں کو اپنے مندروں میں عبادت کرنے اور گھنٹے بجانے سے نہیں روکا۔ لیکن خسرو خاں مرتد کی پنج ماہہ سلطنت میں ہندوؤں نے چیرہ دست ہو کر مسلمانوں کے معبدوں یعنی مسجدوں اور ان کی مذہبی کتاب قرآن مجید کے ساتھ جو سلوک کیا وہ سنہ ۷۲۱ھ تک کے ہندو حوصلوں کی بخوبی خبر دیتا ہے۔ سبحان رائے بھی چونکہ ہندو تھا لہذا اسکو اپنے ہم مذہبوں کی اس سفلہ مزاجی اور رذیلانہ حرکات کا حال معلوم کر کے ضرور شرم آئی ہوگی اسی شرم و ندامت کے تقاضے سے اسکو اپنی تاریخ میں خسرو خاں کی نسبت یہ اشعار درج کرنا پڑے کہ ؎

کسے راکہ نہ بود شرف در نہاد — نباشد عجب گر بود بدنہاد
سر ناکساں را برافراشتن — وز ایشاں امید بہی داشتن
سر رشتۂ خویش گم کردنست — بجیب اندروں مار پروردنست
دگر زندگانے توقع مدار — کہ در جیب و دامن دہی جائے مار

باب چہارم و جلد اوّل ختم شد

خاتمہ

حضرت مصنف مدظلہ نے اس کتاب کے دیباچہ طبع اول میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو اس کتاب کو مطالعہ کرتے وقت ان کتابوں کے ناموں کی ایک فہرست خود مرتب کر لے، جنکے اقتباسات اس کتاب میں موجود ہیں۔ جب اس طبع ثانی کی کاپیاں پڑھنے اور مسودہ کے ساتھ کاپیوں کا مقابلہ کرنے کا کام انجام دینا پڑا تو خیال آیا کہ میں ہی ایک ایسی فہرست مرتب کر کے کیوں نہ اس کتاب کے ساتھ شامل کر دوں۔ چنانچہ اس پہلی جلد میں جن جن تاریخوں کے حوالے یا اقتباسات درج کیے گئے ہیں یا بعض مقامات پر کتاب کا نام نہیں بلکہ مصنف یا مورخ کا نام لیکر اس کا قول نقل کیا گیا ہے اُن سب کے ناموں کی فہرست اس کتاب کی کاپیاں پڑھتے ہوئے میں نے مرتب کر لی۔ اس کتاب کا مقدمہ چونکہ ایک الگ حیثیت کی چیز ہے اور اُسکو بجائے خود ایک مستقل تصنیف کہا جا سکتا ہے لہذا میں نے مقدمہ سے تعلق رکھنے والی فہرست الگ اور ابواب کتاب کی فہرست الگ مرتب کی فہرست کے ان دونوں حصوں پر ایک نظر ڈالنے سے بیک وقت ان کتابوں اور ان مصنفوں کے نام سامنے آجائینگے جن کا حوالہ اس کتاب میں جابجا دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں ایسی ہونگی جن سے اس کتاب کی تصنیف میں مدد لیگئی ہے جیسا کہ دیباچہ میں اشارہ موجود ہے۔ اگر میری یہ ذرا سی خدمت کسی کو پسند آجائے تو میرے لیے دعائے خیر فرمائی جائے۔ والسلام

خاکسار محمد ایوب خاں منیجر مکتبہ عبرت نجیب آباد (یوپی)

جن کتابوں یا مصنفوں کا مقدمہ میں حوالہ دیا گیا ہے

(۱) قرآن مجید و فرقان حمید
(۲) حجۃ الاسلام
(۳) مروج الذہب و مصنفہ ابوالحسن علی المسعودی)
(۴) چچ نامہ
(۵) تاریخ ابن خلدون
(۶) تاریخ فرشتہ
(۷) سفرنامہ ابن بطوطہ
(۸) رسالہ عبرت
(۹) رسالہ معارف
(۱۰) تاریخ تبت

(۱۱) تاریخ مولوی ذکاء اللہ
(۱۲) سفرنامہ سلیمان سیرافی
(۱۳) سفرنامہ ابوزید سیرافی
(۱۴) عجائب الاسفار
(۱۵) تحفۃ المجاہدین
(۱۶) تمدن عرب (مصنفہ ڈاکٹر گستاولی بان فرانسیسی)
(۱۷) پریچنگ آف اسلام (مصنفہ ڈاکٹر ڈبلو ٹی آرنلڈ)
(۱۸) لائف آف محمدؐ (مصنفہ سر ولیم میور)
(۱۹) سفر شرق (مصنفہ مسٹر رہبان)
(۲۰) چیمبرز انسائیکلوپیڈیا۔
(۲۱) تاریخ چارلس پنجم (مصنفہ رابرٹسن)
(۲۲) تاریخ جنگ صلیبی (مصنفہ مسٹر رہبان)
(۲۳) میزان الحق (مصنفہ پادری فنڈر)
(۲۴) لیکچرز آن ہیروز (مصنفہ طامس کارلائل)
(۲۵) منوسمرتی یا منوشاستر
(۲۶) چینی سیاح ہیونگ شیانگ کا سفرنامہ
(۲۷) مصر کا اخبار موسومہ ایجپٹ
(۲۸) بیروت کا مسیحی اخبار الوطن
(۲۹) تاریخ ہند مصنفہ ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر صاحب
(۳۰) کیرل ایتبی
(۳۱) اشوک کی لاٹھوں کے کتبے
(۳۲) جنیوا یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ مونٹ
(۳۳) لڈولف کرہیل
(۳۴) موسیو سیلی
(۳۵) ای بلفورٹ فلاسفر
(۳۶) مارگولیتھ ترجمہ قرآن انگریزی راڈویل کا دیباچہ نگار
(۳۷) ڈاکٹر سموئیل جانسن
(۳۸) ریورنیڈ۔ ڈبلو اسٹیفن
(۳۹) جی ایم راڈویل مترجم انگریزی ترجمہ قرآن
(۴۰) جرمن مستشرق عمانویل ڈیوش
(۴۱) طالسطائی روسی فلاسفر
(۴۲) مشہور مورخ گبن
(۴۳) جیون ڈیون پورٹ صاحب
(۴۴) مختصر تاریخ چرچ

جن کتابوں یا مصنفوں کا حوالہ اس جلد اول کے ہر چہار ابواب میں دیا گیا ہے

(۱) تاریخ طبری ترجمہ فارسی مترجمہ ابوعلی محمد وزیر ابوصالح بن منصور سامانی بادشاہ بخارا
(۲) چچ نامہ
(۳) تاریخ سندھ معصومی
(۴) تذکرۃ الحفاظ
(۵) مروج الذہب (از مسعودی)
(۶) عجائب الہند (مصنفہ بزرگ بن شہریار)
(۷) تاریخ اسلام
(۸) تاریخ ذکاء اللہ
(۹) جامع التواریخ (مصنفہ قاضی فقیر محمد صاحب)
(۱۰) زین الاخبار بحوالہ فرشتہ
(۱۱) تاریخ ابن خلدون

(۱۲) تاسیخ التواریخ
(۱۳) روضتہ الاصفیا (مصنفہ مفتی غلام سرور لاہوری)
(۱۴) تاج المآثر (مصنفہ خواجہ صدر نظامی)
(۱۵) تاریخ فرشتہ
(۱۶) پریچنگ آف اسلام (مصنفہ ڈاکٹر ڈبلو ٹی آرنلڈ)
(۱۷) تاریخ نظامی (مصنفہ نظام الدین ہروی)
(۱۸) تاریخ یمینی
(۱۹) روضتہ الصفا (مصنفہ خاوند شاہ یا اخوند شاہ)
(۲۰) طبقات ناصری (مصنفہ ابوعمر منہاج سراج)
(۲۱) طبقات اکبری (مصنفہ خواجہ نظام الدین احمد ہروی)
(۲۲) غزوانامہ مسعود (مصنفہ عنایت حسین بلگرامی)
(۲۳) تاریخ بیہقی (مصنفہ ابوالفضل بیہقی)
(۲۴) مفتاح التواریخ
(۲۵) سفرنامہ حکیم ناصر خسرو ایرانی (مرقومہ حکیم موصوف)
(۲۶) تاریخ ہند (مصنفہ ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر صاحب)
(۲۷) ملکم صاحب کی تاریخ
(۲۸) امیر نامہ (مصنفہ سید سعید احمد صاحب)
(۲۹) منتخب التواریخ (مصنفہ ملا عبدالقادر بدایونی)
(۳۰) تاریخ ہند (مصنفہ الفنسٹن صاحب)
(۳۱) سوانح عمری حکیم ناصر خسرو ایرانی (مرقومہ مولانا حالی)
(۳۲) تاریخ زین المآثر
(۳۳) تاریخ مالوہ (مصنفہ منشی کرم علی میر منشی ریزیڈنسی اندور)
(۳۴) ٹاڈ راجستان
(۳۵) سفرنامہ مظہری (مصنفہ محمد حلیم انصاری)
(۳۶) تاریخ فیروز شاہی (مصنفہ ضیا برنی)
(۳۷) سفرنامہ ابن بطوطہ
(۳۸) ہندوستان پر حملے (مصنفہ ڈی میجر جنرل ایل این سیولیوف)
(۳۹) جواہر فریدیہ
(۴۰) تاریخ روس (مصنفہ سر ڈی میکنزی والس)
(۴۱) ہندوستان کی تاریخی کہانیاں (مصنفہ جی سی ایلن صاحب)
(۴۲) لیتھبرج کی تاریخ ہند
(۴۳) ابن حوقل
(۴۴) بشاری مقدسی
(۴۵) تاریخی سلسلہ حکایات (مصنفہ ای مارسڈن)
(۴۶) آئینہ تاریخ نما (مصنفہ راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند)
(۴۷) مختصر سیر گلشن ہند (مصنفہ لالہ بابو رام)
(۴۸) خلاصۃ التواریخ (مصنفہ منشی سجان رائے بھنڈاری بٹالوی)
(۴۹) لنگ پوران۔
(۵۰) تاریخ ہند قدیم (مصنفہ کے ایم پانیکار)
(۵۱) وقائع راجپوتانہ (مصنفہ بابو جوالا سہائے)
(۵۲) جغرافیہ اقلیم ہند (منشی سجان رائے بٹالوی)
(۵۳) تاریخ ہند (مصنفہ لالہ لاجپت رائے)
(۵۴) تاریخ حالات ہند (مصنفہ رام چندر صاحب)
(۵۵) جامع التواریخ (مصنفہ محمد حسین سندیلوی)
(۵۶) تاریخ ابو الفداء